سرگزشت
جواں مرد
ادارہ — 15
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت وشنید
شہرِ خیال
مدیرِ اعلیٰ — 16
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت
استادِ ادب
ڈاکٹر ساجد امجد — 24
پنجاب کے ایک بہت بڑے قلم کار کا احوالِ زیست

خراجِ تحسین
فنکار
شکیل صدیقی — 47
پاکستان سے جرمنی تک پھیلی ایک مصور کی کتھا

معلومات
شطرنج
محمد ایاز راہی — 61
اس کھیل کا تذکرہ جو برِصغیر میں ایجاد ہوا

حیرت انگیز
عفریت
ابنِ کبیر — 65
اس جھیل میں ایک عجیب الخلقت جانور رہتا تھا

عزم وحوصلہ
بلند حوصلہ
طارق عزیز — 85
بلند وبالا برف پوش پہاڑوں کو سر کرنے کی داستان

حادثات
ہمتِ مرداں
امجد رئیس — 91
اس نے موت کو بھی شکست دے دی

فلم و صحافت
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی — 95
فلم صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، فلم نگری کی باتیں یادیں

تحقیق
سیفٹی ریزر
اختر شہاب — 117
ہر گھر میں استعمال ہونے والا آلہ کیسے ایجاد ہوا

تذکرہ
بے زباں ہمدرد
امیمہ سلیم — 121
ایک کتے کے حوصلے اور وفاداری کا بیان

سفرکہانی
ترکی نمی دانم
علی سفیان آفاقی — 131
اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفرکہانی

تذکرہ شکاری
مہا شکاری
اقبال احمد — 145
برِصغیر کے اس شکاری کا ذکر جو آدم خوروں کا دشمن کہلایا

جرم وسزا
وارداتِ خونچکاں
نسرین عثمانی — 157
قاتلوں نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

معاشرت
سراب
کاشف زبیر — 162
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی
محسنہ
نگار عابد الرحمن — 210
اسے خبر نہ تھی کہ اس کا سوتیلا بیٹا باپ کے ساتھ مل کر ایسا کھیل کھیلے گا

دوسری سچ بیانی
عورت ایک پہیلی
عمران — 229
اس نے اپنے مفاد کی خاطر اسے اپنا شوہر بنایا تھا

تیسری سچ بیانی
وہی ہوتا ہے
ارجمند — 245
دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے اپنے انجام سے بے خبر رہتے ہیں

چوتھی سچ بیانی
نہیں چاہیے
منظر امام — 251
ایک خواب کا تذکرہ جس نے اسے الجھا دیا ہے

پانچویں سچ بیانی
زندہ درگور
ہارون احمد — 257
گھر والوں نے اسے زندہ دفن کر دیا تھا

چھٹی سچ بیانی
گولڈ میڈل
گیتی آرا — 265
وہ اچھی کارکردگی کا صلہ چاہتا تھا مگر اسے ملا کیا؟

ساتویں سچ بیانی
الٹی تدبیر
شکیل — 269
وہ باپ کو بچانے کی خاطر خود جیل میں جا پھنسا

آٹھویں سچ بیانی
اشکِ ندامت
جاناں یار محمد — 279
اس نے حسد کے مارے شوہر کو ہی کھو دیا

نویں سچ بیانی
ادائیگی
عظیم — 283
اس نے انتقام کے لیے الگ انداز اختیار کیا تھا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ◆ شمارہ 08 ◆ جولائی 2013ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمایندہ کراچی	محمد عرفان خان	0333-2168391
	ماہا محمد جمید	0323-2895528
نمایندہ لاہور	افراز علی بارش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ◆ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اگر ہم یہ کہیں کہ سانحہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد تاریخِ پاکستان کا دوسرا بڑا سانحہ بابائے قوم کی رہائش گاہ کو راکھ کا ڈھیر کر دینا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ عقیدتِ قائد اعظم پر سیدھی ضرب ہے اور اس واردات کے لیے دہشت گردوں نے اس روز کا انتخاب کیا جس روز پوری دنیا ''فادر ڈے'' منا رہی تھی۔ عین اسی روز آثار یات کو تباہ کرنا ثابت کرتا ہے کہ ایک پلاننگ کے تحت ہی تمام وارداتیں ہو رہی ہیں۔ الگ الگ جگہ، الگ الگ وارداتیں مگر ایک دوسرے سے مربوط۔ مثلاً قائد اعظم کی رہائش گاہ کو تباہ کرنے کا الزام ایک قوم پرست تنظیم نے قبول کیا تو کوئٹہ کی معصوم طالبات کی بس پر حملہ کرنے کی ذمے داری ایک کالعدم مذہبی جماعت نے قبول کی۔ دو الگ الگ مقام پر الگ الگ قسم کی دہشت گردی لیکن غور کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ اصل ہدف بابائے قوم کی یادگار ہے۔ انسانی جانوں، خصوصاً معصوم طالبات کی اموات نے میڈیا کا رخ اُدھر موڑ دیا اور اتنی اہم بات دب گئی۔ انسانی فطرت کے اس کمزور پہلو کو آزمایا گیا۔ گویا خیبر سے کراچی تک قسم ہا قسم کے تعصبات پھیلائے جا رہے ہیں۔ دہشت گردی کی جو وارداتیں ہو رہی ہیں ان کا مقصد ہی استحکامِ پاکستان پر ضرب لگانا ہے۔ اور یہ سب پکھ لانگ ٹرم پروگرام ہے۔ یہ نسلی، گروہی، فرقہ واریت، لسانی تعصب وغیرہ وغیرہ بڑے منظم انداز میں پھیلایا جا رہا ہے۔ تاکہ استحکامِ پاکستان کو زک پہنچے اور وطن پرستی کا جذبہ کم ہوتا جائے۔ اگر وطن پرستی کا جذبہ جو ہمارا خاصّہ تھا، کلی طور پر باقی رہتا تو کیا قائد کی یادگار کی تباہی کے بعد ہمارے آنسو تھمتے؟ مگر ایسا کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ حیرت تو جب ہوئی جب ایک اہم شخصیت نے یہ کہا کہ زیارت کی واردات صوبائی حکومت کا مسئلہ ہے، تو کیا بابائے قوم صرف بلوچستان کے تھے۔ ہمارے یا ان صاحب کے نہیں تھے؟ ایک دو چھوٹی تنظیموں نے پلے کارڈ اٹھا کر احتجاج ریکارڈ کرایا باقی سب اپنے اپنے مسائل سلجھانے میں لگے رہے۔ کیونکہ فوراً ہی دوسری پھر تیسری واردات ہو رہی ہے، جو پہلی واردات کا اثر خود کم کر دیتی ہے۔ اس کا بس ایک حل ہے کہ حبّ الوطنی، اتحاد و یگانگت کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرایا جائے۔ بقول پروین شاکرہ

دوستو! آج ہی طے منزلِ فردا کر لیں
منزلیں ساتھ رواں ہوں گی ارادہ کر لیں
پاسِ ناموسِ وطن زیست کا عنواں ٹھہرے
روحِ قائد سے پھر اِک بار یہ وعدہ کر لیں

معراج رسول

جواں مرد

سرگزشت

سولہویں صدی عیسوی میں مکہ مکرمہ سے وہ لوگ آئے تھے۔ مغلوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اس لیے کہ ان کا تعلق خاندانِ قریش سے تھا۔ دہلی یا آس پاس کہیں جاگیر دیتے تو وہ چھوٹی موٹی ہوتی اس لیے انہیں دکن کے علاقے کی طرف روانہ کر دیا۔ دکن ان دنوں شورش زدہ علاقہ تھا۔ اس علاقے میں پہنچتے ہی اس خاندان نے بقا کی خاطر تعلقہ داری قبول کر لی۔ تعلقہ داری برقرار رکھنے کے لیے شمشیر زنی ضروری ہے۔ آہستہ آہستہ یہ خاندان سپاہیانہ زندگی کی طرف آنے لگا۔ اسی خاندان کے شیخ فتح محمد کو جنوبی ہند کے سرا صوبے کی منصب داری ملی تھی۔ ان کی شادی مقامی زمیندار اکبر علی خان کی دختر مجیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے اس بچے نے جنم لیا جس نے برصغیر کی تاریخ میں حوصلے اور ہمت کا ایک نیا باب رقم کیا۔ ابھی اس بچے کی عمر صرف 5 سال تھی کہ ماں کی گود چھن گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد شیخ فتح محمد نے اسے اپنے بھائی شیخ حیدر صاحب کے سپرد کر دیا کہ ان کی بیوی اس کی نگہداشت کرے گی۔ شیخ حیدر صاحب میسور کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وجہ سے بچے نے بھی فنِ سپاہ گری میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ بچے نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کی فنِ سپاہ گری کی شہرت دور دور تک پہنچنے لگی اور کرناٹک کے نواب محمد علی والا جاہ کے بھائی عبدالوہاب نے اسے اپنے یہاں نوکری دے دی۔ بعد میں میسور کے راجا نے اسے سرنگا پٹم میں ریاستی فوج کے ایک دستے کا کماندار بنا دیا۔ اس کی جانبازی اور فوجی صلاحیتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے 1752ء میں اسے ڈنڈیگل کا گورنر بنا دیا گیا۔ جس زمانے میں میسور کی فوجیں کرناٹک میں جنگ لڑ رہی تھیں مرہٹہ پیشوا بالاجی باجی راؤ نے میسور پر حملہ کر دیا۔ راجا نے ایک کروڑ روپے بطور تاوان دینے کا وعدہ کیا اور بطور ضمانت ریاست کا ایک بڑا حصہ مرہٹوں کی کفالت میں دے دیا۔ جب رقم ادا کر دی گئی تو مرہٹے 1755ء میں دوبارہ حملے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ رقم کا انتظام اسی نوجوان نے کیا تھا اس لیے راجا نے اسے فتح حیدر بہادر کے خطاب سے نوازا اور میسور کی افواج کا سپاہ سالار مقرر کر کے مرہٹوں سے معاملات طے کرنے کے کلی اختیارات دے دیے۔ نوجوان نے اس بار تاوان دینے کی بجائے جنگ کا راستہ اختیار کیا اور مرہٹوں کو بری طرح شکست دے دی۔ 1760ء میں اس نے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کے بھائی بسالت جنگ کو فوجی امداد دی اور قلعہ ہوسکوٹ فتح کر لیا۔ اس غیر معمولی کامیابی پر خوش ہو کر نواب بسالت جنگ نے شہنشاہ دہلی سے سفارش کی اور صوبہ سرا کی صوبیداری اس کے نام کر دائی۔ اگست 1760ء میں میسور کے وزیر کھنڈے راؤ نے راجا کے ساتھ مل کر اسے بے دخل کرنا چاہا۔ نوجوان کے اندر ہمت و شجاعت تھی۔ اس نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ راجا کو باقی ریاست سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ اب سرنگا پٹم پر اس کا قبضہ تھا۔ اس نے کھنڈے راؤ کو قید کر کے اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ 1763ء میں مرہٹوں نے پھر میسور کا رخ کیا اور بدنور پر قبضہ کر لیا۔ خبر سنتے ہی وہ اپنے لشکر کے ساتھ سرنگا پٹم سے نکلا۔ اس کی آمد کی خبر سن کر مرہٹے خوف کے عالم میں ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس کی فتوحات سے آس پاس کی ریاستیں سخت خوفزدہ تھیں۔ مرہٹوں اور نظام نے انگریزوں سے ساز باز کر لی۔ کرناٹک کا نواب بھی انگریزوں سے مل گیا۔ ان سب نے مل کر مشترکہ فوج بنائی اور میسور پر حملہ کر دیا۔ 69-1767ء کی اس جنگ میں بھی کامیابی نے اس نوجوان کے قدم چومے۔ مشترکہ فوج کو تہ تیغ کرتا ہوا وہ سیدھا انگریزوں کی فوج پر جا پڑا۔ اس حکمتِ عملی نے انگریزوں کے قدم اکھاڑ دیے مگر یہ فوج اس افراتفری میں اس طرح بھاگی کہ اس کا سارا سامان میدان میں پڑا رہ گیا۔ انگریز سپہ سالار کرنل اوڈ نے دوبارہ کوشش کی تو اس پوری آٹھ پہنی فوج کو موت کی نیند سلا کر اس کے بھاری توپ خانے پر نوجوان کی فوج نے قبضہ کر لیا۔ 1770ء میں پیشوا مادھو راؤ نے پھر حملہ کیا اور جنگ طویل ہو گئی۔ 1772ء میں پیشوا مر گیا تو مرہٹوں نے صلاح کر لی۔ 1772ء میں کورگ۔ 1773ء میں ملیبار کوچین اور نیل گری۔ 1774ء میں بلاری اور گتی، 1775ء میں بادامی، دھاڑواڑ اور چتلدرگ۔ 1779ء میں کڈپہ فتح کر کے اس نے اپنی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ اس باہمت جوان کو دنیا حیدر علی کے نام سے جانتی ہے۔ وہ شیرِ میسور ٹیپو سلطان شہید کے باپ کے نام سے بھی مشہور ہے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

☆ رانا محمد شاہد، بورے والا سے رقم طراز ہیں "جون کا شمارہ سخت گرمی میں خریدا۔ گرمی کی شدت اوپر سے غیر اعلانیہ اور بدترین لوڈشیڈنگ نے عوام کا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ سوچیے ذرا اس مزدور کے بارے میں جو ساری رات اپنے بچوں کو بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پنکھا جھلتا رہتا ہے اور اگلی صبح پھر کام پر چلا جاتا ہے کیونکہ اگر وہ نہیں جائے گا تو گھر کا چولہا کیسے جلے گا؟ تو پھر اس کی نیند کون اور کیسے واپس کرے گا؟ نئی حکومت وجود میں آ چکی ہے۔ بجلی کے بحران کا حل اس حکومت کو زیادہ سنجیدہ بنیادوں پر اور جلد حل کرنا ہوگا۔ ورنہ ان کا انجام بھی کچھ اچھا نہ ہوگا۔ (فیصل آباد میں علاج کرنے کی کوشش تو ہوئی۔ بہت سے زخمی اب تک اسپتال میں پڑے ہیں) اداریے میں معراج رسول صاحب نے ہماری معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے ایران گیس پائپ لائن معاہدہ اور گوادر پورٹ کے مسئلے کا ذکر کیا۔ یہ دونوں معاہدے پاکستان کے بہت سے مسائل کا حل ہیں جو یقیناً میاں نواز شریف کی گورنمنٹ کے لیے چیلنج ہوں گے۔ "مشکول توڑ دیں" اگر ہمارا نظریہ بن جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم دنیائے عالم میں ایک باوقار قوم کی طرح جی سکیں۔ ہماری بدقسمتی کہ قائداعظم کے بعد ہمیں کوئی ایسا لیڈر نہ ملا جو ایک وژن و نظریات اگلی نسل کو منتقل کر سکتا۔ ماؤزے تنگ سے صحافیوں نے پوچھا کہ نشہ کرنے والی قوم ترقی کیسے کرے گی تو انہوں نے ایک بوڑھے کی مثال دی جس کا گاؤں پہاڑ کے عقب میں تھا۔ ایک دن وہ بوڑھا کدال لے کر پہاڑ کے اوپر گیا اور اسے توڑنے لگا تو لوگوں نے پوچھا تم اس پہاڑ کو ختم کر لو گے؟ اس بوڑھے نے جواب دیا کہ میں جب مرنے لگوں گا تو یہ کدال اپنی اگلی نسل کو دے دوں گا اور میرے بچے اسے اگلی نسل کو دیں گے۔ اس طرح ایک دن پہاڑ ختم ہو جائے گا اور سورج کی شعاعیں گاؤں میں آنے لگیں گی۔ دعا ہے کہ ایران گیس پائپ لائن اور گوادر پورٹ کے معاہدے ہمارے ملک کو بھی روشن کر دیں۔ اسلام آباد پہاڑیوں کے درمیان بن سکتا ہے تو گوادر دبئی کیوں نہیں بن سکتا۔ بندرگاہ بنے گی تو گوادر بھی دبئی بنے گا کیونکہ آج سے 30 سال پہلے دبئی بھی ایسا ہی تھا۔ برصغیر کے ایک بڑے پہلوان غلام محمد المعروف گاما پہلوان کی یک صفحی سرگزشت میں پہلوانی کے حوالے سے ان کی تربیت اور کارنامے دلچسپی سے بھرپور تھے۔ عزیز اللہ کا خط شہزاد جہانگیر کے خط کے درمیان میں آ گیا جس کی وجہ سے دلیپ کمار والا حصہ ان کے خط عزیز اللہ و دلیپ کمار کے بڑے فین لگتے ہیں۔ (عزیز اللہ کا خط ... کا حصہ بن گیا) بہرحال محبت کے حوالے سے ان کی بات سے اتفاق ہے کیونکہ محبت Age Limit کی پابند نہیں ہوتی۔ عمران خان یاور کو صحافتی زندگی میں اتنی کامیابیاں سمیٹنے پر مبارکباد۔ اعجاز حسین سنارہ سے بے تکلف لب و لہجہ گفتگو ہو تو میرے خیال میں عمروں کا فرق نہیں رہتا کیونکہ زندگی تو ہوتی ہی زندہ دلی کا نام ہے۔ احمد خان تو جیدی، ایک ڈاکٹر عبدالقدیر اور ایم ایم عالم ہی کیا..... ہمارے پاس تو احسان فراموشی کی ایک لمبی لسٹ ہے۔ ہمارے کسی بھی شعبے کے ہیرو ہوں، ہم نے انہیں کبھی وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ حالانکہ مغربی دنیا اور ہمارے ہمسایہ ملک کے لوگ بھی اپنے ہیروز کی بے پناہ قدر کرتے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سوچا کہ قرۃ العین حیدر جیسی بڑی رائٹر کیوں یہ ملک چھوڑ کر چلی گئیں؟ ساحر لدھیانوی کیوں یہ ملک چھوڑ گئے؟ قومیں وہی ترقی کرتی ہیں اور دنیا میں باوقار طریقے سے جیتی ہیں جو اپنے ہیروز کی قدر کریں۔ ابن مقبول کا تبصرہ پسند آیا۔ عمران قریشی کی بات سے اتفاق ہے کیونکہ تحریر شائع ہونے کے بعد رائٹر کو اعزازی کاپی کی ترسیل اس کا بنیادی حق ہے۔ اس دفعہ ڈاکٹر ساجد امجد اشتراکیت کے عظیم مفکر کارل مارکس کا زندگی نامہ لے کر آئے۔ کارل مارکس کے نظریات و افکار اس لیے عظیم ٹھہرے کہ اس نے خود مشکلات و مصائب میں زندگی گزاری، مگر ایک دنیا کو جینے کا ڈھنگ دے گیا۔ طارق عزیز خان نے خلا کے اولین مسافر کی روداد بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھی۔ ایک عجیب انداز میں تباہ ہونے والے ہوائی جہاز کی پُراسرار کہانی ابن کبیر سنا رہے تھے۔ ایک مختلف انداز سے جہاز کا تباہ ہونا اور اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود تحقیق کا منطقی انجام تک نہ پہنچنا، یقیناً ایک الگ اور افسوس ناک پہلو ہے۔ آصف ملک کی "موت کے سائے" اور صائمہ اقبال کی "جہنمی گڑھے" دلچسپ و منفرد انداز کی تحریریں تھیں۔ سید احتشام ایک مہذب اور باضمیر معاشرے کی کہانی سنا رہے تھے۔ کاش ضمیر کی یہ خلش ہمارے معاشرے کو بھی بے چین کر دے تو ہمارے ہاں بھی قانون و انصاف کی حکمرانی ہو۔ کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اور اسلاف کی تاریخ ہمیشہ ہی انصاف کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ شکیل صدیقی نے طنز و مزاح سے بھرپور لکھنے والے ایک بڑے لکھاری کا زندگی نامہ بڑے شگفتہ انداز میں لکھا۔ آرٹ بکوالڈ ایک عظیم صحافی ہی نہیں عظیم انسان بھی تھا۔ اس کا کالم دنیا بھر کے تقریباً 1600 اخبارات میں شائع ہوتا تھا۔ جس میں سے زیادہ تر کا معاوضہ وہ مصائب و مشکلات میں گھرے انسانوں کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ گجرات کے سانحے پر کیا کہیں۔ درجن سے زائد معصوم بچے اور ان کی ٹیچر دن میں زندہ جل گئے۔ ہم لوگ ہر بات میں یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ اللہ کو یہی منظور تھا تو کیا اللہ یہ چاہتا تھا کہ ہنستے مسکراتے گھرانوں کے چہرے آنسوؤں سے بھیگ جائیں۔ یقیناً نہیں، کیونکہ وہ تو خود اپنی کتاب قرآن مجید کی ایک آیت میں فرماتا ہے، جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ "تمہیں جو بھی تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کسب و عمل کا نتیجہ ہے اور تمہیں ملنے والی ہر نعمت کا سرچشمہ میری رحمت ہے۔"

☆ صوبی شاہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے "سرگزشت 30 تاریخ کو مل گیا تھا سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ ہم بھی اپنے وطن کے لیے دعا گو ہیں۔ شہرِ خیال میں سب کے خطوط پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک ہی گھر کے سب افراد مختلف طریقوں سے اپنا اپنا اظہارِ خیال کر رہے ہوں۔ بھائی طاہر الدین بیگ آپ کی یہ بات مجھے بے حد پسند آئی کہ مسل علی جیسی آپ بیتی کو فوٹو کاپی کروا کر تقسیم کرنا چاہیے۔ میں نے اس پر عمل بھی کر لیا ہے۔ سچ بیانیوں میں لے پالک پڑھی تو حیرت نہیں ہوئی کیونکہ آج کل کے دور میں سب کچھ ممکن ہے۔ قاتل جذبے، ناظمہ نے جو کیا اس کا پھل بھی پا لیا..... محمد ظفر حسین صاحب کی کہانی ازالہ پڑھی تو دل بہت دکھا، ہم واقعی بے حس ہو گئے ہیں، اس میں کچھ شک نہیں۔ میں خود ایک بیوہ عورت ہوں اور ایک بیٹی کی ماں۔ میں نے کس طرح سفید پوشی کا بھرم رکھا ہوا ہے یہ میرا رب بہتر جانتا ہے۔ ہمیں اگر اللہ نے رزقِ حلال اور مالی طور پر آسودہ کر رکھا ہو تو ہم غریب غربا اور مساکین لوگوں کو اس میں حصہ دار کیوں نہیں بناتے؟ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے، کبھی وقت ملا تو اپنی آپ بیتی بھی تحریر کروں گی (انتظار رہے گا)"

☆ انجم فاروق ساحلی کا مکتوب لاہور سے "جون کا سرگزشت خوبصورت اور جاذبِ نظر ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ اشتہارات کی رنگین محراب سے آگے بڑھے تو مفکر کے نام سے تاریخ ساز شخصیت کے حالات موجود تھے۔ کارل مارکس نے معاشی نظام، زندگی اور تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے، ان کی زندگی معاشی جدوجہد کا ایک سبق چھوڑ گئی ہے جس میں کئی طرح کی قربانیاں شامل ہیں۔ آفاقی صاحب کی دونوں تحریریں اچھی ہیں۔ ترکی کے ماحول کا اچھا عاطرانہ جائزہ قلمبند ہوا۔ مضامین کے انتخاب میں مدیرِ سرگزشت نے کافی محنت اور عرق ریزی سے منتخب واقعات کو سرگزشت کی زینت بنایا۔ موت کے سائے، پُراسرار حادثہ اور بڑا بہترین انتخاب تھے۔ آپ بیتیوں میں لے پالک، ایم الیاس کی چڑیل، اور اپنی آگ بہتر معلوم ہوئیں۔ امید ہے ہماری طرف توجہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔"

☆ وحید ریاست بھٹی کلر سیداں، راولپنڈی سے لکھتے ہیں "خوبصورت سرورق سے سجا "سرگزشت" 28 مئی "یوم تکبیر" کو ملا۔ سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز اداریہ پڑھا۔ میاں نواز شریف میڈیا پہ تو ہر مسئلے کا حل لیے نظر آتے ہیں لیکن جب کرسیِ اقتدار پہ بحیثیت وزیرِاعظم پاکستان تشریف فرما ہوں گے تو میری دانست میں یہی شعر ہر وقت گنگناتے رہیں گے بقول شاعر "ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں۔ اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں"۔ معراج صاحب شاید آپ میری اس فکر سے اتفاق کریں کہ میرے پیارے قائد محمد علی جناح کا پیارا وطن "پاکستان" 1947ء سے ابھی تک سفر میں ہے۔ دعا ہے اس ربِ عظیم سے جو تمام مخلوقات کا رب ہے کہ کوئی مخلص و ایماندار شخص میرے پیارے ملک کا ہاتھ پکڑ کر اس کو منزلِ مقصود تک لے جائے جہاں امیر و غریب ایک ساتھ پڑھتے ہوں، بیماروں کا علاج بالکل فری ہوتا، ہو جہاں بیروزگاری کا نام و نشان نہ ہو یا بیروزگاروں کو گھر بیٹھے وظیفہ مل رہا ہو جہاں کی یونیورسٹیاں ہر سال ہزاروں ریسرچ پیدا کر رہی ہوں۔ مذہبی ہم آہنگی ہو، امن ہی امن کا راج ہو، اے میرے خدا اب وہ وقت لے آ، ناانصافی و ظلم کی حد ہو چکی۔ تجھے تیری عظمت و بزرگی کا واسطہ اپنے حبیب کریم کا واسطہ اس ملک کے رہنے والوں کو اب معاف کر دے۔ اے بحر و بر کے خدا (آمین) باقی سرگزشت ناسازیِ طبع کی وجہ سے کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کر سکا اپنے تمام شہرِ خیال کے باسیوں کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کرتا ہوں اور آپ کا مشکور ہوں کہ ناچیز کا خط باقاعدگی سے شائع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے "مفکر" لکھ کر تو ہمارا دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا، ڈاکٹر صاحب کا شکریہ۔ علی سفیان آفاقی صاحب نے بمبئی ٹاکیز، فلمستان اور محبوب اسٹوڈیو کا تعارف بہت اعلیٰ انداز میں کرایا۔ طارق عزیز خان صاحب نے تسخیرِ خلا پر بہت خوبصورت لکھا اور غلطی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔ "ترکی کا سفرنامہ" بہت جاندار لکھا ہے اگر ہو سکے تو "نیوزی لینڈ" کا سفرنامہ کسی سے لکھوا لیجیے گا۔ ابھی سچ بیانیاں نہیں پڑھ سکا ایک چیز جاتے جاتے عرض کروں کہ اپنے آرٹیکل محرم بھارت، جو کہ KC.DEY کے حوالے سے تھا بلکہ مزید ریسرچ پیشِ خدمت ہے ہو سکے تو سابقہ آرٹیکل میں شامل کر لیجیے گا" (بہت شکریہ)

☆ عمران خان یاور کی آمد شاہ کوٹ، ننکانہ صاحب سے "سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ معراج رسول صاحب نے مختصر الفاظ میں ملکی حالات کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا، میری رائے میں نئی حکومت کے لیے سب سے بڑا اور اہم چیلنج کرپشن پر قابو پانا ہے۔ چونکہ کرپشن پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور یہ بجا طور پر اُم الخبائث کہلا سکتی ہے اور لوڈشیڈنگ، بے روزگاری، مہنگائی سب اسی کی دین ہیں۔ اس کے بعد مختصر مختصر یک صفحی سرگزشت میں عظیم گاما پہلوان کے بارے میں دلچسپ اور معلوماتی تحریر پڑھی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ گاما پہلوان جیسے مردِ میداں کے ملک کے پہلوان گزشتہ برس انڈیا کے

پہلوانوں سے مقابلہ ہار گئے۔ پھر ہم پہنچے شہرِ خیال میں جہاں پر ہمارا خط بھی شائع ہوا تھا جس سے جی بہت خوش ہوا۔ ڈاکٹر آر ایم ای صاحب سے گزارش ہے کہ اپنی فلاسفی کو revisit کریں۔ تاریخ کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کوئی objective چیز نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہر شخص ایک تاریخی واقعہ یا شخصیت کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے مورخ کے ذہنی رجحانات، میلانات اور Prejudices کے بارے میں آگاہی بہت ضروری چیز ہے تاکہ ہم اپنی approach کو بیلنس رکھ سکیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی ”مفکر“ پڑھی، کارل مارکس کے اپنے فلسفے اور نظریے کے ساتھ خلوص کے بارے میں معلوم ہوا، اس نے جو ٹھیک جانا ساری زندگی اسی کی تبلیغ کرتا رہا اور بجا طور پر جدید دنیا کا نہایت پُراثر اور اہم مفکر ثابت ہوا۔ صائمہ اقبال کی تحریر ”جنتی گڑھے“ بہت دلچسپ تحریر تھی۔ علی سفیان آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ نے اس بار بھی دل موہ لیا۔ ”شہنشاہِ صحافت“ میں معروف کالم نگار آرٹ بکوالڈ کی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات جان کر خوشی ہوئی۔ شاید بہت سارے لوگ یہ نہ جانتے ہوں کہ یہودی ہونے کے باوجود وہ انسانیت کے لیے بڑا نرم گوشہ رکھتا تھا اور بلا تفریق مذہب، رنگ و نسل لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کھلے دل سے کام کرتا تھا۔ سچ بیانیوں میں ”آٹھ لاکھ“ کا انجام ہماری سوچ سے بالکل مختلف نکلا، شروع میں اختر کی ناکام محبت پر افسوس ہوا لیکن آخر میں اس کے انتقام کے جذبے کے تحت کی گئی حرکت نے سب پر پانی پھیر دیا، محبت ہے تو انجام جو بھی ہو، انتقام کیسا؟ اس ماہ کی کترنیں بھی بڑی دلچسپ اور معلوماتی رہیں۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔“

☆ منظر علی خان کی لاہور سے تشریف آوری ”مفکر کے عنوان سے کارل مارکس کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ کارل مارکس وہ پہلا مفکر ہے جس نے سائنٹفک انداز میں معاشرے کی طبقاتی کشمکش کا نظریہ پیش کیا۔ کارل مارکس پرولتاری تھا بورژوائی نہیں اور انقلاب کا قائل تھا۔ سرمایہ داری ہو یا اشتمالیت معاشرہ کو کسی ایک نظریہ پہ منجمد نہیں کیا جاسکتا۔ ارتقائی عمل ایک حقیقت ہے معاشرے کا فرض ہے کہ حق و صداقت کو رائج کرے اور معاشرہ میں مساوات پرمبنی انصاف ہوتا نظر آئے۔ بہرحال سرمایہ داری ایک لعنت ہے اور انسانی آزادی سلب کرنے والا کوئی بھی نظریہ باطل ہے۔ تسخیرِ خلاء خلا میں رسائی کی شروعات کا تذکرہ تھا اور اب تو مریخ اور خلا میں بستیاں بسانے کے تصورات بھی پنپ رہے ہیں ”پُراسرار حادثہ“ شاید دہشت گردی کا واقعہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ ”موت کے سائے“ جنوبی افریقا میں فطری حیات سے متعلق دلچسپ واقعہ تھا۔ ”ترکی کی دھوم“ وہ چاشنی نظر نہیں آتی جو کہ آفاقی صاحب کی تحریروں کا حصہ ہے۔ فلمی الف لیلہ میں روانی ہے۔ ”سراب“ حسبِ روایت دلچسپیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ سچ بیانیوں میں ”لے پالک“ پسند آئی۔ بچے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بچہ ایڈاپٹ کرنا قطعی نامناسب اور فطرت کے خلاف ہے۔ ویسے خدمتِ خلق کے طور پر بچوں کی پرورش میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ ”قاتل جذبے“ کے عنوان سے ہمدردیاں سمیٹنے کے بعد کسی کو دھوکا دینا اور اسے تباہ و برباد کردینا صرف مردوں کا شیوہ نہیں بہت سی خواتین بھی ایسے ڈرامے کرکے سادہ لوح لوگوں کو لوٹ کر کنارے لگ جاتی ہیں۔ ”ازالہ“ کس چیز کا ازالہ، معاشرہ میں رسموں کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ کب تک پستے رہیں گے۔ فوتگی ہو یا شادی، اہلِ خانہ کا کباڑا ہو جاتا ہے۔ اصلاحِ رسوم کے لیے معاشرتی تبدیلی ضروری ہے مگر اسے فرقہ واریت کے رنگ میں اختیار کیا گیا تو سراسر خسارہ ہی خسارہ ہے۔ ”چڑیل“ نفسیاتی کہانی ہے۔ کسی کالی یا بدصورت کو قبول کرنا ہو تو تمام تر اچھائیوں برائیوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیے اور آوارگی بہرحال آوارگی ہے۔ ”آزادی“ سبق آموز کہانی ہے۔ ”اپنی آگ“ معاشرہ میں بگاڑ کی سزا اپنے ہاتھوں سے دینا جذباتیت سہی مگر ویسے بھی تو کوئی کیا کرے۔ آشیانہ ابدی پڑھ کر قبروں کی فروخت سے نیکی کمانے اور ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق بہت سے لوگوں کا خیال آتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ ”آٹھ لاکھ“ ذہنی ایڈجسٹمنٹ کی کہانی ہے۔ ایسے لوگ ایک دوسرے کو قبول کرلیتے ہیں اور عزت و حشمت کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے بلکہ مادی فوائد ان کا مطمعِ نظر ہوتا ہے۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ”مردِ میداں کو پڑھا اور دل فخر اور غرور سے بھر گیا کہ کبھی ہمارے پہلوان ایسے بھی ہوتے تھے جن سے ملک کا نام روشن رہتا تھا اور لوگ فخر کے ساتھ کہتے تھے He Is Pakistani اور اب بولتے ہیں See he is Paki ہم نے اپنے دین رسم و رواج کو تماشا بنا دیا ہے۔ دنیا میں پاکستانی وہ واحد قوم ہے جو دوسروں کے غلط کام، غلط باتیں اور ان کے معاشرے کے رسم و رواج کو اپنا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم اس سپر پاور و ہیر کی سپر پاور رامت ہیں لیکن افسوس ہمیں اپنے ان رویوں پر اور اس عمل پر جو ہمارے دین کے منافی ہیں شرم بھی نہیں آتی۔ ایک حکمران عوام کا باپ ہوتا ہے۔ اور اس کی ڈیوٹی ہے کہ وہ اپنے بچوں میں اتفاق، اتحاد، تنظیم اور محبت و بھائی چارہ قائم رکھے۔ اگر ایسا ہوگیا تو میرا یقین ہے کہ میرا ملک یہ پیارا ملک پاکستان ترقی ہی نہیں کرے گا بلکہ دوڑے گا۔ انشاء اللہ! اب کچھ دوستوں کے خطوط پر تبصرہ۔ پہلے نمبر پر ڈاکٹر آر ایم آئی کا خط پڑھا۔ واقعی نمبر ون ہونے کے قابل تھا، مبارک ہو۔ روبینہ نفیس انصاری صاحبہ آپ کتنی سویٹ ہیں۔ آپ جب وزیراعظم بن جائیں گی تو مرد بیچارے تو دل تھام لیں گے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی آپ کا تبصرہ اور تنویر عباس بھائی کا تبصرہ میں دل کی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ اس بار حاضر ہیں وہ بھی اتنے اچھے تبصرے کے ساتھ۔ معراج الدین بھائی آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ آپ بھی اپنی باجی کو یاد نہیں کریں گے۔ جاوید سرکانی صاحب آپ کہاں غائب ہو گئے اور مسز بشریٰ افضل آپ آ کے دوبارہ غائب ہوگئیں جناب یہ اچھی بات نہیں ہے۔ قطرہ قطرہ زندگی نے بہت رلایا۔ کتنی جاہلیت ہے ہم لوگوں میں۔ ہم کالج، یونیورسٹی کی خوبصورت عمارتوں میں تو بڑی شان سے پھرتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں لیکن ہم صرف ڈگریاں حاصل کرنے کی دوڑ میں آگے ہیں۔ ہم علم کی روشنی حاصل نہیں کرتے۔ قاتل جذبے، جو سیالکوٹ کی سیر ناز اور اس کی بیٹی کی کہانی ہے، جس ان کی نہیں میری بھی کہانی ہے۔ میرے بہت سے دوستوں کو پھر میری باتیں آگ لگیں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرد ہمیشہ عورت کو کھلونا بناتا ہے۔ مکاری کے آنسو بہا کے اس کے دل میں پہلے ہمدردی اور پھر محبت جگاتا ہے لیکن یہ مرد نہ کبھی کسی کے ہوتے ہیں نہ ہوں گے۔ یہ صرف

اپنی عیاشیوں اور جذبات کو پورا کرنے کے لیے کسی کی بھی بہن بیٹی کی زندگی برباد کردیتے ہیں۔ کہانی چڑیل، پڑھ کر بہت دکھ ہوا، دل بہت بوجھل ہوا۔ کیا بدصورت لوگوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں؟ دوسروں کو تو چھوڑو افسوس تو نیلم کے والدین پر ہوا اور پھر اسی احساسِ نفرت نے اسے اس حال تک پہنچایا کہ اس نے اپنی محبت کو حاصل کرنے کے لیے پلاسٹک سرجری تک کرائی لیکن اس ذلیل اور ناہنجار نے اس کے جذبے اور محبت کا کیا صلہ دیا۔ اس کی امانت طوائف پر لٹاتا رہا۔ مرد یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ عورت اگر محبت میں حد سے گزر جاتی ہے تو نفرت اور انتقام میں بھی آخری حد تک جاتی ہے۔ کہانی اپنی آگ پڑھی اور پہلی دفعہ دل بہت خوش ہوا اور سکون بھی ملا۔ عذرا اور تحریم نے بہت اچھا کیا ان جیسے مردوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ بھائی تھا تو کیا ہوا، تھا تو وہ بھی مرد نا جو دوسروں کی بہن بیٹی کی عزت سے کھیلتا رہا۔ کہانی 8 لاکھ، کچھ خاص نہیں اور ضد ہی مانتا ہے۔ ویسے ڈائجسٹ کے چار صفحے اس پر خراب کیے ہیں۔ آخری کہانی آشیانہ ابدی جو بزبان مکرم شاہ صاحب نے بیان کی ہے۔ کہانی سرگزشت کے ساتھ تو لگا نہیں کھا رہی تھی اس نے اپنے کام کے بارے میں اتنی تفصیل سے بیان کیا کہ لگا جیسے ہمیں بھی یہ کام شروع کرنا چاہیے۔ اپنی فیورٹ کہانی سراب، اب لگنے لگا ہے کہ سراب اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ شہباز بچ تو گئے تھے وسیم بھی زخمی تھا لیکن پھر شہباز کو کرنل اور مہرو نے بچالیا۔ یہ سب دوست پھر بکھر گئے۔ دور رتن، محمد ایاز راہی کو پڑھا بہت اچھا تھا۔ شکیل صدیقی نے شہنشاہِ صحافت، آرٹ بکوالڈ کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ بہت اچھا لگا۔ ساتھ ہی دل سے ایک ہوک اٹھی کہ کاش ہمارے ملک میں بھی آرٹ بکوالڈ پیدا ہو جائے (یونس کو پڑھیں)۔ سید احتشام کی تحریر سزا بہت زبردست کہانی تھی جو ہر باضمیر انسان کے لیے ہے۔ آج ہم کیوں زوال پذیر ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ضمیر نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ ہم اپنوں کے بڑے سے بڑے گناہ پر پردہ ڈالتے ہیں یہ سوچ کر کہ یہ ہمارے اپنے ہیں۔ تنویر ریاض نے اداکار لہری پر بہت منفرد طریقے سے لکھا۔ میں نے ان کی تمام فلمیں دیکھی ہیں۔ تنویر صاحب نے بہت اچھا لکھا لیکن ایک بات سے مجھے سخت اختلاف ہے کہ اکشے کمار اور گووندا کو ایک برابر لکھا۔ اکشے، گووندا کے پاؤں کی مٹی کے برابر بھی نہیں۔ باقی پھر پڑھوں گی تاکہ خط کو دیر نہ ہو جائے۔“

☆ محمد عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے ”معراج صاحب کے خوبصورت جملے ”وقت کا کام ہے گزرنا۔ گزر ہی جاتا ہے“ اور حسبِ حال شعر سے جون کے شمارے کا آغاز ہوا۔ واقعی اللہ پاک کی بڑی نعمت ہے کہ وقت ہر حال میں گزر جاتا ہے۔ آنے والے وقت میں اللہ سے اچھی امید انسان کا بنیادی سہارا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کا نام دنیا بھر میں روشن کرنے والے درخشندہ ستارے غلام محمد عرف گاما پہلوان کی مختصر سرگزشت سامنے آئی، وہ زمانہ فنِ پہلوانی کے عروج کا تھا عوام بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ تیس سال تک پوری شان سے اکھاڑے میں اپنا عالمی مقابلہ جیتنا بڑی بات ہے۔ شہرِ خیال میں ڈاکٹر آر ایم ای اپنے جامع اور خوبصورت الفاظ سے مرصع خط کے ساتھ بجا طور پر کرسیٔ صدارت کے مستحق نظر آئے، ڈاکٹر صاحب کی تحریر میں تجربہ کی نفاست صاف محسوس ہوتی ہے۔ شاہد جہانگیر صاحب کا طویل تبصرہ بھی پسند آیا، دو انگلیوں والے ضمن میں آپ نے لکھا کہ ایسے لوگوں کو شرم آنی چاہیے جو ایسے لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے ان سے بھیک منگواتے ہیں۔ ارے میرے بھائی ہم من حیث القوم ایسی بے شرمی اور سرد مہری کا شکار ہیں کہ بیان مشکل ہے۔ عزیز اللہ صاحب! انتہائی ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں کہ شہرِ خیال میں تبصروں کے علاوہ کوئی بات نہ ہو یا تنقید نہ کی جائے جہاں چار لوگ ہوں گے وہاں اختلاف بھی ہوگا۔“ عمران خان یار! بھائی آپ میرے ہم نام ہی نہیں ہم ذوق بھی ہیں۔ کم و بیش میرے پسندیدہ ادیبوں کی فہرست بھی یہی ہے۔ اللہ آپ کے علم میں خوب برکت دے۔ اعجاز احمد سفار کے بے ساختہ لہجے کا کیا کہنا ”صاف علی“ کے حوالے سے آپ کا تبصرہ بہت خاص تھا۔ دل خوش ہو گیا۔ افتخار احمد محسن صاحب کے بچوں کو اللہ مکمل صحت دے آمین۔ احمد خان توحیدی! آپ کے خط کی تیز رفتاری دلچسپی لیے ہوتے ہے لیکن آفاقی صاحب کی شاندار تحریر کو 25 صفحات کا ضیاع قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب! جس طرح آپ نے شہرِ خیال کے حاضرین سے فرداً فرداً علیک سلیک کی مزہ آگیا، انداز پسند آیا۔ آپ کا جامع تبصرہ باریک بین مطالعہ کی غمازی کرتا ہے اور رانا محمد سجاد صاحب کا مکتوب تو پورے کا پورا احوالِ شہرِ خیال تھا لطف آگیا۔ آپ جس طرح غیر حاضر ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں، قابلِ داد ہے۔ عبدالقیوم سیال صاحب خوش آمدید۔ بھائی معراج الدین بڑی ہمت کی بات ہے کہ ایسا خوفناک حادثہ دیکھنے کے ایک گھنٹے بعد آپ خط لکھ سکے۔ کارل مارکس کی سرگزشت ویسی ہی ہے جیسے عام طور پر ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ دنیا بھر کی سوچ کا محور تبدیل کرنے والے اکثر اوقات اپنے گھرانے سے غافل ہو جاتے ہیں حالانکہ ان ذمہ داریوں سے کوئی انسان بری الذمہ نہیں۔ تسخیرِ خلاء معلومات کا خزانہ ثابت ہوئی خاص کر تاریخوں کا حوالہ دے کر پورا انصاف کیا گیا۔ ٹیگ رین کو جو عزت ملی بجا طور پر اس کا مستحق تھا ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے اور پھر وہ کوئی پاکستانی تھوڑا ہی تھا جو اس کے ساتھ سرکاری طور پر ”ڈاکٹر خان“ یا ”ایم ایم عالم“ جیسا سلوک کیا جاتا۔ کچھ راز ایسے ہیں جو ہمیشہ راز ہی رہیں گے، ابن کبیر کی ”پُراسرار حادثہ“ بھی یقیناً ایسے ہی حادثے کی کہانی ہے۔ ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور پاؤں کھال اور نسوں کے سہارے لٹکا ہوا تھا اس ایک جملے میں آصف ملک صاحب نے ”موت کے سائے“ میں تمام تکلیف اور کرب کو سمیٹ کر مہارت سے بیان کردیا۔ کچھ عرصہ سے سرگزشت میں شائع ہونے والے شکاری مضامین یکسانیت کا شکار تھے مگر اس مضمون کی سنسنی اور تیز ٹیمپو نے تشنگی دور کردی۔ آفاقی صاحب بہترین منظر نگاری کے ساتھ ترکی کی سیر کرواتے نظر آئے، ترکی محض اپنی سیاحت کے بل پر اربوں ڈالر کما رہا ہے۔ ہم سے یہ قوم محبت بھی بہت کرتی ہے لیکن ہمارا معاملہ ”ہم ہیں مشتاق وہ ہیں بیزار“ والا ہے، ہم اپنے دوست ملکوں سے بھی صحیح طور پر فوائد حاصل نہیں کرپاتے، اپنے اندرونی خلفشار کی بنا پر...... ساتھ ساتھ روم کے مختصر تذکرے نے بھی مزہ دوآتشہ کردیا، روم کے بارے میں پہلے کافی تفصیل سے معروف لکھاری قمر علی عباسی کے سفرنامہ میں پڑھا تھا (قمر بھائی دو دن قبل انتقال کر گئے اللہ جنت نصیب فرمائے آمین) آفاقی صاحب آپ کی تحریر میں ایسا جادو ہے کہ کردار ذہن کی اسکرین پر چلتے پھرنے لگتے ہیں۔ صائمہ اقبال کی جنتی گڑھے،

اپنے رنگ ڈھنگ سے انگریزی مضمون کا ترجمہ لگی، موضوع نہایت حساس ہے، جس کے ساتھ غیر جانبداری سے عمدہ انصاف کیا گیا، یہ جادو کا اثر تھا یا کچھ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ روایات میں قربِ قیامت میں زمین کے دھنس جانے کا ذکر ضرور موجود ہے۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب نے اس مرتبہ تاریخی فلم اسٹوڈیوز کا بطور خاص تفصیلی ذکر کیا۔ اسٹوڈیوز میں ایک اور ہی جہاں آباد ہوتا ہے اس کے بارے میں پڑھنے اور جاننے کا اپنا رومانس ہے۔"

☆ احمد خان توحیدی، کراچی سے لکھتے ہیں" شمارہ جون 27 مئی کو مل گیا۔ شکریہ ادارہ یہ پڑھ کر کہنا پڑ رہا ہے کہ برادر معراج رسول صاحب وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ ہونے کو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ ایک روپیہ سے ٹھنڈا پانی پلا کر شام تک ڈیڑھ سو روپیہ منافع نوٹل ڈھائی روپے بنا لیتا ہے محنت میں عظمت جان کر دنیا بھر میں بزنس میں کھرب پتی بن جاتا ہے۔ تو بفضلِ خدا ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ صرف جذبہ صادق و نیک نیتی لازم ہے۔ ازلی دشمن امریکا و انڈیا کو جوتے کی نوک پر رکھ کر قومی مفاد کے فیصلے خود کریں۔ توانائی بحران کا فوری کالا باغ ڈیم، دریاؤں و چشموں پر ترمل پاور بنا کر جواب دیا جاسکتا ہے۔ گوادر پورٹ و گیس لائن کے بارے میں اتنا کہنا ہے کہ چین و ایران ہمارے مخلص دوست ہیں مگر امریکا کو صرف اسرائیل کا مفاد عزیز ہے، اللہ تعالیٰ نئی حکومت کو قوم و ملک کے مفاد میں کام کی توفیق دے (آمین ثم آمین) مرد میدان، گاما پہلوان کے بارے میں پڑھا۔ فنِ پہلوانی کی درست سرپرستی کی جائے تو وطنِ عزیز کے پہلوان دنیا بھر میں اپنا لوہا منوا کر ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ شہرِ خیال میں خوط لگایا تو ڈاکٹر RME صاحب کو کرسیِ صدارت پر پایا۔ لاجواب تبصرہ تھا۔ وہ گہرا ادبی مطالعہ رکھتے ہیں۔ واقعی ہم غیر مسلم کی طرح قانون کا احترام نہیں کرتے۔ شاہد جہانگیر پشاور، منتخب حکومت نے نیک نیتی سے درست قومی مفاد میں اب بھی کام نہ کیا تو تباہی کا اژدھا ہمیں نگل لے گا۔ برادر عزیز اللہ نامعلوم مقام، زندگی کے سچے سبق آموز واقعات واقعی سرگزشت سر پر... تاج سجانے والا ادبی رسالہ ہے۔ آفاقی صاحب بھی سفر کے اور فلمی سچے واقعات لکھتے ہیں۔ کامریڈ کنول کمانا، شمالی علاقہ جات قدرت کا حسین شاہکار ہیں تفصیلی تحریروں کی حمایت کرتا ہوں ابن مقبول، رانا سجاد، مظفر لاہور، اعجاز مختار، سدرہ نا گوری کے اچھے تبصرے تھے۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پر۔ مظفر ڈاکٹر ساجد صاحب کی اچھی معلوماتی تحریر تھی مگر بہت پرانی، قریبی تاریخ لکھیں (مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم نے کبھی تاریخ سے سبق نہیں سیکھا) تسخیرِ خلا، گڈ معلوماتی تحریر ہم نے تو بھاپ سے جہاز اڑانے کی ابتدا پڑھی ہے پُراسرار حادثہ، ایسا ہی تو ہمارا فوکر طیارہ گلگت سے اسلام آباد آتے لاپتا ہو گیا۔ تاحال کوئی نام و نشان نہیں۔ موت کے سائے، وویری گڈ شکاری کہانی ہے۔ ترکی کی دانم، دلچسپ سفر کی سچی کہانی ہے۔ پولیو کے قطرے ہمارے ملک میں بھی یہی حال باعثِ جہالت ہے۔ مسکراہٹوں کے سفیر، لہری مرحوم کی یاد دلا کر غم تازہ کر دیا۔ فلمی الف لیلہ، آفاقی صاحب تفصیل لکھ چکے ہیں۔ تنویر ریاض صاحب، رفیع خاور عرف ننھا بہت عظیم مزاحیہ اداکار تھے۔ تفصیلی حالات لکھیں۔ فلمی الف لیلہ، آفاقی صاحب آپ کی عمر کتنی ہے؟ اتنی پرانی 8 نایاب تصاویر کے ساتھ 1906ء کے حالات کا تذکرہ؟ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ سزا، قانون کا احترام ہی انسانیت ہے۔ دورتن، دربار اکبری کے 9 رتن (وزیر) کے بارے میں پڑھا۔ راہی صاحب علاوہ دو پیازہ اور بیربل کی نوک جھونک لطائف کی تفصیل لکھیں۔ (مچھ چکا ہے) لے پالک، کے عدیل کو ابتدا سے درست بتا دینا چاہیے تھا۔ عارف گڈ مین۔ اسلم جیسے بے ضمیر زندگی بھر ترستے رہتے ہیں۔ قطرہ قطرہ زندگی، پولیو کے قطرے پلانے والے مسیحاؤں پر حملے ابھی 28 مئی کو لیڈی ہیلتھ ورکر پشاور میں شہید اور چار زخمی ہو گئیں، فائزہ کا جذبہ قابلِ تعریف ہے۔ قاتل جذبے، والدین اولاد کا بہتر سوچتے ہیں۔ ناظمہ جیسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے کہ ندیم جیسے معذوری کی آڑ میں چھپے بھیڑیے انھیں نگل جاتے ہیں۔ ازالہ، سب باتیں سننے کے باوجود ظفر حسین نے گھر والوں کو اور فضول شاپنگ کے ساتھ سالی کو شاپنگ کرائی۔ ایک جوڑا غریب بچی کو خرید دیتا تو قیامت نہ آجاتی (کہانی بغور پڑھیں) چڑیل، جدید سائنسی دور میں پلاسٹک سرجری ہر طرح ممکن ہے، عبدل کو نیلم نے سب بتا دیا۔ شریفانہ زندگی گزارنا، عیاشی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آزادی، ریحان کو نگہت سے شادی کے بعد سیرت دیکھنی تھی۔ درست سزا ملی۔ اپنی آگ، اوباش لوگوں کو سوچنا چاہیے جس کے ساتھ ایسی ویسی حرکت، اس کی جگہ اپنی ماں بہن ہوتی تو پھر؟ عذرا کو تاحیات ایسے لوگوں کا علاج کرنا چاہیے۔ آٹھ لاکھ، عیاش مرد نادیہ جیسی لڑکیوں کو چنا پھرتا بازارِ حسن بناتے ہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بہت اچھا ہے۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا اظہاریہ پشاور سے حضرت بیدل کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ خط کے ہمراہ ارسال ہے۔ اس بار بھی سرگزشت پشاور دیر سے پہنچا ہے۔ نہ جانے یہاں کی نیوز ایجنسیوں کے ساتھ کیا معاملہ ہے جو تاخیر سے شمارہ... مارکیٹ میں لاتے ہیں۔ مارچ 2013ء کے شمارے میں چھپنے والے میرے مضمون سپر اسٹار کے بارے میں ابھی تک بے شمار دوستوں اور واقف کاروں کے فون اور خطوط پسندیدگی موصول ہو رہے ہیں۔ گل حمید (مرحوم) کے بھتیجے سرجن احمد جمال صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مضمون کی پسندیدگی کے ساتھ یہ شکوہ بھی کیا کہ جیسے ہی گل حمید کے گاؤں (جو کہ اب ایک بہت بڑی آبادی پر مشتمل ہے) یہ خبر پہنچی تو وہاں کے ہر گھرانے نے پشاور کا رخ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شمارہ مارکیٹ سے غائب ہو گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں ہفتہ وار تعطیل پر گاؤں جاتا ہوں تو لوگ تقاضا کرتے ہیں کہ ہمیں مذکورہ شمارہ چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے لوگوں کو اپنے ذرائع سے دیگر شہروں سے سرگزشت منگوا کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو میں نے مشورہ دیا کہ وہ خود بھی کوشش کر کے یا امت کر کے دوسرے شہروں سے مذکورہ شمارہ منگوالیں۔ چنانچہ لوگوں نے میرے مشورے پر عمل کیا اور آج میرے بھائی کے ہر گھر میں سرگزشت کا مذکورہ شمارہ یادگار کے طور پر موجود ہے۔ لوگوں نے مضمون کو بے حد پسند کیا۔ خود میں خوش بھی ہوں اور ناخوش بھی۔ خوش اس لیے ہوں کہ سرگزشت جیسے معیاری پرچے میں میرا مضمون شائع ہوا اور ناخوش اس لیے ہوں کہ سیکڑوں خطوط، رسالے اور آرٹیکلز پڑھنے اور گل حمید کے رشتہ داروں سے اور واقف کاروں سے انٹرویو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ گل حمید مرحوم کو فوت ہوئے 79 برس گزرنے کے بعد بھی نسل در نسل ان کے چاہنے والے اور ان کے بارے میں جاننے والے لوگوں کی آج

بھی کوئی کمی نہیں۔ (ہم معذرت خواہ ہیں کہ گزشتہ شمارے میں آپ کے خط کے درمیان میں سہواً عزیز اللہ کا خط آ گیا اور دلیپ کمار پر آپ کا اظہارِ خیال ان کے خط میں شامل ہو گیا۔

☆ سدرہ بانو نا گوری کا خلوص نامہ کراچی سے جون کا شمارہ 28 مئی کو ملا۔ شرماتی مسکراتی حسینہ سے سجا سرورق خوب لگا۔ مختصر سرگزشت میں معروف گاما پہلوان کا زندگی نامہ پسند آیا۔ شہرِ خیال کی محفل میں تمام ساتھیوں کے تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو صدارت کی کرسی کی مبارکباد۔ شاہد جہانگیر، احمد خان توحیدی، عمران جونانی، رانا سجاد اور طاہر الدین بیگ کا تبصرے کی پسندیدگی اور مبارکباد دینے کا شکریہ۔ پُراسرار حادثہ، ابن کبیر اپنے منفرد انداز میں بے حد خوبصورت تحریر لے کر آئے۔ پُراسراریت کے پردے میں چھپے جہاز کی روداد دل کی سطر سطر دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کرتی رہی۔ دلچسپ بات ہے کہ 230 افراد کی موت پورے امریکا کی نیندیں اڑا دے اور بے انتہا کوشش اور لگن کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہ آئے۔ امریکا کی ترقی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ اس کی عوام اپنے ملک کے ساتھ بڑی وفادار ہے جبھی تو 9/11 سمیت تمام واقعات آج بھی ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ کوئی دردناک سانحہ پیش آجائے تو 2 سے 3 دن کے اندر ہم اسے فراموش کر چکے ہوتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے سفیر تنویر ریاض کی زبانی لہری صاحب کا تذکرہ اچھا لگا ہم نے ان کی زیادہ فلمیں تو نہیں دیکھیں لیکن انور مقصود صاحب کے ڈرامے آنگن ٹیڑھا میں ان کا خوبصورت کردار دیکھ کر دل سے ان کی اداکاری کے قائل ہو گئے تھے۔ اسی ڈراما میں ایک موقع پر سلیم ناصر ان سے کہتے ہیں کہ ایک دن ہم یہاں سے چلے جائیں گے پھر ہمیں کون یاد رکھے گا تو لہری صاحب نے جواب میں بڑی خوبصورتی سے کہا تھا کہ "یہاں کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا" ان کا وہ لہجہ وہ انداز آج بھی لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہے۔ صائمہ اقبال کی تحریر جہنمی گڑھے نے دل ہلا دیا کہ زمین زندہ انسانوں کو نگل رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے عذاب کہیں یا...... Sinkhole کے نظریے کی تفصیل جان کر اسے بھی اور واقعات کی طرح نظر انداز کر دیں۔ آفاقی انکل کی فلمی الف لیلہ اس بار سپرہٹ تحریر ثابت ہوئی۔ ہم تو ماضی کی تصاویر دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ خاص طور پر بمبئی ٹاکیز کی تصویر اپنی بدحالی کا رونا روتی نظر آئی بھارتی فلمی صنعت میں مسلمان فنکاروں کے کردار اور جمہوریت کا نعرہ لگانے والے مغرب کی حقیقت بڑی تفصیل سے پڑھنے کو ملی۔ دیویکا رانی کی جوانی اور بڑھاپے کی تصاویر دیکھ کر بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ بڑی بڑی عظیم عمارتوں کو بھی کھنڈرات بنتے دیر نہیں لگتی۔ جیت بازی میں اسحاق دلبر کا شعر بے حد پسند آیا۔ سچ بیانوں میں پہلی سچ بیانی شہلا عارف کی لے پالک پڑھی۔ شہلا صاحبہ دولت تو ایسی شے ہے جو اپنوں کو اپنوں سے بدظن کر دیتی ہے پھر عدیل تو آپ کا سوتیلا بیٹا تھا جسے ایک دن تو اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے تھے۔ باقی سچ بیانیاں اپنی مثال آپ تھیں اور آخر میں شہرِ خیال کے باسیوں اور تمام اہلِ وطنوں کو رمضان کی ڈھیروں مبارکباد۔

☆ توکل عباس شاہ کا راجن شاہ لیہ سے ای میل "فضائی حادثات" پر مضمون بہت زیادہ پسند آیا، پلیز کشمیریوں پر بھی مضامین شائع کریں جو مسلسل ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہر شمارے میں ایک دو صفحے ہونا چاہیے، صرف اور صرف کشمیر پر۔ محی الدین نواب یا طاہر جاوید مغل کی کوئی قسط وار تحریر لگائیں (سرگزشت سچ کو فوقیت دیتا ہے۔ یہ دونوں مصنف ہمارے دوسرے پرچے جاسوسی ڈائجسٹ اور سسپنس کے لیے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں میں ان کی تحریر پڑھ لیا کریں) جہنمی گڑھے اور باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ایک درخواست ہے کہ برمودہ ٹرینگل (جزیرہ خطرناک) پر ایک مکمل تحریر شائع کریں (برمودہ پر اگست 2011 کے شمارے میں بھرپور تحریر شائع ہو چکی ہے) اللہ پاک پاکستان کو حفظ امان میں رکھے۔

☆ نسرین بٹ نے آزاد کشمیر سے لکھا ہے۔ "مرد میدان" بہت پسند آئی مظفر بھی اچھی لگی۔ طارق عزیز خان کی تحریر تسخیرِ خلا غاصے کی چیز ثابت ہوئی۔ جہنمی گڑھے نے بھی مزہ دیا۔ کہانیوں میں لے پالک اچھی رہی۔

☆ طاہر الدین بیگ میر پور خاص (سندھ) سے تشریف لائے ہیں، سرگزشت کے شروع میں مرد میدان گاما پہلوان کے بارے میں کافی دلچسپ اور معلوماتی تحریر پڑھنے کو ملی، زبردست۔ سعودی عرب سے ڈاکٹر کی تحریر واقعی اس قابل تھی کہ اول نمبر پر جگہ پاتی۔ پشاور سے شاہد جہانگیر صاحب بہت خوب تبصرہ کے ساتھ آئے عزیز اللہ نے دلیپ کمار صاحب کے بارے میں لکھا اور خوب لکھا ہم اس کے لیے آپ کو داد دیتے ہیں مگر ان سب واقعات سے اسماء سے شادی اور پھر فوراً ہی طلاق جبکہ شرعی طور پر یہ شادی بالکل جائز تھی۔ اولاد کے لیے بھی اکثر دوسری شادی کی جاتی ہے۔ کیا تعلق بنتا ہے، اس میں کسی کا بھی کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ ایک پٹھان زادہ کا عمل تھا جو اتنے طوفانوں سے ٹکرایا ہے، وہ اس طرح طلاق دے دے بات سمجھ میں نہیں آئی، عزیز اللہ صاحب معذرت کے ساتھ (عزیز اللہ کا مختصر سا خط کمپوزر کی غلطی سے شاہد جہانگیر کے خط کے درمیان میں ایسا آیا کہ شاہد... جہانگیر کا تحریر کردہ دلیپ کمار پر اظہارِ خیال ان کے نام ہو گیا) محترم مختار صاحب کا تحریر کردہ خط بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر مسجد بلند غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلومات ہوئی۔ سدرہ بانو نا گوری اور ابن مقبول صاحب کی تحریر اچھی رہی۔ 23 سال میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لینے والے مظفر

انتقالِ پُر ملال

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ کارکن جناب رضی الدین مشیت ایزدی سے انتقال کر گئے۔ ہم ان کے اہلِ خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین سے سورۃ فاتحہ کی درخواست ہے۔

کا احوال لاجواب رہا۔ ایسے معلوماتی مضامین ڈاکٹر صاحب کی پہچان بنتے جا رہے ہیں۔ زندہ باد ڈاکٹر صاحب۔ تسخیر خلا اور پُراسرار حادثہ دونوں الگ الگ موضوع ہیں مگر ہیں زبردست، پڑھتے وقت بلڈ پریشر اوپر نیچے ہوتا رہا۔ ایسی تحریروں کو سکون اور آرام سے پڑھے تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ موت کے سائے اور جیتی گزھے پڑھیے اور داد دیجیے سرگزشت والوں کو اور صائمہ اقبال اور آصف ملک کو، بھلا کہاں کہاں سے ایسے زبردست موضوع اور معلومات ہمارے لیے لاتے ہیں۔ مسکراہٹوں کے سفیر پڑھیے اور مسکرائیے لہری مرحوم پر کافی عمدہ لکھا گیا ہے۔ کافی معلوماتی تحریر محترم آفاقی صاحب کی بھی ہے محبوب اسٹوڈیو، فلمستان اور بمبئی ٹاکیز پر بہت خوب لکھا ہے۔ محبوب صاحب کے بارے میں بھی کافی دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔ شہنشاہ صحافت اور دور تن پڑھیے اور اپنی معلومات میں اضافہ کر لیجیے۔ آپ بیتیاں اپنے اپنے رنگ میں خوب مگر قطرہ قطرہ زندگی اور خاص طور پر لے پالک بہت اچھی تھیں۔

☆ سدرہ انجم کا نامہ گوجرانوالہ سے "میں تین برس سے سرگزشت کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ لیکن اب خاموش رہنے کی عادت کو چھوڑنا چاہتی ہوں اس لیے آپ کی بزم میں پہلی مرتبہ قلم اٹھانے کی جسارت کر رہی۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میری تک ودو کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ (خوش آمدید) شہرِ خیال میں انٹری ہوئی تو ڈاکٹر آر ایم ای ریاض سعودیہ صدارت کی چیئر پر اس قدر جچے ہوئے تھے کہ جس طرح گلستان بلبل۔ بقیہ دوستوں کے پسندیدہ تبصرے جو مجھے لگے اعجاز حسین سخارنور پور تھل سے، انجم فاروق ساحلی لاہور سے، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، آپی کیا میں آپ کا درد جان سکتی ہوں۔ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے، مائی ڈیئر آپ بہت اچھا لکھتی ہو میں آپ کی بہت فین ہوں۔ سدا ایسا لکھتی رہو۔ اس کے بعد کہانیوں کی وادی کا رخ کیا تو ان میں پہلی سچ بیانی "لے پالک" پڑھی۔ "آزادی" ریحان لاہور عذرا کراچی، باجی آپ کی کہانی کو اگر سامنے لایا جائے تو حقیقت کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ آخر میں میگزین کی پوری ٹیم کے لیے دعا گو ہوں۔

☆ ایم افضل کھرل کی آمد عظیم والہ ننکانہ صاحب سے "میں ماہنامہ سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ جب تک اس کو پڑھ نہ لوں بے قرار سا رہتا ہوں۔ شہرِ خیال میں ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہیں دوبارہ صدارت کی کرسی سنبھالنے کے لیے منتخب کیا، لیکن اب جمہوریت کا دور دورہ ہے اور عام انتخابات میں عوام کو حق ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں۔ شاہد جہانگیر پشاور سے' بھائی آپ کا تبصرہ جب آنکھوں کی زینت بنا تو صندل کے درخت کی طرح دل کو منور کر گیا۔ کیونکہ صندل کا درخت کلہاڑے کو چوٹ کھا کر بھی کلہاڑے کو خوشبودار بنا دیتا ہے۔ (مگر افسوس ان کا خط دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا) اعجاز حسین سخارنور پور تھل سے، آپ کا اس محفل میں شرکت کرنا ایسے ہی ہے جیسے گلستان میں پھول کا کھل آنا۔ عمران بھائی شاہ کوٹ ننکانہ صاحب سے، آپ کی اس بزم میں شرکت پر ہم آپ کو ویل کم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ ہمیشہ اس مجلس کی زینت بنے رہیں گے۔ سدرہ بانو ناگوری آپ کی شرکت سرگزشت میں ایسی ہے کہ جیسے صحرا میں پیاسے کے لیے پانی کا چشمہ، بیت بازی میں اپنا شعر دیکھ کر مرجھایا قلب شگفتہ ہو گیا۔ جیتی گزھے کہانی سے یہ پیش گوئی کی جاتی ہے کہ دنیا اپنے اعمالوں کی بنا پر نابود ہوتی جا رہی ہیں۔ کہانی لے پالک بے پایاں پلک پلیز آگاہ کیجیے گا (لے پالک)۔ "قاتل جذبے" "اپنی آگ" کہانی پڑھ کر اس بات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ ہماری معاشرت فحاشی کے دہانے پر کھڑی ہے کہ نجانے کب قیامت کا منظر آن کھڑے۔ بقیہ میگزین کی اسٹوریاں زیرِ مطالعہ ہیں۔

☆ سعید احمد چاند کراچی سے لکھتے ہیں "میں ہر مہینے شہرِ خیال، بیت بازی، علمی آزمائش میں حصہ لینے کی کوشش کرتا ہوں اور ہر مہینے خط پوسٹ کرتا ہوں۔ مگر تین چار مہینے سے میرا نام شہرِ خیال وغیرہ میں نظر ہی نہیں آتا اور نہ ہی تاخیر سے موصول خطوط میں شمار ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس دفعہ خط لکھ رہا ہوں دیکھیں اس کا کب حاصل ہوتا ہے (وجہ تاخیر ہے ورنہ ہم پابندی سے خطوط لکھنے والوں کے منتظر رہتے ہیں) شاہد جہانگیر، ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی' رانا محمد سجاد صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ تعجب ہے ڈاکٹر روبی کیسے بھول گئیں۔ ان سے مجھے ایسی بے رخی کی امید نہیں تھی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ہم مرے تھے جن کے لیے وہ وضو کرتے ہی رہ گئے۔ آپ کھڑی تو ہوں الیکشن میں سب سے پہلا ووٹ میرا ہی ہوگا آپ کے حق میں۔ آئندہ نہ بھولنا۔ تبصروں میں مجھے ان کے تبصرے پسند آئے، ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی، رانا محمد سجاد' شاہد جہانگیر۔ عزیز اللہ صاحب سے عرض ہے کہ ڈاکٹر آر۔ ایم۔ ای صاحب نے دلیپ کمار کے متعلق جو لکھا وہ ان کی تحقیق میں نہیں تھا۔ انہوں نے تو ان کی ہمدردی میں لکھا تھا، مجھے یاد ہے، دلیپ کمار نے حیدرآباد دکن کی ایک بیوہ اسماء سے شادی کر لی تھی تو سائرہ بانو نے کتنا اودھم مچایا تھا۔ سائرہ بانو کے دباؤ میں آ کر دلیپ کمار نے اسماء کو طلاق دے دی۔ اصل میں دلیپ کمار کی نسل کی قاتل سائرہ بانو ہی ہیں۔ ان کی والدہ نسیم بانو نے تو جیتے جی اپنے شوہر میاں احسان کو چھوڑ دیا تھا۔ میاں احسان دلبرداشتہ ہو کر پاکستان چلے آئے اور کراچی میں انہوں نے احسان کارپوریشن کے نام سے بس سروس شروع کر دی۔ پرانے لوگوں کو اب بھی نیلے رنگ کی بس یاد ہوگی۔ دراصل اس میں اس کا بھی قصور نہیں ہے، بیوفائی اسے وراثت میں ملی ہے۔ سائرہ بانو کی نانی شمشاد بیگم دہلی کے "اس" بازار سے تعلق رکھتی تھیں۔ (سعید صاحب، عزیز اللہ صاحب کے خط میں سہواً شاہد جہانگیر کا خط شامل ہو گیا تھا۔ وہ تمام سطور شاہد جہانگیر شاہد..... پشاور کی تھیں۔ ڈاکٹر روبی کا تبصرہ مختصر تھا مگر خوب تھا۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ آفاقی صاحب نے فلمی الف لیلہ میں محبوب خان کا تعارف ادھورا دیا اور آخری صفحات میں قطار بندی کے متعلق اتنا کچھ لکھا کہ بوریت ہونے لگی۔ سچ بیانیوں میں شہلا عارف کی "لے پالک" "اختر لاہور کی" "آٹھ لاکھ" عذرا کی "اپنی آگ" اچھی لگیں باقی زیرِ مطالعہ ہیں۔ ماضی کی ہیروئین شمیم آرا کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ اب وہ کس حال میں ہیں۔ گلوکار جی۔ ایم۔ درانی کے بارے میں کوئی صاحب روشنی ڈالیں۔

☆ احسان سحر کا میانوالی سے مکتوب "ہر ماہ کی طرح دیدہ زیب اور خوبصورت کہانیوں سے سجے سرگزشت نے اپنا دیدار کرایا۔ ایسی ایسی نادر اور قیمتی سوغات کہ ایک ایک شاہکار ایک سے بڑھ کر ایک۔ پہلے اسے پڑھیں یا پہلے اُسے پڑھیں، ہر ماہ یہی کشمکش رہتی ہے۔ پڑھ کر پیاس اور بھی بڑھنے لگتی ہے۔ علم چیز ہی ایسی ہے کہ جتنا خرچ کرو اتنا ہی بڑھتا ہے۔ ایسی معلومات بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں۔ میں نے بہت سے معلوماتی ماہنامے پڑھے ہیں لیکن سرگزشت ان میں سے الگ، بیسٹ اور معیاری پرچہ ہے۔ بہت عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ پہلے کرکٹ کے بارے میں عظیم کھلاڑیوں کے بارے میں مواد شامل ہوتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے پڑھنے کو نہیں مل رہا۔ ہر ماہ نہ سہی وقفے سے اس پر بھی قلم چلا لیا کریں۔ فلمی الف لیلہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ فلم کے علاوہ پاکستانی ڈراموں کے حوالے سے بھی لکھا جائے تو بہت اچھا ہوگا اور بہت سے عظیم ڈرامافنکار، ڈائریکٹرز، رائٹرز کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ کیونکہ ڈراما کی صنعت جو کہ پاکستان کی مانی ہوئی صنعت ہے۔ ڈراموں اور فلموں کی بات ہو اور پاکستان کے شاعروں کی بات نہ ہو یہ زیادتی ہوگی۔ اب تک ان پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ اور لکھا بھی گیا ہے تو مختصر مختصر، پلیز پاکستانی شاعروں پر ہر ماہ تفصیلی اور جامع مضمون شائع کریں (سرگزشت واحد پرچہ ہے جو ہر ماہ شاعر و ادیب کی سوانح شائع کرتا ہے) احمد فراز، ناصر کاظمی، مرزا غالب، پروین شاکر، احسان دانش، یہ سب ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔ امید ہے آپ ہماری تجویز پر غور اور عمل ضرور کریں گے؟ (تقریباً سب پر بھرپور تحریر آ چکی ہے) سفرنامے پڑھتے ہوئے ہمیں خیال آیا کہ اب تک بہت سے سفرنامے ہم پڑھ چکے ہیں۔ مصر کے حوالے سے ابھی تک مکمل اور جامع سفرنامے شائع کیوں نہیں ہوئے۔ (شاید آپ سرگزشت کے نئے قارئین میں شامل ہیں) سائنسی ادب جی ایجادات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور امید ہے یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ بہت عرصہ پہلے غالباً 2004 میں ہم نے غلام قادر صاحب کی ترجمہ شدہ تحریر پڑھی تھی بابری مسجد شہید کے حوالے سے اور اس طرح کی اور بھی بہت سی معلوماتی تحریر شائع ہوتی رہنی چاہئیں۔ اب بات ہو جائے مشہور شخصیات کے حوالے سے۔ غیر ملکی ناول نگاروں میں جیمز... ہیڈلے ایک بہت بے باک ناول نگار تھے اس پر بھی مکمل مضمون ہونا چاہیے۔ اسی طرح ادب کا ایک اور خاص نام اگاتھا کرسٹی بھی ہے اسے بھی مت بھولیے گا (اگاتھا کرسٹی اور جیمز ہیڈلے پر مضامین اسی سال کے شمارے میں شائع ہوئے ہیں) اس کے علاوہ اسلامی دنیا کے سب سے بڑے راک اسٹار سمیع یوسف کے بارے میں بھی لکھیں۔ جس کے 3 کروڑ 20 لاکھ اسلامی گیت فروخت ہو چکے ہیں۔ مائیکل ڈیل کی زندگی کے بارے میں بھی کچھ ہونا چاہیے۔ جس نے کمپیوٹر کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ (بھائی ان سب پر مضمون آ چکا ہے) آرٹ بکواللہ کے بارے میں فرمائش کرنے والا تھا۔ آخر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ناں، اس ماہ وہ شائع ہو گیا۔ شکریہ سرگزشت۔ جیتی گزھے ایک عمدہ معلومات رہی جہاں سائنس اور پُراسراریت دونوں زیرِ بحث رہے۔ آنچل کی بھاگ دوڑ آخر کامیاب رہی اور بہت سے حقائق سے پردہ چاک ہوا۔ موت کے سائے ایڈونچر سے بھرپور رہی۔ سام اور جری کی ہمت کی داد دوں گا جو واقعی موت کے سائے میں رہے۔ ہمت کر کے بال بال بچے۔ دور تن معلوماتی پارچہ تھا۔ پاکستانی چیپلن لہری صاحب پر مضمون نے متاثر کیا اور واقعی وہ عظیم انسان تھے۔ عظیم اور بلند کردار کے مالک انسان ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ پُراسرار حادثہ بھی خوب رہی ہر رنگ اور ڈھنگ میں سراغ لگانے کی کوشش کی گئی پھر بھی سچ صاف طور پر واضح نہ ہو سکا۔

☆ ڈاکٹر روبینہ ثاقب انصاری بھکر سے رقمطراز ہیں "سب سے پہلے میں نواز شریف کو وزیراعظم بننے کی مبارک باد دیتی ہوں۔ اس بار کا سرورق پسند نہیں آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی لوکٹ پر بنوایا گیا ہو۔ شہرِ خیال میں پہنچے تو اعجاز حسین صاحب سے کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اس میں شکریہ والی کیا بات ہے۔ میں تو سب کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ کسی کا نام لیتی ہوں کسی کا نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان کو بھول جاتی ہوں۔ تمام احباب میرے ذہن میں رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ مجھے بھلا دیتے ہیں، اپنے خط میں یاد نہیں رکھتے۔ ابن مقبول جاوید صدیقی صاحب، یاد آوری اور دعاؤں کے لیے مشکور ہوں۔ امید ہے آئندہ بھی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ رانا محمد سجاد میں تو ہر بار کوشش کرتی ہوں کہ آپ سب کے درمیان رہوں لیکن کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت آ جاتی ہے اور میں چاہ کر بھی شامل نہیں ہو پاتی ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پریشانی دل و دماغ پر اس طرح جکڑ بنا لیتی ہے کہ میں کچھ لکھنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ لکھنے کے لیے دل اور دماغ کا فریش ہونا ضروری ہے۔ رانا محمد شاہد میرا تعلق کسی پیروں کے خاندان سے نہیں ہے مگر میں ایک بزرگ کی منہ بولی بیٹی ہوں۔ کہانیوں میں لے پالک نے بہت متاثر کیا۔ میں ایک ڈیڑھ سال سے ایک فیصلہ کرنے کا سوچ رہی ہوں مگر سسرال والے اجازت نہیں دیتے۔ ہم عورتوں کی یہی تو ایک مجبوری ہے کہ وہ اپنا فیصلہ بھی خود نہیں کر سکتیں۔ اس کہانی نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ آپ سب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔

تاخیر سے موصول خطوط:

عارف حسین، بھکر۔ شار رحمٰن، نسیم الدین خان، حبی اللہ (نواں کوٹ)۔ نوید شہزاد، احسن فاروقی، محمد محمود، نازش انصار، وسیم منصور فاروقی، ملک میاں سرور (لاہور)۔ محمد ظفر، سید نجم الحسن، انجم تسلیم (سیالکوٹ) عاصم احسن، فاروق خان (جھنگ)، شار چغتائی۔ نعیم ارباز خان (ملتان) فرحان خان، رضا ریاض (چنیوٹ) فرحت حسین، زینب مرزا، رضا احسن، نعمان (پشاور)۔ محمد رمضان، ادریس محمد خان (کراچی)۔ زہرہ گوہر (کراچی)۔

استادِ ادب

ڈاکٹر ساجد امجد

الفاظ سے کھیلنا، لفظوں کو زبان دینا ایک ایسا فن ہے جو ہر کسی کو اللہ تعالیٰ ودیعت نہیں کرتا۔ خاندانی پیشہ کچھ اور تھا جس سے ادب کا دور دور تک تعلق نہیں تھا لیکن جب الفاظ کے سوتے پھوٹے، وہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرتے ہوئے ادب کا ایسا شناور بن گیا کہ کوئی اس کی گرد کو بھی پا نہیں سکا، انشائیہ کی راہ ایسی متعین کردی کہ لوگ پڑھنے کو ترسنے لگے، ڈاکٹر وزیر آغا جیسی شخصیت بھی اس کی قدردان بن گئی بلکہ انہی نے اس کے اندر سے فن کی دنیا تلاش کی۔

ادب کی دنیا میں ہلچل مچا دینے والی شخصیت کا زندگی نامہ

تلے اوپر کے بچے گلی سر پر اٹھائے کھیل رہے تھے۔ کہیں کہیں سے کوئی گالی نعرے کی صورت بلند ہوتی پھر کوئی دو سورما آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ صلح صفائی کروانے والا لشکر فوراً دوڑ پڑتا۔ کچھ دیر بعد سیاسی حریفوں کی طرح دونوں لڑنے والے پھر کھیل میں لگ جاتے۔

اس روز حریف کو گالی دینے، گتھم گتھا ہونے کی باری غلام جیلانی کی تھی۔ یہ دنگل ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ شیخ محمد دین نے گلی میں قدم رکھا۔ بلند ہونے والی گالی کے آخری الفاظ ان کے کانوں میں بھی پڑ گئے تھے لیکن انہوں نے میدانِ کارزار میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور گھر میں چلے آئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی نظر اپنے والد یعنی غلام جیلانی کے دادا پر پڑی جو صحن میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ وہ ہمیشہ غلام جیلانی کی حمایت میں شمشیر بدست رہتے تھے اس لیے ان کے سامنے واقعے کی شدت بیان کرنا بہت ضروری تھا۔

"بس ابا جی اب حد ہو گئی ہے۔ غلام بہت بگڑ گیا ہے۔"

"ارے اس عمر میں تو بھی ایسا ہی تھا۔ اک ذرا گلی میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیل لیتا ہے تو تیرا کیا چلا جاتا ہے۔"

"میں نے آج اپنے کانوں سے سن لیا ہے۔"

"گالیاں بک رہا ہوگا۔"

"یہ کوئی بات ہی نہیں ہے؟"

"ایسی بات بھی نہیں ہے کہ تم اس کی شکایت مجھ سے کرنے بیٹھ گئے۔"

"بس وہ کل سے اسکول جائے گا۔"

"کچھ دن اسے کھیلنے کودنے دے پھر تو اسے ہماری طرح کام دھندے میں لگ ہی جانا ہے۔"

"کام دھندے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ آپ کا زمانہ نہیں ہے آج کل تجارت پڑھے لکھوں کے ہاتھ میں ہے۔" شیخ محمد دین نے کہا اور باپ کے پاس سے ہٹ گئے۔

دادا کا مصالحانہ رویہ کام نہ آیا اور شیخ محمد دین صحن میں چارپائی ڈال کر بیٹھ گئے کہ آنے دو غلام جیلانی کو۔ حقے کی گڑگڑاہٹ سے صحن گونج رہا تھا۔

غلام جیلانی دنگل سے نکلا۔ کپڑے جھاڑے اور گھر میں داخل ہوا۔ حقے کی گڑگڑاہٹ کی آواز اس کے کانوں میں اس وقت آئی جب وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ حقے کی گولہ باری سے بچنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس نے بچنا بھی چاہا تو باپ کی آواز نے اسے روک لیا۔

”ادھر آؤ، کہاں تھے تم؟“
”باہر گلی میں، بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔“
”کل سے تم گلی میں نہیں جاؤ گے۔“
”جی۔“
”یہ تو پوچھو گلی میں نہیں تو پھر کہاں جاؤ گے۔“
”کہاں جاؤں گا؟“
”کل سے تم اسکول جا رہے ہو۔ تمہیں تختی اور قلم مل جائے گا۔ فی الحال قاعدے کی ضرورت نہیں۔“
”جی۔“ اس نے کہا اور باپ کے سامنے سے ہٹنے لگا۔
”ٹھہرو۔“ وہ ٹھہر گیا۔
”میں نے ماسٹر شیر خان سے کہہ دیا ہے کہ اگر پڑھائی کے دوران کوئی ایسا مرحلہ آجائے جہاں شدید پٹائی کی ضرورت ہو تو وہ تمہارا چمڑا اپنے پاس رکھ لے اور ہڈیاں مجھے واپس کردے۔ تم آج کے بعد سے گلی کو صرف آمدورفت کے لیے استعمال کرو گے۔“

غلام جیلانی کو یوں لگا جیسے گھر کی تمام چھتیں ایک ساتھ زمین پر آگئی ہوں۔ اسے اسکول جانے کا اتنا افسوس نہیں تھا جتنا دکھ اس بات کا تھا کہ اب وہ گلی میں نہیں کھیل سکے گا۔ گلی کا اعلیٰ نصاب چھوڑ کر اسکول کا معمولی قاعدہ پڑھنا پڑے گا۔

اس کے والد نے اسے دھمکانے کے لیے جو یہ کہا تھا۔ ”تمہارا چمڑا اپنے پاس رکھ لے اور ہڈیاں مجھے دے دے“ ان کی اس نفسیات کی ترجمانی کرتا تھا کہ اس خاندان کا آبائی پیشہ چمڑے کی تجارت تھا۔

تجارت کے دوسرے شعبوں پر ہندو قابض تھے لیکن چمڑے کے کاروبار کو ہندو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ غلام جیلانی کے پردادا حاجی محمد عظیم نے اس کاروبار کو قبول کرلیا۔ ان کی اولادوں نے اس کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے چمڑے کی مصنوعات کی طرف توجہ دی چنانچہ ان کی بدولت زریں جوتوں کی صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہ جوتے بیرونِ ملک بھی برآمد کیے جاتے تھے۔ یہ کاروبار اب تک چلا آرہا تھا۔ غلام جیلانی کے والد کنبے کے دیگر افراد سے قدرے مختلف تھے۔ انہوں نے تجارت ہی کو اپنا پیشہ بنایا لیکن اس میں گم نہیں ہوگئے۔ سماجی اور سیاسی امور میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ انجمن خواجگان کے صدر بنائے گئے۔ میونسپل کمشنر منتخب ہوئے۔ مجلس احرار سے وابستہ ہوئے اور جب قرارداد لاہور منظور کرلی گئی تو مسلم لیگ کے سرگرم رکن بن گئے۔

خود شاعر نہیں تھے لیکن شاعری سے شغف تھا۔ حالی کی مسدس اور حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کا بیشتر حصہ انہیں یاد تھا جو وہ غلام جیلانی کے کانوں تک بھی پہنچاتے رہتے تھے۔

☆☆☆

یہ خاندان تلہ گنگ (ضلع جہلم، حال چکوال) میں صدیوں سے آباد تھا۔ اجداد کا تعلق ہندوؤں کے سہگل خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے کسی بزرگ نے کب اسلام قبول کیا یہ اب کسی کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔ اسلام اور تجارت اس خاندان نے آنکھ کھولتے ہی دیکھی تھی۔ اپنی خوش حالی کی بدولت تلہ گنگ میں یہ خاندان عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

”ابا، ہمارے دادا کا نام تو حاجی میاں احمد ہے پردادا کا نام کیا تھا؟“ ایک روز غلام جیلانی نے اپنے والد سے پوچھا۔
”بیٹا ان کا نام تھا حاجی محمد عظیم۔ بڑے نیک آدمی تھے۔ بچپن میں ہی قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ وہ سارا سال قرآن مجید کا ورد کرتے اور رمضان کے مہینے میں تراویح میں سناتے تھے۔ بڑی شہرت تھی ان کے پڑھنے کی۔ اس کا انعام اللہ نے یہ دیا تھا کہ انہوں نے کئی حج کیے تھے۔ تمہارے دادا بتاتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ وہ حج پر جانے لگے تو دور دور سے عزیز واقربا کو بلایا۔ جب سب جمع ہوگئے تو انہیں نصیحت کی۔
”اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور خاندان کے شیرازے کو بکھرنے نہ دو......“ اور بہت سی نصیحتیں کیں۔ بعض لوگوں کو حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے جب بھی حج کو گئے ایسی نصیحتیں کبھی نہیں کیں اب کیوں کررہے ہیں۔ جب ارضِ حجاز سے خبر آئی کہ ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں جدہ میں دفن کردیا گیا ہے تب لوگوں کو یاد آیا کہ وہ یہ نصیحتیں کیوں کررہے تھے۔ ایسے تھے تمہارے پردادا۔“
”پھر کیا ہوا؟“ غلام جیلانی نے تقاضا کیا۔
”یہ کوئی کہانی ہے جو پوچھ رہے ہو کہ پھر کیا ہوا۔“
”بتایئے ناں، ہمارے دادا کے بارے میں تو بتایئے۔“
”چلو اچھا سنو۔ تمہارے پردادا کے تین بیٹے تھے۔“
”کون کون سے؟“
”چپ چاپ سنو۔ حاجی میاں احمد، حاجی غلام یاسین، حاجی میاں محمد۔ یہ تینوں اپنا آبائی کام یعنی چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان تینوں کی بدولت تلہ گنگ کے زریں جوتے دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔ اب تمہارے دادا اور میں بھی اسی تجارت سے وابستہ ہیں اور بڑے ہوکر تمہیں بھی یہی کرنا ہے۔“

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ کچھ اور نہ سنا سکے کیونکہ اس کے بعد ایسی باتیں تھیں جو وہ غلام جیلانی کو سنا نہیں سکتے تھے بلکہ اب دوبارہ خود بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔

غلام جیلانی ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کی والدہ اور والد کے درمیان گھریلو جھگڑے شروع ہوگئے۔ یہ تنازع اتنا بڑھا کہ خاندان کے بزرگ بھی اسے طے نہ کروا سکے۔ والدہ ناراض ہوکر میکے چلی گئیں۔ اب یہ رسّا کشی شروع ہوگئی کہ وہ آنے کو تیار نہیں تھیں۔

محمد دین کہتے تھے کہ بیوی خود گئی ہے خود چلی آئے۔ میرے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ بیوی کے میکے والے بضد تھے کہ محمد دین خود اپنی بیوی کو لینے ان کے گاؤں پہنچی آئیں۔ معمولی سے جھگڑے نے انا پرستی کی خوف ناک شکل اختیار کرلی اور آخرکار ہمیشہ کے لیے دونوں کے راستے جدا ہوگئے۔

اس جھگڑے کا سب سے زیادہ نقصان غلام جیلانی کو اٹھانا پڑا۔ وہ معصوم ماں سے چھین لیا گیا اور باپ کے پاس رہنے پر مجبور ہوگیا۔

☆☆☆

غلام جیلانی باپ کے حکم پر تلہ گنگ کے پرائمری اسکول پہنچ گیا۔ باپ کا اثر ورسوخ اتنا تھا کہ اسکول پہنچتے ہی ہیڈ ماسٹر غلام حسین کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ غالباً باپ نے کچھ ہدایات دی تھیں جو ہیڈ ماسٹر کو غلام جیلانی تک پہنچانی تھیں۔
”اب تم اپنے محلے کی گلی میں نہیں ہو، اسکول میں ہو۔“
”جی، مجھے ابا نے بتا دیا تھا۔“
”یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ تمہیں یہاں کس طرح رہنا ہے؟“
”نہیں یہ تو نہیں بتایا۔“
”شرارتیں بالکل نہیں ہوں گی۔ گلی میں سیکھی ہوئی گالیاں یہاں نہیں دہراؤ گے۔“
”اچھا ہوا آپ نے مجھے بتا دیا۔“
”اگر دہرائیں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟“
”مجھے کیا معلوم۔“
”یہ میں نہیں ماسٹر شیر خان تمہیں بتائیں گے۔“ ہیڈ ماسٹر نے کہا اور ماسٹر شیر خان کو بلایا۔

ماسٹر شیر خان کو دیکھتے ہی غلام جیلانی کو باپ کی باتیں یاد آگئیں۔ اپنی کھال اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نام ہی ایسا تھا کہ دہشت تو ہونی ہی تھی۔
”غلام جیلانی، تمہیں یہاں رہ کر صرف پڑھنا ہے ورنہ تمہارے والد نے بتا دیا ہوگا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔“
غلام جیلانی میں بولنے کی سکت نہیں رہی۔ ماسٹر شیر خان پھر دہاڑے۔ ”تمہارے والد نے مجھے پوری اجازت دے دی ہے کہ میں تمہاری پٹائی کروں لہٰذا دل لگا کر پڑھنا ہوگا۔“

غلام جیلانی نے پابندی سے اسکول جانا شروع کردیا۔ گلی کی درس گاہ سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ اسکول سے آنے کے بعد بھی اسے گلی میں جانے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ موقع اسے صرف اس وقت ملتا تھا جب وہ اپنی ننھیال میں اپنی ماں کے پاس رہنے جاتا تھا۔

اپنے والد کے جلالی حصار سے نکل کر جب وہ ماں کے پاس جاتا تو اسے ایسی فرحت ملتی جیسے ٹھنڈے پانی کے چشمے میں اتر گیا ہو۔ جب تک ماں کے پاس رہتا خود کو ہر مصیبت سے دور سمجھتا۔ ماں کی مسکراہٹ اس کے رگ و پے میں اتر جاتی اور وہ نہال ہوجاتا۔

سوانحی خاکہ

نام: غلام جیلانی
تخلص: اصغر
والد: شیخ محمد دین
پیدائش: یکم جون 1918ء تلہ گنگ، ضلع جہلم حال چکوال
تعلیم: میٹرک، گورنمنٹ اسکول تلہ گنگ۔ ایف اے، گورنمنٹ کالج کیمبل پور۔ بی اے، اسلامیہ کالج لاہور۔ ایم اے انگریزی، پشاور کالج۔
ملازمت: زمیندارہ کالج، گجرات۔ گوجر خان، جوہر آباد۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا۔
اعزاز: تمغائے امتیاز
وفات: 26 دسمبر 2006ء سرگودھا

اسی جاہ وجلال کی کیفیات سے دوچار ہوتے ہوئے وہ عمر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ پرائمری پاس کرلی تو اسے گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ میں داخل کروادیا گیا۔

اس کے خاندان میں تعلیم کا رجحان نہیں تھا لیکن غلام جیلانی کسی اور طرح کا لڑکا ثابت ہورہا تھا۔ اسے پڑھنے کا شوق ہی نہیں جنون تھا۔ گھر میں تین اخبارات ”زمیندار، سیاست اور الہلال“ آتے تھے۔ غلام جیلانی کو جیسے ہی اردو کی شدبد ہوئی وہ ان اخبارات پر ٹوٹ پڑا۔ گلی سے ناتا ٹوٹ ہی چکا تھا اس نے ایک گلی پڑوس کے محلے میں قائم کرلی جہاں ایک لائبریری تھی جس میں یہ تین اخبار رکھے ہوتے تھے۔ زمیندار تو اس کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ اس اخبار نے وقت سے پہلے اس کے سیاسی شعور کو بیدار کردیا۔ ملک کے سیاسی حالات کیا ہیں اس کی عمر کے بچوں کو معلوم نہیں تھے لیکن اسے معلوم تھے۔ وہ الہلال کی طرف راغب ہوا تو اس کے اندر ادبی شعور نے بھرپور انگڑائی لی۔ سوچا کرتا تھا ایسی ہی شستہ اردو وہ بھی لکھنے لگے جیسے اس اخبار کے اداریوں میں ہوتی ہے لیکن اس کے لیے ابھی وقت درکار تھا۔ اسکول میں اس کی انگریزی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

تلہ گنگ میں ایک بڑا عوامی جلسہ ہوا۔ باپ کے ساتھ وہ بھی اس جلسے میں گیا۔ بڑا ہجوم تھا۔ چند تقریروں کے بعد نفیس خلیلی اسٹیج پر آئے۔ وہ بنیادی طور پر ایکٹر تھے لیکن شعر بھی کہتے تھے اور شعر تحت اللفظ میں پڑھتے تھے۔ انداز ایسا تھا کہ دلوں میں آگ لگادے۔ اس وقت بھی یہ عالم تھا کہ حاضرین پر وجد طاری ہوگیا۔ وہ نظم ختم کرکے اسٹیج سے نیچے اترے تو بڑی دیر تک میدان تالیوں اور نعروں سے گونجتا رہا۔

وہ جلسے سے واپس آیا تو اس کی عجیب حالت تھی۔ نفیس خلیلی کی جس طرح پذیرائی ہوئی تھی اس کا جی چاہتا تھا اس کی بھی اسی طرح پذیرائی ہو۔ لوگ اس کے لیے بھی تالیاں بجائیں۔ یہ تو جب ہوتا جب وہ نفیس خلیلی ہوتا، وہ یہ روپ کیسے دھارے؟

اس نے اسی رات نفیس خلیلی کے رنگ میں ایک نظم کہہ ڈالی۔ وہی انقلابی انداز، وہی سیاسی بازگشت اور سب سے بڑی بات یہ کہ پوری نظم وزن میں تھی۔ اس وقت تو اسے وزن کا شعور بھی نہیں تھا۔ بہت بعد میں جب اس نے اس نظم کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔ ”وزن کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ اوزان اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔“

یہ اللہ کی دین ہی تو تھی کہ تیرہ سال کی عمر میں وہ وزن میں شعر کہہ رہا تھا اور کسی کا یہ قول اس پر صادق آرہا تھا۔ ”شعر اچھا برا تو بعد میں ہوتا ہے پہلے وزن میں تو ہو۔“

اس واقعے کے بعد اس کی ہمت نے کچھ پر تولے۔ ہر شام اسے باپ کی طرف سے حالی کی مسدس یا حفیظ کے شاہنامۂ اسلام سے گزارہ جاتا تھا۔ ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی داستانیں اس کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ یہ موضوع اسے ازبر ہوگیا تھا۔ اس نے جب کچھ اور نظمیں کہنے کی کوشش کی تو یہی موضوع اس کے پیشِ نظر رہا اور کئی نظمیں کہہ ڈالیں۔ مطالعہ کی عادت نے ذخیرۂ الفاظ مہیا کردیا تھا لہٰذا بہ آسانی نظمیں کہتا رہا۔

اس کا یہ سفر اتنا خاموش تھا کہ والد صاحب کو بھی خبر نہ ہوسکی کہ برخوردار کیا فرمارہے ہیں۔ مطالعے کا شوق بڑھتا رہا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔

خاندانی روایت کے اعتبار سے میٹرک تک کی تعلیم بہت تھی۔ تجارت پیشہ خاندانوں میں تعلیم نہیں کاروبار کرنے کا سلیقہ اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے خاندان کا طریقہ بھی یہی تھا۔ جوان ہونے کے بعد بیٹا کاروبار سنبھالتا تھا لیکن غلام جیلانی کو کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گھر میں آنے والے اخبارات کے مطالعہ نے مزید علم حاصل کرنے کی شمع دل میں روشن کردی تھی۔ والد تو بدلتے ہوئے ماحول میں تعلیم کی اہمیت کو سمجھ رہے تھے لیکن دادا کی ضد تھی کہ وہ کتابوں میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے کاروبار میں ہاتھ بٹائے۔ شیخ محمد دین بھی نیم دلی سے باپ کی ہاں میں ہاں ملارہے تھے لیکن غلام جیلانی کی ضد کے آگے دونوں مجبور ہوگئے۔ دادا یہ کہہ چپ ہوگئے کہ کچھ تعلیم اور حاصل کرلے پھر اسے کاروبار ہی تو سنبھالنا ہے۔ غلام جیلانی نے بھی سوچا کہ ”کچھ تعلیم اور“ کے طعنے کے ساتھ ہی کبھی وہ باہر تو نکلے، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اس نے دادا سے وعدہ کیا کہ واپس آکر وہ کاروبار سنبھال لے گا۔

وہ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ انٹر کالج کیمبل پور (جو اب اٹک موسوم ہوتا ہے) میں داخل ہوگیا۔ وہ یہاں آتو گیا تھا لیکن اجنبی ماحول میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یہ سوچنے لگتا تھا کہ کاروبار سنبھال لیتا تو اچھا تھا لیکن جب کلاس میں جاتا اور علمی معلومات میں اضافہ ہوتا ہوا محسوس کرتا تو اسے اپنا فیصلہ درست معلوم ہوتا۔ وہ اپنے گھنگریالے بالوں میں ہاتھ پھیرتا اور خود سے کہتا، چل چھڈ (چل چھوڑ) جو ہوا اچھا ہوا۔ چند دوست ملے لیکن ان سے دلی رفاقت نہیں تھی۔

کئی مہینے کی تنہائی کے بعد اس کی ملاقات سید ضمیر جعفری نام کے ایک طالب علم سے ہوگئی۔ غلام جیلانی ایک درخت کے نیچے بیٹھا کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک لڑکا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”یار، یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ میں کسی تعارف کے بغیر تمہارے پاس آکر بیٹھ گیا اور تمہیں ڈسٹرب کررہا ہوں لیکن تمہاری تنہائی مجھے اچھی لگی۔ سوچا تم سے اپنا تعارف کروادوں۔ میرا نام سید ضمیر جعفری ہے۔“

”میرا نام غلام جیلانی اصغر ہے۔“

”غالباً، اصغر تمہارا تخلص ہے۔ تم شاعری کرتے ہو؟“

”ہاں، نظمیں لکھتا ہوں۔“

”پھر تو ہم دونوں کی خوب گزرے گی۔ میں بھی شعر کہتا ہوں۔“

”ارے واہ، یہ تو خوب انہونی ہوئی کہ ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔ ہم کوئی اتنے بڑے شاعر تو ہیں نہیں کہ ہمیں کوئی مشاعرے میں بلائے۔ ایک دوسرے کو سنا کر دل خوش کرلیا کریں گے۔“

”آؤ میں تمہیں اپنے دوست شیر محمد شاد سے ملواتا ہوں وہ بھی شعر کہتا ہے۔“ وہ دونوں شیر محمد شاد کی تلاش میں نکلے اور ایک جگہ اسے ڈھونڈ لیا۔ وہ ضمیر جعفری کے ساتھ ایک نئے لڑکے کو دیکھ کر حیران ضرور ہوا تھا لیکن پھر اس طرح گھل مل گیا جیسے برسوں کا تعلق ہو۔

وہ تینوں اس طرح ایک ساتھ دیکھے جانے لگے جیسے ان تینوں کے علاوہ کالج میں کوئی چوتھا نہ ہو۔ اکثر لاہور کی اور وہاں کے ادبی ماحول کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ اختر شیرانی کی شاعری پڑھی جاتی تھی یا پھر بدلتے ہوئے سیاسی حالات پر بحثیں ہونے لگتی تھیں۔ ان باغیانہ تحریکوں پر باتیں ہوتی تھیں جو ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جارہی تھیں۔ ان دنوں پڑھے لکھے نوجوانوں کے یہی موضوعات تھے۔

غلام جیلانی نظمیں لکھ رہا تھا جبکہ شیر محمد شاد غزلوں کا طرف دار تھا اور اکثر اسے غزل کہنے پر اکساتا تھا۔

”دیکھو تم جو یہ طویل نظمیں کہتے ہو اس ایک خیال کو ایک شعر میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ غزل کے پانچ شعر کہہ لو تو سمجھو تم نے پانچ نظمیں کہہ لیں۔“

”موضوع کے ساتھ جو انصاف نظم میں ہوتا ہے غزل میں تو نہیں ہوتا۔ اس میں تو صرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔“

”یہ اشارہ ہی تو قیامت ہوتا ہے پیارے۔ مشاعروں میں بھی غزلوں پر ہی داد ملتی ہے کیونکہ موضوع فوراً سامع تک پہنچتا ہے۔ نظم جب تک مکمل نہ ہو داد دینے کو جی ہی نہیں چاہتا۔“

یہ تقریباً روز ہی کا قصہ تھا۔ روزانہ ہی یہ باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بچپن میں جو نقش قائم ہوگئے تھے اتنی جلدی مٹنے والے نہیں تھے۔ وہ بدستور نظموں سے چمٹا رہا۔

ایک حادثے نے اس سے پہلی نظم لکھوائی تھی۔ نفیس خلیلی کو سن کر اس نے نظم لکھی تھی۔ ایک حادثے نے اس سے غزل لکھوادی۔

ان کے حلقۂ احباب میں ایک لڑکا سورج پرکاش شامل ہوا تھا۔ یہ لڑکا نہایت خوب صورت تھا اور اپنے حسین نقش کی وجہ سے نمایاں تھا۔ شاد نے غلام جیلانی سے فرمائش کی کہ سورج پرکاش پر غزل لکھے جس میں اس کے حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہو۔ مقصود تھا اس غزل کے اشعار سنا کر سورج کو چھیڑا جائے گا۔

غلام جیلانی نے غزل لکھ دی۔ اسے نظمیں لکھنے کی تو کچھ مشق فراہم ہوگئی تھی لیکن غزل کہنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کی پہلی غزل تھی اور وہ بھی فرمائشی۔ اس میں سورج کے حسن کی تعریف تو ہوگئی تھی لیکن غزل میں تو قافیے اور ردیف کا سارا کھیل ہوتا ہے۔ قافیہ اور ردیف فنی دستگاہ سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ قافیوں کا پوری طرح خیال نہ رکھ سکا۔ وہ سخت مایوس ہوا اور پھر نظموں کی پناہ میں چلا گیا۔

یہ غزل جیسی بھی تھی بہت دن تک گردش میں رہی اور سورج کو چھیڑنے کے کام آتی رہی۔

کیمبل پور کا یہ کالج جس میں وہ پڑھ رہا تھا انٹر کالج تھا لہٰذا جب اس نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی

تصنیفات

میں اور میں، ایک ذرا شام سے پہلے، نرم دم گفتگو، شاعری کے پروں پر (انگریزی)

تالیفات

تذہیر غالب، پاکستان کا بہترین ادب 1968

پاکستان کا بہترین ادب 1970ء

حاصل کرلی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال ہوا تو کسی ایسے کالج میں داخلے کا سوال آیا جہاں بی، اے کی کلاسز ہوتی ہوں۔ لاہور ہی وہ شہر تھا جہاں اسے یہ سہولت مل سکتی تھی۔

لاہور میں اس وقت تین کالج فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم تھے۔ ہندوؤں کا سناتن دھرم کالج تھا، سکھوں کے لیے سکھ نیشنل کالج قائم کیا گیا تھا اور عیسائیوں نے اپنے لیے فارمن کرسچین کالج کھولا تھا۔ اس فضا میں، انجمن حمایت اسلام اسلامیہ کالج علی گڑھ یونیورسٹی کے خطوط پر جاری کیا تھا اور مسلمانوں کا کالج قرار دیا جاتا تھا۔ یہاں کے مسلمان طلبہ نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرلی تھی۔ اس فیڈریشن کا نصب العین علامہ اقبال کے مشورے سے ”ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام“ قرار دیا گیا تھا۔

یہ کالج مسلمان طلبہ میں بے حد مقبول ہورہا تھا۔ سید ضمیر جعفری بھی اسی اسلامیہ کالج میں داخل ہوچکے تھے۔ غلام جیلانی بھی اپنے سیاسی اور ادبی ذہن کی بدولت اسی ادارے کے حق میں تھا لیکن سوال پھر سامنے تھا کہ گھر سے اجازت ملتی ہے یا نہیں۔

دادا نے کہا تھا کہ کچھ اور تعلیم حاصل کرلو پھر کاروبار سنبھالنا۔ ان کے نزدیک کچھ اور تعلیم ہوچکی تھی اب اسے کاروبار سنبھالنا تھا البتہ والد نے اب بھائے باہمی کا اصول اپنالیا تھا۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن دنیا دیکھی تھی۔ سیاسی تحریکوں میں بھی شامل تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اب ہوا کدھر کی ہے۔ دادا نے بہت مخالفت کی لیکن باپ نے اجازت دے دی اور غلام جیلانی کے دادا کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ بس دو سال کی بات اور ہے اس کے بعد غلام جیلانی گھر آکر کاروبار میں حصہ لے گا۔

غلام جیلانی لاہور چلا آیا اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ضمیر جعفری یہاں پہلے سے موجود تھا۔ شیر محمد شاد بھی آگیا تھا۔ یہ تکون پھر ایک جگہ جمع ہوگئی۔

اس کے پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔ اسے عید میلہ کا نام دیا گیا تھا۔ برانڈرتھ روڈ کی طرف میدان کے کنارے کنارے مسلمان تاجروں کے اسٹال قائم تھے۔ ریواز ہوسٹل کے سامنے کھانے پینے کی اشیا کے اسٹال لگائے گئے تھے اور بچوں بچے عوام کی دلچسپی کے لیے کشتیوں، بازی گری کے کھیلوں اور دوسرے مشاغل تفریح کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس میلے کا مقصد یہ تھا کہ عید کے دن خاص و عام ایک مرکزی مقام پر جمع ہوں تاکہ مرکزی ارتباط کو تقویت پہنچے۔ اسی رات مشاعرہ ہوا کسی نے اس کا نام بھی لکھوادیا۔

جب اس کا نام پکارا گیا تو اس نے بھی نظم سنائی۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ اپنی کوئی نظم دوسروں کو سنا رہا تھا۔

اس مشاعرے میں لاہور کے تقریباً تمام ہی شعرا شریک ہوئے تھے۔ غلام جیلانی کو انہیں دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ لاہور میں نہیں کسی ادب کدے میں ہے۔ اگر وہ اس سے فیض حاصل نہ کرسکا تو خالی الذہن ہی چلا جائے گا۔

”یار سب سے ملاقات ہوئی اختر شیرانی سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ملنا تو انہی سے تھا، کیا انہیں بلایا نہیں گیا جو وہ مشاعرے میں نہیں آئے؟“

”بلایا تو ضرور ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ لاہور میں نہ ہوں یا کوئی اور وجہ ہو۔“ شاد نے عجیب معنی خیز انداز میں کہا۔

”کوئی اور وجہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”وہ شراب ناب میں غرق رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے انہیں یاد ہی نہ رہا ہو۔“

”پھر ان سے ملاقات ہوسکتی ہے؟“

”یوں نہیں ہوسکتی۔ آج کل فلیمنگ روڈ پر رہتے ہیں۔ ان کے رسالے رومان کا دفتر بھی وہیں ہے۔ کسی دن میرے ساتھ چلنا۔“

”وہ تمہیں جانتے ہیں؟“

”ایک دو بار ملا ہوں۔ ویسے تو اتنے خلیق ہیں کہ اجنبیوں سے بھی اخلاق سے ملتے ہیں۔ خاص طور پر نوجوانوں سے مل کر تو بہت خوش ہوتے ہیں۔“ وہ اور شیر محمد شاد، اختر شیرانی سے ملنے رومان کے دفتر پہنچے۔ ایک بڑی حویلی تھی جس کی سیڑھیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا کمرا تھا۔ یہی رومان کا دفتر بھی تھا اور یہیں ان کی اقامت گاہ بھی۔

اس وقت اتفاق سے وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ان سے بات کی بھی جاسکتی ہے یا کس موضوع پر کی جائے انہوں نے جیلانی سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔

تمام عمر سہا ہے عذاب آنکھوں کا
کھلیں...... تو چاروں طرف تھا غبار چہروں کا
وہ چہرے جن پہ لکھی ہے حکایت شب و روز
گزرتے لمحوں کی تحریر کا وہ نقش دوام
جو وقت اپنے صحیفوں پہ لکھ کے چھوڑ گیا
میں پڑھ رہا ہوں یہ ساری اداس تحریریں

چھ مصرعوں پر مشتمل یہ نظم آشوب ذات کی بھرپور عکاسی کررہی تھی۔ معلوم نہیں اختر شیرانی کو یہ نظم پسند آئی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہوں نے اصرار کرکے کہا کہ وہ دونوں ان کے پاس آیندہ بھی آسکتے ہیں۔

غلام جیلانی کو یہ اچھا ٹھکانا مل گیا تھا۔ وہ ان کے پاس پابندی سے حاضری دینے لگا۔ کبھی اکیلا کبھی شاد کے ساتھ، کبھی کسی اور دوست کے ہمراہ۔

اختر شیرانی اس دور میں نوجوانوں کے محبوب شاعر تھے۔ ان کی رومان پرور نظمیں نوجوانوں کو نہ صرف متاثر کررہی تھیں بلکہ وہ ان کے رنگ میں کہنے کی کوشش بھی کررہے تھے۔ غلام جیلانی بھی ان کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہ رہ سکا، بقول اس کے ”میری شاعری میں رومان کا جو عنصر ہے وہ انہی ملاقاتوں کی دین ہے۔“

لاہور کے اس قیام میں اس کی ملاقات مختار صدیقی اور تابش صدیقی سے بھی ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ یہ حضرات نظم کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہہ رہے ہیں۔ غزلیں مشاعروں میں دلچسپی سے سنی جاتی ہیں اور رسالوں میں چھپتی ہیں تو اپنے داخلی، موضوعی اور فکری انفرادیت سے متاثر کرتی ہیں۔ اس نے بھی ان دوستوں کی طرح غزل اور نظم کہنے پر یکساں توجہ دینی شروع کردی۔

”میں مختلف اصناف کو ایک ہی عمل کے اظہار کے لیے مختلف سانچے سمجھتا ہوں۔ جب جذبہ مجرد لیکن اندر سے جڑا ہوا ہوتا ہے تو وہ اپنے اظہار کے لیے غزل کا پیرایہ منتخب کرتا ہے۔ جب وہی جذبہ وضاحت طلب ہوتا ہے تو نظم کا پیکر اس کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ اس کی موزونیت کا میں انتخاب نہیں کرتا بلکہ وہ جذبہ خود کرتا ہے۔

اس کو یاد رکھنا ہے اس کو بھول جانا ہے
دکھ تو ایک جیسا ہے انتخاب کرنا ہے

☆☆☆

وہ لاہور کی ادبی فضا میں مکمل مل گیا۔ مشاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔ غزلیں بھی کہتا رہا، نظمیں بھی، البتہ اب اس میں مسدس حالی کی پیروی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے موضوعات، ان کا لب ولہجہ بدل گیا تھا۔ وہ اگر پابند بھی تھیں تو قدیم سے مختلف تھیں۔

آج کے روز جنہیں کل کو خدا پر چھوڑیں
ایک لمحے کے لیے وقت کا بندھن توڑیں

انتخاب شاعری

میں کیسے زخم چھپاتا تری مروت کے
یہی تو میرے اثاثے میں ساری دولت تھی

☆

اک ذرا سی بات سے شیشے میں آجاتا ہے بال
بات میں تلخی سہی اونچا نہ بولا کیجیے

☆

اس کو یاد رکھنا ہے اس کو بھول جانا ہے
دکھ تو ایک جیسا ہے انتخاب کرنا ہے

☆

بس یہی بات کہ لوگوں کو نہ چاہو دل سے
تجربے اس کے سوا عمر کو کیا دیتے ہیں

☆

میں خود اپنے آپ سے بچ کر نکل جاؤں کہاں
اس زمیں کے چار جانب آسماں ہیں شہر میں

☆

جس کو دیکھو کسی کے چہرے پہ لکیریں سوچ کی
جیسے ہوجائے کسی شے کا مقدر سوچنا

☆

کتنے چہرے کتنے موسم کتنے دن یاد آگئے
جب کبھی اس بے مروت کا بیاں ہونے لگا

☆

اک عمر میں نے اپنے تعاقب میں کاٹ دی
لیکن یہ تھا گماں کہ تمہیں ڈھونڈتا رہا

☆

مسافر کس پڑاؤ پر رکیں گے
امیر کارواں سویا ہوا ہے

☆

اب تو اس شہر کے سناٹے سے ڈر لگتا ہے
اپنے اندر ہی کوئی شہر بسایا جائے

زیست خود اپنی رضا اپنی ہی تعزیز وفا
اس کا ہر لمحہ گریزاں ہے خود اپنی تقدیر
اپنے اسلاف کے ژولیدہ خیالات کا بوجھ
کتنی صدیوں سے اٹھائے ہوئے ہم پھرتے ہیں

ایک مجروح پرندے کی طرح
اپنی ہی قید میں محبوس ہیں ہم
اپنی ناکردہ گناہی کے طفیل
کس قدر زیست سے مایوس ہیں ہم

دیکھ یہ لمحہ جو سورج کی طرح ابھرا ہے
شب کی ڈائن اسے دم بھر میں نگل جائے گی
اب تو ہر ساعت تابندہ ہے میرے بس میں
کل یہی وقت کی گرمی سے پگھل جائے گی

اس نے بی، اے کا امتحان پاس کرلیا اور کچھ کچی پکی نظموں اور غزلوں کو ساتھ لے کر وہ تلہ گنگ چلا آیا۔ دادا ابھی زندہ تھے۔ انہوں نے اس کا وعدہ یاد دلایا" کچھ اور تعلیم" مکمل ہو چکی۔ اب اسے کاروبار سے منسلک ہو جانا چاہیے اور اسے روزنامچہ، کھاتا اور کیش بک لکھنے کی ابتدائی تربیت دینے لگے۔ دادا لاکھ سمجھاتے تھے اس نے کوشش بھی کی لیکن کھاتا لکھتے ہوئے نظمیں اس کے ذہن میں مچلتی رہتی تھیں۔ کوشش بسیار کے باوجود کھاتے اس کے بس میں نہ آتے تھے۔ اکثر لوگوں کو شکایت پیدا ہوگئی کہ جو رقم انہوں نے جمع کروائی تھی وہ ان کے نام لکھی ہی نہیں گئی یا جمع نہیں کی گئی۔ اس کا استدلال تھا کہ رقم تو موجود ہے نام اور جمع سے کیا فرق پڑتا ہے۔

ایک شام اس نے اپنے دادا کو یہ کہتے سنا۔" محمد دین! یہ تیرا پتر ہٹی نہیں چلا سکے گا۔" وہ غلام جیلانی کے والد سے کہہ رہے تھے۔ ان لفظوں میں ایسی تاثیر تھی کہ غلام جیلانی جھوم اٹھا۔ اس کا مطلب یہ ہے دادا میری طرف سے مایوس ہوگئے ہیں۔ اب مجھے کاروبار کے جھنجٹ میں نہیں پھنسایا جائے گا۔ میرے سامنے مزید تعلیم کے لیے میدان کھلا ہے۔

اس زمانے میں، سلامیہ کالج پشاور صوبہ سرحد کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ شمار ہوتا تھا۔ اس نے بہت غور و فکر کے بعد طے کیا کہ وہ اسلامیہ کالج پشاور میں داخلہ لے گا اور انگریزی میں ایم، اے کرے گا۔ وہ پشاور پہنچ گیا ہے۔

یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ یہاں داخلے سے قبل انگریزی میں ایک مضمون بھی لکھوایا جاتا ہے۔

اس داخلے کے لیے غلام جیلانی کو میتھو آرنلڈ کے ایک ادبی مقولے پر مضمون لکھنا پڑا۔ یہ مضمون جب پروفیسر اسٹوور کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے اسے سراہا۔

"تم انگریزی میں بہت اچھا ہے۔ ہم تمہاری فیس بھی معاف کرے گا۔" یوں اس کا داخلہ نہایت اعزاز کے ساتھ اسلامیہ کالج پشاور میں ہوگیا۔

اس کالج کا معیارِ تعلیم اتنا بلند تھا کہ اوسط درجے کا طالب علم اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے سخت محنت اور قابلیت کی ضرورت تھی۔ غلام جیلانی کی انگریزی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ پروفیسر اسٹوور نے اسے مشورہ دیا کہ وہ کالج میگزین "خیبر" میں مضامین لکھا کرے۔

اس کے قلم نے اب تک نظم و غزل کا ذائقہ چکھا تھا۔ کالج کے میگزین کے لیے مضامین لکھنے کا آغاز کیا تو اس پر اپنا یہ جوہر بھی کھلا کہ وہ اعلیٰ پائے کے مضامین لکھ سکتا ہے۔ کالج میں ہونے والے مباحثوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ چند مباحثوں کے بعد تو تقریر کا بادشاہ کہلانے لگا۔ وہ ہر موضوع پر ہر جگہ اور ہر وقت بلا تکان بول سکتا تھا۔ سوچنے کا وقت تو جیسے اس کے پاس تھا ہی نہیں۔ مزاح اس کا خاص ہتھیار تھا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع میں۔۔ مزاح کے پہلو تلاش کر لیتا تھا۔ کیسی ہی ہونگ ہو کیسا ہی ماحول ہو اس کی تقریر سن ہی لی جاتی تھی۔ اس خوبیِ خطابت میں اس کے حافظے کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ مطالعے کا جوہر اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا تھا اور حسبِ ضرورت کثرت سے استعمال کرتا تھا۔ کہتے بھی ہیں کہ تقریر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے لیکن اس کی تقریریں یا ان کے اقتباسات بار بار محفلوں میں سنائے بھی جاتے تھے۔

اس نے کالج کے لیے کئی ٹرافیاں اپنے نام کیں اور کالج کی ناموری کا باعث بنا۔ ایسے طلبہ جو غیر نصابی سرگرمیوں میں فعال ہوتے ہیں اکثر تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں لیکن وہ قابلِ فخر طالب علم بھی تھا۔

یہ 1941ء کا سال تھا جب اس نے ایم، اے انگریزی کا امتحان پاس کرلیا۔ اب اسے عملی زندگی کے لیے کسی شعبے کا انتخاب کرنا تھا۔ خاندان کا پیشہ تجارت تو وہ اپنا نہیں سکتا تھا اور اب اس سے کوئی کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے مشورہ بھی ضروری نہیں سمجھا۔ درس و تدریس کا میدان

اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور وہ اس کے لیے موضوع بھی تھا۔ انگریزی اردو دونوں روانی سے بول سکتا تھا۔ نفسی نفسی میں بات کو سمجھانا بھی آتا تھا۔ انگریزی میں ایم، اے اس وقت کرتے ہی کتنے لوگ تھے۔ بارے زمیندارہ کالج گجرات میں انگریزی کی لیکچررشپ بآسانی مل گئی۔

یہ غیر سرکاری کالج ایک مقامی انجمن نے قائم کیا تھا جس کے صدر نواب سر فضل علی تھے اور مقصد متوسط درجے کے مسلمانوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ پرنسپل ڈاکٹر جہانگیر خاں تھے جن کی کشادہ نظری اور اسپورٹس مین اسپرٹ کے قصے زبان زدِ خاص و عام تھے۔

غلام جیلانی اس ماحول میں کالج پہنچا تو اس کے تمام جوہر ایک ایک کرکے کھلنے لگے۔ اس نے سب سے پہلے تو طلبہ کا دل جیتنے کے لیے انہیں محنت سے پڑھانا شروع کیا۔

طلبہ اس استاد سے خوش ہوتے ہیں جو انہیں کتاب سے باہر کا علم دے۔ کتابیں تو وہ خود بھی پڑھ لیتے ہیں۔ کتاب سے باہر کا علم وہی استاد دے سکتا ہے جس نے خود کچھ پڑھا ہو۔ غلام جیلانی کتاب کی چند سطریں پڑھتا اور پھر اس کی تشریح میں مختلف کتابوں کے حوالے دیتا چلا جاتا۔ طلبہ نے کچھ ہی دنوں میں جان لیا کہ وہ تو علم کا ایک سمندر ہے اور پھر سمجھانے کا ایسا شگفتہ انداز کہ ہر بات دل میں اترتی جائے۔

ہوتا یہ ہے کہ اساتذہ اپنے لائق شاگردوں پر توجہ دیتے ہیں اور نالائق شاگردوں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ غلام جیلانی کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کمزور طالب علموں پر زیادہ توجہ دیتا تھا۔ لائق طلبہ تو پہلے ہی اس کے گرویدہ ہوگئے تھے، نالائق طلبہ بھی اس کے گن گانے لگے۔ عالم یہ ہو گیا کہ طلبہ کو اس کی آمد کا انتظار رہتا۔ وہ اسٹاف روم سے نکلتا تو طلبہ بے تابی سے جھانک جھانک کر اس کا انتظار کرتے اور جونہی اس پر نظر پڑتی اچانک ایک لڑکا چیختا۔" وہ جیلانی صاحب آگئے۔" یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

جب اس نے طلبہ کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی تو اس نے ایسے طلبہ کا انتخاب کیا جو ادبی ذوق رکھتے تھے اور ان طلبہ کی خصوصی سرپرستی شروع کی۔ کسی کو مباحثے کے لیے تیار کرنا کسی کی شاعری کی اصلاح کرنا۔ کالج میں مشاعروں کا انعقاد بھی کیا۔

اس کی اپنی ادبی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ اس نے یہاں رہ کر ایک نظم "آنسو" تخلیق کی۔ گجرات میں ایک مشاعرہ

موت (نظم)

رات آنگن میں اتری
بہت دیر تک مجھ کو سینے سے چمٹا کے کہتی رہی
شانتی! شانتی!
چاند بوڑھے لبادے میں لپٹا ہوا
زینہ زینہ مرے پاس آتا گیا
اپنی خوش رنگ ٹھنڈی سی انگشت سے
میری تپتی جبیں پر یہ کلمہ لکھا
شانتی! شانتی!
اس کے برفاب سے ٹھنڈے ہونٹوں کے خم
میرے ہونٹوں سے پیوست ہوتے گئے
خون بجھتا گیا
رات ڈھلتی گئی
چاند کجلا گیا
چاندنی سوگئی
شانتی! شانتی!

ہوا تو اسے بھی بلایا گیا۔ اس نے یہی نظم نذرِ سامعین کی۔

زندگی گریۂ پیہم ہی تو ہے
مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جا
تو نے پھولوں کو کبھی دیکھا ہے
ان کے عارض پہ دمکتے ہوئے ننھے موتی
ان کی الفت کا ہے اظہارِ جمیل
ان کو شبنم نہ سمجھ

....

میرے رونے کا برا مانتی ہو
اس سے مطلوب شکایت تو نہیں
یہ مرا اشکِ ندامت بھی نہیں
یہ مرے ذوقِ عقیدت کی فراوانی ہے
اشک بن کے جو نگاہوں میں ڈھلک آئی ہے

جدید انداز کی یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ مشاعرہ تو لوٹا ہی لوٹا طلبہ کا یہ حال ہوا کہ پورے ایک سال کالج کے احاطے میں اس نظم کے مصرعے گنگناتے پھرتے تھے اور پھر یہ نظم اس سے ہر مشاعرے میں فرمائش کرکے سنی جانے لگی۔

اسے کچھ بھی سنانا ہوتا اس سے قبل یہ نظم ضرور سنانی پڑتی۔

☆☆☆

اس نے ابھی بی۔اے پاس نہیں کیا تھا کہ اس کی شادی کردی گئی۔ اس نے اس شادی کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ نہ اسے غیر معمولی واقعہ سمجھا تھا۔ وہ اپنی تعلیم اور شاعری میں مگن تھا۔ کیمبل پور، لاہور اور پشاور میں قیام کرتا رہا۔ بیوی کو کہاں کہاں لیے پھرتا۔ جب قربت ہی نہیں تھی تو محبت کہاں سے بڑھتی۔ بس زندگی کی گاڑی کھینچنے کو دونوں کا ساتھ تھا۔ جب اسے ملازمت مل گئی اور زمیندارہ کالج گجرات میں تعیناتی ہوگئی تو وہ اپنی اہلیہ کو لے آیا۔ یہیں اس کی پہلی اولاد پیدا ہوئی۔

وہ اپنی والدہ کی واحد اولاد تھی۔ اس کے دوسرے بھائی دوسری والدہ سے تھے۔ وہ اپنی والدہ کا اکیلا تھا لیکن اسے قدرت نے کثرتِ اولاد سے نوازا۔ سات بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا ہوئیں۔

جب اس کی عمر ڈھلنے لگی تھی تو ایک بیٹے نے اسے بڑھاپے کا غم دے دیا۔ شادی کو آٹھ دس دن ہوئے تھے کہ برین ہیمبرج ہوا اور وہ جانبر نہ ہوسکا۔ اس کے آنسو اس کی اس نظم میں سما گئے۔

کتنے سال تمہیں سمجھایا
موت آئی تو اس سے کہنا
بی بی کسی اور دن آنا
کھڑکی کا پٹ کھول کر آہستہ سے
میرا نام اور کام بتانا
شاید اس کو رحم آجائے
لیکن تم تو خود سر نکلے
تم نے پہلی ہی دستک پر
کیوں دروازہ کھول دیا
اب صدیوں آرام سے لیٹو
میں بھی اک دن آجاؤں گا

☆☆

وہ زمیندارہ کالج میں نہایت شاندار دن گزار رہا تھا۔ اس دوران کیا کچھ نہیں ہوگیا تھا۔ سب سے بڑا واقعہ تو قیام پاکستان ہی کا تھا۔ اس نے یہ پُرآشوب دور گجرات میں گزارا تھا۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتے دیکھا نہیں تھا لیکن سنتا ضرور رہتا تھا اور شکر بھیجتا تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس کا محبوب شہر لاہور سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا۔

پاکستان کو قائم ہوئے دو ماہ ہوئے تھے کہ وہ گجرات کی ملازمت ترک کرکے سرگودھا آگیا اور یہاں گورنمنٹ کالج میں انگریزی کا لیکچرار مقرر ہوگیا۔ ہندو اور سکھ ہجرت کرکے جاچکے تھے۔ مشرقی پنجاب کے بیشتر لٹے پٹے مسلمان سرگودھا آچکے تھے اور یہ شہر خالصتاً مسلمانوں کا شہر بن چکا تھا۔ اس وقت گورنمنٹ کالج فوج کی خالی بیرکوں میں قائم تھا۔

سرگودھا شہر بیس بلاکوں میں منقسم تھا۔ گورنمنٹ کالج کے اساتذہ شہر کے مختلف بلاکوں میں متروکہ مکانوں میں مقیم تھے۔ اسے بلاک 18 میں ایک حویلی نما متروکہ مکان کے بالائی حصے میں رہائش کے لیے جگہ ملی۔

ابھی وہ اپنا سامان اچھی طرح کھول بھی نہیں سکا تھا کہ اس کا تقرر فیصل آباد میں کردیا گیا۔ وہ ہرگز وہاں جانے کو تیار نہیں تھا۔ سرگودھا اس کا پسندیدہ شہر تھا۔ یہاں وزیر آغا تھے، جوہر نظامی تھے، انگر سرحدی تھے۔ یہاں کی ادبی فضا سے وہ باہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سیکریٹری تعلیمات کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے سرگودھا تقرری کی درخواست کی۔

”جناب، اگر آپ میری فکری اور سماجی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو مجھے سرگودھا بھیجا جائے۔“

”آپ فیصل آباد (لائلپور) سے کیوں گریزاں ہیں۔ سرگودھا میں ایسی کیا خاص بات ہے جو آپ وہیں رہنا چاہتے ہیں؟“

”حضور، سرگودھا مجھے اس لیے عزیز ہے کہ وہاں لتریاں ہوتی ہیں۔“ یہ عجیب و غریب جواب سن کر وہ لاجواب ہوگئے۔

”لتریوں سے آپ کا کیا تعلق؟“

”جناب، میں اب سے بہت پہلے 1935ء میں سرگودھا آیا تھا۔ ان دنوں سرگودھا پر عجیب ویرانی کا عالم تھا۔ میں دن بھر سرگودھا کو تلاش کرتا رہا۔ مجھے اس سرے پر دانتوں والے ڈاکٹر بالی اور دوسرے سرے پر سردار لہنا سنگھ ملے۔ اس زمانے میں سردار لہنا سنگھ کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اور ڈاکٹر بالی ہر اس دانت کے دشمن تھے جس میں کوئی خوبی ہو۔ شہر کے ان دو سربرآوردہ افراد کے درمیان ایک وسیع خلا تھا جسے گھوڑوں اور گدھوں سے بھرا گیا تھا۔ چاروں طرف سکون اور شانتی کا ایسا عالم تھا کہ بازار میں کوئی گاہک جب داخل ہوتا تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوشی

کی لہر دوڑ جاتی اور گاہک بھی اس لہر کی گرفت میں اس طرح آجاتا کہ دکاندار شام تک اس کا انتظار کرنے کے بعد اپنی دکانیں بڑھا دیتے اور ایک گہرا پُراسرار اندھیرا دکانوں کے چوبی دروازوں کے عقب سے نکل کر اور اس کے آس پاس گلیوں میں پھیل جاتا۔“

(غلام جیلانی اصغر، خاکہ آہن کی طرح سخت بریشم کی طرح نرم)

میں نے ایک روز ایک خواجہ سگ پرست سے پوچھا۔ ”بھائی اس شہر میں قابلِ دید جگہ کون سی ہے اور قابلِ شنید آدمی کون ہے؟“

وہ بڑے خلوص سے مسکرایا اور کہا۔ ”یہاں کی تو صرف لتریاں مشہور ہیں اور کوئی شے نہیں ہے۔ مجھے اس زمانے میں لتریاں کا لغوی مفہوم معلوم نہیں تھا۔ میں نے سمجھا شاید کوئی نسوانی نام ہے جس کا پیکر قابلِ دید ہوگا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے ایک جاننے والے نے مجھے بتایا کہ یہاں کی مقامی آبادی ”جوتی“ کو لتری کہتی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا اگر قیام کرکے ہی جینا ہے تو ایسے شہر میں رہنا چاہیے جہاں جوتی پر بھی عورت کا گمان ہو۔“

(ادب کہانی، غلام جیلانی)

یہ تفصیل سن کر سیکریٹری صاحب بہت محظوظ ہوئے اور اسے اسی وقت سرگودھا تبدیل کردیا۔

اس نے سرگودھا آکر اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں مشاعروں، ادبی مباحثوں کا سلسلہ جاری کیا۔ مشاعروں میں ملک کے نامور شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس کالج میں پہلا یوم اقبال بھی اس کی تحریک پر منایا گیا جس میں صوفی غلام مصطفی تبسم، پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر عباد بریلوی جیسے جید لوگ شریک ہوئے۔

اس نے سرگودھا کے گورنمنٹ کالج میں بائیس سال کا عرصہ گزارا۔ ان برسوں میں سیکڑوں طالب علم تیار ہوئے جنہوں نے ملک و قوم کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس نے ادب کے ایک فعال معمار کا فریضہ بھی ادا کیا۔

1969ء میں اس کا تبادلہ گوجر خان کردیا گیا۔ یہاں وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے جانا پڑا۔ وہ جانے کو چلا تو گیا تھا مگر اس کا دل سرگودھا میں اٹکا ہوا تھا۔ اسے وہ محفل یاد آرہی تھی جو ہر شام وزیر آغا کی رہائش گاہ پر منعقد ہوتی تھی۔ ادب کے مختلف موضوعات و مسائل پر بحثیں ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں وہ بلبل کی طرح چہکتا تھا۔

گوجر خان آنے کے بعد یہ محفلیں اس سے چھوٹ گئی تھیں۔ ایک روز وہ سنیچر کی شام کو ٹرین میں بیٹھا اور سرگودھا پہنچ گیا۔ وزیر آغا کی رہائش گاہ پر ہونے والی محفلوں میں شرکت کی اور پیر کی صبح واپس گوجر خان پہنچ گیا۔ یہ سلسلہ قریباً ایک سال تک جاری رہا۔ یہ محکمہ تعلیم کے خلاف ایک قسم کا احتجاج بھی تھا کہ تم لاکھ میرا تبادلہ کردو میں تو سرگودھا سے دور نہیں ہوسکوں گا۔ ہر ہفتے سرگودھا جاکر دکھاؤں گا۔

اس کی یہ شکایت شاید محکمہ تعلیم نے بھی سن لی۔ اسے گوجر خان آنے کے ایک سال بعد..... پرنسپل کے عہدے پر ترقی دے کر اس کے آبائی شہر تلہ گنگ بھیج دیا گیا۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ محکمہ تعلیم نے جان بوجھ کر اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس شہر کا ریل کے ساتھ سرگودھا کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ اب ہر ہفتے سرگودھا آنے کا

مزاج

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی گفتگو اور تحریر میں مزاح کی چاشنی ہمیشہ موجود رہی ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ جیلانی صاحب کے انشائیوں میں مزاح کی ساری چکا چوند انشائیہ کی بالائی سطح تک ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے ہاں ایک انتہائی خوب صورت نسوانی چہرہ میک اپ کی دبیز تہ کے نیچے موجود ہے۔ دیکھنے والا اگر میک اپ ہی سے لطف اندوز ہونا چاہے تو جیلانی صاحب کو اس پر اصولاً کوئی اعتراض نہیں مگر ان کی یہ خواہش ضرور ہے کہ دیکھنے والا میک اپ کے بھاری پردوں میں سے اصلی چہرے کی جھلک پائے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا)

پروفیسر غلام جیلانی اصغر کی تحریر ذہین بھی ہوتی ہے اور حسین بھی۔ وہ بہ یک وقت بچوں کی طرح معصوم اور عالموں کی طرح دانا۔ علم و بصیرت اس کے ہاں مسکراتے نظر آتے ہیں۔ اس کا فکر اتنا گہرا اور اس کا انداز اتنا اچھوتا ہوتا ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنی بھوک بھول جاتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں اگر غلام جیلانی اصغر انشائیہ نہ لکھتا تو اردو ادب کتنا اداس ہوتا۔

(سید ضمیر جعفری)

سلسلہ بھی رک گیا۔ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ تلہ گنگ میں اس کے خاندان کے مایوس چہرے جن کے ساتھ اس کے خون کے رشتے تھے اس کے گردوپیش موجود تھے۔ شہر میں ہر طرف اس کے چرچے ہو رہے تھے کہ اس شہر کے ایک فرزند نے گورنمنٹ کالج کی قیادت سنبھال لی ہے۔ اس شہر نے آج تک کوئی ایسا فرزند پیدا نہیں کیا تھا جو اس عہدے پر پہنچا ہو۔ اس کے والد بھی اب سر اٹھا کر چلتے تھے۔

سب خوش تھے لیکن غلام جیلانی کا دکھ وہی جانتا تھا۔ وہ گلیوں میں گھومتا رہا۔ بچپن کے دوستوں کو تلاش کرتا رہا۔ دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ چہرے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ وہ تمام دوست جنہوں نے میٹرک تک اس کے ساتھ تعلیم پائی تھی یا تو کاروبار میں مصروف ہو گئے تھے یا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تلہ گنگ چھوڑ کر بڑے شہروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ تلاشِ زر میں بہت آگے نکل گئے تھے۔ چھوٹے شہروں کا المیہ یہی ہوتا ہے۔ بچپن کے دن بہت سہانے ہوتے ہیں لیکن گلیوں سے نکل کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ رزق کی تلاش میں ایک ایک کر کے سب اڑ جاتے ہیں۔ اسے رہ رہ کر سرگودھا یاد آتا تھا۔ تلہ گنگ اس کا شہر تھا، اس کا بچپن ان گلیوں میں کھیلا تھا۔ اس کی محبت اپنی جگہ لیکن اس کی فکری ارتقا کا کوئی سامان یہاں نہیں تھا۔ وہ جس داخلی کیفیت سے گزر رہا تھا اس کا اظہار وہ غزل کے پیرائے ہی میں کر سکتا تھا۔

تجھ کو چاہوں تو زمانے کی عداوت دیکھوں
بھول جاؤں تو شبِ مرگ کی ساعت دیکھوں
جی کڑا کر کے کسی روز بچھڑ جائیں ہم
کیسے ہر روز جدائی کی قیامت دیکھوں
کوئی تو خول سے نکلے گا شناسا چہرہ
کس عقیدت سے ہر اک شخص کی صورت دیکھوں
پہلے حیرت سے تکا کرتا تھا دیواروں کو
اب میں دیواروں کی آنکھوں میں وہ حیرت دیکھوں

اس کے دل کی آواز شاید گوشِ فلک تک پہنچ گئی۔ وہ سوچا کرتا تھا اس صحرا میں کب تک اذانیں دے گا۔ اس کاروباری شہر میں کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ ادبی محفلیں سجاتا۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا کہ علوم و فنون پر اس سے تبادلہ خیال کرتا۔ یہاں کے طلبہ میں بھی ادب سے محبت کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ کالج چلے جانا، طلبہ کو نصاب پڑھانا اور گھر آ کر بند ہو جانا۔ وہ یہ زندگی تو نہیں چاہتا تھا۔ سرگودھا یاترا کے مواقع بھی فراہم نہیں ہو رہے تھے پھر خدا نے اس کی سن لی۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ یہ ادیب یوں ضائع ہو جائے۔ اس کا تبادلہ تلہ گنگ سے جوہر آباد کر دیا گیا جو سرگودھا سے صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر ایک نوآبادی بستی تھی اور دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر آباد قدیم شہر خوشاب سے ملحق تھی۔

یہ شہر تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ جوہر ثقافتی نے ایک چھوٹا ادبی سرگودھا اس شہر میں قائم کر رکھا تھا۔ غلام جیلانی یہاں پہنچا تو گویا سرگودھا کو اٹھا کر جوہر آباد میں لے آیا۔ ادب و شعر کی محفلیں کالج میں بھی منعقد ہونے لگیں۔ ہند و پاک مشاعرے ہونے لگے۔ اس شہر کی کیفیات کو اس نے ایک غزل میں سمیٹ دیا۔

میں نے وہ پھول وہ خوشبو وہ چمن بھی دیکھے
جاگتی آنکھوں نے کیا خواب کے منظر دیکھے
دو گھڑی ابر کبھی دھوپ کبھی سایہ ہے
میں نے موسم کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے
اس طرف چاند اُدھر عارضِ تاباں نکلا
ایک لمحے میں کئی خواب کے منظر دیکھے

☆☆☆

اب اس کی عمر پختہ ہو چکی تھی۔ باطن کی گہرائی میں جھانکنے کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ داخلی و خارجی تجربات کے علاوہ عالمی مصنفین کا بھی بھرپور مطالعہ کر چکا تھا۔ یہ مطالعہ زیادہ تر انگریزی ادب کا تھا۔ ابتدا میں انگریزی حصولِ رزق کا ذریعہ تھی لیکن پھر انگریزی نثر نے اسے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا۔ اسے انگریزی کے انشائیہ نگاروں سے عقیدت پیدا ہو گئی۔ یہ عقیدت اسے انشائیہ نگاری کی طرف لے آئی جس کا آغاز اردو میں ہو چکا تھا۔ وزیر آغا نے اپنے انشائیوں کا مجموعہ "خیال پارے" شائع کیا تھا۔ مشتاق قمر کے انشائیوں کا مجموعہ "ہم ہیں مشتاق" شائع ہو چکا تھا۔ جمیل آذر کے تین مجموعے منظرِ عام پر آ چکے تھے۔

غلام جیلانی نے یہ مجموعے بھی بغور پڑھے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ انشائیہ لکھنے کے لیے جس جوہر کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔ خاص طور پر اس کے شگفتہ جملے اور مزاح کا عنصر جو اس کی تقریروں میں ابھرتا ہے اگر تحریر میں آ جائیں تو نمبر ون انشائیہ کا روپ دھار لیں گے۔ وہ انگریزی کے حوالے سے انشائیہ کی فنی قدروں سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انشائیہ نگار اسلوب کے تیکھے پن سے سنجیدہ موضوع پر ایک دبیز تہ چڑھا دیتا ہے۔ قاری مزاح سے لطف اندوز ہوتا ہوا اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ جب اختتام کو پہنچتا ہے اور اس پر غور کرتا ہے تو اس کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ اس پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوتا ہے۔

وہ ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنا پہلا انشائیہ لکھنے بیٹھ گیا۔ "انشائیہ بستر پر لیٹنا" وجود میں آیا جو اوراق میں شائع ہوا۔

"بعض لوگ بستر اور بے کاری کو ہم معنی سمجھتے ہیں مثلاً آپ کسی روز یونہی اپنے دفتر کے کسی بھلے مانس سے پوچھیں، صاحب! آپ فارغ وقت میں کیا کرتے ہیں تو وہ نہایت معصومیت سے کہہ دے گا۔ بس یونہی لیٹا رہتا ہوں۔ اس سے احمقانہ جواب میں نے آج تک تنقید میں بھی نہیں پڑھا۔ یونہی لیٹنا اور بستر پر لیٹنا بنیادی طور پر دو مختلف عمل ہیں۔ یونہی لیٹنے سے بے کاری، بے زاری اور اپنے افسر اور دفتر سے شدید نفرت کا تاثر ملتا ہے لیکن بستر پر لیٹنا تو ایک سوچا سمجھا فعل ہے۔ جب آدمی غیر شاطرانہ قسم کے بوٹ اور کپڑے اتار کر شب خوابی کا زرہ بکتر پہن کر بستر میں داخل ہوتا ہے تو زندگی کا سب سے مصروف پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ بستر تو دراصل ایک میدانِ عمل ہے۔ ایک کارگاہِ فکر ہے جس میں نئے تخلیقی منصوبے وجود میں آتے ہیں۔ بستر پر آدمی بے کار لیٹ ہی نہیں سکتا۔ بے کاری تو ایک ذہنی کیفیت ہے اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب آدمی ڈاکٹر سے ساز باز کر کے سرکاری طور پر بیمار پڑتا ہے۔"

(اقتباس بستر پر لیٹنا)

ماہنامہ "اوراق" (جس کی ادبی ساکھ کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں) میں انشائیہ شائع ہوا تو تازہ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اس کی ایک ایک سطر سے ایسا پختہ فکر ادیب جھانک رہا تھا جس نے غزل اور نظم کی شاعری کرتے کرتے اچانک اظہار کا پیمانہ انشائیہ کی صنفِ سخن سے لبالب بھر لیا تھا۔

اس پہلی کاوش کے بعد اس کا قلم سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس نے پے در پے کئی انشائیے تحریر کر ڈالے اور اردو انشائیے کو پرانے دائرے سے نکال کر نئی فضا میں سرگرم ہونے کی راہ دکھائی۔

اس کے انشائیوں میں شگفتگی کا عنصر غالب تھا لہٰذا بعض لوگوں نے انہیں مزاحیہ مضمون کی ایک صورت قرار دیا حالانکہ ان کا یہ مزاح اس میک اپ کی طرح تھا جس کے پیچھے اصل چہرہ چھپا ہوتا ہے۔ مزاح کی تخلیق ان کا بنیادی مقصد نہیں، مثلاً یہ اقتباس۔

"بچہ ایک مکمل سوشلسٹ ہے۔ وہ خود مال و دولت، سیم و زر ہر قسم کی مزروعہ و غیر مزروعہ اراضی سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ وہ خود کچھ نہیں کماتا لیکن سب سے پہلے اور سب سے اچھا کھانا طلب کرتا ہے۔ اس میں دودھ دینے کی چنداں صلاحیت نہیں ہوتی لیکن دن بھر دودھ پیتا ہے چنانچہ مارکس جس جنت اراضی کی تلاش میں ہے وہ دراصل انسانی معاشرے میں بچپن کو دریافت کرنا ہے اور جس سیاست داں کو اپنے بچپن کے سوا کسی اور بچے کو پروان چڑھانے کا تجربہ نہیں وہ کیسے جان سکتا ہے کہ بچہ پالنا کتنا بڑا تخلیقی تجربہ ہے۔"

(اقتباس بچہ پالنا)

اس نے اتنے انشائیے تخلیق کر لیے کہ ایک مجموعہ "زرِ دمِ گفتگو" ترتیب دے لیا۔ اردو کے مشہور ناقد و دانشور ڈاکٹر وزیر آغا اس پر اپنی یہ رائے پیش کرتے ہیں۔

"انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ لفظ یا مظہر، شے یا تصور کو اس کے متعین اور مقرر معنی سے نجات دلا کر تر و تازہ کرتا ہے۔ انشائیہ کی یہ خوبی غلام جیلانی اصغر کے ہاں اپنا بھرپور مظاہرہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ وہ عام اشیا، مظاہر، تصورات اور افکار اس طور صیقل کرتے ہیں کہ ان میں قوت انعکاس پیدا ہو جاتی ہے۔ غلام جیلانی اصغر کے انشائیوں کی ایک اور خاص خوبی ایک ایسا دلکش انشائی اسلوب ہے کہ جو اپنی شگفتگی، کاٹ، چبھن، ایمائیت اور لفظوں کے تخلیقی استعمال کے باعث حد درجہ جاذبِ نظر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ انشائیہ میں نمائشِ دنداں معدوم اور تبسم کی لکیر فروزاں ہوتی ہے اور آنکھیں خارج سے کہیں زیادہ باطن کو ٹٹولنے لگتی ہیں۔ غلام جیلانی اصغر کو انشائیہ کے یہ دونوں اوصاف حاصل ہیں لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اب خود بھی ایک چلتا پھرتا انشائیہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ غلام جیلانی اصغر اردو انشائیہ کے ایک بہت بڑے ستون ہیں۔"

خود غلام جیلانی اصغر نے اپنے بارے میں یہ لکھا۔

"میں انشائیوں کو اپنی ذات کی ہی توسیع سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ محسوس کریں گے کہ میں ہر انشائیے کے ظاہر اور باطن میں موجود ہوتا ہوں۔ جب میں محسوس کرتا ہوں کہ انشائیہ میری سطح سے اوپر اٹھ کر کھلی فضا میں داخل

ہوگیا ہے تو مجھے خوف آنے لگتا ہے کیونکہ یہ مرحلہ انتہائی نازک ہوتا ہے۔ اگر یا تو کبوتر اور انشائیہ اپنے مرکز کی طرف واپس نہ آئے تو آپ نے دونوں کو صحیح تہذیب نہیں دی۔"

☆☆☆

1974ء میں اسے پرنسپل گورنمنٹ کالج بنا کر سرگودھا بھیج دیا گیا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے چند کے مصداق ہر شام ڈاکٹر وزیر آغا کی رہائش گاہ پر "شام دوستاں" کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ بحث کے دروازے کھل جاتے۔ کوئی خاص موضوع نہ ہوتا۔ بحث خود بخود بڑھتی چلی جاتی۔ ادب، سائنس، نفسیات، عمرانیات، سیاسیات اور مذہبیات وغیرہ۔ علمائے فن کے حوالے یوں چلے آتے جیسے کتابیں کھلی سامنے رکھی ہوں۔ علم کے ایسے دریا بہتے کہ اگر کوئی کاغذ قلم لے کر بیٹھتا تو کئی کتابیں تصنیف ہو جاتیں۔

وہ یہاں سے اٹھ کر شیخ محمد سعید کے گھر پہنچ جاتا جو اس شہر کے مشہور صنعت کار تھے۔ ادب اس کا شعبہ تھا لیکن صنعت وتجارت کے شعبے سے بھی دوستیاں تھیں۔ دوستیاں کرنا اور انہیں قائم رکھنا اس کا مشغلہ تھا۔ جو اس کے ذرا قریب آیا اس کے خانہ محبت میں رہائش پذیر ہو گیا۔ سرکاری افسروں تک اس کی رسائی کا عالم یہ تھا کہ جو نیا کمشنر آتا اسے سلام نیاز پیش کرنے ضرور آتا اور وہ اس سے اس برابری سے ملتے جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ یہ اس کی خود اعتمادی تھی جو ایسے موقعوں پر رنگ دکھاتی تھی۔ اس کا اصل مظاہرہ تو لوگوں نے اس وقت دیکھا جب ادبیات پاکستان کی ایک اہل قلم کانفرنس میں اس کی ملاقات صدر مملکت سے کروائی گئی۔ اس نے ایسی بے تکلفی سے ان سے گفتگو کی جیسے کہہ رہا ہو تم اگر صدر مملکت ہو تو میں صدر مملکت ادب ہوں۔ دونوں ہم منصب ہیں پھر خوشامد یا خوف کیسا۔ یہ بے خوفی اس کے علم نے اسے عطا کی تھی۔

ایک مرتبہ ن۔ م۔ راشد سرگودھا آئے تو ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ منتظمین کو افسوس ہو رہا تھا کہ غلام جیلانی اس وقت سرگودھا میں نہیں۔ لوگ ایک اچھی تقریر سے محروم رہ جائیں گے۔

وہ اسی شام تلہ گنگ سے واپس آیا۔ آتے ہی اس نے تقریب کی بابت سنا تو جلسہ گاہ میں پہنچ گیا۔ اسٹیج سیکریٹری کی اس پر نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی تقریر کے بلا لیا۔ سب کو معلوم تھا کہ اسے اچانک بلا لیا گیا ہے۔ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے۔ تقریر تیار بھی نہیں کی ہوگی چند جملے رسمی سے کہہ کر اتر آئیں گے لیکن جب وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا تو تقریر ایسی معرکہ آرا تھی کہ لوگ دم بخود رہ گئے۔ اپنی ہر دلیل کے جواب میں راشد کی نظموں کے اقتباسات پیش کرتا جا رہا تھا جیسے لکھ کر لایا ہو۔ جدید نظم کے تناظر میں راشد کی شاعری پر ایسی پر مغز تقریر کی کہ خود راشد جھوم اٹھے۔ تقریر ختم ہوئی تو انہوں نے برسر محفل اعتراف کیا۔

"جدید اردو نظم پر ایسی پُر مغز تقریر میں نے پہلے بھی نہیں سنی۔ میں اس نوجوان مقرر کے مطالعے سے متاثر بھی ہوا ہوں اور مرعوب بھی۔"

"نوجوان مقرر" کے الفاظ پر محفل میں ایسا قہقہہ بلند ہوا کہ راشد سوچنے لگے کہ اس میں قہقہے کی کیا بات تھی لیکن جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو خود بھی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ غلام جیلانی اس وقت اپنی عمر کی پچاس سے زیادہ بہاریں دیکھ چکا تھا لیکن اپنے گٹھی جسم، میانہ قد اور اچھی صحت کی بدولت ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا راشد کا خیال تھا۔

ایسا ہی دھوکا ایک مرتبہ صاحب اسلوب مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کو ہوا تھا جب انہوں نے ایک مجلس میں اسے نوجوان مزاح نگار کہا۔ غلام جیلانی نے برجستہ کہا۔

"آپ واقعی صاحب نظر ہیں۔"

اس کی اچھی صحت کا راز یہ تھا کہ پیدل چلنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک مرتبہ کار خرید بھی لی تھی اور سیکھنے کے شوق میں چلانے کی مشق بھی کر لی تھی لیکن اس کار سے اسے یہ شکایت تھی کہ چلتی بہت تیز ہے۔ بھلا اس بات کا کسی کے پاس کوئی جواب تھا۔ دو چار مرتبہ کھمبوں سے ٹکرانے کے بعد وہ پھر زمین پر اتر آیا۔ کار سے نجات حاصل کر لی۔

"بھئی کار میں بیٹھنے والے کا ناتا زمین سے ٹوٹ جاتا ہے۔"

زمین سے ناتا جوڑے رکھنے کا خیال اتنا تھا کہ صوفے پر بیٹھنا ہوتا تو جوتے اتار کر اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھ دیتا۔ وہ سارے جہاں میں گھومتا لیکن شام کو کسی کبوتر کی طرح اپنی چھتری پر اتر آتا یعنی وزیر آغا کی رہائش گاہ پر۔ اس ادبی محفل کے بارے میں اس نے خود ایک جگہ لکھا۔

"یہ ایک بے تکلف سی بیٹھک ہوتی۔ عام سی باتیں ہوتیں مختلف ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر بحث بھی ہوتی۔ لطیفے بھی ہوتے لیکن ان باتوں کا مزاج بہت دوستانہ ہوتا۔ ان کو ادبی معرکوں سے موسوم کرنا غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ جب اردو ادب میں معرکوں کا ذکر ہوتا ہے تو ان سے آتش و ناسخ،

انیس اور دبیر کے باہمی اختلافات کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارا مل بیٹھنا ایک تخلیقی عمل ہوتا تھا جس میں شعر بھی ہوتے تھے۔ تنقیدی مباحث بھی اور خوش گپیاں بھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی ایسی متنازعہ بات کی جائے جس سے رنجش محفل میں کسی بدمزگی پیدا ہو۔"

☆☆☆

تنقید کا جوہر اس کی ذات میں کہیں گم تھا۔ یہ جوہر تقریروں میں تو ظاہر ہوتا تھا لیکن تحریروں میں ظاہر ہو یہ نوبت نہیں آئی تھی۔ اس نے اپنا سفر شاعری سے شروع کیا تھا اور انشائیہ تک آیا تھا لیکن بے پناہ مطالعہ کا تقاضا تھا کہ وہ ادب پاروں کی تنقید کا فریضہ بھی انجام دے۔ اس کے لیے ٹک کر بیٹھنا ضروری تھا اور وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ کلاس میں وقت گزارتا یا دوستوں کی محفل میں۔ اس لیے... ایک لمبے عرصے تک تنقید نگاری اس کی شخصیت کا حصہ نہ بن سکی۔ کتابی ماخذات اس کے سینے میں محفوظ تھے جنہیں وہ کلاس روم میں نچھاور کرتا رہتا تھا یا ادبی تقریبات میں فیاضی سے لٹاتا تھا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جب "اوراق" جاری کیا تو اس میں "سوال یہ ہے" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا۔ ان کی نظروں سے غلام جیلانی کا تنقیدی جوہر چھپا ہوا نہیں تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ غلام جیلانی کے لیے ٹک کر بیٹھنا اور مضمون مکمل کرنا کار دارد ہے مگر انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اگر اسے چھیڑ دیا جائے تو اسے آمادہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی بالغ نظری سے ہزاروں قارئین کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ وزیر آغا نے اسے اکسانا شروع کیا۔ نتیجہ یہی نکلا۔

"ارے صاحب تنقید نگاری بڑے عالم فاضل لوگوں کا کام ہے۔ میری تحریریں کون پڑھے گا؟"

"آپ سے تحریر کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔ آپ جو تقریریں کرتے ہیں انہی کو کاغذ پر اتار دیں۔ یہی وہ مضامین ہوں گے جو میں "اوراق" میں چھاپوں گا۔"

"رسالے سے دل بھر گیا ہے تو اور بات ہے ورنہ میری تحریروں سے تمہارے رسالے کا بھلا تو ہونے سے رہا۔ اس کے برعکس تنازعے اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

"کچھ سوال اٹھیں گے آپ اسے تنازع کیوں کہہ رہے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب دینے میں ہی تو ادب کی زندگی ہے۔"

"میں نے بڑی مشکل سے چند دوست جمع کیے

آزرزوبی

(1922-2001) پاکستانی مصور، عنایت اللہ نام، قصور پنجاب میں پیدا ہوئے۔ میو اسکول آف آرٹس (اب نیشنل کالج آف آرٹس) لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ 1950ء میں اٹلی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، اور تین سال میو انسٹی ٹیوٹ روم میں آرٹس کی تعلیم دی۔ علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے کلام کو مصور کیا۔ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ متعدد ممالک میں ان کے شہ پاروں کی نمائش ہو چکی ہے۔ 1970ء میں اکیڈمی آف اپلائیڈ آرٹس کراچی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مرسلہ: ناہید فاطمہ، کراچی

ہیں۔ آپ انہیں میرا مخالف بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"اگر ہوگی تو ادبی مخالفت ہوگی۔ ذاتی دشمنی تو ہوگی نہیں جو دوستیوں پر حرف آئے۔ آپ اپنا موقف پیش کریں گے، کچھ اور دوست اپنا خیال پیش کریں گے۔"

"بھائی میں کیا اور میرا موقف کیا۔ مجھے کیوں کانٹوں پر گھسیٹتے ہو؟"

"عاجزی ایک حد تک ہی اچھی ہوتی ہے۔ آپ کا سینہ ادب کا خزینہ ہے۔ آپ اس خزانے کو لٹانے میں کنجوسی اختیار نہ کریں تو ادب کی ترقی کے لیے کتنا اچھا ہو۔ آپ شاعر ہیں، انشائیہ نگار ہیں میں چاہتا ہوں آپ تنقید نگاروں کی صف میں بھی کھڑے ہو جائیں۔ آپ کیسے کیسے گوہر نایاب تقریروں اور نجی محفلوں میں لٹاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ان سب کو تحریر میں آنا چاہیے۔"

"دوستوں کی میں نے کبھی کوئی بات نہیں ٹالی۔ آپ کہتے ہیں تو آپ کی خاطر لکھنے کو تیار ہوں۔ کیسے کیا سوال ہے، کیا لکھنا ہے؟"

مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وزیر آغا نے انہیں "اوراق" میں شائع کر کے اردو دنیا کے طول و عرض میں پھیلا دیا۔

یہ مضامین ہی اس کا کل اثاثہ تنقید ہیں لیکن ان میں جو خیالات پیش ہوئے۔ مغربی حوالوں سے جس طرح انہیں مزین کیا گیا پھر جس طرح ان حوالوں کی مدد سے اپنی ایک رائے متعین کی گئی۔ قاری کی انفرادی سوچ کو برانگیختہ کیا گیا۔ الجھی ہوئی آرا کو سلجھایا گیا۔ سب سے بڑھ کر یہ

مضامین ایک دلکش اسلوب میں تحریر کیے گئے اور تنقید کی خشکی کو رواں اور دلکش اسلوب کا پیراہن عطا کیا اس سے یہ مضامین بہترین تنقیدی مضامین بن گئے اور غلام جیلانی کو معتبر نقادوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

ان مضامین سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مصنف غیر ملکی دانش وروں اور مصنفوں کے حوالے سے ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے بلکہ ہمیں اپنے مطالعے کے نتائج سے آگاہ کر رہا ہے مثلاً اپنے مقالے ''اسلوب کیا ہے'' میں اس نے کئی مغربی فنکاروں کی مثالیں دی ہیں لیکن نہ تو وہ ان سے مرعوب ہے اور نہ ان کے لمبے لمبے اقتباسات دے کر صفحے ضائع کیے ہیں۔ محض نام لینے پر اکتفا کیا ہے اور بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

''فارم یا ہیئت کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو اگر اس کے پیچھے خیال موجود نہیں تو وہ آزادانہ طور پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس طرح خیال اپنی تمام تر ندرت اور منطق کے باوصف اس وقت تک قابلِ قبول نہیں ہوتا جب تک اسے موزوں ہیئت نہ ملے۔ ''لاک'' کے یہاں خیال کی جدت تو ہے لیکن اس کی تحریر میں اسلوب کی کمی ہے۔ اس کے برعکس ''برکلے'' کی تحریر میں خیال کی جدت کے ساتھ ساتھ اسلوب کی تازگی بھی موجود ہے۔ تقابلی مطالعہ میں بطور فنکار ہم برکلے کو لاک پر فوقیت دیتے ہیں حالانکہ جہاں تک مطالعے کی بنیادی صحت کا تعلق ہے وہ دونوں میں ایک مشترک حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ اسلوب کا اپنا ایک کردار تو ہے لیکن بقول ''اد تریٹی'' اس میں خیالات کے بنیادی عنصر کا ہونا ضروری ہے۔''

اس اقتباس میں نہایت اختصار سے تین مغربی مصنفین کے خیالات بیان کردیے اور ان مثالوں سے اپنے نقطہ نظر کو بھی بیان کردیا اور کس سہولت سے۔

وہ انگریزی کا پروفیسر تھا لیکن اردو پر بھی اسے مکمل عبور حاصل تھا اور چونکہ انگریزی سے مرعوب نہیں تھا لہٰذا حسبِ ضرورت اپنی بات کو سمجھانے کے لیے اردو کے مصنفین کے بھی بے دریغ حوالے دیتا جاتا تھا۔

''ہم یہ جان سکتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے ایسا کیوں لکھا اور سرسید کا اسٹائل (اسلوب) مہدی افادی سے کیوں جداگانہ ہے اور اختر شیرانی، اقبال سے مختلف اسلوب میں اپنا اظہار کیوں کرتا ہے اور شاکر علی کی تصویروں کے خطوط اتنے تراشیدہ کیوں نہیں جتنے کہ عبدالرحمن چغتائی کی تصویروں میں ہیں۔''

اس کی تنقید صرف ''اوراق'' کے سلسلۂ مضامین تک محدود تھی لیکن مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی تھی اور وہ ہر موضوع کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔

ایک تو وہ ناقد ہوتے ہیں جو صرف ناقد ہوتے ہیں لیکن وہ چونکہ تخلیق کار بھی تھا لہٰذا اس کی تنقید زیادہ معتبر ہوگئی تھی۔

اگر ان دیباچوں کو بھی شامل کرلیا جائے جو غلام جیلانی نے مختلف کتابوں کے لیے تحریر کیے تو ان کے تنقیدی کام کی تعداد میں کچھ اور اضافہ ہوجاتا ہے کیونکہ دیباچہ نگاری بھی تنقید کا ایک شعبہ ہی ہے۔ دیباچہ نگار نہ کڑا نقاد ہوتا ہے اور نہ محتسب۔ اسے ہمدرد نقاد کہہ سکتے ہیں۔ وہ کتاب کے ساتھ ساتھ مصنف کا تعارف بھی کرواتا ہے اور کتاب کے موضوع کا تعارف اس انداز میں کرواتا ہے کہ کتاب پڑھنے کی ترغیب ہو۔ یہ دراصل تنقید سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔

غلام جیلانی کی شہرت اور تخلیقی و علمی حیثیت اس بات کی متقاضی تھی کہ مصنفین اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھوانے کے لیے رجوع کریں۔

غلام جیلانی نے جو دیباچے لکھے وہ اس ٹیکنیک کے مطابق لکھے کہ پہلے مصنف کی شخصیت اور اس سے اپنے تعلق کا اظہار کیا اور اس کے بعد کتاب کے موضوعات کا جوہر اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا، اس ہمدردی کے ساتھ کہ قاری کتاب خریدنے یا پڑھنے پر مجبور ہوجائے۔ اس ہمدردی کے پیچھے کوئی فرمائش کارفرما نہیں ہوتی بلکہ ایک نرم تجزیاتی عمل سے ایک ادبی فضا کا اہتمام کرتا ہے۔

اکثر دیباچہ نگار دیباچے میں وہ لکھتے ہیں جو مصنف چاہتا ہے لیکن غلام جیلانی نے اول تو پیشہ ور دیباچہ نگاروں کی طرح زیادہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور جن پر دیباچے لکھے وہ وہی کتابیں تھیں جنہیں وہ خود بھی پسند کرتا تھا۔ اس کے تمام دیباچے قاری اور کتاب کے درمیان ایک پل کا کام کرنے کے لیے لکھے گئے۔

غلام جیلانی ان لوگوں میں سے نہیں تھا جن کا ذوق مطالعہ کسی ایک جگہ آکر رک جاتا ہے۔ وہ ادب کی تمام تر منزلیں طے کرنے کے بعد بھی مطالعہ کتب کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ کتابیں نہ صرف یہ کہ خود پڑھتا بلکہ جب کوئی نئی کتاب پڑھتا تو اس کا ذکر دوستوں سے ضرور کرتا اور انہیں بھی پڑھنے کی ترغیب دیتا۔ اس کتاب کے ایک ایک پہلو پر سیر

حاصل بحث کرتا۔ یہی اس کی تبصرہ نگاری کی ابتدا تھی پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ وہ ان زبانی تبصروں کو ضبطِ تحریر میں لانے لگا۔

تبصرہ دراصل تنقید ہی کا ایک پہلو ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے ''تاثراتی تنقید'' کہہ سکتے ہیں جس میں تبصرہ نگار اختصار کے ساتھ اپنی جچی تلی رائے کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے جو تبصرے سامنے آئے ان میں یہ بات نمایاں تھی کہ پیشِ نظر کتاب کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سابقہ مطالعے کی کرنیں بھی بکھیرتا رہتا ہے۔ کبھی مصنف ہی کی سابقہ کتب کا حوالہ دے کر مصنف کے فکری ارتقا پر بحث کرتا ہے۔ کبھی کسی اور مصنف کی کسی کتاب کا حوالہ دے کر زیرِ نظر تبصرہ کتاب سے اس کا رشتہ جوڑتا ہے۔ اس طرح پڑھنے والے کو ایک کتاب پر تبصرہ پڑھتے ہوئے کئی کتابوں اور مصنفین سے واقفیت ہوجاتی ہے یا خود پیشِ نظر کتاب کے مصنف کے ارتقائی عمل سے آگاہی ہوجاتی ہے۔

تبصرہ نگاری اس کے لیے ایک آزاد عمل تھا۔ وہ کسی کتاب کو پڑھتا اس پر تبصرہ لکھنے بیٹھتا پھر اس کا قلم اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا اور دائرہ سا بناکر اسی نقطۂ آغاز سے آکر مل جاتا جہاں سے آغاز کیا گیا تھا۔ دائرہ بنانے کی یہ کوشش بہت شعوری تھی اس لیے... بات سے بات نکالنے کے باوجود بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔

ان تبصروں میں اس کا اسلوب بھی معرکے کی چیز ہے۔ وہ تبصرہ شروع کرتا ہے اور پھر انشائیے کی طرح اسے پھیلانا شروع کردیتا ہے۔ اس نے اسلوب کے اعتبار سے بھی تبصرے اور انشائیہ کو ملادیا ہے۔

تبصرہ پڑھتے پڑھتے اچانک احساس ہوتا ہے کہ ہم کوئی انشائیہ پڑھ رہے ہیں۔

''میں نے کتاب ''فکر و خیال'' کا مطالعہ خود اپنی تحریر سے شروع کیا پھر پہلے مضمون کا ابتدائی حصہ پڑھا اور پانچویں سطر سے فوراً دوسرے مضمون کے وسط میں پہنچ گیا پھر مجھے غالب کے شعور مرگ نے اپنی طرف متوجہ کرلیا اور جب میں موت کے معین دن تک پہنچا تو میں نے الٹی زقند بھری اور مصنف کے ساتھ فسانوں کے دیہات میں گھومنے لگا۔ یہاں میں قاش قاش ہوکر جونت سنگھ، احمد ندیم قاسمی اور جمیلہ ہاشمی کے درمیان بٹ گیا۔ میں دن بھر قند پارسی اور دربارِ اکبری کے درمیان معلق رہا۔ ابھی میں اس کیفیت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیسری آنکھ کے شاعر نے دوزخ کی دیوار سے اونچا اٹھا کر مجھے اچک لیا اور میں دن بھر راجا مہدی علی خان کی رفاقت میں رہا۔ حسنِ اتفاق سے دوزخ میں میرا قیام زیادہ طویل نہیں رہا۔

میری اس ہذیانی کیفیت سے آپ کو موضوعات کے تنوع اور حسنِ موضوع کی بوقلمونی کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔ اس تنوع سے ہٹ کر تحریر کا اسلوب اس سے کہیں زیادہ جاذب اور دلکش ہے۔''

اس کے ان تبصروں کو اگر ''تنقیدی انشائیے'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے زیادہ کتابوں پر تبصرے نہیں لکھے شاید اس لیے کہ ایسی تحریریں روز روز نہیں لکھی جاتیں۔

تبصرہ تو کتابوں کی خاکہ نگاری ہے۔ ایک چیز شخصی خاکہ نگاری بھی ہوتی ہے جسے ''سوانح'' کا ذیلی حصہ سمجھنا چاہیے۔ سوانح میں کسی شخص کی مکمل زندگی بند ہوتی ہے۔ خاکہ اس زندگی کے کسی ایک حصے کو پیش کرنے کا نام... ہے۔ ظاہر ہے اختصار اور طوالت خود بخود پیدا ہوجائے گی۔ خاکہ نگاری کی کامیابی یہ ہے کہ ہیرو کی زندگی کے چند واقعات اس جامعیت سے بیان کردے کہ اس کی پوری شخصیت کا احاطہ ہوجائے۔

غلام جیلانی مجلسی آدمی تھا۔ کثرتِ احباب کا قائل تھا۔ مشاہدے کی قوت بھی رکھتا تھا اور تنقیدی نظر بھی پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ان احباب میں سے بعض پر خاکے لکھ کر انہیں تحسین پیش نہ کرے لہٰذا اس نے خاکے لکھے اور خاکہ نگاروں میں بھی اپنا نام لکھوایا۔

ان خاکوں میں اسے مزاح نگاری کا بھرپور موقع ملا جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس شگفتہ نثر نے ان خاکوں کو نہایت پُرلطف بنادیا۔

وہ دوست کی خامیوں کو اچھالنے کے بجائے اس کی خوبیوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ اسے غلام جیلانی کی کمزوری بھی کہا جاسکتا ہے اور شخصی خوبی بھی۔

اگر کسی کمی کا ذکر کرنا بھی ہے تو اس ہنر سے کہ بات مذاق میں ٹل جاتی ہے۔

''سجاد نقوی نے پچھلے پچاس سال کا افسانوی ادب پڑھ لیا ہے جو اس نے نہیں پڑھا اس کا نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔ مجھے اس کے مطالعے کی رفتار سے یہ ڈر ہے کہ اگر وہ اسی طرح پڑھتا رہا تو وہ آیندہ پچاس سال کا ادب وقت سے پہلے پڑھ کر فارغ ہوجائے گا۔''

ایک ''خود نوشت خاکہ'' بھی لکھا جس میں اپنی شخصیت کو مزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر پیش کیا۔

"میں ایک متوسط خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے متوسط خاندانوں کے چشم و چراغ ہوتے ہیں۔ میں جب پیدا ہوا تو بہت چھوٹا تھا۔ اس لیے وثوق سے بتا نہیں سکتا کہ میری شکل و صورت کیسی تھی لیکن جب ذرا بڑا ہوا اور مجھے اپنے آپ کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر میں کسی اور خاندان میں پیدا ہوتا تو میری شکل و صورت مختلف یا کم از کم بہتر ہوتی۔" (میری امر کہانی)

غلام جیلانی کی ایک حیثیت "خط نگار" کی بھی تھی۔

خط نگاری ایک نجی فعل ہے لیکن اب اس نے بھی ادب کی ایک صنف کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ خطوطِ غالب سے پہلے بھی خطوط محض خطوط ہوا کرتے تھے لیکن غالب کے خطوں میں کچھ ایسی ادبی خصوصیات جمع ہوگئیں کہ انہیں بھی اردو نثر کے شاہکار کی طرح پڑھا گیا۔ اس کے بعد اردو ادب کے ہر بڑے آدمی کے خطوط شائع ہوتے رہے اور ان پر لمبی چوڑی بحثیں ہوتی رہیں۔

نثر لکھنا سب جانتے ہیں لیکن خط لکھنا ایک عطیۂ خداوندی ہے۔ یہ فطری جذبہ غلام جیلانی کو بڑی فیاضی سے عطا کیا گیا تھا۔ وہ اچھی گفتگو کا بادشاہ تھا۔ اس کا یہی اندازِ گفتگو اس کے خطوط میں در آیا۔ افسوس یہ ہے کہ احباب کی کثرت کی وجہ سے اسے کثرت سے خطوط لکھنے پڑتے تھے لیکن ان خطوط کو محفوظ نہیں کیا گیا ورنہ مشاہیر کے خطوط میں اس کے خطوط کو نہایت اہم جگہ ملتی کیونکہ اس کے خطوط نجی ہوتے ہوئے بھی تخلیقی حس کی بیداری کا مرقع ہوتے تھے۔ ذاتی نوعیت کو ادبی افادیت سے ملانے کے حامل ہوتے تھے۔

غالب کے نجی خطوط اس لیے ادب کا حصہ بن گئے کہ ان میں ادبی لطافت موجود تھی۔ غلام جیلانی کے خطوط بھی ادبی لطافت کا مظہر تھے۔

غالب کے لیے بھی کہا جاتا ہے کہ جب 1857ء کی جنگ آزادی کی ہنگامہ آرائی کے بعد ان کے بہت سے دوست ان سے دور ہوگئے تو انہوں نے خطوں کا سہارا لیا۔ وہ فرض کرلیا کرتے تھے کہ ان کا فلاں دوست ان کے پاس بیٹھا ہے اور وہ اس سے باتیں کررہے ہیں۔ غالب نے اسی لیے تو کہا تھا۔ "میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔" غلام جیلانی کا بھی یہی عالم ہے۔ جب تنہائی حملہ آور ہوتی تو وہ دوستوں کی انجمن میں دوستوں سے باتیں کرنے لگتا۔

"کل ہمدانی صاحب آئے تھے۔ مختصر ملاقات کے لیے۔ تمام عرصہ آپ (پروفیسر آغا جلیل) ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ آپ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ دو معقول انسان آپ سے بہتر کوئی موضوعِ سخن تلاش ہی نہ کرسکے۔"

غلام جیلانی کے ساتھ بھی غالب کی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ جب تک ملازمت تھی سرکاری نوعیت کے خطوط کے سوا کچھ لکھنے کی نوبت نہ آئی تھی لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد (گویا جنگ آزادی کے بعد) اور خاص طور پر بڑھاپے کی کمزوری کے باعث دوستوں سے ملنا جلنا کم ہوگیا تو خط لکھنا اس کا معمول بن گیا۔

وہ بے کار آدمی نہیں تھا کہ بے کار گفتگو کرتا۔ اس کے خطوط میں عام سی باتیں ضرور ہیں لیکن بے ہنگم نہیں۔ بے تکلفی کی فضا میں دانش کی ایک لکیر سی کھنچتی چلی جاتی ہے۔

"اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عمل بنیادی طور پر جتنا ضروری ہے، اتنا ہی بے سود ہے۔ اس سے مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنی کوشش یا کاوش کم کردے بلکہ یہ ہے کہ کوشش کے ساتھ اپنے ایمان کو بھی شامل کرلے کیونکہ کامیابی اور ناکامی کا منبع اور مصدر ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔"

غالب کو حیوانِ ظریف سمجھا جاتا تھا۔ ان کے مزاج کی خوبی ان کے خطوط میں خوب ابھرتی تھی۔ غلام جیلانی کے خطوط میں بھی یہ مواقع اکثر آتے ہیں۔

"سرگودھا میں رہنے کا ایک خاص فائدہ ہوا ہے۔ آیندہ زندگی میں اگر مجھے کسی خاص مصلحت کے پیشِ نظر جنت میں نہ بھجوایا جاسکا تو جہنم میں صرف نامناسب خوراک کی شکایت ہوگی۔ موسم کی شکایت نہیں ہوگی۔"

اس کے خطوط انشائیہ بھی ہیں، تبصرے بھی، ادبی تنقید بھی، خودنوشت بھی۔ افسوس کہ ان خطوط کو سنبھال کر نہیں رکھا گیا۔ انہیں شائع ہونا چاہیے تھا۔

☆☆☆

ہر سرکاری ملازم کو ریٹائرمنٹ کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اسے بھی بھری جوانی میں ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ کر 1978ء میں ریٹائر کردیا گیا۔ ابھی کل کی بات تھی کہ مشتاق احمد یوسفی نے اسے "نوجوان مزاح نگار" کہا تھا مگر سرکار بڑی بے درد ہے۔ اسے ساٹھ سال کا قرار دے کر ریٹائر کردیا۔

اس نے سیکڑوں نادانیاں کی ہوں گی لیکن ایک عقل مندی کا کام بھی کیا تھا۔ سرگودھا میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرلیا تھا۔ وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس نئے گھر میں منتقل ہوگیا۔ یہ کنبہ مزید وسیع اس لیے ہوگیا تھا کہ اس کے والد بھی [illegible] سے آکر اس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔

یہ مکان نہایت ہوادار تھا۔ ہر طرف گھاس کا مخملیں فرش بچھا ہوا تھا اور متعدد اقسام کے پھولوں سے آراستہ تھا۔ ان پھولوں کی دیکھ بھال وہ خود کیا کرتا تھا۔ فرصت ہی فرصت تھی لہٰذا پھولوں کا منہ دھلاتے رہنا اس کا مشغلہ ہوگیا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر وزیر آغا اس سے ملنے اس کے نئے کوٹھی نما مکان پر پہنچے۔ گیٹ کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھے مالی کو کپڑے اتارے جانگیا پہنے کیاری میں بیٹھے دیکھا۔ آغا صاحب نے اس سے کہا، جیلانی صاحب کو اطلاع دو کہ آغا جی آئے ہیں۔ بوڑھے مالی نے سر اٹھایا۔ کیاری سے نکلا اور لپک کر وزیر آغا سے لپٹ گیا۔ تب پتا چلا کہ یہ تو خود جیلانی ہے۔

جب پھول اچھی طرح خوشبو دینے لگے۔ بیٹے اپنے اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور چلے گئے۔ تنہائی کاٹنے کے لیے اس نے اپنے شاگردوں پر گھر کے دروازے کھول دیے۔ شام کو احباب جمع ہوتے اور ادب کی گتھیوں کی گرہیں کھولی جاتیں۔

اب اس کا معمول یہ ہوگیا تھا۔ صبح سیر کے لیے نکل جاتا۔ دن کے وقت کالج کے طلبہ آجاتے۔ شام کو یا تو اس کے گھر دوستوں کی محفل جمتی یا وہ خود وزیر آغا کی محفلِ دوستاں میں پہنچ جاتا۔

عمر بھر شاعری کی تھی۔ انشائیے لکھے تھے، خاکے تراشے تھے۔ تنقیدی مضامین تحریر کیے تھے۔ دانش کے جتنے جوہر تقریروں میں بکھر گئے تھے وہ تو اپنی جگہ لیکن تحریری سرمایہ بھی کم نہیں تھا لیکن طبیعت ایسی بے نیاز پائی تھی کہ وسائل ہونے کے باوجود کوئی کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی تھی۔ اس کے شاگردوں کے مجموعے شائع ہوچکے تھے لیکن وہ ابھی تک صاحبِ کتاب نہیں تھا۔ دوستوں نے اسے خالی بیٹھے دیکھا تو اصرار کیا کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرے۔ نیکی آدمی کی کاہلی نے اس اصرار پر کان نہ دھرے۔ بالآخر دوستوں نے خود یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ منظوری اس کی تھی محنت دوستوں کی۔

چالیس غزلوں اور چوبیس نظموں کا ایک مجموعہ مرتب ہوگیا۔ مناجات، نعتیں اور چند قومی نظمیں بھی تھیں۔

یہ سرمایہ جمع ہوگیا تو مجموعے کا نام رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ دوستوں نے ہاتھ اٹھا لیے کہ نام خود جیلانی صاحب رکھیں گے۔

غالباً 1952ء کا ذکر ہے سہگل خاندان کے ایک بڑے صاحب، حبیب جالب مرحوم کے فن سے بے حد متاثر ہوئے اور جالب مرحوم کو اپنے پارچہ بافی کے کارخانے میں ملازم رکھ لیا۔ یہ کارخانہ لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں (کوہ نور ملز) تھا اب بھی ہوگا۔ کچھ دن گزرے تو سہگل خاندان کے بڑے صاحب جو بہرحال مالک تھے جالب مرحوم سے روایتی سلوک پر اتر آئے۔ جالب مرحوم فطری طور پر آزاد منش اور درویش آدمی تھے کسی سے دب کے رہنا ان کے مسلک میں تھا ہی نہیں کہ صاحبِ ایمان فن کار تھے۔ کارخانے میں حسبِ معمول ماہانہ مشاعرے کا انعقاد ہوا تو پنڈال میں سب سے اگلی نشست پر بڑے صاحب جلوہ فرما تھے۔ پنڈال کے عقب میں بڑے صاحب کی کوٹھی بھی سر اٹھائے کھڑی تھی۔ حبیب جالب مرحوم کی باری آئی تو شاعرِ شمشاد قداں کی بے باک آواز بھرپور انداز میں چہار جانب گونج اٹھی۔

شعر ہوتا ہے اب مہینوں میں
زندگی ڈھل گئی مشینوں میں

دوسرا شعر بڑے صاحب اور اس کی کوٹھی کی طرف اشارہ کرکے ادا کیا کچھ اس طمطراق سے کہ پورا جلسہ دم بخود رہ گیا۔

پیار کی روشنی نہیں ملتی
ان مکانوں میں ان مکینوں میں

نتیجتاً دوسرے روز جالب مرحوم فارغ کردیے گئے۔ دوستوں کے استفسار پر جالب مرحوم نے صرف اتنا ہی کہا۔ "ہاں، یارو آزاد ہوگیا ہوں۔" جالب مرحوم یقیناً جرأتِ ایمانی سے مالا مال تھے۔ عمر بھر طاغوت کے آگے ڈٹے رہے اور خود کو امر کرگئے۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

غلام جیلانی ان لوگوں میں سے تھا جو بچے کے نام کو بچے پر فوقیت دیتے ہیں۔ اس نے نہایت منفرد نام تجویز کیا۔

''مجموعے کا نام رکھیے ''میں اور میں۔''

''یہ کیا نام ہوا۔ میں اور تو ہوتا تو پھر بھی کچھ تھا؟''

''اس نام کی معنویت پر ذرا غور کیجیے۔'' غلام جیلانی نے اصرار کیا۔ ''پہلا 'میں' میری شناخت ہے اور دوسری 'میں' میرا وہ سیلف (self) ہے جو تنہائی کے لمحوں میں میرے خارجی سیلف پر غالب آجاتا ہے۔''

اس کی وضاحت کے باوجود یہ نام کئی دنوں تک دوستوں کے درمیان زیرِ بحث رہا۔ بات جب ڈاکٹر سید عبداللہ تک پہنچی تو انہوں نے اس نام کی تعریف کی۔

''میں اور میں نہایت عمدہ نام ہے۔ شاید احباب یا ناشر کی نظر اس کے فکری مطالب پر نہیں پڑی۔'' یہ مجموعہ شائع ہوا تو بھی اس کے منفرد نام ''میں اور میں'' پر گفتگو جاری رہی اور اس عنوان ہی سے اس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔

غزلوں کا مجموعہ سپردِ قارئین کرنے کے بعد وہ نظموں کی طرف زیادہ متوجہ رہا۔ یہ نظمیں ''اوراق، تخلیق اور صریر'' جیسے ممتاز ادبی رسائل کی زینت بنتی رہیں۔

پہلے مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی نے اسے حوصلہ مند کردیا تھا۔ 2002ء میں پہلے مجموعے کے تقریباً پندرہ سولہ سال بعد اس نے دوسرا مجموعہ ''اک ذرا شام سے پہلے'' پیش کیا۔ اس میں ستر سے زیادہ نظمیں شامل تھیں۔

شاعری سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے انشائیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ تیس سال کے عرصے میں اس نے بیس انشائیے تحریر کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ان پر کتنی محنت کی ہوگی۔ صرف نوک پلک سنوارنے میں کتنا وقت لگایا ہوگا اور صبر کتنا کہ تیس سال تک انہیں شائع کرنے کا خیال تک نہیں آیا۔ بہرحال ایک کتاب... انشائیوں کی مرتب ہوگئی جولاہور سے شائع ہوئی۔

مرزا اسداللہ خاں غالب کی برسی منائی جارہی تھی۔ غلام جیلانی ''سرگودھا اکادمی'' کا معتمد تھا۔ اس نے غالب کے بارے میں مضامین نظم ونثر کا ایک انتخاب مرتب کیا جو اس موقع پر اُدبا وشعرائے سرگودھا نے لکھے تھے۔ یہ مضامین ''نذرِ غالب'' کے عنوان سے سرگودھا اکادمی نے شائع کیے۔

غلام جیلانی کی مرتب کردہ اس کتاب کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں غالب کے فکروفن اور احوال وآثار پر مشتمل آٹھ مضامین تھے جبکہ دوسرے حصے میں غالب کی زمین میں شعرا کی غزلیں شامل کی گئی تھیں۔

غلام جیلانی نے یہ طرحی غزل لکھی تھی

اِک ترے ترکِ تعلق سے بھی کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے
سی لیے ہونٹ بھی توقیرِ وفا کی خاطر
سانس لیتے ہیں تو یاروں کو گلہ ہوتا ہے
موجِ گرداب میں لے آؤ سفینے اپنے
صرف ساحل سے بھی کیا لطفِ دعا ہوتا ہے
آج رو لینے دے جی بھر کے مجھے شامِ فراق
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆

سرگودھا اکادمی ہی کے زیرِ اہتمام انور سدید کی معاونت سے اس نے ''بہترین ادب'' کے تحت ان تحریروں کو یکجا کرکے شائع کیا جن میں زندہ رہنے کی سکت تھی۔

اس کتاب کو جب تحسین آمیز نظروں سے دیکھا گیا تو دو سال بعد ایک اور انتخاب شائع کیا۔ اس انتخاب کو بھی ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ وہ افسانے، نظمیں، غزلیں، مقالات جو رسائل میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے یکجا ہوگئے۔

☆☆☆

والد کا انتقال پہلے ہی ہوچکا تھا لیکن جب بیوی کی وفات ہوئی تو صدمے کے ساتھ ساتھ کبھی نہ ختم ہونے والی تنہائی نے اسے گھیرلیا۔ بیوی کی ضرورت جوانی میں نہیں بڑھاپے میں ہوتی ہے۔ یہ تنہائی اس کی رگوں میں اترنے لگی۔ کب کی سنبھالی ہوئی صحت میں گھن لگنے لگا۔ اب اس کی فطری شوخی کبھی کبھی ہی رنگ دکھاتی تھی ورنہ مسلسل خاموشی اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ گھر میں بند ہوکر بیٹھ گیا۔ دوست خود اس سے ملنے چلے آتے تھے پھر ایک دن اس نے چادر کی سیاہی سپیدی میں تبدیل کی اور ''شامِ دوستاں'' میں جا پہنچا۔ دوستوں نے سکھ کا سانس لیا کہ وہ خانۂ حزیں سے نکلا تو سہی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دوستوں میں تھا اور خاموش تھا۔ دوست پھر بھی مطمئن تھے۔

وہ اسی طرح ہر شام دوستوں کی محفل میں جاکر بیٹھتا رہا۔ اندر ہی اندر اس کا علاج ہوتا رہا۔ اس نے وقت کے ساتھ ساتھ مفاہمت کرلی۔

زخم مندمل بھی ہوجائے تو زخم کی جگہ بہت دن تک دکھتی رہتی ہے۔ یہی حال اس کا تھا۔ صدمے کو برداشت کرنے کی قوت آگئی لیکن کرب کی کیفیت ختم نہ ہوئی۔ وقت کاٹنا مشکل ہوگیا۔

وہ ایک روز اسی کرب کے عالم میں بیٹھا تھا۔ سوچا وقت گزاری کے لیے کسی کتاب کی ورق گردانی کرلی جائے۔

وہ کتابوں کی الماری کے پاس پہنچا۔ ہونے والی بات کہ ایک شاعرہ نجمہ منصور کی نثری نظموں کا مجموعہ ''اگر نظموں کے پر ہوتے'' اس کے ہاتھ میں آگیا۔ وہ نثری نظموں کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے تو یہ تک لکھا تھا ''میں نثری نظم کو باقاعدہ شاعری کی صنف نہیں سمجھتا۔''

ان خیالات کے باوجود اس کتاب میں کچھ کشش محسوس ہوئی۔ اس نے کتاب ہاتھ میں لی۔ نجمہ منصور اس کی شاگردہ رہ چکی تھی۔ بڑی محبت سے اس نے کتاب پیش کی تھی لیکن ابھی تک اس کے مطالعے میں نہ آسکی تھی۔ وہ اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کتاب کے شعری مواد میں اسے محبت، جدائی اور اداسی کا ایک ایسا پرتو نظر آیا جسے وہ کچھ دنوں سے خود بھی محسوس کررہا تھا۔ وہ بعض نظموں کو بار بار پڑھتا رہا اور ٹہلتا رہا۔ گھبراہٹ تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ وہ برآمدے میں پڑے ہوئے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ کتاب اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کتاب صوفے پر رکھی اور پودوں اور پھولوں سے باتیں کرنے لان میں نکل آیا۔ وہ بہت دیر تک خود کلامی کی کیفیت میں رہا۔ یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ پھر برآمدے میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کتاب پھر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ نجمہ منصور کی ایک نظم اس کے سامنے تھی جو غلام جیلانی کے دکھ کی ترجمانی کررہی تھی۔

وہ رات
کتنی غمگین کتنی اداس
کتنی چپ چاپ گزرتی ہے
جب میرا اپنا آپ
میرے پاس ہوتے ہوئے بھی
میرے پاس نہیں ہوتا
مجھ سے بہت دور، بہت دور
چلا جاتا ہے
بالکل تیری طرح

☆☆

اس نے گھبرا کر صفحہ پلٹا۔ ایک اور نظم سامنے تھی۔

جس رات تری یاد نہیں آتی
مجھے یوں لگتا ہے
جیسے مرے دل کے اندر کوئی چیختا ہے
چیختا ہے اور شور کرتا ہے
شور کرتا ہے اور راہ تکتا ہے
راہ تکتا ہے اور روتا ہے
روتا ہے اور پھر
تھک ہار کے سوجاتا ہے

☆☆

اسے یوں لگا جیسے یہ نظمیں اس نے کہی ہیں۔ نجمہ منصور نے اپنا نام ٹانک دیا ہے۔ اگر اس نے نہیں کہی ہیں تو اسے کہنی چاہیے تھیں۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ وہ ان نظموں کو دوبارہ کیسے کہے۔ اب تو ایک ہی صورت ہے۔ اب تو ایک ہی صورت ہے۔ وہ گنگنانے کے انداز میں کہتا رہا اور لکھنے کی میز پر جاکر بیٹھ گیا۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کو آواز دی اور دونوں نظموں کو انگریزی کے قالب میں ڈھال دیا۔

انگریزی میں ترجمہ کرکے اس نے ان نظموں کو دوبارہ کہہ دیا۔

اسے انگریزی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی لیکن وہ انگریزی سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے زندگی بھر انگریزی پڑھائی تھی لیکن منہ ٹیڑھا کرکے انگریزی کبھی نہیں بولی تھی۔ نہ ضرورت محسوس کی تھی کہ انگریزی میں شاعری کرے لیکن ان نظموں کو انگریزی میں ڈھالنے میں ایسی لذت ملی کہ باقی نظمیں بھی لے کر بیٹھ گیا۔ ترجمہ نگاری کی اس محویت میں ایسا گم ہوا کہ چند ہی روز میں ستر سے زائد نثری نظموں پر مشتمل اس کتاب کو انگریزی میں منتقل کردیا۔ اس نے بالکل آخری دنوں میں اپنی شخصیت کا ایک نیا پہلو پیش کردیا۔

اس نے ان نظموں کے ترجمے میں پناہ ڈھونڈی اور ایک مرتبہ پھر زندگی میں واپس آگیا۔ اس کے بیٹے اعجاز اصغر کی شادی کی بات چل نکلی۔ گھر میں شادیانے بجنے لگے۔ سب اولادیں جمع ہوئیں۔ وہ بھی بہل گیا۔ ان دنوں اس کی خوشی دیکھنے کی چیز تھی۔ احباب اور رشتے داروں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ وہ بڑے ارمانوں سے بہو بیاہ کرلایا۔ شادی کو ابھی ایک ہفتہ گزرا تھا کہ برین ہیمبرج نے اعجاز اصغر کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

''میرا تو بیٹا مرا ہے اس دلہن بے چاری کا کیا قصور تھا

کہ ہفتے کے اندر بیوہ ہوگئی۔" وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ یہ ایسا غم تھا کہ بیوی کا غم پس پشت چلا گیا۔ ہر وقت بیٹے کو یاد کرتا رہتا اور آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے۔ وہ بظاہر زندہ تھا لیکن اندر سے مرچکا تھا۔ اس مرتبہ مسکرانا ایسا بھولا کہ ہونٹوں پر جیسے مہر لگ گئی۔ بہت سے دوست لاہور منتقل ہوگئے تھے جو سرگودھا میں تھے وہ برابر دلداری کو آتے رہتے۔ کمزوری بڑھتی جارہی تھی۔ چلنا پھرنا مفقود ہوگیا تھا۔ گھٹنوں کے درد نے بے حال کیا ہوا تھا۔ کسی کے سہارے چند قدم چل پھر لیتا تھا اور بس۔ وہ بستر کا ہو کر رہ گیا، سماعت بھی کمزور ہوگئی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ چراغ سحری کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے۔ وہ شخص رخصت ہونے کو تھا جس سے سرگودھا کی پہچان تھی۔ اس کا قرض کس طرح اتارا جائے۔

اہل سرگودھا نے ایک شام جیلانی کے نام کی۔ سیکڑوں شاگرد تھے جسے خبر ملی اس تقریب میں شرکت کے لیے پہنچ گیا۔ احباب کا بڑا مجمع شریک ہوا۔ وزیر آغا لاہور میں تھے۔ اس تقریب میں شرکت کے لیے سرگودھا آئے اور اپنا تاثراتی مضمون پڑھا۔ وہ چپ سادھے ہوئے تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر چہرے پر ایک رونق سی ضرور آئی لیکن پھر فوراً ہی اپنے خول میں بند ہوگیا۔

یہ اس کے ساتھ سرگودھا کی آخری تقریب ثابت ہوئی۔ سماعت پہلے ہی جاتی رہی تھی۔ یادداشت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ پہچانتے ہوئے لوگوں کو پہچاننا دشوار تھا۔ جب کوئی دوست ملنے آتا تو پہچاننے کی کوشش میں آنکھیں ادھر ادھر گھماتا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب بے بسی ہوتی۔ اس کی بیٹی زینت جیلانی اس کے کان میں اونچی آواز میں بتاتی کہ فلاں صاحب ہیں۔ کچھ دیر کے لیے مزید گم صم ہوجاتا جیسے ذہن کے البم میں اس شخص کی تصویر تلاش کررہا ہو پھر جب ذہن کی تصویر سے آنے والے کے چہرے کو ملالیتا تو کھل اٹھتا۔ دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ بیماری کے غلبے کے باوجود توانائی آجاتی۔ آنے والا رخصت ہوجاتا تو توانائی بھی رخصت ہوجاتی۔

یہ کیفیت تقریباً ایک سال رہی۔ وہ زبان حال سے یہ کہتا نظر آتا تھا۔

تمہارے شہر کا تنہا ستارۂ شب ہوں
مجھے بجھا کے سرِ شام کیا جلاؤ گے

26 دسمبر 2006ء کو وہ بے مثل ادیب اپنے دوستوں کو یہ تلقین کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

تجھ سے بچھڑے ہیں قیامت تو نہیں ٹوٹی ہے
اک ذرا سی بات پہ کیوں حشر اٹھایا جائے

☆☆☆

غلام جیلانی اصغر نے ایک زمانے میں (85ء سے 87ء) انگریزی روزنامہ "دی پاکستان ٹائمز" میں اردو کے جدید شعرا پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ پہلا مضمون فیض احمد فیض پر اور آخری مضمون وزیر آغا کی شاعری پر لکھا تھا۔ یہ مضامین مقبول بھی ہوئے تھے اور ادب کے لیے اثاثہ بھی تھے۔ بہت اہم تھے لیکن ابھی تک کتابی صورت میں نہیں آئے تھے۔ اس کی وفات کے بعد اس کے ایک شاگرد ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے حق شاگردی ادا کیا اور زینت جیلانی کی مدد سے ان مضامین کو تلاش کیا۔ یہ مضامین جیلانی کی فائلوں میں محفوظ تھے۔ زاہد منیر نے انہیں ترتیب دیا اور اردو اکیڈمی لاہور سے جولائی 2007ء میں شائع کرادیا۔ پیش لفظ زاہد منیر نے تحریر کیا تھا۔

"ان کے یہ مضامین جن میں ان کی دانش و فراست و بصیرت موجود ہے بہت کم لوگوں تک پہنچے۔ تاہم اب یہ مضامین شائع کیے جارہے ہیں۔"

اس کتاب کے پہلے حصے میں دس شعرا پر مضامین شامل ہیں یعنی فیض احمد فیض، ن۔ م راشد، مجید امجد، یوسف ظفر، مختار صدیقی، راجا مہدی علی خاں، وزیر آغا۔

دوسرے حصے میں غالب، اقبال، وارث شاہ پر مضامین ہیں۔

یہ تمام مضامین نیم تنقیدی ہیں کیونکہ یہ مضامین ادبی رسالے کے نہیں بلکہ اخبار کے عام قاری کے لیے لکھے جارہے تھے۔ اس لیے انداز شگفتہ ہے اور کسی خاص بحث و تمحیص کے بغیر ان شاعروں۔ کی شاعری کے چند نئے زاویے تلاش کیے۔

اس کتاب کا نام "شاعری کے پردوں پر" تجویز کیا گیا۔ شاید کتاب تمام مضامین انگریزی میں ہیں۔

یہ کتاب بہترین ہدیۂ عقیدت تھا جو مرحوم غلام جیلانی اصغر کو ان کے دوستوں کی طرف سے پیش کیا گیا۔

کیسے کیسے نقش تھے سیلاب میں جو بہہ گئے
جانے کس کا نام تھا، دیوار پہ لکھا رہا

ماخذات

پروفیسر غلام جیلانی اصغر، شخصیت اور فن
ڈاکٹر انور سدید، سرگزشت عبدالمجید سالک

فنکار

شکیل صدیقی

وہ ایک پاکستانی مصور تھا لیکن اس کے خیالات مغربی تھے۔ اس کے فن میں بھی مغربیت تھی اسی لیے یہاں کے ماحول میں رچ بس نہ پایا۔ اس نے شاہکار تصاویر بنائیں مگر جرمن بیوی کے روٹھ جانے سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ اپنا نگارخانہ بند کیا اور خود بھی جرمنی میں جاکر بیٹھ گیا مگر اسے حاصل کیا ہوا؟

ایک مشہور و معروف مصور کی روداد

تقسیم کا اعلان ہوچکا تھا، اس لیے خوں خوار درندے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے۔ ان کا نشانہ بے کس اور نہتے مسلمان تھے۔ انہیں لوٹنا، گھروں کو آگ لگانا ان کا مشغلہ تھا۔ بشیر مرزا اور اس کے اہل خانہ کے لیے ہدایت تھی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔ اندر دبک کر اس طرح بیٹھیں کہ ان کی آواز باہر تک نہ جائے۔ اہل خانہ اندر بیٹھے کانپتے رہتے اور بندوقوں کے دھماکے سن کر اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے رہتے۔ فضا میں خون کی بو بسی ہوئی تھی۔ وہ

افراد جو امرتسر چھوڑ رہے تھے، اپنا اثاثہ سنبھال کر ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگے تھے۔ کسی نہ کسی طرح سے ٹرینوں میں بیٹھتے اور پھر واہگہ پہنچ جاتے۔ آگ و خون کا یہ سفر آسان نہیں تھا۔ اس لیے کہ درندے ان ٹرینوں کو راستے میں روک کر قتل عام شروع کردیتے۔ جب وہ ٹرینیں واہگہ پہنچتیں تو ان کے ڈبوں سے خون ٹپک رہا ہوتا۔ دروازے کھولے جاتے تو بعض اوقات ایک فرد بھی زندہ نہ ملتا۔ بشیر کا باپ تانگے بناتا اور فروخت کرتا تھا، بالکل جیسے آج کل کاروں کے شوروم ہوتے ہیں اور کاریں فروخت کی جاتی ہیں۔ اس کا باپ محمد دین مرزا آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ بشیر کو بھی اپنے ساتھ دکان پر لے جایا کرتا تھا۔

بشیر 8 جون 1941ء میں پیدا ہوا تھا۔ خاندانی نام بشیر احمد مرزا تھا۔ ابتدا میں وہ بشیر اے مرزا ہی لکھا کرتا تھا پھر اسے اس نے نکال دیا اور بشیر مرزا بن گیا۔ ایک زمانہ آیا کہ وہ صرف بی ایم ہوگیا۔ اسے رنگوں سے آشنا ہونے میں دیر نہ لگی۔ تانگوں کو دل کش اور دیدہ زیب بنانے کے لیے جو نیلی پیلی پٹیاں چھتوں پر لگائی جاتی ہیں، گھوڑے کو خوب صورت اور انوکھا بنانے کے لیے اس کی لگام سے لے کر دم تک جو رسیاں لگائی جاتی ہیں، وہ بھی رنگین ہوتی ہیں۔ تقریباً سب ہی رنگ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تانبے اور نکل کے مصنوعی زیورات ہوتے جن سے تانگے میں چمک آجاتی ہے۔ بشیر کہتا تھا۔ "میرے والد ذہنی طور پر فنکار تھے، اس لیے کہ میں نے انہیں گاڑی کا کوئی پہیا ٹیڑھا بناتے نہیں دیکھا۔ ان کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز تناسب میں ہوتی تھی۔ میں خود بھی لکڑیوں کو رنگین بنانے کے لیے ان پر پینٹ کرتا تھا۔ بس اسی کے بعد میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں تصویریں بناؤں۔ جب بھی کوئی سفید کاغذ مل جاتا میں اسے سیاہ کرنے بیٹھ جاتا۔ یقین کیجیے اس زمانے میں بھی میری تصویریں لوگوں کو پسند آتی تھیں۔ ابتدا میں پڑھنے لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں تھی، والدین اسکول بھیجتے تھے تو میں بستہ لے کر مسجد کے زینے پر جا کر بیٹھ جاتا تھا اور اس کے صحن کی طرف دیکھا کرتا یا پھر جو لوگ سڑک پر سے گزر رہے ہوتے ان کا مشاہدہ کرتا رہتا۔ یہ مشاہدات آگے چل کر بہت کام آئے۔ خیر میں گھر سے زیادہ دور نہیں جاتا تھا، جب ظہر کی اذان ہوجاتی تھی تو گھر واپس آجاتا تھا۔ اس طرح سے اس بات پر پردہ پڑا رہتا کہ میں اسکول گیا ہوں یا نہیں۔"

رنگوں کی اس دنیا سے آشنائی کے بعد بشیر کے دل میں یہ خیالات جاگزیں ہوئے کہ وہ مصور بنے گا اور ان اشکال کو کینوس پر منتقل کرے گا۔ مگر فسادات کیا ہوئے کہ سب کچھ گڈمڈ ہوگیا۔ اس کے دماغ میں دہشت انگیز مناظر نقش ہوگئے، جس کی ہر شے میں سرخی نمایاں تھی۔ سسکتے بلکتے چہرے، سراسیمگی میں لپٹے ہوئے اجسام، مدد کے لیے پکارتی ہوئی چیخیں، سرخی میں نہائے ہوئے لوگ، کرب و اذیت کا نہ رکنے والا سلسلہ تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ بربریت کا ایک سیل رواں تھا جو اس کی بصارت میں جذب ہوکر دماغ کی پلیٹوں میں محفوظ ہوگیا تھا۔

سرخ اور شعلوں جیسا رنگ اس کی پینٹنگز میں غالب کیوں ہے، وہ اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ ایک بار وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ باہر سے آیا تو منظر کشی کو دل چاہنے لگا۔ اس نے ایک کاغذ لیا اور اس پر پنسل چلانے لگا۔ اس دوران چھوٹے بھائی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ ماچس سے کھیلنے لگا۔ پھر اس نے تیلیاں نکالیں اور مسالے پر رگڑ کر شعلہ پیدا کرنے لگا۔ حالانکہ وہ سگرٹ نہیں پیتا تھا، لیکن بس شغل کے طور پر تیلیاں جلائے جا رہا تھا۔ کسی چیز میں آگ لگ گئی۔ بشیر تصویر بنانے میں محو تھا۔ اس نے توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ پھیلتی چلی گئی۔ جب گرمی محسوس ہوئی تو بشیر نے گرد و پیش پر نگاہ ڈالی۔ پھر اضطراب میں چیخا اور اپنے چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھام کر مکان سے باہر نکل آیا۔ ذرا سی دیر میں شعلوں نے مکان کو چاٹ لیا، اس لیے کہ تانگے بنانے والا لکڑی کا سامان زیادہ تھا۔ اس کے بعد بربادی کی داستان شروع ہوگئی۔ اس لیے کہ اس آگ میں سب کے کپڑے، تک جل کر خاک ہوچکے تھے۔

جب تقسیم کا اعلان ہوا تو اس کا خاندان واہگہ تک پہنچ گیا اور پھر وہاں سے لاہور آنے میں کامیاب ہوگیا۔ معلوم نہیں وہ کیسے زندہ بچ گئے۔ قسمت نے یاوری کی اور انہیں سر چھپانے کے لیے جگہ مل گئی۔ وہ ٹھیک 14۔ اگست 1947ء کو نئے وطن پاکستان پہنچے تھے، جب سب ایک عزم کے ساتھ وطن کو بنانے سنوارنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا کہ جس ٹرین میں ہم لوگ آئے تھے، اس کے تقریباً سارے ڈبوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

وہ خونی واقعہ اس کے ذہن پر اس طرح سے منقش ہوا کہ اس نے ایک میورل بنایا جس کا نام "دی لاسٹ ٹرین فرام امرتسر" تھا۔ اس میورل کے مختلف حصے تھے، اس کی یادوں کا عکس، سیاسی حالات، پاکستان کا پس منظر بھی تھا۔ یہ میورل 1998ء میں بنایا گیا تھا۔ اس کے دس پرنٹ بنوا کر بشیر نے دوستوں میں تقسیم کردیے۔ یہ میورل بنانے کا خیال اسے اس وقت آیا جب اس نے خشونت سنگھ کا ناول "اے ٹرین ٹو پاکستان" پڑھا تھا۔ پھر اس پر بننے والی فلم بھی دیکھی۔

بشیر چھ بھائی بہنوں میں پانچواں تھا۔ جب ہجرت کر کے وہ یہاں آیا تھا تو اس کی عمر صرف چھ برس کی تھی۔ لاہور آکر وہ مہاجرین کے کیمپ میں رہے جو واشن روڈ پر تھا۔ اس کے بعد کرائے کے مکان میں رہے۔ پھر متروکہ املاک کے بدلے انہیں قلعہ گوجر سنگھ میں ایک مکان مل گیا۔

احمد پور شرقیہ میں اس کے بہنوئی محمد یوسف رہتے تھے۔ ان کے بارے میں پتا چلا تو والد نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے احمد پور کا رخ کیا۔ اس کا باپ محنتی اور جفاکش تھا، وسائل نہ ہونے کے باوجود اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنا ورک شاپ قائم کرلیا اور تانگے بنانے لگا۔ روزی روٹی چلنے لگی۔ وہ سیدھا سادا تھا۔ ذہانت اور چالاکی اس میں نہیں تھی۔ اس لیے ادھار پر کام کروانے والوں نے اس کا جینا حرام کردیا۔ کشاکش زندگی میں تقریباً سب ہی مبتلا تھے۔ اس لیے وہ دل کو بہلا لیتے تھے کہ قدرت ان کے نوزائیدہ ملک کے لیے کچھ تو کرے گی۔ بہرحال اس کے دن بدل گئے اور وہ پھر سے آسودہ زندگی بسر کرنے لگا۔

اس کے والد کو چھوٹے شہر میں رہنے کی عادت نہیں تھی۔ لاہور اس کے دماغ میں بس گیا تھا۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہیں رہنا چاہیے۔ محمد یوسف نے سمجھایا کہ اب وہاں نہ جاؤ۔ یہاں کاروبار جم چکا ہے۔ پریشانی اٹھاؤ گے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ پھر لاہور آگیا۔ اس کے پاؤں نہ جم سکے اور دورِ ابتلا شروع ہوگیا۔

واپسی پر لوہاری منڈی میں کوچہ پیر بھولے شاہ میں رہنا پڑا۔ ایک چھوٹا سا کمرا تھا اور اتنے افراد رہنے والے۔ بشیر کو اسکول بھیجنے کے لیے اس کے والد کے پاس پیسے نہیں تھے، اس لیے بشیر پرچون کی ایک دکان پر بطور معاون کام کرنے لگا۔ اس کے والد کا خیال تھا کہ جب وہ کاروبار کی باریکیوں کو سمجھنے لگا تو اسے دکان کرا دی جائے گی۔ جبکہ دکان دار نے یہ سمجھ لیا تھا کہ بشیر کو اس کی غلامی میں دے دیا گیا ہے، لہٰذا وہ اس سے گھر کے کام بھی کراتا تھا۔ اس کے بچوں کو اسکول پہنچانے اور لانے بھی جاتا تھا۔ گویا بشیر کی ذمے داریاں دوہری تھیں۔

اس کی ایک خالہ نے بہن سے کہا کہ بشیر اب ان کے گھر رہے گا اور وہ اسے تعلیم دلوائیں گی، وہی اس کا خرچہ اٹھائیں گی۔ ان کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس کی شادی کے بعد وہ تنہا ہوگئی تھیں۔ اس کے خالو ریلوے میں ملازم تھے اس لیے گزر بسر اچھی ہورہی تھی۔

بشیر کی ماں نے اجازت دے دی۔ اسے ایک اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ پرائمری تعلیم ختم کرنے کے بعد اسے مسلم ماڈل اسکول میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ جہاں اسے ڈرائنگ سے خاص شغف تھا۔ اس نے بتایا کہ جماعت کے سارے لڑکے اپنی ڈرائنگ اسی سے بنوایا کرتے تھے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ پیدائشی پینٹر ہے، اس لیے کہ جب بھی کلاس میں وقت ملتا تھا تو میں 'فلم فیئر' کا کوئی شمارہ اٹھا لیتا اور اس میں سے دیکھ کر مدھوبالا یا بلراج ساہنی اور دلیپ کمار کی تصویر بنانا شروع کردیتا۔ تاہم میں محسوس کرتا تھا کہ مجھ میں کچا پن ہے اور مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایم اے عزیز تھے جو معروف سیاست داں، ماہر اقتصادیات اور سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کے والد تھے۔ ڈرائنگ ماسٹر اسلم صاحب تھے۔ 1958ء میں اسکول کی تعلیم ختم ہوئی، اس نے امتحان اول درجے میں پاس کیا۔ بعد کے زمانے میں شاکر علی نے اس کے یہ اسکیچ دیکھ کر کہا تھا۔ "یہ تو بازاری کام ہے۔ یہ تو سب ہی کرلیتے ہیں۔ آرٹ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم آرٹسٹ بننے کی کوشش کرو۔"

اسے مسلم ماڈل اسکول میں داخل کردیا گیا۔ اسے چونکہ ابتدا ہی سے ڈرائنگ بنانے کا شوق تھا، اسی لیے وہ اس میں خصوصی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ ساری کلاس کے لڑکے اس سے متاثر تھے، لہٰذا اپنی ڈرائنگ اسی سے بنوایا کرتے تھے یا ٹھیک کرایا کرتے تھے۔ جب ہائی کلاس کا رزلٹ آیا تو بشیر نے فرسٹ کلاس نمبر حاصل کیے۔ گھر والوں نے اس کا شوق دیکھ کر ہدایت دی کہ اسے کسی سائن بورڈ بنانے والے کے ہاں ملازمت کرنا چاہیے۔ اس کی پینٹنگ مزید بہتر ہوجائے گی۔

بشیر نے ان کی تجویز مان لی اور ایک سائن بورڈ پینٹر کے ہاں کام کرنے لگا۔ اس بارے میں وہ کہتا ہے "پہلے تو اس

نے میرا امتحان لیا اور اس کے بعد چھوٹے چھوٹے خاکے دینے لگا۔ چند ہفتوں کے بعد ہی اس نے ایک بڑا سا سائن بورڈ بنوایا۔ اس کے لیے یہ کوئی دشوار بات نہیں تھی، اس نے سائن بورڈ بنا دیا۔ دکان کا مالک یہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا تربیت دینا چاہیے۔ بس وہ اس سے کام کروانے لگا۔ بشیر سمجھ گیا کہ وہ اس سے استادی کر رہا ہے اسے کچھ سکھانا نہیں چاہتا اور صرف گدھوں کی طرح سے کام کرانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے سائن بورڈ کی دکان پر کام کرنا چھوڑ دیا۔

انہی دنوں کالج آف آرٹس کا ایک اشتہار پاکستان ٹائمز لاہور میں شائع ہوا۔ بشیر اس وقت ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اشتہار پڑھ کر داخلے کے لیے درخواست دے دی۔ اسے انٹرویو اور ٹیسٹ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ جب ڈرائنگ کا ٹیسٹ ہوا تو اس سے کہا گیا کہ وہ میلے کی ایک تصویر بنائے۔ وہ چونکہ کئی بار داتا گنج بخش کے مزار پر جا چکا تھا اور اس نے عرس بھی دیکھا تھا، اس لیے اس نے وہی پینٹ کر دیا۔ اسے کالج میں تعلیم کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ یہ 1958ء کا واقعہ ہے۔ اس نے جوڑ جوڑ کر فیس جمع کی اور کالج جانا شروع کر دیا۔ کالج کی فیس چار روپے تھی اور طلبہ کو میٹریل کالج کی طرف سے ملتا تھا۔

یہ مایو اسکول آف آرٹس تھا جسے انگریزوں نے 1875ء میں قائم کیا تھا۔ اسی کو اپ گریڈ کر کے کالج بنا دیا گیا تھا۔ نئے کالج کا چارج پروفیسر ایم۔ آر اسپون برگ نے سنبھال لیا۔ وہ کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ بشیر پہلے گروپ (ج) میں شامل تھا۔ پہلے سال کے مضامین مشترک تھے۔ سب کو سارے مضامین پڑھنا تھے۔ جب دوسرا سال شروع ہوا تو تین گروپ بن گئے۔ ہر طالب علم کو ان میں سے کسی ایک گروپ کا انتخاب کرنا تھا:

۱۔ کمرشیل آرٹ

۲۔ ڈیزائن

۳۔ آرکیٹکچر

پروفیسر شاکر علی جنہوں نے بشیر مرزا میں آرٹ کے جراثیم تلاش کر لیے تھے، اسے مشورہ دیا کہ وہ فائن آرٹ کا انتخاب کرے۔ جب کہ دوسرے خیر خواہوں نے اس کے برعکس مشورہ دیا کہ وہ کمرشیل آرٹ یا پھر ڈیزائن کا گروپ لے، تاکہ اس کی دال روٹی کا بندوبست ہو سکے۔ فائن آرٹ تو وقت ملنے پر وہ کبھی بھی کر لے گا۔ بشیر مخمصے میں مبتلا ہو گیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کرنا کیا چاہیے۔ تذبذب کے عالم میں اس نے ڈیزائننگ کا انتخاب کر لیا۔ جب فائنل امتحان ہونے لگے تو اس نے ایک پینٹنگ بنائی جو کشتی اور دریا کی منظر کشی تھی۔ یہ پینٹنگ پروفیسر شاکر علی کو اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا اور اس کا انکشاف کئی برس بعد کیا۔

اس وقت شاکر علی کا طوطی بول رہا تھا۔ بشیر بھی ان سے متاثر تھا مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی خواہش کے برعکس اس نے ڈیزائننگ لی ہے تو وہ ناراض ہوئے۔

بہرحال جب انہوں نے دیکھا کہ وہ پینٹنگ بھی کر رہا ہے تو ان کی ناراضی جاتی رہی۔ وہ ان کے گھر پر حاضری دینے لگا۔ انہوں نے بھی اندازہ لگا لیا کہ اس لڑکے میں تخلیقی جراثیم ہیں۔ اسے رنگوں کی پہچان ہے اور وہ انہیں استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے پاس موضوعات بھی ہیں۔ اسے بخوبی معلوم ہے کہ اسے کیا بنانا ہے، کیسے بنانا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر محنت کی اور بہت کچھ بتا دیا۔ ان کی رہنمائی میں بشیر کی تخلیقی صلاحیتیں دو چند ہو گئیں۔ وہ اب اندر سے خالی نہیں رہا تھا، اس کے اندر کا مصور بیدار ہو گیا تھا۔ بشیر ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے اندر کا دروازہ نہیں کھلا تھا شاکر علی نے وہ دروازہ کھول دیا۔ وہ اس کے لیے ماڈل کا بندوبست کرتے اور اسے پیسے اپنے پاس سے دے دیا کرتے تھے۔ انہیں بشیر کی معاشی ابتری کے بارے میں اچھی طرح سے معلوم تھا، اس لیے انہوں نے اس کا وظیفہ جاری کرا دیا۔

شاکر علی کا شمار جدید مصوروں میں کیا جاتا تھا۔ انہوں نے آرٹ کی تعلیم میں ۱۱ برس گنوائے، پیرس اور لندن میں گزارے۔ پیرس میں کام کیا پھر پراگ چلے گئے۔ ۱۹۵۱ء میں وہ پاکستان لوٹ آئے۔

ان کی زیادہ تر پینٹنگز کا موضوع یورپ کی لوک داستانوں پر منحصر تھا اور ان میں سرخ رنگ نمایاں ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے پرندوں کو بھی پینٹ کیا، جو آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں اور رسم و رواج کے پابند نہیں ہوتے۔ شاکر علی رنگوں کو اس طرح سے استعمال کرتے تھے کہ وہ نفسی لکیریں محسوس ہوتے تھے۔

1956ء ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ 1960ء میں انہوں نے اسلامی خطاطی بھی کی۔ 1961ء سے 1973ء تک وہ اسکول آف آرٹس لاہور کے پرنسپل رہے۔ پاکستان کے مشہور و مقبول مصور ان کے شاگرد تھے جن میں بشیر مرزا کے علاوہ جمیل نقش اور احمد پرویز ہیں۔

14۔ اگست 2006ء میں پاکستان کے محکمہ ڈاک نے مصوروں کے یادگاری ٹکٹ جاری کیے جن میں مشہور مصوروں کے ساتھ ان کا ٹکٹ بھی شامل ہے۔ وہ 1914ء میں کان پور انڈیا میں پیدا ہوئے اور انہوں نے 1975ء میں لاہور میں انتقال کیا۔

☆☆☆

بشیر جب فائنل ایئر میں تھا تو شاکر علی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ فائن آرٹ کے شعبے کے سربراہ تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”تمہارے پاس اپنا خرچہ اٹھانے کے لیے پیسا نہیں ہے، لہٰذا کچھ کرو۔“

”جناب! کیا کروں؟“ اس نے پوچھا۔

”سبط حسن کے پاس جاؤ۔ میں انہیں فون کر دوں گا۔“ انہوں نے ہدایت دی۔

اس زمانے میں سبط حسن ”لیل و نہار“ کے مدیر ہوا کرتے تھے۔ دوسرے دن بشیر ان کے پاس گیا اور اس نے شاکر علی کا حوالہ دیا۔ انہوں نے نوجوان لڑکے کو دیکھا اور سوچنے لگے۔ بشیر سوچنے لگا کہ چند گھنٹے کا کام مل جائے گا تو خرچہ چل جائے گا۔ سید سبط حسن نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا اور کہا۔ ”اس پر لکھو کہ کتنی رقم لو گے؟“

بشیر سوچنے لگا کہ رقم لکھنا تو ایک امتحان ہے، اگر زیادہ لکھ دی تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کورا سا جواب دے کر باہر جانے کا راستہ دکھا دیں۔ اسے خیال آیا کہ جب وہ ڈھائی سو لکھے گا تو ڈیڑھ سو تو ہی جائیں گے۔ چنانچہ اس نے ڈھائی سو لکھ دیے۔ حیران کن بات یہ ہوئی کہ سبط حسن نے اس رقم کو منظور کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ بشیر کا کہنا ہے کہ میں نے سوچا کہ میری تو لاٹری نکل آئی۔ چند گھنٹوں کے کام کے لیے ڈھائی سو روپے! مجھے معلوم تھا کہ اتنی رقم ملی تو میں عیش کروں گا۔

بشیر مرزا نے فائنل امتحان فرسٹ کلاس نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس لیے کہ قدرت نے اسے ذہانت کا جوہر عطا کر رکھا تھا۔ اسی اثنا میں گورنمنٹ آف پاکستان پرنٹنگ پریس کے عہدے دار آئے اور انہوں نے کالج کے پروفیسروں سے پوچھا کہ کالج کا سب سے ہونہار اور مشاق طالب علم کون ہے۔ بشیر مرزا اور کسی ایک طالب کا نام لیا گیا۔ پرنٹنگ پریس والوں نے ان دونوں کو جز وقتی ملازمت کی پیشکش کی، جو ان دونوں نے قبول کر لی۔

یوں وہ لاہور سے کراچی آ گیا۔ اتفاق سے یہ بھی 14 اگست کا دن تھا۔ اس سے پیشتر اس نے 14۔ اگست کو اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔

وہ یہاں آ تو گیا، لیکن رہائش کا مسئلہ تھا۔ کوئی جان پہچان ہی نہیں تھی، اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے؟ سرِراہ اس کا ایک دوست مل گیا۔ اس نے پوچھا کہاں رہ رہے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ وہ ڈرگ کالونی (اب شاہ فیصل کالونی) میں رہتا تھا۔ اس نے بشیر کی چتاؤن کر پیشکش کی کہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ ایک کمرے کے گھر میں رہ سکتا ہے۔ وہ خود بھی اپنی قسمت آزمانے کراچی آیا تھا۔ حالات اس کے بھی اچھے نہیں تھے، مگر دل کشادہ تھا۔ اس نے جس خلوص سے پیشکش کی تھی اس کے جواب میں بشیر نے اس کے کوارٹر میں رہنا منظور کر لیا۔

پریس میں بہت سے ڈیزائنر کام کر رہے تھے۔ بشیر سے کہا گیا کہ وہ ان کا کام دیکھے اور اگر وہ ڈیزائننگ میں کوئی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہوں تو ان کی اصلاح کرے اور اس کے علاوہ پریس کے سارے شعبوں میں جا کر انتظامی معاملات پر بھی نگاہ رکھے۔ اگر اس کے خیال میں کوئی کام بہتر انداز میں ہو سکتا ہو تو اس کی رپورٹ انتظامیہ کو دے۔ اس کی یہ مصروفیت چھ ماہ تک رہے گی۔

یہ بھی طے پایا کہ اس کے بعد اسے چند ٹکٹ کے ڈیزائن بنانا ہوں گے۔ بشیر ٹکٹ فوراً ہی بنانا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ٹکٹ بنانے پر بھی اصرار کیا۔ یہ کام اسے دے دیا گیا۔ ٹکٹ کا عنوان اس نے ’بھوک سے نجات‘ رکھا۔ اس میں صرف ایک ٹکٹ نہیں تھا، بلکہ یہ سیریز تھی۔

اس زمانے میں ڈاک ٹکٹ فوٹو انگریور سے چھپتے تھے اور باہر سے چھپ کر آتے تھے۔ ابھی پاکستان میں چھپائی کا یہ طریقہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ٹکٹ اصلی سائز میں ڈیزائن کیے جاتے تھے۔ اس پر لکھائی اور تصویر دونوں اصل سائز پر ہی بنائی ہوتی تھیں۔ گویا پورا ڈیزائن ہی اصل سائز میں بنانا پڑتا تھا۔

بشیر کو ہدایت دی گئی کہ وہ چھ ماہ تک کام کا مشاہدہ کرے اور اس کے بعد خود بنائے، لیکن اس نے پہلے مہینے میں ٹکٹ ڈیزائن کرنا شروع کر دیے۔ انتظامیہ کو اس کے بنائے ہوئے ڈیزائن پسند آئے اور ان کی چھپائی کی منظوری دے دی گئی۔ یہ بشیر کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا اس

لیے کہ جولڑکے پرنٹنگ پریس میں کام کرنے آتے تھے، ان کے ڈیزائن برس دو برس کے بعد منظوری حاصل کر پاتے تھے۔ دوسرے لڑکوں نے اسے رشک اور تحسین کی نظروں سے دیکھا۔

ملازمت تو مل گئی تھی، لیکن اس کے اصول اور ضوابط پر عمل کرنا بشیر کے لیے دشوار تھا۔ وقت پر دفتر جانا اس کے لیے کارِ دارد تھا۔ اکثر جب وہ پرنٹنگ پریس کے گیٹ پر پہنچتا تو وہ بند ملتا۔ چنانچہ وہ آوارہ گردی کر کے وقت گزارتا۔ لنچ ٹائم میں وہ دوسروں کے ساتھ اندر چلا جاتا تھا۔ جب اس کے تاخیر سے دفتر پہنچنے کا سلسلہ جاری رہا تو انتظامیہ نے اسے نوٹس دینا شروع کر دیے۔ بس میں سوار ہو کر دفتر جانے والا بشیر مرزا عذر لنگ پیش کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

پرنٹنگ پریس سے دل اچاٹ ہونے کا سبب ایک واقعہ بھی بنا۔ ہوا یوں کہ ایک روز وہ ڈرگ کالونی کے کوارٹر سے نکلا تھا کہ اسے پرنٹنگ پریس کے انگریز منیجر کی کار نظر آئی۔ اس نے ہاتھ دے کر اسے روکنا چاہا، لیکن منیجر نے اسے دیکھنے کے باوجود درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ بشیر کا دماغ غصے میں بھک سے اُڑ گیا۔ اسے انگریزی میں جتنی گالیاں آتی تھیں وہ اس نے بک دیں۔

اس نے سوچا کہ مشاہرے میں اضافہ ہو جائے گا تو وہ اپنے لیے اسکوٹر خرید لے گا۔ اس نے مشاہرہ میں اضافے کی بات کی جو منظور نہیں کی گئی تو اس نے وہ عارضی ملازمت چھوڑ دی۔ انتظامیہ نے اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ فاقے کرے گا اور مارا مارا پھرے گا۔ بشیر نے اس کی پروا نہیں کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

اسے ایک برطانوی اشتہاری ایجنسی کرافورڈ میں سینئر آرٹسٹ کی حیثیت سے کام مل گیا اور اس کی تنخواہ سات سو روپے مقرر ہوئی۔ ایجنسی کا مالک آرٹسٹوں کی نازک مزاجی اور حساسیت سے بخوبی واقف تھا، لہٰذا اس نے بشیر پر کوئی بے جا قدغن نہیں لگائی اور نہ یہ اصرار کیا کہ وہ پابندی سے ایجنسی آئے۔ اس نے کہا کہ اسے کام دیا جا رہا ہے جو اسے ایک معینہ مدت میں ختم کرنا ہوگا۔ چاہے وہ اسے ایک روز میں کرے چاہے چار دن میں۔ اس لیے کہ آرٹسٹوں کا بہرحال ایک موڈ ہوتا ہے اور تخلیق کار کوئی مشین نہیں ہوتا۔ تخلیق ایک کیفیت کا نام ہے جو کسی وقت بھی طاری ہو سکتی ہے۔ بشیر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔

اب اس کا معیارِ زندگی بڑھ گیا، اس لیے کہ سات سو روپے بہت زیادہ تھے۔ وہ پی ای سی ایچ ایس میں ایک صاحب کے گھر میں پے انگ گیسٹ کی حیثیت سے رہنے لگا۔ اب اس کی شامیں کیفے لبرٹی میں کٹنے لگیں (کیفے لبرٹی اب بند ہو گیا ہے)۔

اس کے کام کو سراہا گیا، لیکن جب مالک چند ہفتوں کے لیے ملک سے باہر چلا گیا تو اس کے نائب کو بشیر کا انداز پسند نہیں آیا۔ خاص طور پر ایجنسی سے کئی دن تک غیر حاضر رہنا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بے اصولی ہے۔ آرٹسٹ کو پابندی سے کلرکوں کی طرح دفتر میں آنا چاہیے۔ بشیر نے پابندی کو قبول نہیں کیا اور ایجنسی چھوڑ دی۔ اب اس میں خود اعتمادی آگئی تھی اور وہ جانتا تھا کہ زندگی کی گاڑی کو کیسے چلایا جا سکتا ہے۔

اس نے کراچی آمد کے بعد چند ماہ میں کافی ڈرائنگز بنا ڈالیں۔ اس کی ملاقات نائجیریا کے سفارت خانے کے ہائی کمشنر سے ہو گئی۔ انہیں وہ ڈرائنگز پسند آئیں اور انہوں نے اجازت دے دی کہ وہ ان کی نمائش ان کی رہائش گاہ پر کر سکتا ہے۔ یہ اس کا پہلا ون۔مین شو تھا جو اس نے کراچی میں آنے کے دس ماہ بعد 27 جون 1963ء میں کیا تھا۔ شو میں اس نے اپنی چالیس تصاویر رکھیں، جن میں بال پوائنٹ، انک، چین اور کیریون کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ پینٹنگز بھی تھیں جن میں آئل، واٹر کلر اور پوسٹر کلر کا استعمال کیا گیا تھا۔

نمائش کو پسند کیا گیا۔ پریس نے اس کے کام کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس نمائش میں اس نے نیوڈز بھی بنائیں تھیں۔ نائجیریا کے ہائی کمشنر برائے پاکستان، جناب الحاج عبدالقدیر ابوبکر کوکونا نے اپنے تاثرات مہمانوں کی کتاب میں یوں درج کیے:

”......وہ پینٹنگز جو خاص طور پر آئل میں بنائی گئی ہیں میں ان سے متاثر ہوا ہوں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ بشیر نے پہلی بار سنجیدگی سے آرٹ ورک کیا ہے۔ میں آرٹ کا شائق ہوں میرے اندرونی جذبے نے بے اختیار مجھے اکسایا کہ میں بشیر کی ستائش کروں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ نوجوانوں نے بھی اس کے کام میں دلچسپی...لی ہے۔ بشیر بہت حساس ہے، اس نے کینوس پر جو رنگ بکھیرے ہیں وہ اس کے احساسات اور مشاہدات ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ نوجوان مستقبل کا بڑا آرٹسٹ ہے۔ ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے اور نہ اس رو کو روک سکتے ہیں جو اندر سے باہر آنے کے لیے بے تاب ہے۔“

بشیر کی عمر اس وقت بائیس برس تھی اور اس کی مونچھیں بھی تھیں۔ اس کا حلقۂ احباب بڑھ گیا اور سماجی رتبے میں اضافہ ہو گیا۔ اسے پارٹیوں میں بلایا جانے لگا۔ وہ جب... دلچسپ اور مزے دار گفتگو کرتا تھا تو لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر خواتین اس کے گرد منڈلاتی تھیں۔ جب ایک صحافی نے اس سے پوچھا کیا اسے بھی کسی سے عشق ہوا ہے تو اس نے واڈکا کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ بھرے اور پھر کہا کہ بہت سے عشق ہوئے۔ جب میں طالب علم تھا تو محلے کی ایک لڑکی کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ روز صبح اسکول جاتی تھی اور مجھے بھی اسکول جانا ہوتا تھا۔ وہ جس وقت گھر سے نکلتی تھی اتفاق سے اسی وقت میں بھی گھر سے نکلتا تھا۔ چنانچہ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔ جب اس کا اسکول آتا وہ اندر چلی جاتی اور میں اپنے اسکول کی طرف چل پڑتا۔ یہ یک طرفہ عشق تھا، مگر تھا بہت جذباتی اور ہیجان خیز۔ اس میں شدت تھی۔ میں نے اس کا چہرہ تو نہیں دیکھا، لیکن خواب و خیال میں اس کا ایک خاکہ ضرور بنا لیا تھا۔ آنکھیں ایسی ہوں گی، ناک ویسی ہوگی اور چہرہ اس قسم کا۔ وہ لوگ محلہ چھوڑ گئے تو عشق ختم ہو گیا۔

دوسرا عشق اس وقت ہوا جب میں میٹرک میں تھا۔ میرے گھر کے سامنے والے گھر کی کھڑکی میں ایک لڑکی آکر کھڑی ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے دیکھتی تھی اور میں اسے دیکھتا تھا۔ بہت دنوں تک محض دیکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک روز جب وہ گھر میں تنہا تھی تو میں اس کے گھر میں داخل ہو گیا۔ سوچا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوگی، لیکن اس نے مجھے دیکھ کر شور مچا دیا۔ میں گھبرا گیا اور بھاگ کر واپس آگیا۔ میں نے سوچا اس معاملے پر خاک ڈال دینی چاہیے، لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا اور اس لڑکی کی ماں نے آکر میری ماں سے شکایت کر دی۔ بس نہ پوچھیے کہ شرمندگی سے کیا حال ہوا۔ کوئی خاص عشق نہیں تھا، لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ بھلائے ہی نہیں بھولتا۔ ذہن پر اس کا نقش گہرا ہے۔

جب کالج میں پڑھتا تھا تو وہاں بھی ایک عشق ہوا۔ ایک بڑے شخص کی بھتیجی پڑھتی تھی۔ وہ فرسٹ ایئر میں تھی اور میں فائنل میں۔ پری چہرہ اور دل میں اتر جانے والی۔ اس کی چوٹی بہت لمبی تھی اور وہ پھول لگا کر آتی تھی۔ میں وقت پر کالج نہیں جاتا تھا، لیکن اس کی وجہ سے وقت پر جانے لگا۔ کالج کا وقت آٹھ بجے ہوا کرتا تھا اور میں ایک گھنٹا پہلے ہی یعنی سات بجے پہنچ جاتا تھا یوں باتیں کرنے کے لیے وقت مل جاتا تھا۔ ملا جلا معاملہ تھا، عشق بھی اور دوستی بھی۔ اب بھی اچھی دوست ہے۔ ایک بچے کی ماں ہے، طلاق ہو چکی ہے۔ آرکیٹیکٹ ہے۔

اس وقت بہت سنجیدہ قسم کا عشق ہو گیا جن دنوں میں طارق روڈ پر رہتا تھا۔ میں پے انگ گیسٹ تھا، وہ مالک مکان کی لڑکی تھی۔ کالی اور بدشکل سی۔ وہ بتدریج میرے قریب آتی چلی گئی۔ اکثر آکر میرے قریب بیٹھ جاتی اور ہم لوگ بے تکی سی باتیں کرتے رہتے۔ ابتدا میں تو کچھ پتا نہ چلا، ایک روز احساس ہوا کہ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔ پھر وہ لاہور چلی گئی اور اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اگر وہ کراچی میں رہتی تو میں یقیناً اس سے شادی کر بیٹھتا۔ لاہور سے وہ امریکا چلی گئی اور میں یہاں روتا چیختا رہ گیا۔ بعد میں خط و کتابت بھی ہوئی، لیکن وہ بہت چالاک تھی۔ میرا خیال ہے کہ لڑکیاں چالاک ہی ہوتی ہیں۔

جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ کسی لڑکی نے اس سے سچی محبت کی؟ اس نے اعتراف کیا کہ ایک طالبہ تھی جس نے آخری وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس وقت وہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ وہ شادی کے بعد دوسرے صوبے میں چلی گئی تھی اور اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے کراچی آتی رہتی تھی اور مجھ سے ملتی بھی تھی۔ میری شدید بیماری کے دوران بھی آتی رہی۔ میں اس سے خط و کتابت بھی کرتا تھا۔ ہمارے درمیان ہر طرح کے تعلقات تھے۔

☆☆☆

بشیر مرزا کی پینٹنگز کی دوسری نمائش اپریل 1965ء میں امریکن کلچر سینٹر میں ہوئی۔ پریس اس کے کام سے متاثر ہوا۔ انگریزی اخبار ’لیڈر‘ کے مدیر سلطان احمد نے لکھا:

”بشیر مرزا میں عزم و حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک بیدار مغز آرٹسٹ ہے اور اس کا مشاہدہ وسیع ہے۔ پہلے اس نے زندگی گزارنے کے لیے کمرشیل آرٹ کی طرف توجہ دی۔ پھر اس کی سیاہ لکیروں نے اسکیچز کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس نے واٹر کلر کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد اب آئل سے کام کر رہا ہے۔ اس نے بتدریج مصوری کی انتہا کی طرف سفر کیا۔ بشیر پر خارجی اثرات بھی ہیں۔ اس کی پینٹنگز کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس نے

ہمارے جیسے انسانوں کو پینٹ کیا ہے۔ وہ محض آنکھوں کو تسکین پہنچانے اور سفلی جذبات کو حرارت بخشنے کے لیے نیوڈز نہیں بناتا۔ اس کا موضوع کچلے ہوئے جذبات اور ناتمام خواہشات ہیں۔ اس کے میورل "پتھر کا شہر" نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔"

مارچ 1966ء میں اس کی پینٹنگز کی تیسری نمائش ہوئی۔ پینٹنگز بن رہی تھیں، لوگ تعریف و توصیف بھی کر رہے تھے، پریس میں شائع ہونے والے تبصرے بھی ستائشی تھے لیکن خریدار میسر نہیں تھے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب باقاعدہ گیلری کھول کر پینٹنگز کی نمائش کی جائے۔ اپنا اور دوسروں کا کام وہاں رکھا جائے۔

اسی زمانے میں ایک جرمن لڑکی لوسی اس کی زندگی میں داخل ہوئی...... وہ سیر کرتی ہوئی کراچی آئی تھی۔ ایک دوست کے وسیلے سے اس کا تعارف بشیر مرزا سے ہوگیا۔ بشیر تو ایسے موقعوں کے انتظار میں رہتا تھا۔ لوسی کو رہنے کے لیے ٹھکانا چاہیے تھا اور بشیر کو کسی لڑکی کی قربت۔

لوسی مصورہ تھی اور آرٹ کے حوالے سے پاکستان آئی تھی۔ وہ نہ صرف اس کی دوست بن گئی بلکہ اس کے لیے ماڈل بھی! وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آئے یا نہیں، بہر حال کچھ دنوں کے لیے ایک دوسرے کے ہوگئے۔ غالباً ان کے لیے پہلی ضرورت یہی تھی۔ ان دنوں بشیر طارق روڈ کے قبرستان کے قریب ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ لاابالی اور بے پروائی سے، اس کے کمرے کی ہر چیز بکھری رہتی تھی۔ نظم و سلیقہ اس کی زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں۔ لوسی چار برس تک اس کے ساتھ رہی۔ انھوں نے شادی نہیں کی، لیکن ساتھ رہتے تھے۔ اس کی ماں تک یہ بات پہنچ گئی۔ جب وہ ان کے سامنے گیا تو انھوں نے پہلا سوال یہی کیا۔ جھوٹ وہ بول نہیں سکتا تھا اور سچی بات بتا نہیں سکتا تھا، اس لیے اس نے ان کی بات کا گول مول جواب دیا۔ اس کے بھانجے شہباز قریشی نے ایک بار انکشاف کیا کہ بشیر مرزا لوسی کو احمد پور شرقیہ بھی لے گیا، جہاں اس کی بہن رہتی تھی۔

وہاں مسئلے کھڑے ہوگئے۔ وہاں کا کلچر کراچی سے بالکل مختلف تھا۔ گھر میں ائرکنڈیشنر بھی نہیں تھا، نہ باتھ روم، نہ فلش سسٹم۔ وہ اس زمانے میں وہاں گئے تھے جب سورج سوا نیزے پر تھا۔ اس لیے دونوں فرش پر بستر کے بغیر سو جاتے تھے، تاکہ موزائیک کی ٹھنڈک سے ہی نیند آجائے۔ جرمن خاتون کا وہاں جانا ایک عجوبہ تھا۔ جب دونوں کسی گلی سے گزرتے تو لڑکے "میم" دیکھنے کے چکر میں پیچھے لگ جاتے تھے۔

1965ء میں اس کی کمرشل آرٹ گیلری کھولنے کی خواہش پوری ہوئی۔ اس نے اپنے ایک انگریز دوست آرٹسٹ پیٹر چناک کے اشتراک سے ایک آرٹ گیلری کھولی تھی جس کا نام "دی گیلری" تھا۔ نیچے گیلری تھی اور اوپری منزل پر اس کی رہائش گاہ تھی جہاں وہ لوسی کے ساتھ رہتا تھا۔

وہ گیلری کچہری روڈ پر تھی جو اَب ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے ساتھ۔ دوسری عمارتیں بھی گرا کر نئی عمارات قائم کردی گئی ہیں۔ اس گیلری کا افتتاح ذوالفقار علی بھٹو کو کرنا تھا، مگر 65 کی جنگ کے سبب وہ نہ آسکے۔ چناک ان کا انتظار نہ کرسکا اور گیلری بشیر کے حوالے کرکے واپس برطانیہ چلا گیا۔ گیلری چلنے لگی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے پاکستان میں سب سے پہلے گیلری کھولی تھی۔ اس سے پہلے مشرقی پاکستان کے پینٹر جہانگیر نے راول پنڈی میں ایک آرٹ گیلری بنائی تھی، لیکن کہا جاتا ہے کہ وہ گیلری سے زیادہ دکان تھی، جہاں مصوروں کے فن پارے فروخت ہوتے تھے۔ چنانچہ بشیر کا یہ دعویٰ کسی حد تک درست ہے کہ اس کی گیلری سب سے پہلی پاکستانی گیلری تھی۔

اس گیلری کے افتتاح کے وقت چالیس پچاس افراد آئے تھے اس کے بعد ایک ماہ تک بھولے بھٹکے لوگ آجاتے تھے۔ لوگوں کو ابھی آرٹ کا پتا نہیں تھا اس لیے اسے خریدتا کون؟ بشیر اس صورتِ حال سے آزردہ ہوا لیکن اس نے اپنی گیلری کو جاری رکھا۔ پھر ایک سال بعد اس کی سال گرہ بھی منائی۔ اس سال گرہ پر فیض احمد فیض نے بھی ایک پیغام بھجوایا تھا۔ اسی دور میں حکومتِ امریکا کی طرف سے بشیر کو ہوائی میں اسکالر کی پیشکش کی گئی۔ اس نے انکار کردیا اس لیے کہ پھر لوسی کو چھوڑنا پڑتا۔ وہ یقیناً جرمنی چلی جاتی، لہٰذا اس نے اسکالرشپ پر لوسی کو ترجیح دی۔ یہ اس کی بڑھی ہوئی خود اعتمادی تھی جس کا اسے بعد میں افسوس ہوا۔ اس نے سوچا اسکالرشپ تو بعد میں بھی مل سکتی ہے۔

انھی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اسے بلیک لسٹ کردیا۔ فیض صاحب نے اس سے کہا کہ ویت نام کمیٹی کا اجلاس کرنا ہے، تمھاری گیلری میں کرلیتے ہیں۔ وہ فیض صاحب سے انکار کیسے کرسکتا تھا۔ اس نے اجازت دے

دی۔ چنانچہ "دی گیلری" میں ویت نام کمیٹی کا اجلاس ہوا، ترقی پسند مقررین نے امریکا کے خلاف تقریریں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بشیر امریکا کے نزدیک "کمیونسٹ" بن گیا۔ ہوائی کی اسکالرشپ اسے دوبارہ نصیب نہیں ہوئی۔ بہر حال اسے لوسی پر ہی گزارہ کرنا پڑا۔

وہ کہتا ہے۔ "لوسی پر میرے فن کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ وہ بعد میں ایک بڑی پینٹر بن گئی۔ جرمنی میں آرٹ کے ایک مقابلے میں جہاں 118 پینٹروں کا کام رکھا گیا تھا، اس میں لوسی کو پانچواں انعام ملا۔"

☆☆☆

اس سوال پر کہ وہ نیوڈز کیوں بناتا ہے اس نے جواب دیا۔ "موسم برسات ہو یا موسم بہار، پھول کھلیں یا پت جھڑ ہو، درخت ایک موسم میں پتوں سے بے نیاز ہوجاتے ہیں اور ٹنڈ منڈ ہوجاتے ہیں۔ قدرت انھیں برہنہ کردیتی ہے تو پھر آرٹسٹ پر قدغن کیوں؟ پھر بازار میں عورتوں کو برہنہ کرنے والوں، جسموں کا کاروبار کرنے والوں کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا، لیکن سب آرٹسٹوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ پر کسی قسم کی اخلاقی ذمّے داری نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پینٹر کا عوام سے براہِ راست تعلق بھی نہیں ہے۔ میں تو تھہ پیٹ تو نہیں بیچتا، میری ذمّے داری تو تخلیق کرنا ہے۔ یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ میرے کام کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر انھیں میرا کام پسند آتا ہے، تو خوش آمدید۔ میں لوگوں کو ایجوکیٹ نہیں کرتا۔ میں کوئی کلاس ٹیچر نہیں ہوں کہ انھیں بتاؤں کہ ان کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے نیوڈز جنسی حیثیت کے حامل ہیں، مگر عریاں یا فحش نہیں ہیں۔ ایک فرد کی حیثیت سے آزادانہ اظہار میرا حق ہے اور میں یہی کچھ کر رہا ہوں۔ زمانہ قدیم سے نیوڈز مصوروں اور مجسمہ سازوں کا موضوع رہا ہے، پھر مجھ ہی پر اعتراض کیوں؟ میں لوگوں کو ... تفریح کا سامان کیوں مہیا کروں۔ میں کوئی اداکار یا گانے والا نہیں ہوں۔ میں جو کچھ بناتا ہوں اپنی تسکین کے لیے بناتا ہوں۔"

اس زمانے میں لوگوں کا رجحان آرٹ کی طرف اتنا نہیں تھا کہ پینٹنگز دھڑا دھڑ فروخت ہوتیں اور مصور کی زندگی آسائش کے ساتھ کٹ جاتی۔ یہ گیلری کچہری روڈ پر کھولی گئی تھی۔ وہ مکان جہاں آرٹ گیلری کھولی گئی نصرت بھٹو کی ملکیت تھا۔ کاروباری نقطۂ نظر سے وہ علاقہ آرٹ کے لیے موزوں نہیں تھا، مگر بشیر نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ اس گیلری کو آرٹ کی بنیاد بنائے گا۔

ستمبر 1965ء کی جنگ کے بعد اس نے اپنا غصہ پینٹنگز کی شکل میں بھارت کے خلاف نکالا۔ پینٹنگز کا عنوان "چیخیں" تھا۔ تقسیم کے وقت کا بھارت اس کے لاشعور میں بسا ہوا تھا، اس لیے اسے کینوس پر منتقل کردیا۔ امرتسر کی گلیاں اور کوچے اب بھی اسے شعلوں کی لپیٹ میں دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں اور شیطان صفت لوگوں کے قہقہے۔ یہ سب اسے یاد تھا۔ ان پینٹنگز میں زیادہ تر سورج کو سیاہ دکھایا گیا تھا، جو روشنی نہیں تاریکی بکھیر رہا تھا۔ یہ نمائش اپریل 1966ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ہوئی تھی۔

بچپن کا ایک اور واقعہ جو اس کے ذہن پر نقش ہوگیا تھا وہ بکری کی قربانی کا تھا۔ قربانی کے بعد بہنے والے لال لال خون کو دیکھ کر وہ بدحواس ہوگیا۔ اسے انسانوں کا وہ بہتا ہوا خون یاد آگیا جو اس نے تقسیم کے وقت دیکھا تھا، لہٰذا اس نے اپنی پینٹنگز میں لال رنگ کو بطور وحشت اور دیوانگی سے معنون کیا۔ اس نے بہت سی پینٹنگز میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو تمثیلی طور پر استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر 1990ء میں پینٹ کی گئیں سیاسی پینٹنگز جن کا عنوان "مہر بہ لب" تھا۔ بشیر مرزا کا خیال تھا کہ لوگوں کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگادی جاتی ہے اس لیے وہ اپنے جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کرپاتے۔ ان کا سب کچھ سینے میں ہی گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ اسے کینوس پر ظاہر کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں اکثر لوگوں کی آنکھیں نیلی نہیں ہوتیں، لیکن اس کی پینٹنگز میں جہاں جہاں بھی نیلا رنگ استعمال کیا گیا ہے وہ تمثیلی طور پر کرپشن اور گری ہوئی اخلاقیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح سے شوخ نارنجی، پیلا اور ہلکا سرخ اس نے ہندوستان کے علاقے راجستھان کی عورتوں کو پینٹ کرتے وقت استعمال کیا ہے۔ جبکہ بالکل سیاہ رنگ کو اس نے برصغیر کی عورتوں کے بالوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ ہرچند کہ وہ مغل آرٹ سے متاثر تھا، لیکن اس نے مغربی انداز کو اپنایا۔ اس کی پینٹنگز میں جہاں بھی سبز رنگ استعمال ہوا ہے وہ ممتا کے جذبے کو ظاہر کرتا ہے، جس میں قدرتی طور پر نسوانیت اور زرخیزی ہوتی ہے۔ گہرا بھورا اس نے زمین کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔

جنگ 65ء کی ان پینٹنگز اور ڈرائنگز کو روزنامہ لیڈر

کے مدیر سلطان احمد نے اپنے کالم میں سراہا۔" جنگ کی ہولناکیاں ان پینٹنگز سے بخوبی عیاں ہیں۔ بشیر کا کام نہایت عمدہ ہے۔"

نصرت بھٹو کو جب کچہری روڈ کے اس مکان کو فروخت کرنے کا خیال آیا تو انہوں نے بشیر مرزا سے کہا کہ وہ اپنی آرٹ گیلری کو کسی اور علاقے میں لے جائیں۔ بشیر مرزا نے اس بار سندھی مسلم سوسائٹی میں ایک مناسب جگہ تلاش کی اور گیلری کو وہاں منتقل کر دیا۔ پہلے والی گیلری کا نام صرف "دی گیلری" تھا، لیکن نئی گیلری کا نام "بی ایم گیلری" رکھا گیا۔ کیونکہ یار دوست اب اسے مختصر نام سے پکارنے لگے تھے۔

1966ء کے آخر میں اس نے "پاکستان کے چہرے" کے عنوان سے متعدد اسکیچز پیش کیے۔ جن میں سارے صوبوں کے لوگوں کو کینوس پر اجاگر کیا گیا تھا۔ ان آٹھ بین اسکیچز میں صرف ایک ٹون استعمال کیا گیا تھا۔ ان اسکیچز میں اپنے دیس کے لوگوں کی ہمت اور اولوالعزمی کو ظاہر کیا گیا تھا۔ بلاشبہ وہ اس سلسلے میں صادقین سے متاثر تھا، جنہوں نے رنگوں کے ساتھ لائن ورک کا ایک حسین امتزاج پیش کیا تھا۔ یہ اسکیچز تجریدی کی بجائے حقیقت پسندانہ تھے۔ یہ اسکیچز چھوٹے تھے اور فائلوں میں رکھ کر فروخت کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ ان اسکیچز میں کوئی خاص بات نہیں تھی، البتہ اس کا کام متاثر کرتا تھا۔ خاص طور پر جہاں اس نے لکیروں کو گنجان کر کے گہرائی کا تاثر دیا تھا اور سفیدی کو ابھار کے طور پر استعمال کیا تھا۔

اس کے علاوہ اس نے دوسری سیریز "پاکستان کے لوگ" بنائی جس میں مشہور اور باوقار لوگوں کی قدِآدم پینٹنگز بنائیں۔ ان میں قائد اعظم محمد علی جناح، فیض احمد فیض، جالب، احمد فراز اور بے نظیر شامل تھے۔

یہ سب کام ہو رہا تھا، لیکن ملکی اقتصادی حالت ابتر تھی، کیونکہ جنگ تو ختم ہو چکی تھی، لیکن اس کی ہولناکیاں اب تک سروں پر منڈلا رہی تھیں۔ ایسے میں پینٹنگز کی طرف کون توجہ دیتا؟ آٹا بہرحال ہر چیز پر مقدم ہوتا ہے، کیونکہ اس سے روٹی تیار ہوتی ہے۔ جب معاشی دباؤ بڑھا تو اس نے اپنا قیمتی فلیٹ چھوڑ کر ایک کم تر درجے کا فلیٹ تلاش کر لیا۔ "پاکستان کے چہرے" کے بعد اس نے چند اور کتابچے نکالے، مگر بات نہیں بنی۔ پھر اس نے ایک میگزین شائع کرنا شروع کر دیا جس کا نام "آرٹسٹک پاکستان" تھا۔ چند شمارے شائع کرنے کے بعد اس کا وہی حشر ہوا جو کہ موضوعاتی میگزینوں کا حشر وطنِ عزیز میں ہوتا ہے۔ اس نے میگزین شائع کرنے کی ذمے داری علی رضا کے سپرد کر دی جو علی امام کا بھائی تھا اور خود اس ذمے داری سے علیحدہ ہو گیا۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ان دنوں آرٹ تو فروغ پا رہا تھا لیکن خریدار اب بھی نہیں تھے۔ میرے اسٹوڈیو میں باہر سے غیر ملکی خواتین آتی تھیں۔ پینٹنگز دیکھتی تھیں، ان کی تعریف کرتیں، پھر اپنے ہینڈ بیگ میں سے کوئی رنگین پھولدار کپڑا نکال کر سامنے رکھ دیتیں اور کہتیں کہ ان رنگوں کی کوئی پینٹنگ دے دو۔ میں ان دنوں واٹر کلر سے کام کر رہا تھا، ایسی خواتین کے لیے کام کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ ان کے حوالے کر دیتا۔ اس کام کو میں ٹورسٹ پینٹنگز کہا کرتا تھا۔

معاشی دباؤ کا تو شکار تھا ہی مصوری کی راہِ پُرخار پہ چلتے ہوئے وہ اپنی محبت کی بازی بھی ہار بیٹھا۔ جرمن حسینہ لوسی نے اسے چھوڑ کر ایران جانے اور پھر جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس ناتمام محبت پر بشیر بہت آزردہ ہوا۔ اس نے اپنی گیلری سلطان احمد ڈائریکٹر یونائیٹڈ ایڈورٹائزرز کو فروخت کر دی اور اپنی محبوبہ کے ساتھ جرمنی کا رختِ سفر باندھ لیا۔

1969ء اس کے سفر کا سال تھا۔ جرمنی جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ پاکستان کے چیدہ آرٹسٹوں کی پینٹنگز لے گیا۔ جن میں احمد پرویز، جمیل نقش، ظہور الاخلاق، منصور اے، راشد آرائیں شامل تھے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے آرٹسٹوں کی بھی پینٹنگز شامل تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے کی مدد سے میونخ، ہنٹ گارٹ، کولوج اور کرفلڈ میں ان پینٹنگز کی نمائش کی۔ پھر اس نے بین الاقوامی سطح کے شو میں شرکت کی اور پیرس اور ٹوکیو گیا۔ وہ لوسی کے چکر میں گیا تھا مگر اب اس نے لفٹ نہ دی کیونکہ اس کے سر میں بڑا پینٹر بننے کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے بشیر کو اس دنیا میں یکہ و تنہا چھوڑ دیا۔

واپس آ کر اس نے جرمنوں کی تعریف کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جرمنوں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سرد مزاج اور اکھڑ ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا رویہ میرے لیے دوستانہ اور بڑی حد تک مشفقانہ تھا۔ وہ مجھ سے نرم و ملائم لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ اس نے بتایا کہ اس نے بہت سے آرٹسٹوں سے ملاقاتیں کیں، لیکن ان سے تعلقات نہ بڑھا سکا اس لیے کہ میرے پاس اتنی رقم ہی نہیں ہو پاتی تھی کہ میں انہیں کہیں مدعو کر سکوں۔ یہ دو سال بشیر کے لیے بہت جاں

گسل اور عذاب ناک تھے۔ وہ جہاں چاہتا سو جاتا اور جو مرضی آتی کھا لیتا۔ شراب خوب پی لیکن وہ خود کہتا کہ میں کتنی پی سکتا تھا؟ تاہم اس نے آرٹ کے وسیلے سے مشاہدات کیے اور بہت کچھ اپنے میں جذب کیا۔ بشیر نہایت کرب سے کہا کرتا تھا کہ صرف کاروباری افراد ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں چاہے چلے جاتے ہیں اور جہاں چاہے قیام کر لیتے ہیں۔ مگر ایک آرٹسٹ صرف اپنے ہی ملک میں گھوم پھر سکتا ہے اور یہیں لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کی بیش بہا آسائشوں کے بارے میں سوچ سکے۔ بالآخر وہ جرمنی سے واپس آ گیا۔ اس نے بتایا۔ "جب میں نے ایک آرٹ گیلری میں پینٹنگز سجائیں تو اور لوگوں کو پتا چلا کہ پاکستان سے ایک آرٹسٹ پینٹنگز لے کر آیا ہے تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں آرٹ نام کی بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ بہرحال جب انہوں نے مختلف مصوروں کا کام دیکھا تو اسے سراہا۔"

1971ء میں اس نے چار آرٹسٹوں کا شو انڈس آرٹ گیلری میں منعقد کیا۔ جن میں گل جی، علی امام اور منصور علی شامل تھے۔ منصور علی نے سندھ کی ثقافت پیش کی تھی، جب کہ علی امام نے اپنے سنجیدہ مزاج سے ہٹ کر شوخ اور بولتی ہوئی پینٹنگز بنائی تھیں۔ گل جی نے دھنک رنگوں کا استعمال کیا تھا اور قدرتی مناظر پینٹ کیے تھے۔ جب کہ بشیر مرزا نے نیوڈز پینٹ کیے تھے۔ اس کے دل میں لوسی کا درد جاگزیں تھا۔ جسے اس نے ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ یہ اس کی آزاد نظم سے بھی ظاہر ہوتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

وہ آئی تھی ایک دور کی سرزمین سے
جرمنی کے رنگوں میں ملبوس
اس کی کوئی خواہشات نہیں تھیں
وہ انبوہ میں بے لباس تھی
سب دم بخود رہ گئے
(حالانکہ ہر ایک دل ہی دل میں اس کی توصیف کر رہا تھا)
مگر افسوس
چاروں طرف سے سرگوشیاں ابھرنے لگیں
لوگوں نے اس کی طرف سے پیٹھ کر لی
لڑکی کو اس کا احساس ہی نہیں ہوا
لوگوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا
کبیدہ خاطر اور رنجور
وہ بے چاری تنہا لڑکی
اوہ! اس کی پروا نہ کرو
یہ ملاؤں کے طور طریق ہیں
لباس پہنو، سیدھے ہو کر چلو۔۔۔ سر جھکا کر چلو
جب کوئی تمہاری توصیف کرے
تو اپنا سینڈل اسے کھینچ مارو
اوہ! وہ بے چاری
ایک دور کی سرزمین سے آئی تھی

☆☆☆

1971ء کے آخر میں اس نے اپنی پینٹنگز کی سولو نمائش کی اور اس کا نام "تنہا لڑکی سیریز" رکھا۔ اس سیریز میں 40 پینٹنگز پیش کی گئی تھیں۔ وہ سب نیوڈز تھیں۔ مکمل نیوڈز تو نہیں مگر کچھ اس طرح سے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ اس پر ملک بھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ بشیر کا کہنا تھا کہ وہ مجبور و مقہور صنفِ نازک کی نمائندگی تھی جو اس کہن رسیدہ معاشرے میں پس رہی تھیں۔ جب بشیر کو سیول اولمپکس گیمز میں مدعو کیا گیا تو اس نے اپنی یہ سیریز سیول کی انتظامیہ کو تحفے میں دے دی، جو وہاں کے عجائب گھر میں لگا دی گئی۔ اس سیریز کا خیال اسی جرمن لڑکی لوسی نے پیش کیا تھا، جس کی محبت میں بشیر مرزا گرفتار ہوا اور اپنا سکھ اور چین گنوا بیٹھا تھا۔ بشیر نے خود کہا کہ "تنہا لڑکی سیریز" کا خیال اسے یورپ کے دورے کے بعد آیا۔ وہاں شخصی آزادی تو بہت ہے لیکن اس کے باوجود مجھے صنفِ نازک کچلی ہوئی مخلوق لگی۔

اس نمائش کے بعد لوگوں کے مزید نزدیک آنے کے لیے بشیر مرزا نے اخبارات اور رسائل کے لیے اسکیچز بنانا شروع کر دیے، نظمیں کہنے لگا، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ کرافٹس کراچی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے پڑھانے لگا۔

1971ء میں بنگلہ دیش علیحدہ ہو گیا۔ بھارت نے اسے سب طرف سے گھیر کر درندگی کی انتہا کر دی۔ ہمارے ملک پر سوگواریت چھا گئی۔ عنانِ حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں آ گئی۔ جو ایک پُرجوش اور انقلابی لیڈر کی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا چکے تھے۔ اس زمانے میں بشیر بھٹو سے بہت متاثر تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک یادگار بنائے جس پر بھٹو کی پہلی تقریر کا وہ جملہ لکھا ہو "اب ہم ان

ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر نیا پاکستان بنائیں گے۔"
بشیر مرزا نے اس یادگار کا ڈیزائن بنالیا تھا۔ ایک شخص جس کے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھے ہوئے تھے، ایک ہاتھ میں کلہاڑی لیے ہوئے تھا۔ یہ بھی منظور ہوگیا تھا کہ کسی بھارتی طیارے کو پگھلا کر اس کی دھات سے مجسمہ بنایا جائے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ سناٹا چھا گیا اور وہ پراجیکٹ کسی اور "چیتے" کو دے دیا گیا۔ بشیر دل شکستہ ہوگیا۔

اس نے "جمہوریت کی صبح" کے عنوان سے بہت سی پینٹنگز بنائیں جس کا افتتاح بیگم نصرت بھٹو نے کیا اور نمائش میں شریک ہونے والوں نے اس کی جدوجہد کو سراہا۔ اس بار تعریف و توصیف کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے کہ آرٹ کی سرپرستی حکومت کی طرف سے ہو رہی تھی۔ 1972ء میں اس نے ایک اور گیلری بنائی جس میں اسٹوڈیو اور ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ ایجنسی کی طرف زیادہ مائل ہوگیا اور اشتہاری فلمیں بنانے لگا۔ اس دوران میں اس کی پینٹنگ کا کام متاثر ہونے لگا مگر بہرحال ایجنسی کا نام اخبارات کی زینت بننے لگا۔

وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ایک ترقی پسند اور انقلابی حکمراں تھے۔ وہ ہر چیز کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے دور میں آرٹ پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ انہیں بشیر مرزا کا کام پسند تھا۔ انہوں نے پیش کش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس میں عہدے دار بن سکتا ہے یا پھر نیف ڈیک میں کوئی عہدہ قبول کرلے۔ بشیر نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ حکومت کے عہدے قبول کرنے کے بعد انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ سیدھی سادی ملازمت کرتا ہے اور ایک اچھا کلرک بن جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں۔

اسی زمانے میں اس کے دل میں آرٹ کو عام کرنے اور اس کے بارے میں تعلیم دینے کا شوق ابھرنے لگا۔ اس نے ایک چھوٹا سا انسٹی ٹیوٹ کھول لیا۔ اس اسکول میں طالب علموں نے داخلہ لیا۔ وہ دیر سے آنے والے طالب علموں کی فہمائش کرتا تھا۔ اس کے پڑھانے کا انداز دوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ تین دن کے لیکچر تیار کر لیتا۔ پھر اسکول کے دروازے بند کروا دیتا اور درس دینا شروع کردیتا۔ اس دوران کسی کو باہر جانے یا باہر سے اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی۔

اپنی آیندہ نمائش اس نے 1978ء میں لگائی جس کا نام "پھولوں والی لڑکی سیریز" تھا۔ یہ "تنہا لڑکی" سے ملتا جلتا تجربہ تھا۔ جس میں لڑکیاں صرف اوپری جسم اور پھولوں کے ساتھ تھیں۔ رنگوں کا استعمال بھی تقریباً پہلے جیسا تھا۔

بشیر مرزا روایتی آرٹسٹ نہیں تھا۔ اس کا انداز تھا کہ وہ نمایاں لکیروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کے اسٹروکس عموماً عمودی ہوتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ لوگ یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ وہ نمایاں لکیروں سے ہی کام کر سکتا ہے، اس نے 1980ء میں منیچر پینٹنگز بنائیں، لیکن ان کا سائز پوسٹ کارڈ کے برابر تھا۔ (منیچر پینٹنگز عام طور پر بہت چھوٹی ہوتی ہیں) وہی بادشاہ، ملکہ، ان کی کنیزیں اور دربار کا ماحول۔ رنگوں کا استعمال اس نے مختلف کیا تھا۔ اجسام گہرے رنگوں کے، ہونٹ گلابی، آنکھیں کشادہ اور معمول سے بڑی۔ اس کی یہ سیریز نہایت دل کش اور جدید تھی۔ مداحوں نے اس کا کام پسند کیا۔

1977ء میں ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو مصوروں کو سانپ سونگھ گیا۔ سب پر سکتہ طاری تھا کہ وہ کیا کریں؟ بشیر مرزا بھی ٹامک ٹوئیاں مارنے لگا۔ اس سے کچھ نہ ہوسکا۔ اس اثنا میں اس نے بہت کم کام کیا۔ البتہ جب مارشل لاء ہٹا تو اس نے ایک مہینے میں ہی ایک سو پینٹنگز بنا ڈالیں۔ گویا اس کے تخلیقی سوتے سے ایک دھارا پھوٹ پڑا۔ یہ اتنا کام تھا کہ جو اس نے گزشتہ دس برس سے نہیں کیا تھا۔

تاہم 1989ء میں جب بے نظیر کی حکومت آئی تو وہ پھر تجریدی آرٹ کی طرف آ گیا۔ اس نے ایک سیریز "دوسرے سیارے سے آنے والی آوازیں" بنا ڈالی۔ منیچر سے تجریدی آرٹ کی طرف آنا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی شاہانہ لباس اتار کر تھری پیس سوٹ پہن لے۔ تاہم اس کے کام میں انفرادیت تھی، اس لیے اس کا کام پسند کیا گیا۔

بشیر مرزا میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ کبھی لکیر کا فقیر نہیں رہا۔ اگر "تنہا لڑکی کی سیریز" میں اس نے آئل پینٹ کو اپنا میڈیا بنایا تو "مہر بہ لب" میں ایکریلک کو۔ اس نے تجریدی آرٹ، حقیقی آرٹ، اور نان آبجیکٹو پر طبع آزمائی کی۔ اس کی پینٹنگز میں شدت اور جذبات کی بھرپور طاقت ہوتی تھی۔ وہ اپنی پینٹنگز میں تمثیل کا بھی سہارا لیتا تھا۔ وہ بہرحال ایک عظیم مصور تھا اور مصوری اس کا اوڑھنا بچھونا تھا لیکن اس کے باوجود وہ عوام الناس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جو کچھ بنائے وہ لوگوں کی سمجھ میں بھی آجائے، تاکہ

خیالات کی ترسیل ہوتی رہے۔ سیاست، عمرانیات اور ثقافت اس کے دیرینہ عنوانات تھے۔ اپنے ان رجحانات کی بنا پر وہ او صاف حسین "بوہیمیں طرز فکر" کے آرٹسٹ کہلائے۔

جب آرٹ گیلری سے زیادہ آمدنی نہیں ہوئی تو اس نے گیلری بند کر کے اشتہاری ایجنسی کھول لی۔ یہ ایجنسی بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کی زندگی سے مفلسی اور درماندگی کا نقاب اتر گیا۔ اب وہ لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ چونکہ اس کے خاندان والوں سے تعلقات خوش گوار نہیں تھے، اس لیے وہ تنہا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے واڈکا تھی اور دوستوں کی محفلیں۔ وہ بات بات پر "پارٹی" دیتا تھا اور دوستوں کے درمیان رہنا پسند کرتا تھا۔ تنہائی میں رہنے سے اسے ڈپریشن ہوگیا تھا۔ جب وہ زیادہ نشے میں ہوتا تو اس کی حالت غیر ہوجاتی اور وہ رونے لگتا۔ وہ کہتا۔ "میری دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میری جرابیں اور کپڑے دھونے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر میں بیمار پڑ گیا تو مجھے ڈاکٹر کے پاس کون لے جائے گا؟"

تنہائی کا یہ کرب ناک احساس تھا جو اسے اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا۔ اس تنہائی کو دور کرنے کے لیے اس نے اپنے آفس کی ایک لڑکی نوشین سے شادی کرلی۔ وہ معمولی شکل و صورت کی مسکین لڑکی تھی۔ نکاح آفس میں ہوا۔ بشیر نشے میں دھت تھا۔ قاضی صاحب نے اسے دیکھا تو کہا کہ میں یہ نکاح نہیں پڑھا سکتا اس لیے کہ یہ نشے میں ہیں۔ نشہ حرام ہے۔ جب حاضرین نے ان کی منت سماجت کی تو راضی ہوگئے۔ مولانا نے بشیر سے کہا کہ وہ کلمہ پڑھے۔ اس نے نشے میں ہونے کے باوجود بالکل صحیح کلمہ پڑھا۔ مولانا نے کہا دوبارہ پڑھیں۔ اس نے دوبارہ بھی صحیح پڑھا۔ یوں نکاح ہوگیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ نکاح اسلام آباد میں ہوا تھا۔ جب وہ کراچی آیا تو نوشین کے والدین نے کہا کہ ہم اس نکاح کو نہیں مانتے، نکاح ہمارے سامنے ہوگا۔ بشیر اپنے خاندان والوں کو بھی بلائے۔ بشیر کے خاندان والوں سے تعلقات خراب تھے۔ بہرحال اس نے اپنی بہن کو بلا لیا۔ نکاح دوبارہ ہوا۔ ولیمہ فائیو اسٹار ہوٹل میں دیا گیا۔

نوشین کو بشیر کی تنہائی دور کرنے سے زیادہ اپنے لیے آرام و آسائش درکار تھی۔ اس کی نظر بشیر کی دولت پر تھی جسے لوٹنے کے لیے اس نے شادی سے پیشتر ہی اس سے تعلقات استوار کرلیے تھے۔ یہ بیل زیادہ عرصے منڈھے نہ چڑھ

سکی۔ ان میں طلاق ہوگئی۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہ تھیں۔ دونوں کی عمروں میں کافی فرق تھا، شادی جذباتی انداز میں بلا سوچے سمجھے کی گئی تھی۔ سب سے بڑی وجہ اس کی شراب نوشی تھی۔ اب اسے شدت سے ہچکیاں آنے لگی تھیں۔

1994ء میں وہ پاکستان کے ثقافتی اتاشی کی حیثیت سے آسٹریلیا گیا۔ اس وقت اس کی طبیعت ناساز تھی۔ وہاں بابو ٹائپ زندگی اسے پسند نہیں آئی تو وہ ایک برس کے بعد وطن عزیز آگیا۔ ناسازیٔ طبع کی بنا پر اس نے اپنے برش اور رنگ ایک طرف رکھ دیے۔ کافی عرصے آرام کرنے کے بعد 1999ء میں اس کا کام چوکنڈی آرٹ گیلری میں دیکھا گیا۔ بیماری اس پر غالب آرہی تھی۔ زبان میں لکنت آچکی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ، بہت زیادہ واڈکا پینے سے اسے ہچکیوں کی بیماری ہوگئی۔ اپنے ساتھیوں سے بہرحال کوئی پردہ نہیں تھا، البتہ جب وہ کسی اجنبی سے گفتگو کرتا تو اپنے منہ کے آگے اخبار یا کوئی رسالہ رکھ لیتا۔

ایک بار پیٹ میں درد کی شکایت ہوئی تو اسے اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں اپنڈیکس کا آپریشن ہوا، دوائیں تو اس نے چھپ چھپ کے کھالیں، لیکن اپنے ایک دوست کے ذریعے سے واڈکا بھی منگوالی۔ ڈاکٹر نے بوتل دیکھ لی تو تنبیہ کی کہ وہ شراب چھوڑ دے ورنہ یہ شکایات کبھی نہیں جائیں گی۔

بشیر مرزا کے فن کی پہلی نمائش 1963ء میں کراچی میں ہوئی تھی، اس کے فن پاروں کی آخری نمائش 1999ء میں ہوئی۔ پہلی پینٹنگ اسی روپے میں فروخت ہوئی۔ جبکہ آخری نمائش میں دس فن پارے دس لاکھ روپے میں فروخت ہوئے۔ ان دونوں نمائشوں میں چھتیس برس کا پُرخار اور صبر آزما وقت پھیلا ہوا ہے۔ اس نے تھک کر بیٹھنا نہیں سیکھا۔ اس نے کئی روپ اختیار کیے۔ بہت سے انداز اپنائے۔ میڈیم تبدیل کیے۔ متعدد جہتیں سامنے آئیں، اس نے اپنی گہرائی اور گیرائی سے نت نئے ڈھنگ نکالے۔ اس کے فن کا کمال یہ ہے اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ کہتا تھا کہ آرٹ کی تعریف یہ ہے کہ اسے دوبارہ نہ بنایا جاسکے۔ میری "تنہا لڑکی" پر سب مرتے ہیں، لیکن میں اب اسے بنانا چاہوں تو نہیں بنا سکتا، اس لیے کہ وہ کرافٹ نہیں تخلیق ہے۔ بالکل ایک جیسی تخلیق دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔

5 جنوری 2000ء میں وہ انتقال کرگیا۔ جس ڈاکٹر نے اس کی موت کا اعلان کیا اس کا کہنا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ تاہم حقیقت یہ تھی کہ اسے تنہائی کا عارضہ لاحق

تھا۔ وہ اسی کے سبب دنیا سے سدھار گیا۔ وہ عموماً ساڑھے دس بجے تک بستر سے اٹھ جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اپنے طالب علموں کو آرٹ کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ لیکن 5 جنوری کو اس کے طالب علم 11 بجے تک آگئے، لیکن وہ اپنے بستر سے نہ اٹھا۔ طالب علموں نے تین گھنٹے تک انتظار کیا پھر اس کے ڈرائیور کو بلایا اور دروازہ کھولا تو وہ زندگی کے آخری سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ چوکنڈی میں ہونے والی آخری نمائش میں اس نے کہا تھا کہ وہ دنیا میں تنہا ہے اور یہ تنہائی اسے مارے ڈال رہی ہے۔ اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا کہ کیا اب میں دیواروں سے باتیں کروں؟

اس کی زندگی میں تصنع اور رکھ رکھاؤ بھی نہیں تھا۔ زندگی اتنی سادہ تھی جیسے کھلی کتاب۔ بلاشبہ وہ ایک بڑا مصور تھا، لیکن اس میں بڑے خاندانوں جیسا کروفر نہیں تھا۔ جو مل گیا وہ پہن لیا (زیادہ تر وہ جینز پہنتا تھا) کھانے کا بھی خصوصی اہتمام نہیں تھا۔ سوات سے آئی ہوئی ایک خاتون اس کے ہاں ملازم تھی اور وہی اس کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اس کا اسٹوڈیو ایک رہائشی علاقے میں تھا، مگر ایک بنگلے کا پچھلا حصہ۔ اسٹوڈیو کے اس نے دو حصے کر دیے تھے۔ اگلے حصے میں لوگ کام کرتے تھے جب کہ اسٹوڈیو اس کے بعد پڑتا تھا۔ ہر طرف رنگ بکھرے ہوئے۔ اسے ایکریلک سے کام کرنا پسند تھا۔ اس لیے کہ وہ جلدی سوکھ جاتا ہے۔ مہمانوں کے لیے وہاں بید کی کرسیاں پڑی تھیں اور فرش پر ہرن کی کھال کا ایک ٹکڑا۔ دیوار پر اس ٹکٹ کی تصویر لگی تھی، جو اس نے ابتدائی دنوں میں پرنٹنگ پریس کے لیے بنایا تھا۔ اسے موسیقی کا بھی شوق تھا۔ وہ ٹیپ ریکارڈر پر ٹی ایس ایلیٹ، مہدی حسن اور باب ڈیلن کے گانے سنتا رہتا تھا۔ مہدی حسن سے اتنا عشق تھا کہ اس نے "جب رنگوں کے نغمے" نامی پینٹنگز نمائش کے لیے رکھیں تو اس کا افتتاح کرنے کے لیے مہدی حسن کو بلایا۔ ان پینٹنگز میں خاص بات یہ تھی کہ ان میں برش کا استعمال بہت ہی کم تھا، رنگوں کو ٹیوب سے نکالتے ہوئے اس نے لہریے بنائے اور براہ راست کینوس پر پھیلا دیے۔ اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ جیسے رنگ نغمہ بار ہوں۔

برصغیر ہندو پاک کے جس مصور کے ہاں آپ جائیں گے وہاں دو چار چیزیں قدیم زمانے کی ضرور رکھی دکھائی دیں گی، جنہیں نوادرات میں شامل کیا جا سکے گا، مثال کے طور پر قرآن پاک کی قدیم خطاطی، کانسی کا کوئی برتن (ایک مصور کا دعویٰ ہے کہ اس کے پاس وہ پیالہ بھی ہے جس میں سقراط نے زہر پیا تھا)، بدھا کا کوئی مجسمہ جو تبت میں بھی کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ خلا نورد چاند سے جو مٹی کھود کر لائے تھے وغیرہ۔ اس کے برعکس بشیر مرزا کی سوچ جدید تھی، اس لیے اس کے ہاں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی۔

اساتذہ میں وہ چار پینٹروں کا مداح تھا۔ اس نے بتایا "عبدالرحمن چغتائی نے ایرانی منی ایچر کی توسیع کی ہے۔ ان کی واش ٹیکنیک کی تو کوئی کاپی نہیں کر سکتا۔ استاد اللہ بخش ماسٹر آف کلرز تھے۔ انہیں خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کتنے عظیم آرٹسٹ ہیں۔ حاجی شریف روایتی آرٹ فارم میں منفرد تھے۔ وہ اپنی کمپوزیشن ہی نہیں بلکہ اپنے برش اور رنگ بھی خود ہی بناتے تھے۔ اس کے علاوہ شاکر علی نے بھی کوئی تصویر بری نہیں بنائی اور نہ اس خیال سے بنائی کہ اسے فروخت کرنا ہے۔"

1995ء میں اسے حسن کارکردگی (پرائڈ آف پرفارمنس) کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2006ء میں محکمۂ ڈاک و تار نے وطن عزیز کے دس نامور مصوروں کی یاد میں ڈاک کے ٹکٹ نکالے جن میں بشیر مرزا، صادقین، لیلیٰ شہزادہ، زبیدہ آغا، علی امام، شاکر علی، ظہور اخلاق، احمد پرویز اور عسکری میاں ایرانی شامل تھے۔

اس سوانح میں جن کتابوں اور مضامین سے مدد لی گئی:

۱۔ دی لاسٹ آف دی بوہیمین، بشیر مرزا۔ مارجوری حسین۔ (آرٹ کی نقاد)

۲۔ بشیر مرزا۔ ایس امجد علی۔

۳۔ بشیر مرزا۔ وکٹر آنند۔ (انڈیا)

۴۔ ایک آرٹسٹ کی کہانی۔ مارجوری حسین (آرٹ کی نقاد)

۵۔ پینٹ کرنے کی آزادی۔ دیپا گہرار (ٹائمز آف انڈیا)

۶۔ بشیر مرزا کی نمایاں لائنیں۔ حمید زمان (رپورٹر مارننگ نیوز)

۷۔ مطلوب شخص۔ علی امام (عظیم پینٹر)

۸۔ چونکا دینے والا پینٹر۔ اے بی ایس جعفری (دہلی)

۹۔ پیغام دینے والا میڈیا۔ نجمہ بابر

۱۰۔ تنہا لڑکی۔ نیلوفر فرخ

۱۱۔ دو مصور۔ شفیع عقیل

شطرنج

محمد ایاز راہی

برصغیر کا ایجاد کردہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جسے عقل کو کند کرنے کے لیے کھیلتے تھے۔ آج بھی اسے کامیابی سے وہی کھیل سکتے ہیں جن کی عقل تیز ہو۔ اسے عالمی پیمانے پر پسند کیا جاتا ہے۔ ہر ملک میں اسے پذیرائی حاصل ہے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ خالصتاً برصغیر کا کھیل ہے۔

[illegible]

وقت گزاری اور دل پشوری کے لیے مختلف قسم کے کھیل ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہیں۔ جانور اچھل کود کر کے، ایک دوسرے کو دھکے دے کر، طاقت آزمائی کر کے خوش ہو لیتے ہیں مگر اشرف المخلوقات انسان نے دل خوش کرنے کے لیے نت نئے طریقے ڈھونڈے ہیں۔ طرح طرح کی راہ تلاش کرتے ہیں اور نئے نئے کھیل ایجاد کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر کھیل کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جسمانی کھیل اور ذہنی کھیل۔ ذہنی کھیلوں میں

262 قبل مسیح۔ بہت ہی خوف ناک اور بھیانک منظر تھا۔ گھمسان کا رن پڑ تھا دونوں لشکر پورے جوش و خروش سے برسرِ پیکار تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے شکست دینے میں کوشاں تھے۔ تیروں کی سنسناہٹ ڈھالوں کے ٹکرانے اور کھانڈوں کے بجنے سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ شانوں پر سے سر کٹ کر گیندوں کی مانند اچھل اور گر رہے تھے۔ اڑیسہ (بھارت) کا میدان جنگی رقص گاہ بنا ہوا تھا جہاں شو دیوتا بڑے وحشیانہ جوش سے پنا تانڈو ناچ رہا تھا شو کے پجاری اپنے دیوتا کو لاشوں اور کٹے پھٹے جسموں کی بھینٹ دے رہے تھے۔ جسمانی قوت کے ساتھ ساتھ فنِ سپاہ گری کا جوشیلا اظہار دونوں طرف سے اپنی انتہا پر تھا۔ برِ عظیم ہندوستان کا پہلا اور آخری ہندو شہنشاہ مہاراجا اشوک بہ نفسِ نفیس میدان کارزار میں موجود اپنے لشکر کی قیادت کر رہا تھا اس کی موجودگی سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے ہر سپاہی جان توڑ کر لڑ رہا تھا۔ عظیم مہاراجا اشوک اپنے باپ راجا بندوسار کے عہد میں ٹیکسلا یا تکشا شیلا (ٹیکسلا۔ پاکستان) پر کامیاب ماتحت وزیر کی حیثیت سے حکومت کر چکا تھا اس کی انتظامی صلاحیتیں وہاں تجربے سے مزین ہو کر جلا پا چکی تھیں۔ اور اب باپ کے انتقال کے بعد ہرات (افغانستان) سے سیام (تھائی لینڈ) اور کشمیر سے مدراس تک وسیع و عریض مملکت کا بلا شرکتِ غیرے حکمران تھا اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر فرائضِ حکومت بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا درمیان میں کلنگ (اڑیسہ۔ بھارت) کا خطہ غیر مفتوح تھا جسے وہ اس وقت فتح کرنے اور اپنی سلطنت کی تکمیل میں مصروف تھا۔ راجا چندر گپت موریا کا یہ عظیم الشان پوتا اشوک، مہاراجا سے شہنشاہ بننے کا آخری مرحلہ طے کرنے ہی والا تھا اس کے اقبال کا ستارہ اس وقت بلندی پر تھا دشمن اپنی ہاری ہوئی جنگ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا اور بالآخر کلنگ (اڑیسہ۔ بھارت) کا رن مہاراجا اشوک کے ہاتھ رہا فتح و نصرت اس کی بلائیں لیتی ہے۔ مہاراجا اشوک کے برِ عظیم ہندوستان پہ پہلے، آخری اور واحد ہندو شہنشاہ بننے کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ ''ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما۔'' دشمن کے ایک لاکھ سپاہی رزم گاہ میں کھیت ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ جنگجو قید کثیر تعداد میں قیدی اور مالِ غنیمت سمیٹ کر مہاراجا اور اب شہنشاہ اشوک جب اپنی راج دھانی پاٹلی پتر (پٹنہ۔ بھارت) میں داخل ہوتا ہے تو اسی شہنشاہ کے طفیل برِ عظیم ہندوستان کو پہلی بار اک وحدت بنا نصیب ہوتا ہے۔ چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا برِ عظیم ہندوستان یکجا اور یک جان ہو کر اک پرچم تلے واحد مملکت بنتا ہے اس پرچم کو اشوک چکر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے (جو آج بھی بھارت کا قومی پرچم ہے) گویا شہنشاہ اشوک اپنی ہندو قوم کو نہ صرف ایک عظیم مملکت بلکہ ہمیشہ کے لیے ایک غیر متنازع پرچم بھی عطا کرتا ہے۔ جھنڈے پر چکر یا دائرے کا نشان بہت سی علامتوں کا مظہر ہے۔ 1۔ بھگوان وشنو جی کا ہتھیار (سدرشن چکر)۔ 2۔ ایک فوجی بندش یعنی جنگ کے وقت فوج کو ایک دائرے میں حلقہ کی طرح آراستہ کر کے لڑانا۔ 3۔ حرکت زمانہ کی تاویل میں قدیم ہند کا فلسفہ کہ زمانہ ایک دائرے (چکر) میں حرکت کرتا ہے اور ہر دس ہزار سال بعد اپنا دائرہ (چکر) مکمل کر کے اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ 4۔ آواگون کے چکر کی علامت کہ آدمی بار بار پیدا ہو کر اگلے جنموں میں آتا اور جاتا رہتا ہے۔ نیک کام کرنے والا اگلے جنم میں اعلیٰ انسان بن کر پیدا ہوتا ہے اور برے کام کرنے والا بری جگہ پر شیطان یا جانور کی صورت جنم لیتا ہے۔ کالنگ یا کلنگ (اڑیسہ۔ بھارت) کی شاندار فتح اپنی جگہ، مگر یہ خوں ریز لڑائی فطری طور پر نیک دل شہنشاہ کی کایا پلٹ دیتی ہے ہزاروں دکھوں آدمیوں کا بہیمانہ قتل اسے پشیمانی، تاسف اور افسردگی میں مبتلا کر دیتا ہے وہ سچے دل سے تائب ہو کر آہنسا (عدم تشدد) کا پیروکار بن جاتا ہے مخلوقِ ارضی کو زیادہ سے زیادہ سکھ پہنچانا اس کا مسلک بن جاتا ہے اپنے نام اشوک کا اس پہ بہ تمام و کمال اثر ہوتا ہے اشوک سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں سکھ، چین، آرام، دسہا دھومت اختیار کرنے والا شہنشاہ اشوک پھر ساری عمر بنیادی نیکیوں اور سچائیوں کی عملی تبلیغ کرتا ہے۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

شطرنج کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ یہ خالصتاً ذہنی کھیل یا مشغلہ ہے۔ شطرنج بہت ہی قدیم کھیل ہے اس قدر قدیم کہ اس کھیل اور اس کے موجد سے متعلق مختلف روایات پائی جاتی ہیں۔ گوناگوں آراء ملتی ہیں لیکن ابھی تک کسی مستند روایت کا علم نہیں ہو سکا۔ شطرنج ایک شاہانہ انداز کی امیرانہ بازی یا کھیل ہے جو دو اشخاص کھیلتے ہیں۔ یوں کہ ہر کھلاڑی کے پاس سولہ مہرے ہوتے ہیں جن کو وہ جارحانہ اور مدافعانہ انداز میں چونسٹھ مربع خانوں کی بساط پر اس مقصد سے چلاتا ہے کہ مخالف کا سب سے اہم مہرہ یعنی بادشاہ ہر طرف سے اس طرح گھر جائے کہ کسی بھی خانے میں جانے سے بچت کی گنجائش نہ ہو اور اسے شہ مات دی جا سکے۔ مزید تعریف کچھ اس طرح کہ ایک کھیل جس کی بساط یا فرش پر دو مختلف رنگ کے چونسٹھ چوکور یا مربع خانے بنے ہوتے ہیں (عموماً یہ خانے سیاہ اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں) بتیس مہرے ہوتے ہیں۔ سولہ مہرے ایک رنگ کے اور سولہ دوسرے رنگ کے۔ ہر رنگ کا ایک بادشاہ، ایک وزیر، دو رخ (رتھ) دو گھوڑے (اسپ) دو ہاتھی (فیل یا پیل) اور آٹھ پیادے ہوتے ہیں۔ گویا دو لشکر آمنے سامنے صف آراء ہوتے ہیں۔ شطرنج کی ایجاد سے متعلق ایران اور ہندوستان ہر دو ممالک اپنا اپنا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اہلِ فارس کے نزدیک شطرنج فارسی کے لفظ شترنج کا معرب ہے یعنی فارسی لفظ شترنج تھا جو عربی میں شطرنج ہو گیا۔ صاحبِ فرہنگ رشیدی شترنج کے معنی مختلف قسم کا ملا جلا غلہ قرار دیے ہیں اور پھر وضاحت کرتے ہیں کہ اگر اس ملے جلے غلے کی آش (پتلی پکی ہوئی چیز جسے پی سکیں) پکائیں تو اسے آش شترنج کہتے ہیں اور اگر روٹی پکائیں تو نان شترنج کہتے ہیں۔ اسی طرح صاحبِ ''بہارِ عجم'' لکھتے ہیں کہ شطرنج کا لفظ فارسی کے ست رنگ کا معرب ہے اور ست رنگ فارسی میں لفظ مردم گیاہ (انسان نما گھاس) کے معنی میں ہے۔ چونکہ یہ گھاس اور اس کی جڑ آدمی کی صورت سے مشابہ ہے اور اس کھیل (شطرنج) کے اکثر مہرے انسان کے نام پر ہیں لہٰذا مجازاً اس کھیل کو ست رنگ کہنے لگے۔ بعض کے خیال میں لفظ شطرنج فارسی کا لفظ شد رنج ہے یعنی رنج گیا، ختم ہو گیا کہ فکر اور رنج میں اس کھیل سے طبیعت بہلتی ہے اور بعض کے نزدیک فارسی کے صد رنگ و رنگ بہ معنی حیلہ کا معرب ہے کہ اس کھیل میں سیکڑوں حیلے کرنے ہوتے ہیں۔ رنگ کے معنی حیلہ بھی ہیں۔ ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ شطرنج نوشیرواں بادشاہ کے لیے ایک حکیم نے ایجاد کی جس کا نام شش رنگ تھا اس لیے کہ اس کے مہرے چھ قسم کے ہیں یعنی 1۔ بادشاہ۔ 2۔ وزیر۔ 3۔ فیل یا پیل (ہاتھی)۔ 4۔ اسپ (گھوڑا)۔ 5۔ رخ (رتھ)۔ 6۔ پیادہ۔ رتھ ہندی زبان کا لفظ ہے ایک قسم کی دیسی گاڑی جو پرانے وقتوں میں جنگ کے دوران استعمال ہوتی تھی جس کے اوپر برجی بنی ہوتی تھی۔ رتھ بہ معنی کوٹ، قلعہ، حصار۔ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ محمد بن عباس کے بہ قول

عباسی خلیفہ مامون الرشید شطرنج کا بڑا دلدادہ تھا اور کہتا تھا کہ اس سے ذہن میں بڑی تیزی پیدا ہوتی ہے۔ شطرنج میں مامون نے بہت سی چیزیں ایجاد کیں۔ مامون کہا کرتا تھا کہ جو شخص مجھے شطرنج کھیلنے کے لیے بلاتا ہے گویا وہ مجھے بوجھل کر دیتا ہے۔ مامون اگرچہ اچھا کھلاڑی نہ تھا مگر شوق بہت رکھتا تھا اسی وجہ سے کہا کرتا کہ میں دنیا بھر کا انتظام کر سکتا ہوں مگر اس دو بالشت کے ٹکڑے پر تنگ ہو جاتا ہوں۔ اہلِ علم اور صاحب الرائے اس بات کی طرف میلان رکھتے ہیں کہ شطرنج دراصل اہلِ ہند کی ایجاد ہے اور اصل لفظ چترنگ ہے جو سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ چتر بہ معنی چار۔ اور۔ انگ بہ معنی بدن۔ جسم، عضو، چار عضو والا یعنی فوج۔ سنسکرت میں چترنگی اس فوج کو کہتے ہیں جس میں چار رکن (ہاتھی، گھوڑے، رتھ اور پیدل) ہوں۔ شطرنج میں بھی شاہ و فرزیں (وزیر) کے علاوہ چار ہی رکن (ہاتھی، گھوڑے، رخ (رتھ) اور پیادے ہوتے ہیں لہٰذا چترنگ یعنی چار عضو والا (لشکر یا فوج) نام رکھا گیا۔ کہتے ہیں کہ یہ راون (رام چندر جی کے مخالف اور سیتا جی کے اغوا کار) کی ایجاد ہے جو اس نے سیتا کا دل بہلانے کے لیے تیار کی تھی راون ہی کے حوالے سے غالباً یہ محاورہ بنا کہ شطرنج نہیں صد رنج ہے یعنی شطرنج کے کھیل میں وقت ضائع کرنے والے کو بہت تکلیفیں پہنچتی ہیں اس کی لت پھر چھوٹے نہیں چھوٹتی۔ روگ بن جاتی ہے۔

جہاں کو وضع جہاں پائمال رکھتی ہے
نئی طرح کی یہ شطرنج چال رکھتی ہے
(آسی)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شطرنج سنسکرت کے لفظ شت رنگ کا معرب (عربی نام) ہے کیونکہ لفظ شت سنسکرت میں بہ معنی صد (100) کے آیا ہے چنانچہ شت رنگ یعنی بہت سے رنگوں والا کھیل۔ صاحبِ نفاس

اللغات کے مطابق قاضی ابن خلقان اپنی کتاب رفعیات الاعیان میں لکھتے ہیں کہ شطرنج کا صحیح موجد حکیم صصہ (سسہ) بن داہر ہندی ہے جس نے اس کھیل کو شاہ شیران کے نام پر اختراع کیا۔ سبب یہ ہوا کہ اردشیر ابن بابک عجمی بادشاہ نے تختہ نرد ایجاد کی اس وجہ سے اسے نردشیر بھی کہتے ہیں۔ اس ایجاد سے عجمی لوگ ہند اور ہند کے بادشاہ پر برتری کا اظہار کرنے لگے جب یہ خبر بادشاہ ہند کو پہنچی تو اس نے حکیم صصہ (سسہ) بن داہر ہندی کو جوابی کھیل بنانے کا حکم دیا چنانچہ صصہ (سسہ) بن داہر ہندی نے شطرنج ایجاد کی اور اس زمانہ کے تمام حکیموں نے شطرنج کو تختہ نرد پر فوقیت اور ترجیح دی لہٰذا شطرنج کے ہندی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ مرزا شمشاد علی بیگ خان صاحب رضوان مولف رسالہ ”بساط فرنگ“ اس باب میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ہندی چترنگ کھیل ہی ٹھیک ہے اسی کا معرب (عربی نام) شطرنج ہے چونکہ جنگ کے چار عضو، ہاتھی، گھوڑا، رخ (رتھ)، پیادہ مشہور ہیں۔ لہٰذا یہی نام چترنگ درست ہے اور جس طرح ایک ایک آدمی اپنے اپنے لشکر سے نکل کر حریف کے مقابل آیا کرتا تھا وہی طریق چترنگ (شطرنج) کے مہروں کی چال کا ہے سو چترنگ کا موجد مرزا شمشاد علی بیگ کی رائے میں حکیم صصہ (سسہ) بن داہر ہندی ہی ہے اور یہ فارس (ایران) کی بجائے ذہن ہندی (سندھی) کا ہی کمال ہے۔ شطرنج کے قواعد وضوابط پر مشتمل ایک کتاب سید مصطفیٰ صاحب المتخلص بہ شاطر حیدرآبادی نے 1849ء (1266ھ) میں لکھی ہے جس میں نہ صرف شطرنج کے قواعد وضوابط درج ہیں بلکہ چالوں کے طریقے بھی مثالیں دے کر واضح کیے گئے ہیں۔ نقشے بھی کتاب میں شامل ہیں۔ شطرنج کے کھیل میں نقشہ سے مراد یہ ہے کہ چند مہرے بساط پر رکھ کر قید لگاتے ہیں کہ اتنی چالوں میں مات کرے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد دکن (بھارت) میں محفوظ ہے۔ شطرنجی ایک قسم کے دبیز سوتی کپڑے کو کہتے ہیں جس کی بناوٹ شطرنج کے خانوں کی طرح ہوتی ہے۔ دری یا فرش جس پر دو رنگ کے چوکور یا مربع خانے بنے ہوتے ہیں۔ شطرنج کھیلنے والا شاطر، شطرنج باز اور شطرنجی بھی کہلاتا ہے۔ شطرنج کے انگریز عالم اور محققین بھی معترف ہیں کہ شطرنج جس پر دنیا کے تمام دانا حیران ہیں کہ کس طرح موجد نے اس ڈیڑھ بالشت چوکور کپڑے پر دانائی کو ختم کر دیا ہے ہند ہی میں ایجاد ہوئی۔ سنسکرت میں اس کا نام چترنگ ہے۔ عربی میں پہلے شاطرنج کہہ کر پھر شطرنج کے نام سے مشہور عالم ہوئی۔ ایسے عقلی کام سوائے ہند کے اور کہیں ایجاد نہیں ہوئے۔ شطرنج کے سلسلے میں ایک بہت ہی دلچسپ روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شطرنج کے موجد نے جب یہ کھیل بادشاہِ وقت کو پیش کیا تو بادشاہ بڑا حیران اور خوش ہوا۔ بادشاہ نے موجد سے شاہانہ انداز میں فرمایا ”مانگو، جو مانگتے ہو۔“ موجد ہاتھ جوڑ کر عرض گزار ہوا۔ ”جہاں پناہ! صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ بساط کے چونسٹھ خانوں میں چاول کے دانے رکھ دیے جائیں اس طرح کہ پہلے خانے میں ایک دانہ تو دوسرے میں دو دانے، تیسرے میں چار دانے تو چوتھے میں آٹھ دانے۔ اسی طرح اگلے خانے میں چاول کے پہلے پچھلے دانوں کی دگنی تعداد رکھی جائے۔“ بادشاہ کو موجد کی یہ خواہش بڑی حقیری لگی مگر جب حساب کیا گیا تو تمام اعداد ختم ہو گئے اور وزن کا شمار ممکن ہی نہ رہا۔ اس پر بادشاہ موجود کی ذہانت پر مزید حیران اور خوش ہوا۔ قدر دان، نکتہ شناس اور سلیم الطبع بادشاہ نے موجد کو بے حد انعام و کرام، تعریف اور داد سے نوازا۔ شطرنج کا موجد کتنا ذہین تھا ایک چھوٹی سی فرضی مثال کا سہارا لیا جاتا ہے۔ شطرنج کے چونسٹھ خانے ہوتے ہیں۔ پہلے خانے میں چاول کا ایک دانہ رکھا جائے اور اگلے خانوں میں دانے دگنے کرتے جائیں تو چوتھے خانے میں چاول کے آٹھ دانے بنتے ہیں جو ایک رتی وزن کے برابر ہو جاتے ہیں لہٰذا اس حساب سے چھبیسویں خانے میں ایک من چاول بنتے ہیں اب اگر چاول چار آنے سیر ہوں اور سونا پچیس روپے تولہ ہو تو اس حساب سے انیس کروڑ من سونا بنتا ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ اور اب آخر میں شطرنج سے متعلق امجد اسلام امجد کی ایک مختصری نظم نذر قارئین ہے جو موزوں بھی ہے اور برمحل بھی۔

وہ بادشاہ ہو، گھوڑا ہو، فیل ہو کہ وزیر
بساطِ دہر پہ بکھرے ہوئے سبھی مہرے
جو کوئی غور سے دیکھے تو صرف پیادے ہیں
شکست و فتح کے جھگڑوں سے بےخبر چپ چاپ
صلیبِ وقت پہ لٹکے ہوئے ارادے ہیں

عفریت

ابن کبیر

اسکاٹ لینڈ کی جھیل ان دنوں پوری دنیا کی مرکزِ نگاہ ہے۔ اخبار و ٹی وی کے رپورٹر اس جھیل کو گھیرے رہتے ہیں کیونکہ اس جھیل میں ایک عجیب الخلقت مخلوق نظر آ رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مخلوط النسل جانور ہے۔
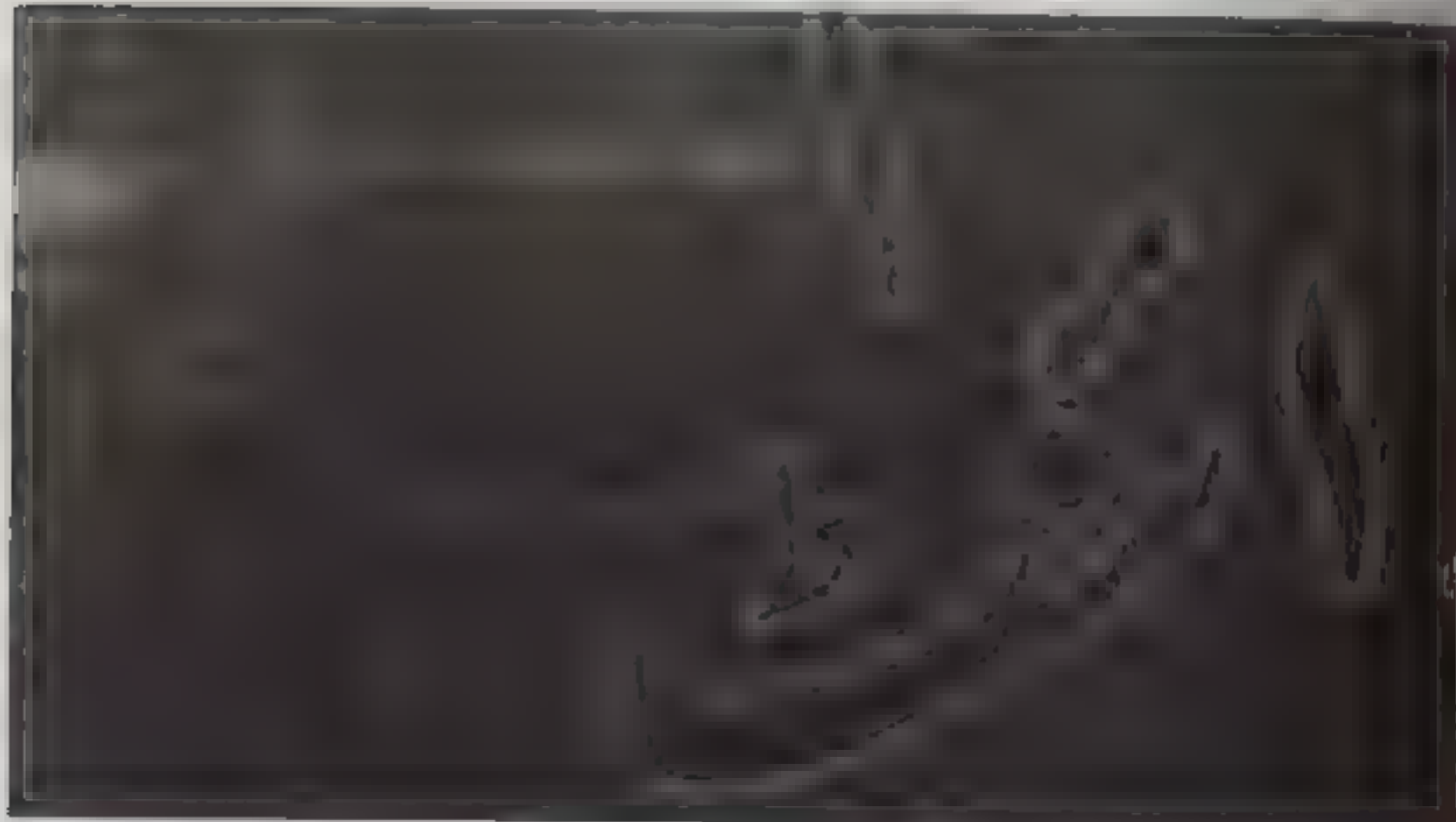
ایک عجیب النسل جانور کی تلاش

وقت ٹھہر سا گیا تھا۔ ہر سُو خاموشی پھیلی تھی۔ سکوت تھا اور بادلوں سے چھن کر آنے والی دھوپ جھیل پر چمک رہی تھی۔

جارج ایڈورڈ ہاتھ میں کیمرا لیے لانچ کے عرشے پر کھڑا تھا۔ پہاڑوں سے آنے والی ہوا قدیم احساس کی حامل تھی۔

اسکاٹ لینڈ کے بالائی علاقے میں واقع یہ حسین جھیل جارج کا گھر تھی۔ رہائش تو انورنیس شہر میں تھی مگر وہ گزشتہ تین عشروں سے جھیل کا طواف کر رہا تھا۔ وقت کا بڑا حصہ یہیں گزارتا۔ اس کی گزر اوقات کا ذریعہ دنیا بھر سے آنے والے وہ

سیاح تھے جنھیں اس علاقے کی پُراسرار خاموشی اپنی جانب کھینچتی تھی۔ وہ اپنی لانچ پر سیاحوں کو 21 مربع میل پر پھیلی اس جھیل کی سیر کرواتا۔ مگر جہاز رانی اس کا پیشہ نہیں تھا۔ یہ تو اس لیے اپنانا پڑا کہ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا۔ جھیل کے انتہائی نزدیک، پانی پر نظریں جمائے، کیمرا ہاتھ میں لیے، بالکل چوکس۔

اچانک اُسے مغرب میں کچھ ہلچل دکھائی دی۔ جارج کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے سطحِ آب پر نظریں گاڑ دیں۔

وہاں لہریں تھیں، جھاگ تھے، جو کسی کی موجودگی کی خبر دے رہے تھے۔ کوئی ایسا... جس کی تلاش نے جارج کو پاگل کر رکھا تھا۔

کوئی شے ابھری۔ جارج کے جسم میں بجلی دوڑ گئی۔ اس نے فوراً کیمرا آنکھ سے لگایا۔ لینس درست کیا۔ فریم سیٹ کیا۔ انگلی بٹن تک گئی۔ اور تب.. مایوسی نے اس پر حملہ کر دیا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں سب غائب ہوگیا۔ اب نہ تو کوئی ابھار تھا نہ ہی جھاگ۔ بس پانی تھا، جس پر دھوپ چمک رہی تھی۔

جارج نے سرد آہ بھری۔ وہ مضمحل معلوم ہوتا تھا۔ ایک قیمتی لمحہ بے حد نزدیک سے نکل گیا۔ وہ پھر ناکام رہا۔ گو آج شکار اُس کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھا۔

☆☆☆

بوڑھے کی کشتی جھیل کے سینے پر تیر رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے دوربین لگی تھی۔ نظریں چند میل پرے ایک لانچ پر ٹکی تھیں۔

وہ جارج ایڈورڈ کی لانچ تھی۔ بوڑھا دیکھ سکتا تھا کہ جارج کاؤچ پر دراز ہے۔ مایوسی چہرے سے جھلک رہی تھی۔

اُس نے گہرا سانس لیا اور دوربین نیچے رکھ دی۔

دفعتاً اُسے کشتی کے گرد کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ گہرائی میں حرکت ہوئی۔ جھاگ سطحِ آب پر ظاہر ہونے لگے۔

بوڑھا کھڑا ہوگیا۔ ایک خاص نوع کا اطمینان چہرے سے جھلکتا تھا۔ وہ ریلنگ سے جھکا اور بائیں ہاتھ سے کشتی کے بیرونی حصے کو تین بار بجایا۔

”سب ٹھیک ہے دوست۔“ اُس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”سب ٹھیک ہے۔“ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ خود کلامی کے عمل سے گزر رہا ہو۔

دھیرے دھیرے لہریں مٹنے لگیں۔ جھاگ غائب ہوگئے۔

بوڑھا اطمینان سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

وہ ایک ماہی گیر تھا۔ نیس جھیل کے مغربی کنارے پر واقع قصبے ڈرمنیڈروچیڈ میں نہ جانے کتنے برس سے وہ تنہا رہ رہا تھا۔ بوڑھے کے ہم عمر تو کب کے مرکھپ گئے لیکن وہ تاحال زندگی سے بھرپور تھا۔ مقامی افراد قابلِ رشک صحت اور بے پناہ طاقت کی وجہ سے اُسے بوڑھا ہرکولیس کہہ کر پکارتے۔ اسے ”جھیل کا رازداں“ تصور کرتے۔ اور وہ کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔ گزشتہ کئی عشروں سے جھیل اور اس کے درمیان مکالمہ جاری تھا۔ ایسا مکالمہ جسے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ بوڑھے کی عمر کتنی ہے۔ کچھ لوگ ازراہِ مذاق کہا کرتے کہ بوڑھا جھیل میں مقیم عفریت کا ہم عمر ہے۔ بوڑھے نے کبھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا۔ شاید یہ بات درست تھی۔ کیونکہ مئی 1933 میں ایلکس کیمبل نامی جس شخص نے اس جھیل میں ایک عفریت کی موجودگی کا انکشاف کیا، اُس نے یہ پُراسرار قصہ کسی اور سے نہیں بوڑھے ہی سے سُنا تھا۔

وہ پہلا اور آخری موقع تھا، جب بوڑھے نے یہ قصہ بیان کیا اور بعد میں اُسے اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑا۔

☆☆☆

”سمندری عفریت صدیوں پرانا تصور ہے، اتنا ہی قدیم جتنی سمندری سفر کی تاریخ ہے۔“

کیمبرل ویل کالج آف آرٹس کے تاریک آڈیٹوریم میں ڈاکٹر جے اینگلز کی آواز گونجی۔

لندن میں واقع انسٹی ٹیوٹ آف لندن کے اس کیمپس میں ”سمندری عفریت سے متعلق ذرائع ابلاغ کا کردار“ کے موضوع پر سیمینار جاری تھا۔

بائیس سالہ نکولس پچھلی صف میں بیٹھا تھا۔ عین پیچھے پروجیکٹر نصب تھا، جس سے پھوٹتی روشنی جب اسٹیج پر لگے پردے سے ٹکراتی، تو سمندری عفریت کی خیالی تصاویر کی شکل اختیار کر لیتی۔ ڈائنا سور جیسا جثہ، گھوڑے جیسا سر، سانپ جیسا جسم... مگر نکولس کی توجہ کا مرکز نہ تو وہ عجیب و غریب تصاویر تھیں، نہ ہی ڈائس پر کھڑا ڈاکٹر۔ وہ تو کن انکھیوں سے پہلو میں موجود دوشیزہ کو دیکھ رہا تھا جو پورے انہماک سے نوٹس لے رہی تھی۔

گھنے سیاہ بالوں والی اس لڑکی کا نام جیکولن تھا۔

اس کی جھیل سی آنکھوں پر بڑی بڑی پلکوں کا سایہ تھا۔ جیکولن اس کی جونیئر تھی۔ وہ میڈیا ڈیپارٹمنٹ میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اسی کا جادوئی حسن نکولس کو یہاں کھینچ لایا تھا۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ”اگر آپ جہاز رانوں کے برسوں پرانے روزناموں پر نظر ڈالیں تو آپ کو سمندری عفریت کا ذکر ملے گا۔ مثلاً سولھویں صدی کے ایک انگریز مہم جو سر ہمفری گلبرٹ نے بحری سفر کے دوران ایک شیر نما مخلوق دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایسے ہی روزناموں میں جولائی 1734 کے ایک واقعے کا ذکر ملتا ہے، جب ناروے کی مشنری ٹیم نے گرین لینڈ کے مغربی کنارے پر پُراسرار مخلوق دیکھنے کا دعویٰ کیا۔ الاسکا کے جنوبی حصے میں بسنے والی ایک تہذیب میں بھی گوناکاڈائٹ نامی سمندری مخلوق کا ذکر ملتا ہے۔“

ڈاکٹر سانس لینے کے لیے رکا۔ ”آپ کو یاد ہوگا، کسی زمانے میں برمودا ٹرائی اینگل میں پیش آنے والے پُراسرار واقعات کو بھی کسی خوفناک مخلوق سے جوڑا جاتا تھا۔ میڈیا نے ان واقعات پر خصوصی توجہ دی۔ دراصل میڈیا ہمیشہ اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے، مگر بدقسمتی سے اس تعلق کو بھی ثابت نہیں کیا جاسکا۔ سائنس اور میڈیا کا رویہ متصادم معلوم ہوتا ہے۔“

نکولس نے نظر ترچھی کرکے جیکولن کو دیکھا۔ بالوں کی ایک لٹ اس کے حسین چہرے کو چھو رہی تھی۔

”یہ ایک طویل موضوع ہے۔“ ڈاکٹر نے دستی گھڑی دیکھی۔ ”سمندری عفریت ہے یا نہیں ہے؟ اگر موجود ہے تو کبھی اس کا ثبوت کیوں نہیں ملا؟ وہ سمندر کے کس حصے میں پایا جاتا ہے؟ ان سوالات پر بات کرنے کے لیے الگ دفتر درکار ہے۔ چونکہ میرے ایک طالب علم نے خصوصی درخواست کی تھی، اس لیے میں گفتگو کا رخ اسکاٹ لینڈ کی جھیل نیس کی جانب موڑنا چاہوں گا، جہاں گزشتہ آٹھ عشروں سے کسی پُراسرار مخلوق کو دیکھنے کے دعوے سامنے آرہے ہیں۔ مخلوق جسے نیسی کا نام دیا گیا ہے۔“

اسکاٹ لینڈ کا ذکر آتے ہی حسین جیکولن نے گہرا سانس لیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی دلچسپی اپنے اوج پر تھی۔

”معزز حاضرین، عفریت کا قصہ یوں تو سمندر اور جھیلوں کے کنارے آباد تمام تہذیبوں میں ملتا ہے، مگر جو شہرت اس کھڑی میں نظر آنے والے جاندار کو حاصل ہوئی، اس کا تصور محال ہے۔ یہ مخلوق Cryptozoology (نامعلوم جانداروں کا علم) کی بہترین مثال ہے، تاہم ایک ایسی مثال جسے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ کم از کم سائنسی کلیے کے تحت تو نہیں۔“ ڈاکٹر دھیرے سے ہنسا۔ ”اگرچہ میڈیا نے اس عفریت کو بہت توجہ دی۔ سیکڑوں تحقیقی کتابیں لکھی گئیں اس بارے میں، تصاویر اور ویڈیوز منظرِ عام پر آئیں، مگر جانچ کی کسوٹی پر ہر دعویٰ خام نکلا۔ خاص کر وہ سرجنز فوٹوگراف.. وہ قصہ تو ایک تاریخی مذاق بن گیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ نیسی فقط ذرائع ابلاغ میں زندہ ہے، حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ بھلا یہ کیسا عفریت ہے، جس نے کبھی انسانوں پر حملہ نہیں کیا۔ یہ کیسا عفریت..“

”بکواس بند کرو۔“ ایک کرخت آواز آڈیٹوریم میں بھر گئی۔ سب نے آواز کا تعاقب کیا۔ وہ دوسری صف میں بیٹھا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے۔

”تم لوگوں کو اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہو۔“ اس نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور اسٹیج کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ”وہ انسانوں کا دشمن ہے۔ جون کوب کی موت کا ذمے دار۔“

وہ اسٹیج پر چڑھ گیا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے دفاعی پوزیشن اختیار کرلی۔ آدمی نے پوری قوت سے بازو گھمایا۔ ڈاکٹر نے کمال مہارت سے سر نیچے کرلیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا حملہ کرتا، دو نوجوانوں نے اُسے دبوچ لیا۔

آڈیٹوریم کی بتیاں روشن کردی گئیں۔ نکولس نے حملہ آور کو غور سے دیکھا۔ اسے لگا جیسے وہ اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔

اس اثنا میں سیکورٹی اہلکار وہاں پہنچ گئے، جو اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہ مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔

اس افسوس ناک واقعے کے بعد سیکشن روک کر کافی بریک کا اعلان کردیا گیا۔

☆☆☆

جیکولن کتاب میں گم تھی کہ اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھایا۔ کالج کی فٹبال ٹیم کا کپتان نکولس اسپارک سامنے کھڑا تھا۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“ اس کے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

”ضرور۔“ اُس نے کتابیں اور ڈائری اٹھا کر بینچ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔ نکولس کی نظر کتابوں کے سرورق پر پڑی۔ ایک کا عنوان تھا ”نیسی۔ حقیقت یا افسانہ!“

”اس موضوع میں آپ خاصی دلچسپی رکھتی ہیں مس..“

جھیل پر لکھی جانے والی کتابوں میں سے ایک کا عکس

نکولس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میکولن۔ جیکولن ڈیئر۔ اور آپ نے درست کہا۔" اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "پُراسرار واقعات مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔ بگ فٹ، برمودا ٹرائی اینگل، کروپ سرکل اور سمندری عفریت۔" اس کی آنکھوں میں یادیں تیر رہی تھیں۔ "میرے والد رائل نیوی میں ملازم تھے۔ میں نے بچپن میں خاصا سمندری سفر کیا۔ لہروں میں چھپی پُراسراریت مجھے پکارتی ہے۔ اور پھر... وہ آرٹش بھی تھے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "شاید اسی وجہ سے دیگر نامعلوم مخلوقات کے مقابلے میں نیسی 'مجھے زیادہ متوجہ کرتا ہے۔"

"نیسی... ہوں۔" نکولس کو بات جاری رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ "دلچسپ! کیا آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

"یہ ذرا طویل موضوع ہے۔" وہ جھجکی۔

"میرے پاس بہت وقت ہے۔ کیوں نہ ایک کپ کافی ہو جائے؟" نکولس کے وجیہہ چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

جیکولن کی حسین آنکھیں چمکیں۔ "ضرور۔"

کچھ دیر بعد وہ قریبی کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ نیس جھیل ان کا موضوع تھا۔

"یہ اسکاٹ لینڈ کی دوسری بڑی جھیل ہے۔ میرے والد کے آبائی شہر انورنیس سے لگ بھگ 37 میل دور۔ بچپن میں میرا ایک بار وہاں جانا ہوا تھا۔" اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ "بظاہر یہ ایک پُرسکون جھیل ہے، مگر اس کا رخ کرنے والوں کا مقصد کشتی کی سیر نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک عفریت کی تلاش میں وہاں جاتے ہیں جسے نیسی کہا جاتا ہے۔"

نکولس پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ آنکھیں جیکولن کے چہرے پر گڑی تھیں جو دمک رہا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ لڑکی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔ ساتھ ہی... جھیل کا اسرار بھی ذہن پر دستک دینے لگا تھا۔

جھیل کا محلِ وقوع بیان کرنے کے بعد اب جیکولن اس سے جڑے پُراسرار واقعات کا ذکر کر رہی تھی جنھوں نے ایک شانت جھیل کو دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

"قصوں کہانیوں کے عفریت اپنی جگہ، مگر اسکاٹ لینڈ کے باسیوں نے کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ سرسبز پہاڑوں میں گھری نیس جھیل بھی اس کا مسکن ہو سکتی ہے۔ اس قصے کی شروعات 1933 میں ہوئی، جب ایک شخص نے..."

جیکولن بول رہی تھی۔ آواز میں مٹھاس تھی۔ اپنائیت تھی۔ مگر ساتھ اس کے الفاظ پُراسراریت سے لبریز تھے جو نکولس کو ایک انوکھی دنیا کی کہانی سنا رہے تھے۔

"اس پیچیدہ معاملے کا آغاز 2 مئی 1933 کو "انورنیس کوریئر" نامی اخبار میں شائع ہونے والی خبر سے ہوا، جس میں نیس جھیل میں کسی عفریت کی موجودگی کا پُرخطر امکان ظاہر کیا گیا تھا۔ پھر جارج اسپیسر نامی ایک سیاح کا ذکر آیا، جس نے اس عفریت کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ آنے والے چند ماہ میں کئی پریشان کن دعوے دار سامنے آئے۔ ہر ایک نے جھیل میں کچھ انوکھا دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ کچھ ایسا، جس نے انھیں خوف کی کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں کھلبلی مچی تو درجنوں فوٹو گرافروں نے جھیل کا رخ کیا، جن میں ہو گلیرے بھی شامل تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جو اس پُراسرار عفریت کی تصویر کھینچنے میں کامیاب رہا۔ گو ہو گلیرے کی تصویر انتہائی دھندلی تھی، مگر عوام میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھی۔

"اس تصویر کی اشاعت کے بعد جھیل کی پُراسراریت اسکاٹ لینڈ سے نکل کر برطانیہ میں داخل ہو گئی۔ مگر بات یہیں تمام نہیں ہوتی۔" جیکولن کی آنکھوں میں ڈرامائی رنگ تھا۔ "اسکاٹ لینڈ انتظامیہ نے محکمۂ پولیس کو اس عفریت کے ممکنہ حملے سے نمٹنے کے احکامات جاری کر دیے۔"

"عفریت کا حملہ؟ تو کیا ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا؟" نکولس نے دریافت کیا۔ اپنے لہجے پر اسے تھوڑی حیرت ہوئی۔ اس میں تجسس تھا۔

جیکولن نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ پھر مسکرائی۔ "نہیں کیپٹن، ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

"اور یہ سرجنز فوٹو گراف کا کیا معاملہ ہے؟" اس بار اس نے اپنی آواز معتدل رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس بارے میں ہم پھر بعد میں بات کریں گے۔" جیکولن نے گھڑی دیکھی۔ "خاصی دیر ہو چکی ہے۔"

"بے شک! تو کل اس طالب علم کی آپ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے مس جیکولن۔" اس نے مہذب یافتہ عشاق کے انداز میں جھکتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ جگہ شان دار ہے مسٹر کیپٹن۔" وہ چہکی۔

☆☆☆

انورنیس کے گرد و نواح پر رات اتر چکی تھی۔ جھیل پر تاریکی کی چادر تنی تھی۔

جیپ ڈرمنیڈروچیڈ کے مغرب میں واقع گلینارک ہارٹ نامی بستی کے ہائی وے سے گزر رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ جارج ایڈورڈ نے سنبھالی ہوئی تھی۔ تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ آج کا دن بھی رائیگاں گیا۔ عفریت کو کیمرے میں مقید کرنے کی کوشش ناکام رہی۔

موڑ کاٹتے ہوئے اس کی نظر قبرستان پر پڑی۔ وہ چونک اٹھا۔ درختوں سے گھرے، گھرنے سے لپٹے قبرستان میں کوئی تھا۔

"بوڑھا ہرکولیس!" جارج بڑبڑایا۔ اس نے جیپ روک دی۔ نیچے اترا اور اس کی سمت بڑھنے لگا۔ بوڑھا یونہی خاموش اور لاتعلق کھڑا رہا۔

جارج نے دھیرے سے کہا۔ "ہیلو ہرکولیس۔ اس وقت یہاں؟"

"ہاں، ایک دوست سے ملنے چلا آیا۔" بوڑھے کے چہرے پر اطمینان تھا۔

جارج قبر کے کتبے کی جانب متوجہ ہوا۔

"جون کوب۔ انتقال 29 ستمبر 1952۔" وہ بڑبڑایا۔ "وہی ریسنگ ڈرائیور نا، جو عالمی ریکارڈ بنانے کی خواہش لیے نیس جھیل آیا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔"

"ہاں وہی۔" بوڑھے نے آہ بھری۔ "وہ ایک باصلاحیت انسان تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس نے رائل

ہرکولیس

ائیرفورس میں خدمات انجام دیں۔ وہیں ہماری دوستی ہوئی تھی۔ پھر اس کے سر میں رفتار کا سودا سما گیا۔ کئی ریکارڈ اپنے نام کیے۔ زمین کو فتح کرنے کے بعد دل میں پانی پر تیز رفتاری کا ریکارڈ قائم کرنے کی خواہش جاگی، جو اسے یہاں لے آئی۔ مجھے یاد ہے وہ دن..." بوڑھا ماضی میں تھا۔ "اس کی کشتی میں جیٹ انجن لگا تھا۔ 320 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے وہ سطحِ آب پر دوڑ سکتی تھی، وہ واقعی پُرجوش تھا مگر..." وہ چپ ہو گیا۔

"اس کی موت سے کئی پُراسرار باتیں منسوب ہیں۔" جارج نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس کی کشتی جھیل میں اچانک نمودار ہونے والی کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ... نیسی تھا۔"

بوڑھا یونہی خاموش کھڑا تھا۔ کہرا بڑھ رہا تھا۔ رات دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ بالآخر اس نے خاموشی توڑی۔ "کیا تمھیں واقعی لگتا ہے کہ میرا پیارا دوست کسی عفریت سے جا ٹکرایا تھا؟"

جارج نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، میں تین عشروں

سے یہاں ہوں۔ نیسی کے وجود پر کامل یقین رکھتا ہو لیکن اس بات پر اعتبار کرنا مشکل ہے کہ وہ باپ کی موت کا سبب بنا۔ وہ تو... انتہائی شرمیلا ہے۔ کیمرا دیکھتے ہی چھپ جاتا ہے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

بوڑھا ہنس پڑا۔ "کیا تم جانتے ہو جارج؟ اس واقعے کے بعد جھیل کے کئی شکاری یہاں آئے تھے۔ ان کے پاس ایک بڑا سا جنگلا بھی تھا۔ انہوں نے جھیل کو کھنگالا، مگر کوئی اُسے نہیں پا سکا۔ جھیل شانت رہی۔"

جارج خاموش ہو کر کچھ بھولا ہوا یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لب وا ہوئے۔ "میں نے ایک شخص کا قصہ سنا تھا جو خود کو مرحوم جون کوب کا بیٹا کہہ کر متعارف کرواتا تھا۔"

"مجھے یاد ہے۔" بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔ "وہ 1970 کا موسم سرما تھا، جب ایک نوجوان ہاتھ میں شوٹ گن لیے جھیل کی سمت بڑھا۔ وہ انتقام کے جذبے سے سلگ رہا تھا۔ اس نے کئی دن کشتی میں گزارے۔ جھیل کئی بار فائرنگ سے گونجی۔ اس کے پُرتشدد رویّے نے قصبے میں ہیجان برپا کر دیا تھا۔ بالآخر پولیس کو اسے شہر بدر کرنا پڑا۔"

"کیا پھر کبھی وہ یہاں آیا؟" جارج کی نظریں کتبے پر ٹکی تھیں۔

"ایک بار۔ بیس برس قبل۔" بوڑھا ماضی میں تھا۔ "اس روز پالا پڑ رہا تھا۔ جب میں کشتی باندھ رہا تھا، تب میری نظر اس پر پڑی۔ وہ کنارے پر خاموش بیٹھا جھیل کو گھور رہا تھا۔"

ایک بار پھر خاموشی در آئی۔

جارج نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "ہرکولیس، نہ جانے تمہاری عمر کتنی ہے۔ تمہارے بارے میں کئی پُراسرار باتیں مشہور ہیں۔ لوگ تمہیں جھیل کا رازداں کہتے ہیں؟" اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ "کیا تم نے کبھی اس عفریت کو دیکھا؟"

"عفریت!" بوڑھا مسکرایا۔ "خدا کی مخلوق کو عفریت کہنا کتنا درشت لگتا ہے۔ خیر جہاں تک تمہارے سوال کا تعلق ہے کہ میں نے کبھی نیسی کو دیکھا ہے، تو اس کا جواب ہے، نہیں، کبھی نہیں!"

وہ قبرستان میں کھڑے تھے۔ درختوں پر کہرا چھایا تھا۔ ٹھنڈ بڑھ رہی تھی اور جھیل کی سطح پر جھاگ جنم لے رہے تھے جو کسی کی موجودگی کی خبر دیتے تھے۔

☆☆☆

"تو ہم سرجنز فوٹو کے بارے میں بات کر رہے تھے گزشتہ روز۔" جیکولن پُرجوش تھی۔

"ہاں۔ 1934 میں اتاری جانے والی نیسی کی مشہور زمانہ تصویر۔ ان معنوں میں، انتہائی اہم کہ وہ پہلی واضح تصویر تھی جس میں عفریت کا سانپ نما سر اور لمبی گردن نظر آ رہی تھی۔ تصویر لندن کے ایک سرجن رابرٹ کینیتھ ولسن نے اتاری تھی۔"

"خاصی ریسرچ کر کے آئے ہو کیپٹن۔" جیکولن چہکی۔

"تھوڑی بہت۔" وہ مسکرایا۔ "اس تصویر نے واقعی دھوم مچا دی۔ لوگوں کو یقین ہو چلا کہ نیسی واہمہ نہیں۔ اور ویسے بھی اگر ثبوت پیش کرنے والا شخص ایک ڈاکٹر ہو تو شک کی خاصی کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ گو اس پر متعدد اعتراضات اٹھائے گئے۔ کسی نے اسے ہاتھی کی سونڈ کہا، کسی نے پرندہ۔ محققین نے اسے جھوٹا ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، مگر کچھ ثابت نہیں ہوا۔ برسوں تک اس تصویر کا سحر قائم رہا، یہاں تک کہ 94ء کا سال آ گیا جب...."

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ جیکولن چہرے پر مسکراہٹ لیے اُسے دیکھتی رہی۔ "میں سن رہی ہوں کیپٹن۔"

"اوکے۔ تو پھر 94ء کا سال آ گیا، جب 90 سالہ کرسچن اسپرلنگ نامی ایک شخص سامنے آیا، جس نے ایک انوکھا انکشاف کیا۔ بلکہ اسے اعتراف کہنا چاہیے۔" اس نے کافی کا گھونٹ بھرا۔ "اس کا کہنا تھا کہ یہ تصویر اس کے سوتیلے باپ نے اتاری تھی جو ایک اخبار کا ملازم تھا۔ ادارے کی جانب سے اُسے عفریت کی تصویر اتارنے کی ذمے داری سونپی گئی۔ ناکامی کے باعث یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ شاید اُسے فارغ کر دیا جائے۔ ملازمت بچانے کے لیے اس نے ایک چال چلی۔ لکڑی کو تراش کر ایک عفریت کی شکل دی۔ اُسے ایک تختے پر نصب کیا۔ اس کے بیٹے نے وہ تختہ پانی میں چھوڑ دیا اور کچھ فاصلے سے تصویر اتار لی گئی۔ پھر اسے ایک سرجن کے حوالے کر دیا۔ یعنی..." وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ "کروڑوں افراد کی نیند حرام کرنے والی، سیکڑوں محققین کا قیمتی وقت برباد کرنے والی تصویر درحقیقت کسی عفریت کی نہیں، بلکہ چھوٹے سے کھلونے کی تصویر تھی۔ ایک فراڈ۔"

نکولس بول رہا تھا۔ جیکولن اپنی جھیل سی آنکھوں میں مسکراہٹ لیے اسے دیکھتی رہی۔ تقریر کے اختتام پر اس نے کافی کا گھونٹ لیا۔

"کیپٹن مجھے ماننا پڑے گا، تم ٹھیک ٹھاک ریسرچ کر کے آئے ہو۔" اس نے ہاتھ رگڑے۔ "پھر تو تم نے کینیڈا کے صوبے برٹش کولمبیا کی مشہور زمانہ پوگو پوگو جھیل کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا۔ خصوصاً وہاں موجود عفریت اوگو پوگو کے بارے میں؟"

نکولس دھیرے سے مسکرایا۔ "نیسی کے بارے میں پڑھتے ہوئے اس پر بھی نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ اس مخلوق کی متعدد ویڈیوز اور کئی تصویریں دیکھیں۔ مجھے کہنے دیجیے، یہ عفریت نیسی کے مقابلے میں خاصا دوستانہ ہے۔ کیمرے سے گھبراتا نہیں ہے۔"

جیکولن نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کے شانے ہلنے لگے۔ حسن نکھر گیا۔

"تو ہم سرجنز فوٹوگراف کے بارے میں بات کر رہے تھے؟" بالآخر اس نے کہا۔

"ہاں!" نکولس نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ "جس کے بارے میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ جعلی ہے۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "فقط دعویٰ کیا گیا ہے۔ ٹھیک ویسے ہی، جیسے اس کے حقیقی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ یہ رویّہ غیرسنجیدہ ہے کہ ہم ایک دعوے کو قبول کر لیں اور ایک کو رد۔"

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ تصویر اصلی ہے؟" نکولس نے سوال کیا۔

"اس کا جواب یہاں کافی ہاؤس میں بیٹھ کر نہیں ملے گا۔" وہ چہکی۔ "ہمیں اسکاٹ لینڈ جانا ہوگا۔ جواب وہیں ہے۔"

"کیا تم وہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہو؟" نکولس کے لہجے کے الفاظ حیران کن تھے۔

"بالکل۔" اس نے ہاتھوں پر چہرہ ٹکاتے ہوئے کہا۔ "تم چلو گے میرے ساتھ کیپٹن؟"

ایک غیرمتوقع پیش کش۔ نکولس ششدر رہ گیا۔ حیران کن خاموشی در آئی۔

دن تیزی سے شام کی جانب بڑھنے لگا۔ کرنیں مغربی افق میں گم ہونے لگیں اور وہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

"ہیلو۔" چھن سے لمحے کا سحر ٹوٹ گیا۔

نکولس نے سر اٹھایا۔ ایک خوش شکل نوجوان سامنے کھڑا تھا۔

ایجاد و صنعت کے لحاظ مسلمانوں کا اہم کام کاغذ کا رواج ہے۔ اس کے اصل موجد تو چینی تھے۔ مگر مسلمانوں نے بغداد، دمشق، نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ اور سسلی وغیرہ میں کاغذ سازی کے کارخانے لگائے اور پہلی بار انہیں کتابوں اور تحریروں کے لیے استعمال کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریر عربوں ہی کی تھی۔ اسی طرح قطب نما کا استعمال بھی مسلمانوں ہی نے کیا اور شورے کے استعمال کو ترقی دے کر بارود ایجاد کیا۔ توپ کو سب سے پہلے افریقا کے سردار یعقوب نے 1205ء میں استعمال کیا اور سلطان مراکش ابو یوسف نے پہلی بار توپ بنانے کا کارخانہ لگایا۔ مسلمانوں کی قابلِ ذکر ایجاد گھڑی اور کلاک ہے۔ مسلمانوں نے عجیب و غریب قسم کی گھڑیاں بنائیں۔ جن کے تذکروں سے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ ول ڈیوران لکھتا ہے کہ اسپین کے ایک مسلمان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اول عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی اور سوم ہوا میں اڑنے والی مشین۔ اسی طرح پہلا چھاپا خانہ بھی اسپین میں لگا۔ جس پر عبدالرحمان اول (788ء) کے احکام چھپتے تھے۔ تاریخ میں ماہِ نخشب کا ذکر عموماً آتا ہے۔ یہ وہ مصنوعی چاند ہے، جسے ترکستان کے ایک عالم حکم بن ہاشم نے بنایا تھا۔ یہ چاند نخشب کے ایک کنوئیں سے نکلتا، اندازاً سو مربع میل کے رقبے کو منور کرتا اور طلوع آفتاب سے پہلے ڈوب جاتا۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور طلیطلہ کی تلواریں، عدن کے اونی کپڑے، حلب کے شیشے، رے کے رنگین برتن۔ رقہ کے صابن، ایران کے قالین اور نیشاپور کا عطر مشہور تھے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

"میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" جیکولن چہکی اور کھڑے ہو کر اس سے گلے ملی۔

لمحے کے اس حصے میں نکولس نے خود کو غیر آرام دہ محسوس کیا۔

"نکولس، یہ ہے گیری، گیری فیمن۔ میرے بچپن کا دوست۔ اسے بھی نیس جھیل میں بہت دلچسپی ہے۔ ٹھیک میری طرح۔" اس نے تعارف کروایا۔ "اور گیری، یہ ہیں مسٹر نکولس اسپارک۔ کالج کی ٹیم کے کپتان ہیں۔ تازہ تازہ ہی ہماری دوستی ہوئی ہے اور میں نے انہیں اپنے ساتھ اسکاٹ لینڈ چلنے کی پیشکش کر دی ہے۔"

"کیا واقعی؟" گیری نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "یہ تو شان دار ہے۔"

نکولس واقعی بے آرامی محسوس کر رہا تھا۔ ایک بے نام جذبہ اس میں پنپ رہا تھا۔

"ابھی میں اور نکولس کینیڈا کی پوکمن اوگن جھیل کے بارے میں بات کر رہے تھے۔" اس نے گیری سے کہا۔

"خوب یاد دلایا۔" گیری چہکا۔ "میری آج مسٹر جون کرک سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی ریسرچ ہمارے ساتھ شیئر کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"زبردست خبر ہے۔" جیکولن نے تالی بجائی۔ پھر نکولس کی جانب مڑی۔ "جون کرک برٹش کولمبیا میں محکمۂ پولیس سے منسلک ہیں۔ انہوں نے اس جھیل پر خاصی تحقیق کی ہے۔"

"میں نے ان کے بارے میں پڑھا تھا۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیلیفورنیا کی خلیج سان فرانسسکو میں ایسی ہی کسی مخلوق کو دیکھے جانے کے دعوے کیے جاتے ہیں۔" گیری نے کہا۔ "دو جڑواں بھائی بل اور باب گراک برسوں سے اس پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان سے بھی بات ہوئی مگر مجھے وہ کچھ سنکی لگے۔"

"خیر، ہماری توجہ کا مرکز تو نیس جھیل ہے۔" جیکولن نے کہا۔ "اور اب ہمیں سفر کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لینا چاہیے۔"

"میری طرف سے ہاں ہے۔ کیا تم تیار ہو؟" گیری نے کہا۔

"سو فیصد۔" وہ چہکی۔

"اور تمہارا نیا دوست؟" وہ نکولس کی سمت مڑا۔

"اوہ۔" وہ تھوڑا متذبذب تھا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خاصی مصروفیات ہیں۔"

"چھوڑو بھی کپتان، آگے چھٹیاں ہیں۔ تمہارا کوئی میچ بھی نہیں۔ تم ہمارے ساتھ خوب لطف اندوز ہو گے۔"

"ہمارے ساتھ۔" اس نے دل ہی دل میں دہرایا۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "بھئی، میری طرف سے معذرت اور یاد آیا، مجھے کہیں پہنچنا ہے۔ آپ دونوں گپ شپ کریں، پھر ملاقات ہو گی۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ جیکولن نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

جب وہ گھر کی سمت بڑھ رہا تھا لندن پر رات چھا گئی تھی، جس میں رقابت کا جذبہ تیر رہا تھا جس کے بوجھ سے اس کے کاندھے ڈھے رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ دریائے ٹیمز کے کنارے پہنچ گیا۔ اس نے خاموشی سے خود کو ایک بینچ کے حوالے کر دیا۔ ایک سگریٹ سلگائی۔ چند بے کیف کش لینے کے بعد اس پر ایک انکشاف اترا۔

"خدایا، میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

وہ دریائے ٹیمز کے کنارے بیٹھا تھا۔ پانی پر روشنی جھلملا رہی تھی۔

☆☆☆

گھور اندھیرا تھا۔ منظر کہرے میں پوشیدہ تھا۔

آسمان برس رہا تھا۔ لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ نکولس ریلنگ سے لگا بیٹھا تھا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ نقاہت بدن میں جا گزیں تھی اور خطرے کی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔

اس نے اپنی بائیں سمت دیکھا۔ ایک شخص عرشے پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا کاندھا زخمی تھا۔

پھر اُسے لانچ کے آخری کونے پر ایک سایہ نظر آیا۔ ایک لڑکی، جس کے بھیگے ہوئے بال طوفانی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر نقاہت آڑے آ گئی۔ وہ کراہا۔

لڑکی مڑی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں گہری اداسی تھی۔ اداس آنکھیں، جن پر لمبی پلکیں سایہ کرتیں۔

"جیکولن۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ خطرے کی بو تیز ہوئی۔

اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کوئی عرشے پر تھا۔ بائیں جانب سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا اور ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

نکولس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ چلایا، مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔

اس شخص نے بندوق سیدھی کی۔ رخ جیکولن کی جانب تھا اور پھر ایک فائر ہوا۔ ڈھس...

"جیکولن۔" وہ چلایا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر تھا۔ پسینے سے شرابور۔ ڈرا ہوا۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے جیکولن کا نمبر ڈائل کیا۔ کچھ دیر بعد نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو جیکولن، میں... میں نکولس بول رہا ہوں۔ تم... تم خیریت سے ہو ناں؟"

"نکولس... کیا ہوا؟" جیکولن پوری طرح بیدار ہو گئی۔

"وہ میں..." نکولس ہچکچایا۔ "میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک کشتی، جھیل اور ایک شخص... اس نے تم پر فائر کیا اور..."

"نکولس۔" جیکولن نے دھیرے سے کہا۔ آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ "میں ٹھیک ہوں اور چاہتی ہوں کہ تم بالکل شانت ہو جاؤ۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے فوراً کہا۔ اب وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔

ایک لمحے کا توقف آیا، جس کے دوران دونوں نے محسوس کیا کہ ایک خاص نوع کے جذبے نے انہیں جوڑ دیا ہے۔ ایک قدیم جذبہ، جو زندگی کا ماخذ ہے۔ محبت!!

"نکولس۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "کیا ہم کل مل سکتے ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اور کیا تم..." ایک لمحے کا توقف۔ وہ اپنے الفاظ تول رہی تھی۔ "اسکاٹ لینڈ چلنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

نکولس نے گہرا سانس لیا۔ "کس کے ساتھ؟"

"میرے ساتھ نکولس، میرے ساتھ۔" اس کی آواز نقرئی گھنٹیوں سی تھی۔ جادوئی محبت سے لبریز۔

رات کے تین بج رہے تھے اور لندن کے مرکز میں دو حسین دل دھڑک رہے تھے!

☆☆☆

"میں ایک کتاب تلاش کر رہا ہوں۔ کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟" نکولس نے لائبریرین کو مخاطب کیا۔

"ضرور جناب۔" لائبریرین خوش دلی سے مسکرایا۔ "کس کتاب کی تلاش ہے آپ کو؟"

"وہ..." نکولس جھجک رہا تھا۔ "ایک کتاب ہے نیس جھیل سے متعلق۔ نیسی۔ توہم پرستی اور حقائق کے درمیان۔"

"اوہ وہ کتاب۔" لائبریرین سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "معذرت خواہ ہوں جناب۔ وہ ابھی ابھی کسی نے ایشو کروائی ہے... ملک دیکھیے۔ شاید وہ صاحب یہیں ہوں۔"

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے بائیں جانب جھکا۔

"آپ خوش قسمت ہیں۔" چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ "تیسری رو میں جو صاحب بیٹھے ہیں، کتاب انہوں نے ہی ایشو کروائی ہے۔"

"شکریہ۔" کہہ کر نکولس اس شخص کی جانب بڑھنے لگا۔ جوں ہی وہ اس کے سر پر پہنچا۔ حیرت کی شدید لہر اس سے ٹکرائی۔ "ڈاکٹر اینگلز! آپ یہاں؟"

ڈاکٹر نے سر اٹھایا۔ شناسائی چہرے پر ابھری۔ وہ جانتا تھا کہ نکولس کالج کی فٹبال ٹیم کا کپتان ہے۔

"ہاں بھئی میں۔" چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ "برائے مہربانی بیٹھ جاؤ اور آواز نیچی رکھو۔ ورنہ ہم دونوں کو لائبریری سے باہر کر دیا جائے گا۔" اس نے کتاب بند کر دی۔

نکولس کی نظر سرورق پر پڑی۔ اس پر قبل از تاریخ کے ایک تخیلاتی جانور کی تصویر بنی تھی۔ ذہن کے پردے پر آڈیٹوریم کی اُس دوپہر کے مناظر ابھرے، جب ڈاکٹر نے بڑے ہی استہزائیہ انداز میں نیس جھیل کے عفریت کو واہمہ قرار دے دیا تھا۔

"آپ جیسے حقیقت پسند کو ایک اساطیر کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر نے ایک نظر کتاب کی سمت دیکھا، پھر نکولس کی جانب متوجہ ہوا۔ "حیران ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ حیرت سے تلاش جنم لیتی ہے۔ جیسے تمہاری حیرت تمہیں لائبریری میں کھینچ لائی۔ شاید تم بھی کتاب ڈھونڈ رہے ہو؟"

"اوہ ہاں۔ آج کل میں اس موضوع پر مطالعہ کر رہا ہوں۔ کل انٹرنیٹ پر اس کتاب کے بارے میں پڑھا تو سوچا کہ..."

"سن کر خوشی ہوئی کہ تم اس موضوع میں دلچسپی لے رہے ہو۔ مگر اس کا سبب کیا ہے؟ شاید ایک حسینہ جس نے تمہارا دل چرا لیا ہے!" ڈاکٹر کے جھریوں زدہ چہرے پر

شرارت تھی۔

وہ ہونقکا رہ گیا۔ پھر خود کو سنبھالا۔ ''آپ غالباً جیکولن کی بات کر رہے ہیں؟''

''غالباً نہیں، یقیناً!'' ڈاکٹر نے خفیف سا قہقہہ لگایا۔ ''وہ میری اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ اس موضوع میں خاصی دلچسپی ہے اسے۔ مجھے یاد ہے۔ اس روز آڈیٹوریم میں تم اس کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ بس اسی سے اندازہ لگالیا۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے جناب۔'' وہ جھینپ سا گیا۔

''خیر، یہ تو الگ موضوع ہے۔ کہو میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''دراصل میں...'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر کہنیاں میز پر رکھ کر جھکا۔ ''جب آپ کسی پُراسرار مخلوق کی موجودگی پر یقین ہی نہیں رکھتے ڈاکٹر تو آج کی خوشگوار صبح اس بابت مطالعے کی بھلا کیا ضرورت پیش آگئی؟''

''نوجوان۔'' اس نے نکولس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں امکانات پر یقین رکھتا ہوں، جو مجھے اس نوع کی کسی مخلوق کو رد کرنے سے روکتے ہیں۔ ہاں، سائنس ہمارے یقین پر ثبوت کا تقاضا کرتی ہے۔ اور بدقسمتی سے اب تک اس عفریت کی موجودگی کے حوالے سے کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''امکانات کے مانند کیا آپ اس عفریت پر بھی یقین کرتے ہیں ڈاکٹر؟'' اس نے سوال کیا۔

ڈاکٹر نے کاندھے اچکائے۔ ''میں دنیا کے کروڑوں انسانوں کی طرح کہانیاں سننا پسند کرتا ہوں۔ پُراسرار کہانیاں۔ سمندر اور جھیلوں میں سانس لیتے عفریت ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ مگر سائنس، جیسے میں نے کہا، فقط ثبوت مانگتی ہے۔''

''پلیز مجھے بتائیں ڈاکٹر۔ میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ کیا اس قسم کی کسی مخلوق کی موجودگی سائنس کے نزدیک امکانی ہے؟''

چند ساعت ڈاکٹر خاموش رہا۔ پھر اس کے لب وا ہوئے۔ ''دیکھو، Cryptozoology میرا موضوع نہیں، مگر میں اس میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ مسئلہ تسلیم کرنے اور نہ کرنے کے درمیان معلق ہے۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں پُراسرار مخلوقات کا ذکر ملتا ہے، مگر جوں جوں سائنس ترقی کرتی گئی، یہ قصے دم توڑتے گئے۔ بیسویں صدی میں داخل ہونے والا انسان یہ یقین کر چکا تھا کہ وہ زمین پر موجود ہر جاندار کی بابت علم رکھتا ہے، مگر تب کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔''

وہ براہ راست نکولس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، جو ہمہ تن گوش تھا۔

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ ''کسی زمانے میں قوی ہیکل چھپکلیوں کو ایک واہمہ یا ایک داستان کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ 1910 میں ہم نے ایک ایسی مخلوق ڈھونڈ نکالی۔ آج ... کے جزائر کوموڈو ڈریگن کہلانے والی ان چھپکلیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ قوی الجثہ تیر ماہی (Giant squid) کے بارے میں صدیوں سے بات ہو رہی ہے، مگر سائنس دان ان کی موجودگی کا ثبوت 2004 ہی میں حاصل کرسکے۔ شاید تم نے میگا ماؤتھ شارک کے بارے میں سنا ہو۔ اس انوکھی قسم کی مچھلی کو 1976 میں دریافت کیا گیا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ ... ختم ہو چکی ہے۔ اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ دراصل یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ شاید بگ فٹ موجود ہو، شاید سمندری عفریت وجود رکھتا ہو۔''

''سیکڑوں لوگ انہیں دیکھنے کا... دعویٰ کر چکے ہیں۔'' نکولس کو یوں لگا، جیسے جیکولن اس کے اندر بول رہی ہے۔

ڈاکٹر نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''قانون عینی شاہدین اور گواہوں کو اہمیت دیتا تھا نوجوان، مگر سائنس نہیں۔ کئی افراد پھوکن اور کن کے عفریت کو دیکھنے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ تصاویر اور ویڈیوز موجود ہیں۔ امریکا کی خلیج کیلیفورنیا کے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر تمہیں دیگر جھیلوں کے مقابلے میں نیس جھیل پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔'' ایک بار پھر اس کے چہرے پر شرارت کھیل رہی تھی۔ ''شاید تم لوگ وہاں جانے کا بھی پروگرام بنا رہے ہو؟''

''آپ خاصا کچھ جانتے ہیں ڈاکٹر۔'' نکولس جھینپ سا گیا۔ ''جی ہاں، ہمارا ارادہ ہے۔ میں نے آپ کا بہت وقت لیا، مگر ایک سوال اور کرنا چاہوں گا۔ اس جھیل کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟''

ڈاکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ ''سچ کہوں تو کسی بھی جھیل میں پُراسرار مخلوق کی موجودگی کے برعکس جھیل نیس میں اس کے امکانات قوی تر ہیں۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''اس کا سبب ڈاکٹر؟'' نکولس کو ڈاکٹر کے بیان سے تھوڑی حیرت ہوئی تھی۔

چند ساعت ڈاکٹر خاموش رہا۔ ماضی کی پرچھائیں اس کے چہرے پر تھی۔ ''دو برطانوی محققین ٹم ڈنسڈیل اور موریس برٹن نے خاصی تحقیق کی نیس جھیل پر۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، مضبوط دلائل دیے، مگر میرے لیے ان کے دلائل اہم نہیں۔ اس جھیل میں کسی مخلوق کی موجودگی کے امکانات اس لیے قوی ہیں کیونکہ وہ بے حد پُرسکون ہے۔ اتنی خاموش کہ شک ہوتا ہے کہ وہاں ضرور کوئی ہے۔''

☆☆☆

''آہ، کتنی تازگی ہے۔'' یہ پہلا جملہ تھا جو انورنیس ائرپورٹ سے باہر آنے کے بعد نکولس کی زبان سے نکلا۔

جیکولن مسکرائی۔ ہوا اس کی زلفوں سے کھیل رہی تھی۔

''درست کہا دوست۔'' گیری چہکا۔ ''واقعی اسکاٹ لینڈ کی فضا شاندار ہے۔''

نکولس مسکرایا۔ گیری اور اس کی اب اچھی نبھنے لگی تھی۔ وہ اس سے حسد محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اس کا رقیب نہیں تھا... جیکولن فقط اس کی ہے۔

ائرپورٹ سے انہوں نے جیپ کرائے پر لی۔ منزل ڈرمنڈروچیڈ کا قصبہ تھا۔ جھیل کے سحر میں مبتلا بیشتر سیاح اور محققین اسی قصبے کا رخ کرتے تھے۔ وہاں ''نیس جھیل سینٹر'' نامی ایک سرکاری ادارہ قائم تھا جو جھیل کی دیکھ ریکھ کے علاوہ اس کی گہرائیوں میں مقیم عفریت پر ریسرچ کا بھی مرکز تھا۔ سیاحوں کے قیام و طعام کا وہاں مناسب انتظام تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں، غوطہ خوری کا سامان، ویڈیو کیمرے اور دیگر اشیا بآسانی مل جاتیں۔

قصبہ انورنیس سے 37 کلومیٹر دور تھا۔ گفتگو کے لیے ان کے پاس خاصا وقت تھا۔

آج بولنے کی باری گیری کی تھی جو خاصا پُرجوش تھا۔ وہ جھیل نیس کے عفریت کی بابت ہونے والی اب تک کی تحقیقات سے انہیں آگاہ کرنے لگا۔ بات تصاویر سے شروع ہوئی اور پھر اس پُراسرار مخلوق کی ان ویڈیوز تک جا پہنچی جن کی تعداد درجنوں میں ہے۔

''چند سائنس دانوں نے ان تصاویر اور ویڈیوز کو قبول کیا تو چند نے رد۔ مگر ناقدین ان ویڈیوز کے سحر کو کم کرنے میں ناکام رہے۔ عام افراد انہیں ناقابلِ تردید ثبوت تصور کرتے ہیں۔'' گیری نے کہا۔

''کیا آپ کو مارکیز ایٹکنسن کی سونار تصویر کا علم ہے جناب؟''

جیپ کے ڈرائیور کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ نے انہیں چونکا دیا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ بھی اس موضوع میں اتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔'' گیری مسکرایا۔ ''نہیں، اس تصویر کے بارے میں ہمیں علم نہیں۔ براہ مہربانی کچھ بتائیے۔''

''ضرور جناب۔'' ڈرائیور مسکرایا۔ ''یہ تازہ موضوع ہے۔ مارکیز کی سونار امیج سے متعلق خبر کل ہی اخبار کی زینت بنی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ چند روز قبل جھیل سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے آلات پر ایک جانور کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا جو شاید کشتی کا تعاقب کر رہا تھا۔''

''دلچسپ۔'' نکولس نے گہرا سانس لیا۔ ''مگر دیگر تصاویر کے مانند شاید اسے بھی ثبوت کے طور پر قبول نہ کیا جائے۔ میرے خیال میں کئی نامی گرامی محققین نے بھی اس جھیل کا رخ کیا ہوگا۔ کیا تمہارے پاس ان کی تفصیلات ہیں؟''

''بالکل۔'' گیری لیپ ٹاپ گود میں لیے بیٹھا تھا۔ مختلف ویب سائٹس متعلقہ معلومات فراہم کر رہی تھیں۔

ان [illegible] اور چیستانی مہمات کا آغاز برطانوی ماہر سر ایڈورڈ ماؤنٹ کی کوششوں سے ہوا۔ پھر 1962 میں قائم ہونے والے The Loch Ness Phenomena Investigation Bureau (LNPIB) کا ذکر آیا، جن کے اشتراک سے یونیورسٹی برمنگھم کے ایک استاد پروفیسر ڈی گورڈن ٹکر نے جدید آلات کی مدد سے عفریت کی تلاش شروع کی۔ پروفیسر کے سونار آلات ایک قوی الجثہ مخلوق کی موجودگی کے مبہم شواہد پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ 1970 میں یونیورسٹی آف شکاگو کے ایک استاد رائے مائیکل نے زیرِ آب آوازیں ریکارڈ کرنے والے ایک سسٹم کے ساتھ اسکاٹ لینڈ کا رخ کیا۔ مہم کے اختتام پر اس نے چند انتہائی پُراسرار آوازیں ریکارڈ کرنے کا دعویٰ کیا۔

کھڑکی سے آنے والی ہوا گیری کے بالوں سے کھیل رہی تھی۔ نظریں مانیٹر پر ٹکی تھیں۔ وہ کسی سحر کے زیرِ اثر تھا۔

اب وہ انہیں ڈاکٹر رابرٹ رائن کی سربراہی میں اس جھیل کا رخ کرنے والے امریکی محققین کے متعلق بتانے لگا، جن کے آلات نے ایک ایسی زیرِ آب مخلوق کی نشان دہی کی جو کسی ڈریگن کے مانند تھی۔ پھر رابرٹ رائن کی مخلصانہ کوششوں کا ذکر ہوا۔ جو 35 برس تک اس عفریت کی تلاش میں جتا رہا...

جیپ گھنے درختوں کے درمیان دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے قریب درختوں کے ساتھ چشمہ بہتا تھا۔

گیری کا جوش انتہا کو چھو رہا تھا۔ وہ بے تکان بول رہا تھا۔ اس نے نکولس اور جیکولن کو ڈسکوری چینل اور نیشنل جیوگرافک کی تحقیقات سے آگاہ کیا، جس کے بعد بی بی سی کی کوششیں موضوع بن گئیں۔ "2003 میں بی بی سی نے اس عفریت کی تلاش شروع کی۔ انہوں نے سونر ٹیکنالوجی کے علاوہ سیٹلائٹ ٹریکنگ سسٹم بھی استعمال کیا۔ بی بی سی کی ٹیم نے کئی دن یہاں گزارے۔ لوٹنے کے بعد انہوں نے اس عفریت کو ایک واہمہ قرار دے دیا۔ یعنی..." گیری سانس لینے کے لیے رکا۔ "عفریت انہیں بھی چکما دے گیا۔ بڑا شاطر واقع ہوا ہے۔"

"نہیں جناب۔" ڈرائیور نے بات کاٹی۔ "وہ شاطر نہیں۔ وہ تو ایک پُرسکون مخلوق ہے، جو انسانوں سے دور رہنا پسند کرتی ہے۔"

جیکولن دھیرے سے مسکرائی۔ گیری نے لیپ ٹاپ بند کر دیا اور نشست کی پشت سے ٹیک لگالی۔ نکولس بھی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ قصبے سے چند میل دور تھے۔ منزل قریب آتی جا رہی تھی اور تجسس بڑھ رہا تھا۔

اچانک ہارن کی چنگھاڑ کانوں سے ٹکرائی۔ ایک بپھری ہوئی ویگن پیچھے سے برآمد ہوئی۔ لہراتے ہوئے اس نے جیپ کو اوورٹیک کیا۔

وہ ایک خطرناک لمحہ تھا۔ حادثہ ٹالنے کے لیے ڈرائیور نے اسٹیرنگ گھمایا۔ بریک چرچرائے۔ جیپ بے قابو ہونے لگی۔ سانحہ بے حد نزدیک تھا، مگر ڈرائیور کی مہارت نے اسے ٹال دیا۔ لمحے بھر بعد جیپ دوبارہ سڑک پر آگئی۔

ڈرائیور آئرش میں نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ ویگن فرانے بھرتے ہوئے غائب ہوگئی۔

جیکولن اور گیری کے چہرے پر بھی تناؤ آگیا تھا جو آہستہ آہستہ دھیما پڑنے لگا، مگر نکولس... اس کے دل میں اندیشے پنپ رہے تھے۔ کیونکہ اس نے ویگن کے ڈرائیور کو پہچان لیا تھا۔

وہ وہی آدمی... جس نے آڈیٹوریم میں ڈاکٹر اینگلز پر حملہ کیا تھا۔

☆☆☆

جب آبادی کے آثار ظاہر ہوئے، سورج مغرب کی سمت سفر شروع کر چکا تھا۔

ڈرمیڈروچیڈ جھیل کے مغربی کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا حسین قصبہ تھا۔

اُن کی رہائش کا انتظام ایک صاف ستھری سرائے میں تھا۔ کچھ دیر انہوں نے آرام کیا۔ شام کی چائے پینے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔

جس پہلی شے نے نکولس کا متاثر کیا، وہ قصبے کی فضا میں تیرتا سکون اور خاموشی تھی۔ مقامی افراد نے انہیں دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کیا۔ ان کے چہرے اطمینان اور قناعت کے عکاس تھے۔

وہ قصبے کے مسحور کن ماحول پر گفتگو کرتے ہوئے "نیس جھیل سینٹر" کی سمت بڑھ رہے تھے۔ جب وہ نسبتاً اونچے علاقے سے گزرے، تب پُراسرار جھیل کی پہلی جھلک نظر آئی جس کی گہرائی میں ایک راز چھپا تھا۔

گیری نے دوربین آنکھوں پر لگالی۔ "وہ دیکھو۔" وہ مشرق کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ جھیل کے کنارے کسی کھنڈر کے آثار تھے۔ "قلعۂ یورکوہارٹ۔" اس نے دوربین جیکولن کو دیتے ہوئے کہا۔ "اسے 13ویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اسکاٹ لینڈ کی جنگ آزادی میں اس شاہی قلعے کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ایک عرصے تک یہ طاقت کا سرچشمہ رہا، مگر..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"مگر اب یہ ماضی کے مزار کی صورت باقی رہ گیا ہے۔" نکولس نے جملہ مکمل کیا۔

گیری مسکرا دیا۔ "درست کہا۔ واقعی وقت ظالم ہے۔"

وہ کچھ دیر بعد سینٹر پہنچ گئے۔ کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ تینوں اندر داخل ہوئے۔

وہ پانچ کمروں پر مشتمل ایک صاف ستھری عمارت تھی، جہاں اس وقت مکمل سناٹا تھا۔

دفعتاً ایک کھٹکا ہوا۔ کونے والے کمرے سے ایک بوڑھا شخص برآمد ہوا اور انہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں نوجوانو۔" لہجہ آئرش تھا، جس میں روایتی دیہی خلوص تھا۔

"جناب ہم جھیل کی سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لانچ اور دیگر آلات کی ضرورت ہے۔ اور ہاں ایک جہاز راں بھی چاہیے، جو جھیل کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔"

"حیرت ہے۔" آدمی بڑبڑایا۔ پھر کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھیے۔"

کچھ دیر فائل کے ورق پلٹتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ "ٹھیک ہے۔ منگل کی صبح آپ کو لانچ اور تمام ضروری سامان مل جائے گا۔ آدھی رقم ایڈوانس ادا کرنی ہوگی، آدھی لوٹنے کے بعد۔"

"منگل؟" نکولس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "آج اتوار ہے... اور ہم کل صبح سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

آدمی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ "حیرت ہے۔" وہ پھر بڑبڑایا۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے گہرا سانس لیا۔ "تو جو تو، ضرور برطانیہ کا کوئی مرکزی شہر تمہارا مسکن ہے اور تم اس دورافتادہ قصبے کی بابت زیادہ نہیں جانتے۔ انورنیس میں فروری کے پہلے سوموار کو چھٹی ہوتی ہے اور کل سوموار ہے۔"

"مگر ہم کل کا دن ضائع نہیں کر سکتے۔" گیری کے لہجے میں خفیف سا احتجاج تھا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" اس نے ہاتھ سے شانت رہنے کا اشارہ کیا۔ "آپ کو لانچ مل جائے گی۔ آلات بھی۔ مگر لانچ آپ کو خود ہی چلانی پڑے گی۔ سرکاری اہلکار کل چھٹی پر ہیں۔"

چند پل خاموشی چھائی رہی۔

"کیا کوئی نجی کمپنی ہماری مدد کر سکتی ہے؟" بالآخر گیری نے کہا۔

"اس وقت تم ایک چھوٹے سے قصبے میں ہو نوجوان۔ جہاں کے باسی فروری کی پہلی سوموار چھٹی مناتے ہیں۔ ویسے..." وہ سانس لینے کو رکا۔ "ہمارا پیارا جارج ایڈورڈ اپنی نجی ہوئی لانچ کے ساتھ شاید کل جھیل پر موجود ہو۔ کام کے معاملے میں پورا امریکی ہے۔ مگر وہ تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ اس نے فون پر مطلع کیا تھا کہ اس کے لیے کوئی بکنگ نہیں کی جائے۔ وہ مصروف ہے۔"

"یہ تو پریشان کن معاملہ ہے۔" نکولس نے کہا۔

آدمی نے کاندھے اچکائے۔ "بوڑھا ہرکولیس شاید تمہاری مدد کر سکے، مگر..." وہ ٹھہرا۔ "اس کی کشتی زیادہ بڑی نہیں۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ آپ لانچ کرائے پر لے لیں، اگر آپ میں سے کوئی اسے چلانا جانتا ہو۔"

"میں سنبھال لوں گا۔" گیری نے کہا۔ "کوئی مسئلہ نہیں۔"

"خوب! یہ تو اچھی بات ہے۔" اس نے چند کاغذات نکالے۔ ان پر کچھ لکھا۔ پھر دستخط کر دیے۔ "یہاں سے چند میٹر دور، دائیں جانب ہمارا آفس ہے۔ گو شام ہو چکی ہے مگر وہاں ضرور کوئی نہ کوئی ہوگا۔ کوئی اور ہو نہ ہو بوڑھا ہرکولیس تو وہیں ہوگا۔ وہ آپ کو سب سمجھا دے گا۔"

"بوڑھا ہرکولیس۔" جیکولن نے ذہن پر زور دیا۔ "یہ وہی آدمی ہے ناں، جسے سب جھیل کا رازداں کہتے ہیں۔ میں نے اپنے والد سے اس کا ذکر سنا تھا۔ مگر کیا وہ اب تک زندہ ہے؟"

"بالکل۔" آدمی کے چہرے پر ایک خاص نوع کی خوشی تھی۔ "وہ کل کی طرح آج بھی چاق و چوبند ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ میرے پوتے کی شادی میں بھی شریک ہوگا۔"

"شکریہ جناب۔" وہ تینوں کھڑے ہوگئے۔

جب وہ دروازے پر پہنچے، انہیں آئرش کی آواز سنائی دی۔ "مجھے امید ہے کہ آپ کل تنہا نہیں ہوں گے۔ کوئی اور صاحب بھی آئے تھے لندن سے۔ انہوں نے بھی کل کے لیے لانچ لی ہے۔ توقع ہے کہ اچھے دوستوں کی طرح کل کا ظہرانہ آپ ساتھ کریں گے۔" اس نے ایک پرانی آئرش کہاوت کہی۔

جیکولن اور گیری نے تو زیادہ توجہ نہیں دی، مگر نکولس کا ماتھا ٹھنکا۔

"ایک اور صاحب؟" وہ بڑبڑایا۔

☆☆☆

"تو میرے بچو! تم لوگوں نے کل کا دن چنا ہے۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ اچھا ہے۔"

بوڑھا سامنے کھڑا تھا۔ ایک توانا اور ہوشیار شخص کے مانند۔ فقط جھریاں عمر کی چغلی کھاتی تھیں، ورنہ وہ اتنا چوکس اور صحت مند تھا کہ کوئی اس کی عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

وہ جھیل کے کنارے ایک چھوٹے سے کاٹیج میں کھڑے تھے، جس کے نزدیک چند لانچ اور چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ جھیل پر سحر انگیز خاموشی چھائی تھی، جسے بوڑھے کی بھید بھری مسکراہٹ مہمیز کرتی۔

"کل صبح تم مجھے یہیں پاؤ گے۔ لانچ، دیگر اشیا سب تمہیں مل جائے گا میرے بچو۔ دوران سفر بھی شاید ہماری ملاقات ہو جائے۔ میں دن کا حصہ جھیل ہی میں گزارتا ہوں۔" اس نے کنارے پر لگی چھوٹی سی کشتی کی جانب اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" جیکولن نے کہا۔ "کیا ہم آپ کا کچھ وقت لے سکتے ہیں؟"

"ضرور میرے بچو! میرا وقت تمہارے لیے ہی تو ہے۔"

"لوگ آپ کو جھیل کا رازداں کہتے ہیں۔" جیکولن نے بات شروع کی۔ "آپ ضرور اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں گے؟"

"ہاں۔" وہ ہنسا۔ "دراصل جھیل میری دوست ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی ہے اور جھیلیں رازوں کی امین ہوتی ہیں۔"

"تو آپ عفریت کی بابت بھی جانتے ہوں گے؟"
گیری نے فوراً کہا۔

"عفریت۔" بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔ "کتنا عجیب لفظ ہے یہ۔ انتہائی درشت۔" اس کی نظریں جھیل پر ٹکی تھیں۔ "یہ جھیل بہت ہی شانت ہے بچو۔ پُرسکون اور خاموش۔ بلا کی حسین۔"

"آپ برسوں سے یہاں ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کچھ عجیب دیکھا؟ کوئی واقعہ؟ کوئی پُراسرار مخلوق؟"

سامنے سے ایک لانچ گزری۔ عرشے پر کھڑے جارج ایڈورڈ نے بوڑھے کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ کچھ ساعت خاموشی چھائی رہی۔

"واقعہ!" بالآخر بوڑھے نے خاموشی توڑی۔ "نہیں میرے بچو، کبھی نہیں۔ یہاں تو بس میں نے محبت کا تجربہ کیا۔ البتہ..." اس نے ایک نظر تینوں پر ڈالی۔ "میں تمہیں ایک واقعہ ضرور سنا سکتا ہوں۔ صدیوں پرانا واقعہ۔ کیا سننا چاہو گے؟"

"بالکل۔" جیکولن نے گردن ہلائی۔

"یہ چھٹی صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ لیکن اس کا احوال سو سال بعد قلم بند کیا گیا۔" بوڑھے نے کسی داستان گو کی شکل اختیار کر لی۔ "تم نے سینٹ کولمبیا کا نام سنا ہوگا بچو۔ خدا کا نیک بندہ۔ آیانا کے ایک صوفی آدومنن نے اس کے حالاتِ زندگی مرتب کیے۔ اس انسان کی زیست عجیب تھی۔ صدیوں قبل وہ یہاں، اس جھیل کے نزدیک خدا کا پیغام لے کر پہنچا تھا۔" اس نے محبت کی نظر جھیل پر ڈالی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود سینٹ کولمبیا کے دور میں پہنچ چکا ہو۔ "یہ علاقہ اس وقت ویرانہ تھا۔ وحشت رقص کرتی تھی یہاں۔ چند ہی نفوس تھے۔ مگر انسان کو راہِ نجات بتانے کے لیے وہ نیک شخص یہاں چلا آیا۔ اور یہاں ٹھیک اس مقام پر جہاں ہم موجود ہیں، ایک پُراسرار واقعہ پیش آیا۔"

تینوں دم سادھے بیٹھے تھے۔ بوڑھے کی آواز سحر انگیز تھی۔

"اس کی سوانح عمری میں ایک پُراسرار مخلوق کا تذکرہ ملتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے بچو۔ جب وہ نیک نام شخص یہاں سے گزرا تو ماہی گیر مدد کے لیے پکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس کا دامن پکڑ لیا اور فریاد کی۔ درویش کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ان کے ساتھی کو جھیل کے عفریت نے اپنے دانتوں سے ادھیڑ کر ہلاک کر دیا ہے۔ سینٹ کولمبیا نے اپنے ایک شاگرد کو اشارہ کیا، جو فوراً جھیل میں اتر گیا۔ وہ کسی مشاق تیراک کی طرح تیر رہا تھا۔ اور تب ایک عفریت برآمد ہوا۔ سانپ سی گردن، قبل از تاریخ کے جانور سا منہ۔ وہ پھنکار رہا تھا۔ وہ شاگرد پر جھپٹا... تب درویش نے ہاتھ اٹھایا، دراز میں سے روشنی پھوٹی۔ اس نے عفریت پر نگاہ کی، جس میں جلال تھا اور حکم دیا۔ ٹھہر جا... عفریت جیسے اچانک تنویم کے زیرِ اثر آ گیا ہو... وہ ٹھہر گیا۔ اور درویش نے کہا، لوٹ جا، فوراً۔ اور پھر کبھی اس سمت نہیں آنا کہ یہاں خدا کے بندے رزق ڈھونڈتے ہیں۔ بس وہ عفریت پانی میں غائب ہو گیا اور پھر کبھی خشکی پر ظاہر نہیں ہوا۔ کبھی نہیں۔"

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ مشرق سے چلنے والی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی، جو جھیل سا گہرا تھا اور جھیل کی طرح پُرسکون تھا۔

☆☆☆

حیرت نے نکولس کو آلیا۔ ایسی حیرت جس کی تہ میں اندیشے حرکت کرتے۔

چند پلوں قبل ہی وہ تینوں بیگ اٹھائے سرائے سے باہر آئے تھے۔ جھیل تک جانے سے قبل ارادہ مقامی ریسٹورنٹ میں ناشتا کرنے کا تھا۔ ابھی وہ سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک فراٹے بھرتی ویگن پہلو سے گزری اور دھول اڑاتی ہوئی غائب ہو گئی۔

گیری نے ویگن کے ڈرائیور کو صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ مگر نکولس خاموش رہا۔ بالکل خاموش۔ وہ ڈرائیور کو پہچان چکا تھا اور اس شخص کی یہاں موجودگی اسے پریشان کر رہی تھی، تقاضا کر رہی تھی کہ وہ اس شخص کے بارے میں حقیقت تک رسائی حاصل کرے۔

ناشتے کے دوران بھی وہ خاموش رہا۔ جب وہ اٹھنے لگے تو نکولس نے جیکولن کو مخاطب کیا۔ "تم دونوں چلو، مجھے ایک ضروری کام ہے۔ کسی کو فون کرنا ہے۔"

جیکولن کے چہرے پر حیرت ابھری۔ گیری نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "جیسے آپ کی مرضی جناب، لیکن جلدی لوٹ آیئے گا۔ یہ کیپٹن کا حکم ہے۔ ورنہ تیر کر لانچ تک پہنچنا پڑے گا۔"

کچھ دیر بعد نکولس ایک پرانی وضع کے ٹیلی فون بوتھ میں کھڑا تھا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔ بیل جاتی رہی۔ پھر کسی کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

"ہیلو ڈاکٹر اینگلز! میں نکولس بول رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا، ہم ملے تھے۔"

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر ڈاکٹر چہکا۔ "ہیلو

کیپٹن، کیسے مزاج ہیں۔ تمہاری آواز بہت دور سے آتی معلوم دیتی ہے۔ لندن میں ہو یا اسکاٹ لینڈ پہنچ گئے؟"

وہ ڈاکٹر کی یادداشت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ "اسکاٹ لینڈ میں ہوں ڈاکٹر۔ نیس جھیل کے پاس۔ دراصل میں نے آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"پوچھو، کیا پوچھنا ہے۔" لہجہ دوستانہ تھا۔

"وہ..." نکولس متذبذب تھا۔ "سیمینار والے روز آڈیٹوریم میں ایک شخص نے آپ پر حملہ کیا تھا.. کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

فون کی دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ چند پلوں بعد ڈاکٹر کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ "غالباً تم ایک جنونی کی بابت پوچھ رہے ہو۔ ایک بدمعاش، جان کوب کا خودساختہ بیٹا۔"

"جان کوب۔" نکولس بڑبڑایا۔ "وہی معروف ریسنگ ڈرائیور، جو ایک ریکارڈ کے تعاقب میں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔"

"ہاں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اور یہ واقعہ نیس جھیل میں پیش آیا تھا۔"

"مگر اس جنونی شخص کا آپ سے کیا تعلق ہے؟ اس نے آپ پر حملہ کیوں کیا؟"

"تعلق ہے۔" ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ "یہ تیس برس پرانا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف لندن سے منسلک تھا۔ ایک روز الیگزینڈر کوب نامی ایک مضطرب نوجوان کئی تصاویر اور وڈیوز لیے مجھ سے ملنے آیا، جن کا تعلق نیس جھیل کے عفریت سے تھا۔ اس نے خاصی تحقیق کی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جھیل میں عفریت کی موجودگی ثابت کر سکتا ہے۔ سچ کہوں تو وہ تصاویر اور وڈیوز واقعی حیران کن تھیں۔ میں نے نیسی سے متعلق آج تک اتنے واضح ثبوت نہیں دیکھے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں ان ثبوت کی بنیاد پر ایک رپورٹ مرتب کروں۔ اور میں نے رپورٹ تیار بھی کر لی، مگر پھر مجھے اس منصوبے سے پیچھے ہٹنا پڑا۔"

"ایسا کون سا واقعہ پیش آیا ڈاکٹر کہ آپ ثبوتوں کے باوجود پیچھے ہٹ گئے؟" نکولس نے فوراً سوال کیا۔

"اس کا سبب اس کا ایک تقاضا تھا، جو خاصا پریشان کن تھا۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "اس کی خواہش تھی کہ میں اپنی رپورٹ میں یہ تجویز شامل کروں کہ نیسی کہلانے والی یہ مخلوق انسانوں کے لیے خطرے کی علامت ہے، اسے فی الفور ختم کر دیا جائے۔ ظاہری بات ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا

آزر

حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام، جو بت تراش، بت فروش اور بت پرست تھا۔ قرآن میں ہے "اور یاد کر جب کہا ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے، کیا تو مورتیوں کو خدا بناتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہی میں ہے۔" (سورہ انعام۔ آیت 74) توریت میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام تارح (تارخ) بتایا گیا ہے۔ بعض علماء کے مطابق آزر تارخ کا معرب ہے۔

مرسلہ: شکیلہ پروین، سرگودھا

تھا۔ کیونکہ تاریخ میں عفریت کی جانب سے کسی پر حملے یا کسی کو ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔"

"ماسوائے سینٹ کولمبیا کی سوانح عمری کے، جب عفریت نے ایک ماہی گیر کو قتل کر دیا تھا۔" نکولس کے ذہن میں بوڑھے کی سنائی ہوئی کہانی گھوم رہی تھی۔

"وہ دیگر معاملہ تھا۔ ایک قدیم قصہ۔ ایک اساطیر۔" ڈاکٹر نے فوراً کہا۔ "جدید دور میں اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ جب میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، تو وہ مجھ سے اکھڑ گیا۔ اور تب اس نے عالمِ جنون میں جان کوب کی پُراسرار موت کا ذکر کیا، جس کے لیے وہ نیس جھیل کے عفریت کو قصوروار گردانتا تھا۔ اس کے اس دعوے نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ وہ مرحوم کوب کا بیٹا ہے۔ تب مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ انتقامی جذبے کے تحت یہ سب کر رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً انورنیس کی انتظامیہ سے رابطہ کیا، جہاں سے پتا چلا کہ ایک نوجوان کو جھیل کے اطراف فائرنگ کرنے کے الزام میں چند برس قبل شہر بدر کر دیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر خاموش ہو گیا۔ نکولس کے دل میں اضطراب نے جنبش کی۔ "پھر کیا ہوا ڈاکٹر؟"

"میں نے اس پر معذرت کر لی۔" ڈاکٹر بولا۔ "اس نے دستاویزات اٹھائیں اور کف اڑاتا ہوا میرے دفتر سے چلا گیا۔ چند برس بعد مجھے پتا چلا کہ کسی شخص نے آزاد حیثیت میں نیس جھیل کے حوالے سے اپنی تحقیق انسٹی ٹیوٹ کو ارسال کی ہے۔ ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ اس عفریت کے خاتمے کے لیے اسکاٹ لینڈ انتظامیہ پر دباؤ

ڈالا جائے۔ شواہد کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی، جس میں میں بھی شامل تھا۔ تصاویر پر نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ شواہد الیگزینڈر ہی نے ارسال کیے ہیں۔ خیر، کمیٹی نے توقع کے عین مطابق انہیں رد کر دیا۔ اس واقعے کے چند روز بعد مجھے ایک فون کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف الیگزینڈر تھا، جو یہ یقین کیے بیٹھا تھا کہ کمیٹی نے میرے دباؤ پر اس کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس نے دھمکی دی کہ میں نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہوں۔"

نکولس نے گہرا سانس لیا۔ "کیا آپ کا اس سے پھر سامنا ہوا؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔ "برسوں تک وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔ پھر اس روز آڈیٹوریم میں اچانک میں نے اسے اپنے روبرو پایا۔ میں اسے پہچان نہیں پاتا، اگر میری نظر اس کے دائیں گال پر موجود نشان پر نہیں پڑ جاتی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ لندن کے ایک ریسٹورنٹ میں ملازمت کر رہا تھا۔"

چند ساعت خاموشی رہی۔ پھر نکولس کی آواز فون بوتھ میں گونجی۔ "ایک سوال اور ڈاکٹر۔ آپ نے اس کے لیے جون کوب کا خودساختہ بیٹا کے الفاظ استعمال کیے۔ اس سے کیا مراد ہے؟"

"لمبی کہانی ہے۔" ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ "الیگزینڈر کا دعویٰ ہے کہ وہ کوب کا بیٹا ہے، مگر یہ حقیقت نہیں۔ پی ایچ ڈی ریسرچ کے دوران میں نے اُسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جون کوب کے خاندان سے بھی رابطہ کیا۔ اور تب یہ انکشاف ہوا کہ الیگزینڈر اس کی اولاد نہیں۔ دراصل کوب کے محلے میں ایک جنونی شخص رہا کرتا تھا، جس نے ایک طوفانی رات اپنی بیوی اور دو بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا۔ اس کا ایک بیٹا معجزاتی طور پر محفوظ رہا۔ قاتل کو گرفتار کر لیا گیا۔ تشخیص سے پتا چلا کہ وہ نفسیاتی مریض ہے۔ اسے علاج کے لیے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ کیونکہ واقعہ کوب کے محلے میں پیش آیا تھا، اس لیے میڈیا نے اسے خصوصی اہمیت دی۔ کوب نے بھی ایک نیک انسان کی حیثیت سے اس کی کفالت کی ذمے داری لے لی۔ چند برس وہ بچہ اس کے گھر رہا، مگر کوب کی پُراسرار موت کے بعد اسے یتیم خانے میں داخل کروا دیا گیا، جہاں سے چند برس بعد وہ فرار ہو گیا۔ الیگزینڈر دراصل وہی بچہ ہے۔ اور اس واقعے کا سب سے پریشان کن پہلو یہ ہے کہ... چند برس بعد اسپتال میں زیرِ علاج ایک نفسیاتی مریض کو باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے قتل کر دیا۔"

"اوہ۔" نکولس کے منہ سے نکلا۔ "اپنے باپ کو ٹھکانے لگانے کے بعد اب وہ محسن کی موت کا انتقام لینا چاہتا ہے۔ عجیب!"

"عجیب ضرور ہے، مگر میرے نزدیک یہی حقیقت ہے۔" ڈاکٹر نے گہرا سانس لیا۔ "اس کا باپ نفسیاتی مریض تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ نفسیاتی امراض وراثت میں منتقل ہوتے ہیں۔ کوب اس کے لیے کسی مسیحا کے مانند تھا۔ اپنی ماں اور بھائیوں کے بہیمانہ قتل، کوب کی پُراسرار موت اور اذیت ناک بچپن نے اسے نفسیاتی پیچیدگیوں کی اتھاہ گہرائی میں دھکیل دیا، جہاں سے انتقام کا عفریت برآمد ہوا۔ بس یہی کل کہانی ہے میرے دوست۔ مگر... تم اس شخص میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟ سب ٹھیک تو ہے!"

"اوہ ہاں۔" نکولس جیسے خواب سے جاگا۔ "سب ٹھیک ہے۔ شکریہ۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ فون بوتھ میں کھڑا تھا۔ جھیل کی سطح پر اضطراب کی لہریں جنم لے رہی تھیں۔

☆☆☆

کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ دبیز بادل آسمان پر چھائے تھے۔ سورج کی روشنی مٹنے لگی تھی۔

"ہوا کا رخ بدل گیا ہے۔" ایک آواز کانوں سے ٹکرائی۔ بوڑھا اپنی کشتی کے نزدیک کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔

نکولس تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ "کیا طوفان آنے والا ہے؟" لہجے میں اندیشے تھے۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جھیل کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چند کلومیٹر دور نسبتاً گہرے پانی میں ایک لانچ کھڑی تھی۔

"تمہارے دوستوں کو تمہارا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" بوڑھے نے دھیرے سے کہا۔ "وہ تھوڑا رک جاتے تو بہتر تھا۔ خیر میں تمہیں لانچ تک چھوڑ دوں گا۔ کوئی مسئلہ نہیں۔"

جب وہ بوڑھے کی کشتی کی جانب بڑھ رہا تھا، جارج ایڈورڈ اپنی لانچ کے عرشے پر بیٹھا کیمرا ٹھیک کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کشتی لانچ کی سمت بڑھ رہی تھی۔ چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کشتی ایک ٹیلے کے نزدیک سے گزری جہاں ایک چھوٹی لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ عرشہ خالی تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر پریشانی کی لہر ابھری، مگر وہ خاموش رہا۔

چند منٹ بعد وہ اس لانچ کے قریب پہنچ گئے جس پر گیری اور جیکولین سوار تھے۔

گیری ریلنگ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر بوڑھے کو سلام کیا۔ کشتی لانچ سے جا لگی۔ نکولس اس میں سوار ہو گیا۔

"گہرے حصے میں نہ جاؤ تو بہتر ہے بچو۔" بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں موجود ہوں۔" وہ خودکلامی کے عمل سے گزر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد کشتی جھاگ چھوڑتے ہوئے اچھلتے پانی میں چلی گئی۔

نکولس گیری کی جانب متوجہ ہوا، جو ویڈیو کیمرا اٹھائے کھڑا تھا۔

"جیکولین کہاں ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"تمہارے پیچھے۔" اسے جیکولین کی شریر آواز سنائی دی۔ وہ مڑا۔ اس کی محبوبہ دل کش مسکراہٹ لیے کھڑی تھی۔

"یہاں کھڑے رہنا بے کار ہے۔ چلو دوست، اسٹیئرنگ سنبھالنے کا وقت آن پہنچا ہے۔ کیبن میں چلتے ہیں۔" گیری کی آواز میں جوش تھا۔ "اب تم میری مہارت دیکھو گے۔"

وہ گیری کے پیچھے چلتے ہوئے کیبن میں داخل ہوئے۔

گیری بڑے سے آلے کے سامنے جا کر رکا، جو زیرِ آب ہونے والی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ بائیں جانب سولر تصاویر اتارنے والا آلہ نصب تھا۔ اسٹیئرنگ کے ساتھ کمپاس لگا تھا۔

گیری نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ "ہمیں آگے بڑھنا ہوگا دوستو۔"

نکولس نے کنٹرول روم کے دبیز شیشے سے جھانکا۔ آسمان پر سیاہ بادل تیر رہے تھے۔

"موسم اچھا نہیں۔ ہمیں احتیاط برتنی چاہیے۔" نکولس نے دھیرے سے کہا۔

"بے فکر رہو۔" گیری مسکرایا۔ "جلد بادل چھٹ جائیں گے۔ نیسی کی تلاش میں ہمیں جھیل کے گہرے حصے میں جانا ہوگا۔"

وہ جیکولین کی جانب مڑا، جس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

"تم لوگوں کو میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔" اس نے شکوہ کیا۔

"ارادہ تو یہی تھا، لیکن گیری بہت پُرجوش تھا۔" جیکولین نے کہا۔ "اور پھر ہمیں وہ صاحب مل گئے۔"

"کون صاحب؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"شاید میرا ذکرِ خیر ہو رہا ہے۔" اُسے پشت سے ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

وہ مڑا۔ ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مضبوط شانوں پر جھولتے اس کے بالوں میں سفیدی تھی۔ شیو بڑھی ہوئی۔ آنکھوں میں اضطراب اور چہرے پر زخم کا پرانا نشان۔

"الیگزینڈر کوب۔" نکولس کے دل میں سرگوشی ہوئی۔

"ہیلو، میرا نام جیری ٹیم ہے۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

نکولس کے ذہن میں آندھی چلنے لگی۔ وہ انہیں دھوکا دے رہا تھا۔

"مسٹر جیری کی لانچ خراب ہو گئی تھی تو ہم نے انہیں لفٹ دے دی۔" گیری کی آواز اسے لمحۂ حال میں لے آئی۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس شخص کا ہاتھ کرخت تھا۔

گیری نے بات جاری رکھی۔ "مسٹر جیری لندن سے ہیں۔ شوقیہ محقق۔ ہماری طرح انہیں بھی نیسی میں دلچسپی ہے۔ پہلے بھی وہ یہاں آتے رہے ہیں۔ میں نے سوچا ان کا ساتھ ہمارے لیے سودمند ہوگا۔"

"میں اس جھیل، اس کے جغرافیے اور یہاں کے موسم سے اچھی طرح واقف ہوں۔" اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔

"اچھا ساتھ رہے گا۔"

نکولس شدید اذیت میں تھا۔ ڈاکٹر اینگلز سے ہونے والی گفتگو کے بعد یہ عیاں ہو چکا تھا کہ اس کے سامنے ایک جنونی، ایک قاتل کھڑا ہے، جو انتقامی جذبے سے سلگ رہا ہے۔ وہ ان کی زندگیاں بھی خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

"ہمیں مغرب کی طرف بڑھنا ہوگا۔ وہ جھیل کا عمیق ترین حصہ ہے۔ امید ہے، وہاں آپ کو اس عفریت کی ایک جھلک مل جائے۔" خود کو جیری بتانے والے شخص نے عفریت کا لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" یہ کہتے ہوئے گیری اسٹیئرنگ گھمانے لگا۔

"میں کافی کا انتظام کرتی ہوں۔" جیکولین نے کہا اور باہر چلی گئی۔ نکولس وہیں کھڑا اس شخص کو گھورتا رہا۔ آدمی نے اس عمل کو محسوس کیا، مگر خاموشی سے آلات پر نظریں جمائے رکھیں۔

لانچ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بادل اب سورج

پر غالب آ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے شام ڈھل چکی ہو۔

"کیا ہم پہلے مل چکے ہیں مسٹر جیری؟" بالآخر نکولس نے خاموشی توڑی۔

"نہیں۔" لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے جواب دیا۔

جیکولن کافی کے مگ لیے کیبن میں داخل ہوئی۔ وہ خاموشی سے کافی پینے لگے۔ لانچ آگے بڑھتی رہی۔

کافی ختم کر کے وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ "میں ذرا کیمرا لے آؤں۔"

وہ باہر نکل گیا۔

چند لمحہ خاموشی چھائی رہی، پھر نکولس کی مضطرب آواز گونجی۔ "میرے خیال میں ہمیں آگے نہیں جانا چاہیے۔" نکولس نے کہا۔ "موسم ٹھیک نہیں۔"

"چلو بھی نکولس۔" گیری مسکرایا۔ "یہ جھیل ہے کوئی سمندر نہیں۔ اگر بارش ہوئی تو لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

"تم سمجھ نہیں رہے یہ شخص..." وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آدمی سپاٹ چہرہ لیے دروازے میں کھڑا تھا۔ چند ساعت نکولس اور وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

"وہ دیکھو۔" اچانک گیری چلّایا۔

انہوں نے جھیل کی سمت دیکھا۔ پُراسرار انداز میں لہریں جنم لے رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے زیرِ آب کوئی شے حرکت کر رہی ہے۔

تجسس انہیں عرشے پر لے آیا۔ نظریں لہروں پر ٹکی تھیں، جو اب دھیرے دھیرے مٹ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد سطح آب پر سکون چھایا رہا۔ مگر پھر... ان کے بائیں جانب جھاگ جنم لینے لگے۔ کچھ ابھرا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔

"ہمیں اسی سمت آگے بڑھنا ہوگا۔" آدمی چلّایا اور.... کیبن کی سمت دوڑا۔ وہ تینوں اُسے کھڑکی سے دیکھ سکتے تھے۔ اس کی حرکات میں اضطراب تھا۔

اچانک بادل گرجے۔ انہوں نے آسمان کی سمت دیکھا۔ سیاہی گہری ہو رہی تھی۔ اگلے ہی پل بجلی چمکی اور پُراسرار نیلی روشنی جھیل پر پھیل گئی۔

"بارش ہونے والی ہے۔" جیکولن نے زینے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں برساتی لاتی ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" نکولس اس کے پیچھے ہو لیا۔

بیسمنٹ میں جانے والا زینہ کیبن کی پچھلی طرف تھا۔ وہاں سے لانچ کا عرشہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نکولس نے تیزی سے زینہ عبور کیا۔ اس سے قبل وہ جیکولن تک پہنچ پاتا، اُس کی نظر ایک کیبن پر پڑی، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سامان بکھرا تھا۔

تجسس کا سانپ اس کے دل میں پھنکارا۔ نکولس کیبن میں داخل ہوا۔ عجیب سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہاں کئی بوسیدہ بیگ پڑے تھے، منہ تک بھرے ہوئے۔ کچھ آلات بھی پڑے تھے۔ ابھی وہ ان بیگوں کو کھنگالنے کا ارادہ ہی باندھ رہا تھا کہ بادل پھر گرجے۔

اچانک اُسے عرشے پر کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ گیری کے الفاظ کانوں سے ٹکرائے۔ "وہ دیکھو... وہ سامنے!"

غصیلے بادل پھر گرجے۔ بجلی چمکی۔ کیبن کی چھوٹی سی کھڑکی سے نکولس نے باہر دیکھا۔ جھیل پر سیاہی چھا رہی تھی۔ دبیز بادل سورج پر قبضہ کر چکے تھے۔ آسمان تیار تھا اور اگلے ہی پل وہ برس پڑا... پوری قوت سے... کسی غصیلے عفریت کے مانند۔

طوفانی ہوائیں لانچ سے ٹکرا رہی تھیں۔ پُراسرار لہروں کا جنم ہو چکا تھا۔ اچانک بیسمنٹ کی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔

"تم یہاں کیا رہے ہو؟" ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

جیکولن سامنے کھڑی تھی۔ اس نے برساتی پہن رکھی تھی۔

"یہ لو۔" اس نے برساتی اس کی سمت بڑھائی۔ "بارش تیز ہو گئی ہے۔ لگتا ہے ہم طوفان میں پھنس گئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ زینے کی سمت دوڑی۔

چہرے پر تذبذب لیے نکولس آگے بڑھا۔ دفعتاً اس کی نظر ایک عجیب سے دستے پر پڑی، جو بیگوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔

حیرت کے زیرِ اثر وہ جھکا۔ بیگ اٹھاتے ہی خوف کی سرد لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ایک شوٹ گن اس کے سامنے تھی۔

ابھی وہ اسی حیرت سے مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بستر کے نیچے چھپائے گئے ایک چھوٹے سے بیگ نے اس کی توجہ جذب کر لی۔

اس نے بیگ کھینچا۔ زپ کھولتے ہوئے وہ دہل گیا۔ بیگ میں تباہی کا مکمل سامان تھا۔ اس میں چار دستی بم رکھے تھے۔

"طوفان آ رہا ہے۔" عرشے سے ابھرنے والی گیری کی آواز کانوں سے ٹکرائی، جس سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ "ہمیں لوٹنا چاہیے۔"

"نہیں۔" ایک مکروہ آواز بلند ہوئی، جو ایک قاتل کی تھی، ایک جنونی کی تھی۔ "وہ یہیں ہے۔"

"ہم مارے جائیں گے۔" گیری چلّایا۔

غصیلے بادل زور سے گرجے۔ بجلی تڑپی۔ انجن رک گیا۔ لانچ کی بیسمنٹ تاریکی میں ڈوب گئی۔ اندھیرا چھا گیا۔

خوف اور خطرے کے احساس نے نکولس کو آن لیا۔ وہ ٹٹولتا ہوا کیبن سے باہر آیا اور تاریکی کو پھلانگتے ہوئے زینہ کی سمت بڑھنے لگا۔ اور تب... عرشے سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

اُس نے بہ مشکل زینہ عبور کیا۔ عرشے پر پہنچتے ہی ایک وحشت ناک منظر اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔

ایک بڑی سی لہر لانچ کی سمت بڑھ رہی تھی۔

لہر پوری قوت سے ٹکرائی۔ لانچ کو شدید جھٹکا لگا۔ نکولس پورا بھیگ گیا۔

کیبن کی جانب سے اُسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک سایہ برآمد ہو جو تیزی سے لانچ کے اگلے حصے کی سمت بڑھ رہا تھا۔

اس سے قبل کہ نکولس کچھ سمجھ پاتا، ایک اور لہر لانچ سے ٹکرائی۔ ایک بار پھر بادل گرجے۔

وہ لانچ کے اگلے حصے میں پہنچنے ہی کو تھا کہ فائر کی کریہہ آواز گونجی۔ جس کے فوراً بعد ایک زوردار دھماکا ہوا۔

نکولس لرز گیا۔ احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ عرشہ تاریکی میں ڈوبا تھا۔ آسمان پوری قوت سے برس رہا تھا۔ ریلنگ کے پاس گیری اوندھا پڑا تھا۔ اس کے کاندھے سے خون بہہ رہا تھا۔ جیکولن اس کے نزدیک کھڑی تھی۔ وہ خوف سے سفید پڑ چکی تھی۔

اس کے قدم جیکولن کی سمت بڑھے۔ اچانک کوئی بھاری شے سر سے ٹکرائی۔ حملہ انتہائی شدید تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ آنکھیں بند ہونے لگیں۔

منظر دھندلا رہا تھا... حواس گم ہوتے جا رہے تھے اور جھیل میں تلاطم تھا۔

خوابناکی کی کیفیت غالب آنے لگی۔ اور تب پانی پر چھائے کہرے سے کچھ ابھرا۔ کوئی اٹھ رہا تھا... سامنے آ رہا تھا۔

سانپ جیسی لمبی گردن۔ ڈریگن سا سر۔ چمکتی ہوئی زرد آنکھیں۔ اور پھر ایک فائر ہوا... ڈھس۔

نکولس تھاہ گہرائی میں اتر گیا۔

کنارے پر موجود بوڑھے کی نظریں جھیل پر ٹکی تھیں۔

جھیل... جو شدید غصے میں تھی۔

☆☆☆

گھور اندھیرا تھا۔ اسرار تھا۔

آسمان مسلسل برس رہا تھا اور لانچ ہچکولے کھا رہی تھی۔ خواب کے اختتام پر حقیقت نے کروٹ لی۔

نکولس ریلنگ سے لگا بیٹھا تھا۔ سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ نقاہت بدن میں جاگزیں تھی اور خطرے کی بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔

اس نے بائیں سمت دیکھا۔ زخمی گیری لانچ کے عرشے پر پڑا تھا۔

پھر اسے ریلنگ کے آخری کونے پر ایک سایہ نظر آیا۔

جیکولن... جس کے سیاہ بال لہرا رہے تھے۔

اس نے آگے بڑھنے... کی کوشش کی، مگر نقاہت آڑے آ گئی۔

"جیکولن۔" اُس نے اپنی محبوبہ کو پکارا۔ وہ یوں ہی کھڑی رہی۔ اُس کی نظریں جھیل پر گڑی تھیں، جہاں تاریکی اور لہروں کے درمیان کوئی حرکت کر رہا تھا۔ جیکولن مبہوت ہو کر اُسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔

نکولس کو قدموں کی آواز سنائی دی۔ اُس نے اندھیرے میں نظریں گاڑ دیں۔ کیبن سے ایک لڑکھڑاتا ہوا سایہ برآمد ہوا۔ ایک خاص مقام پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

نکولس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"جیکولن۔" وہ چلّایا۔ آواز حلق ہی میں کہیں اٹک گئی۔

پُراسرار سائے نے بندوق سیدھی کی۔ رخ جیکولن کی جانب تھا۔ بجلی کڑکی۔ نیلی روشنی کا جنم ہوا اور تب نکولس کی نظر اس مکروہ چہرے پر پڑی، جس پر زخم کا نشان تھا۔

اس نے قوت مجتمع کی اور الیگزینڈر کی سمت دوڑ پڑا۔ اس سے قبل کہ قاتل کی انگلی ٹریگر دباتی، نکولس حملہ کر چکا تھا... بندوق اس کے ہاتھ سے گر گئی اور ریلنگ سے جا کر ٹکرائی۔

اب وہ دونوں عرشے پر تھے۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا۔ ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوششوں میں مصروف۔ اور جھیل کی سطح پر کوئی پھنکار رہا تھا۔

نکولس اس پر چڑھا ہوا تھا، مگر سر کی چوٹ اب تک حواس معطل کیے ہوئے تھی۔ اسے متلی محسوس ہو رہی تھی۔ ریلنگ کے پاس جیکولن خاموش کھڑی تھی۔ وہ کسی منتر کے زیر اثر تھی۔

جنونی الیگزینڈر حیران کن حد تک توانا تھا۔ اس نے نکولس کو ایک جھٹکے سے پرے پھینک دیا۔ اس سے قبل وہ سنبھل پاتا، الیگزینڈر بندوق اٹھا چکا تھا۔

وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا تھا۔ الیگزینڈر سامنے موجود تھا۔ ایک مکروہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ اس نے بندوق تان رکھی تھی۔ لمحۂ مرگ آن پہنچا تھا۔

اُسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ جیکولن اس کے پہلو میں آکر رک گئی۔ چہرہ پُرسکون تھا۔ اس نے نکولس کا ہاتھ تھام لیا۔

الیگزینڈر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ "خوب! دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کی بانہوں ہی میں دم توڑنا چاہیے۔ تمہاری کہانی رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔" ایک وحشی قہقہہ بلند ہوا۔

جیکولن اور نکولس ایک دوسرے کو تھامے کھڑے تھے۔ بندوق کا رخ ان کی جانب تھا۔ موت کا لمحہ سانس لے رہا تھا۔ ٹریگر پر الیگزینڈر کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا اور تب... نکولس کے چہرے پر حیرت ابھری، جس نے خوف کو زائل کر دیا۔ ہر احساس سے ماورا کر دیا۔

نکولس کے بدلتے تاثرات نے الیگزینڈر کو چونکا دیا۔ اُسے بے چینی کا احساس ہوا۔ اپنی پشت پر پھنکار سنائی دی۔ خوف سے چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ پلٹا۔ ایک لمبی گردن پر ٹکا سر... سر میں پیوست دو زرد آنکھیں۔

وحشت کے زیر اثر وہ پوری قوت سے چلایا۔ بندوق کا رخ جھیل کی سمت موڑ لیا۔ یہی موقع تھا... قیمتی موقع... نکولس تیزی سے آگے بڑھا۔

اس سے پہلے کہ الیگزینڈر فائر کرتا، وہ پوری قوت سے اس سے ٹکرایا۔ الیگزینڈر کا توازن بگڑ گیا۔ وہ جھیل میں جا گرا۔ اس سے قبل کہ وہ خود کو سنبھال پاتا... کسی پُراسرار وجود نے سرعت سے اُسے نیچے گھسیٹ لیا۔

ایک چیخ بلند ہوئی۔ نکولس نے جھیل کی سمت دیکھا، جس کے ایک حصے پر ہیجان برپا تھا۔ کچھ دیر... وہاں جھاگ جنم لیتے رہے۔ اور پھر... خاموشی چھا گئی۔ رہ گئیں تو بس لہریں۔

وہ حیرت اور وحشت کے زیر اثر وہاں کھڑا رہا، یہاں تک کہ اسے جیکولن کا ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔

"ہمیں گیری کی مدد کرنی ہوگی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

کچھ دیر بعد گیری کیبن کے فرش پر لیٹا تھا۔ خوش قسمتی سے زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گولی کاندھے کو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔ نکولس اسے فوراً طبی امداد دینے لگا۔ فرسٹ ایڈ باکس میں درد رفع کرنے والے انجکشن تھے، جن کا سیال اس نے گیری کے جسم میں داخل کر دیا۔

جیکولن اور نکولس اپنے دوست پر جھکے تھے۔ وہ اُس کی جان بچانا چاہتے تھے اور تب وقت نے ایک پُراسرار کروٹ لی۔ کہیں دور، افق پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ نکولس نے سر اٹھایا۔ حیرت نے اُسے آن لیا۔ بارش تھم چکی تھی۔ بادل دور ہٹنے لگے۔ سورج کی روشنی جگہ بنانے لگی۔ جھیل شانت ہو چکی تھی۔

انہوں نے گیری کو اٹھا کر ایک کاؤچ پر لٹا دیا اور عرشے پر آ گئے۔ مغرب کا حصہ روشن تھا۔ بادل جس رفتار سے آئے تھے، اسی رفتار سے لوٹ گئے۔ جھیل ویسی ہی تھی جیسے کل تھی۔ پُرسکون۔

نکولس کو دور ایک دھبا دکھائی دیا، جو دھیرے دھیرے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ ایک کشتی تھی، جو تیزی سے لانچ کی سمت آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد انہیں ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ ایک شفیق آواز نے سماعتوں میں رس گھولا۔

"میرے بچو! تمہیں خیریت سے پا کر خوشی ہوئی۔ طوفان واقعی بھیانک تھا۔" بوڑھا مطمئن تھا۔ "تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟"

کچھ دیر بعد وہ کشتی میں سوار کنارے کی سمت بڑھ رہے تھے، جہاں زندگی تمام رنگینیوں کے ساتھ ان کی منتظر تھی۔

بوڑھا خاموش تھا۔ اس نے گیری کے زخمی ہونے سے متعلق کوئی سوال نہیں پوچھا۔ اور نہ اس پاگل کے غائب ہونے پر کوئی سوال کیا۔

یہ راز آج بھی راز ہے کہ نیسی میں کبھی کبھی نظر آنے والی مخلوق کس نسل کی ہے کیونکہ wild Life والے اس تلاش میں مسلسل رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ اب تو کیمرا اور بندوق لے کر جانا جرم بن گیا ہے۔ پکڑے جانے پر 2500 یورو جرمانہ ہے۔

طارق عزیز خان

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کتنے ہی مشکل مراحل سے گزرنا پڑے وہ انہیں سر کر ہی لیتا ہے۔ یہ اونچے اونچے فلک بوس بلند وبالا پہاڑ جن سے ٹکرا کر ہوائیں بھی جم جاتی ہیں۔ جن کی چوٹیاں ہمہ وقت برف سے ڈھکی رہتی ہیں ان کو بھی عبور کر کے ثابت کر دیتے ہیں کہ انسان سے زیادہ با حوصلہ کوئی نہیں۔

کوہ ہمالیہ اپنے ذیلی پہاڑی سلسلوں کوہ پامیر، کوہ ہندو کش اور کوہ قراقرم کے ساتھ دنیا کا بلند ترین پہاڑی سلسلہ ہے۔ برصغیر پاک و ہند (جنوبی ایشیا) کے شمالی حصے میں 2600 کلومیٹر طویل اور اوسطاً 300 کلومیٹر عریض کمان کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے شمال میں سطح مرتفع تبت، جنوب میں ہندوستان اور پاکستان کے میدانی علاقے، مشرق میں چین اور مغرب میں وسط ایشیا کے میدان واقع ہیں۔ ہمالیہ میں واقع دنیا کے 30 بلند ترین پہاڑوں کی

اونچائی 25 ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ یہاں واقع سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے، جس کی بلندی 29035 فٹ (8850 میٹر) ہے۔ یہ بلند پہاڑ شمال مغربی نیپال میں خط استواء سے 27.59 ڈگری شمال اور 86.55 ڈگری مشرق کے خط پر چین کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ ایورسٹ کی چوٹی کے جنوب میں واقع علاقہ نیپال جبکہ چند میٹر نیچے کی شمالی ڈھلان چین کا حصہ ہے۔ ایورسٹ کو نیپالی لوگ "ساگر ماتھا" (Sagarmatha) کہتے ہیں جس کا مطلب "آسمان میں واقع پیشانی" ہے، جبکہ شمالی نیپال سے تعلق رکھنے والے شیرپا قبائل اسے "چومولنگ ما" (Chomolungma) کے نام سے پکارتے ہیں جس کا مطلب "دنیا کی عظیم ماں" ہے۔

ہمالیہ کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے کے باہر جنوبی امریکا کے سلسلۂ انڈیز میں واقع بلند ترین چوٹی کی اونچائی 22834 فٹ (6960 میٹر) ہے۔ دنیا کے چند نمایاں دریا ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے نکلتے ہیں جن میں سندھ، برہم پتر، گنگا، یانگ سی، میکانگ، زرد، جیحون اور شیر دریا شامل ہیں۔ جنوب مغربی ایشیا، چین اور وسط ایشیا میں واقع ان دریاؤں کی وادیوں میں دنیا کے ایک چوتھائی یعنی تین ارب انسان بستے ہیں۔ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں کا برصغیر کی تہذیب پر خاصا گہرا اثر ہے۔ اس کی اکثر چوٹیاں ہندومت، بدھ مت اور سکھ مت میں مقدس مانی جاتی ہیں۔ کوہ ہمالیہ کا جنم 30 سے 35 ملین سال پہلے برصغیر کے ایشیا سے ٹکرانے کے نتیجے میں ہوا۔ یہ ٹکراتی شدید تھی کہ دونوں بڑے خطۂ زمین کے درمیان واقع قدیم سمندر ٹیتھس (Tethys Sea) صفحۂ ہستی سے غائب ہوگیا اور دونوں علاقوں کی سرحد پر ہمالیہ نام کا بلند علاقہ ظاہر ہونا شروع ہوا۔ ماہرین ارضیات کے مطابق برصغیر کا ایشیا سے ہونے والا تصادم آج بھی جاری ہے جس کی وجہ سے ہمالیہ میں واقع پہاڑوں کی بلندی میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے۔

انگریز ماہر ارضیات سر جارج ایورسٹ (Sir George Everest) (1790-1866) نے 1830ء سے 1843ء تک برطانوی ہندوستان کے وسیع علاقے کا سروے کیا۔ اس نے 1834ء میں شمالی بھارت کی سروے سے متعلق دستاویزات پر ماؤنٹ ایورسٹ کی "پہاڑی نمبر 15" کے نام سے نشاندہی کی۔ 1843ء میں جارج ایورسٹ ریٹائر ہوا، تاہم وہ 47-1846ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی درخواست پر ایک بار پھر نیپال پہنچا، جہاں اس نے شمالی بھارت اور نیپال کے سروے کی نگرانی کی۔ اس کی نگرانی اور مشاورت سے 1850ء میں پہاڑی نمبر 15 کی پیمائش کے لیے چھ الگ الگ مہمات روانہ کی گئیں۔ ان مہمات کے نتیجے میں ایورسٹ کی بلندی 29002 فٹ طے ہوئی۔ 1856ء میں انگریز سرویر، اینڈریو وا (Andrew Waugh) نے کلکتہ میں منعقد ایشین سوسائٹی کے اجلاس میں ہندوستان کے شمالی علاقوں کا نقشہ پیش کیا جس میں پہاڑی نمبر 15 کو جارج ایورسٹ کے اعزاز میں "ماؤنٹ ایورسٹ" کے نام سے ظاہر کیا گیا تھا۔ 20ویں صدی کے دوران ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی کا معاملہ متنازعہ بنا رہا۔ ماہرین کے اختلاف کی وجہ پہاڑوں کی بلندی میں ہر سال چند ملی میٹر کی رفتار سے ہونے والا اضافہ ہے۔ اس اضافے کی شرح تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مختلف مقامات پر مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی عشروں تک بعض ذرائع کے ٹو جبکہ بعض کنچن جنگا کو ماؤنٹ ایورسٹ سے بلند لکھتے رہے۔ 1990ء میں "زمین پر واقع مقامات کے تعین اور پیمائش" Global Positioning System کا اطلاق ماؤنٹ ایورسٹ سمیت کوہ ہمالیہ کے وسیع حصے پر کیا گیا۔ اس نظام کے نتیجے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی بلندی 29 035 فٹ (8850 میٹر)، کے ٹو 28251 فٹ اور کنچن جنگا کی بلندی 28209 فٹ تسلیم کرلی گئی۔ 20ویں صدی کی تیسری دہائی میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے کوہ پیماؤں کی ٹیمیں نیپال پہنچنا شروع ہوئیں۔ 1921ء اور 1922ء میں انگریز کوہ پیما، جارج لیف میلوری (George Leigh Mallory) کی قیادت میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی پہلی کوشش ناکام ہوئی۔ میلوری نے 1924ء میں تیسری کوشش کی جس میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ 1937ء میں ایک برطانوی مہم 27 ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچی لیکن خراب موسمی حالات کی وجہ سے انہیں واپس نیچے اترنا پڑا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد 1951ء میں قابل رسائی مقامات کے تعین کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کے علاقے کا ازسرنو سروے کیا گیا۔ 1952ء میں سوئس مہم بھی موسم کی بے اعتباری کا شکار ہوئی جس کے بعد نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما سر ایڈمنڈ ہلاری (Sir Edmund Percival Hillary) نے ماؤنٹ ایورسٹ کا چیلنج قبول کرنے کا اعلان کیا۔

ایڈمنڈ ہلاری 20 جولائی 1919ء کو نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ میں پیدا ہوا۔ اس نے تو آکاؤ (Tuakau) پرائمری اسکول اور آک لینڈ گرامر اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ وہ 16 سال کی عمر میں اسکول ٹرپ کے ساتھ وابستہ ہوکر نیوزی لینڈ کے شمالی جزیرے پر واقع ماؤنٹ Ruapehu (بلندی 9177 فٹ) سیر کو گیا۔ درحقیقت اس سیر کے دوران نوجوان ہیلاری کی پہاڑوں پر چڑھنے سے متعلق صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔ وہ گھنٹوں تک کی باندھے ماؤنٹ روپیہو کی برف سے ڈھکی بلند چوٹی کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنا آپ بلندی کی طرف کھنچتا ہوا محسوس ہوا۔ ہیلاری خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے اس سیر کے دوران برف کی کم بلند عمودی چٹانوں پر چڑھنے کا شاندار مظاہرہ کیا۔ کسی مناسب تربیت کے بغیر ٹھوس برف کی عمودی چٹانوں پر چڑھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہلاری کے ان کارناموں سے اسے اسکول کی سطح پر شہرت حاصل ہوئی۔ آک لینڈ واپس پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ایک مقامی ماؤنٹین کلب کی رکنیت اختیار کرلی۔ ہلاری نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر چڑھائی کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ اس کا ہر ویک اینڈ کلب کے تجربہ کار ساتھیوں کے ساتھ آک لینڈ کے گردونواح میں واقع چٹانوں پر گزرتا۔ اس نے 1937ء کی گرمیوں کے دوران آک لینڈ کے مغرب میں واقع پہاڑی سلسلے کورومنڈل (Coromandel Range) کی بیشتر چوٹیوں کو تسخیر کیا۔ آنے والے مہینوں کے دوران ہلاری کے کارناموں کی فہرست طویل ہوتی گئی، یہاں تک کہ اس نے 1939ء میں نیوزی لینڈ کے جنوبی جزیرے پر واقع کوہ ایلپس (Alps) کی چوٹی ماؤنٹ اولیور (بلندی 6342 فٹ) کو سر کیا۔ یہ بطور کوہ پیما اس کی پہلی نمایاں کامیابی تھی۔

ہلاری نے 1940ء کی شروعات میں نیوزی لینڈ کی ایئرفورس میں شمولیت اختیار کی۔ وہ جنگ عظیم دوم کی وجہ سے کوہ پیمائی کو زیادہ وقت نہ دے پایا۔ تاہم جنگ کے فوری بعد اس نے ایئرفورس کو خیرباد کہا اور یورپ پہنچ گیا۔ آنے والے سالوں کے دوران ہلاری نے اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور آسٹریا میں واقع نامی گرامی چوٹیوں کو سر کیا۔ اب اس کی نظر کوہ ہمالیہ پر تھی جسے دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ ہر کوہ پیما کی طرح اس کا خواب تھا کہ وہ کوہ ہمالیہ میں واقع دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرے۔ اس کا موقع بھی اسے جلد ہی مل گیا۔ ہلاری کی خوش قسمتی تھی کہ اسے 1951ء کی

ایڈمنڈ ہلاری کے نام سے منسوب مقامات اور اعزازت

جون 1953ء میں برطانوی ملکہ الزبتھ دوم نے ایڈمنڈ ہلاری اور مہم کے لیڈر جون ہنٹ کو "سر" کا خطاب دیا۔

1953ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہلاری سمیت پوری برطانوی ٹیم کو "ملکہ الزبتھ دوم کوروینشن میڈل" دیا گیا۔

1953ء میں نیپالی حکومت نے "آرڈر آف دی گورکھا" ایوارڈ سے نوازا۔

جون 1953ء میں برطانوی حکومت کی طرف سے ہلاری کے ساتھی ٹین زنگ نورگے کو "برٹش ایمپائر میڈل" اور "جارج میڈل" دیا گیا۔

1995ء میں نیوزی لینڈ حکومت کی طرف سے Knight of the Order of the Garter کا اعزاز ملا۔

"Hellary Step" ماؤنٹ ایورسٹ پر واقع مقام کا نام

ایڈمنڈ ہلاری پرائمری اسکول (نیوزی لینڈ کے شہر پاپاکورا (Papakura) میں قائم درس گاہ)

ہلاری کالج (نیوزی لینڈ کے شہر اوٹارا میں قائم درس گاہ)

نیوزی لینڈ کے 5 ڈالر کے نوٹ کی پشت پر ہلاری کی تصویر۔

2001ء میں نیویارک کے ٹائم میگزین نے ایڈمنڈ ہلاری کو 20ویں صدی کی 100 اثر دار ترین شخصیات میں سے ایک قرار دیا۔

2007ء میں برطانوی حکومت نے Polar Medal دیا۔

23 اکتوبر 2008ء کو "ڈیوک آف ایڈنبرگ ایوارڈ" دیا گیا۔

2008ء میں بھارتی حکومت نے Padma Vibhushan ایوارڈ دیا۔

نوٹ: برطانوی حکومت 1953ء میں نیپالی کوہ پیما ٹین زنگ نورگے کو "سر" کا خطاب دینا چاہتی تھی لیکن اس وقت کے بھارتی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے اعتراض کے بعد نورگے کو یہ اعزاز نہیں دیا گیا۔

شروعات میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے تشکیل دی گئی برطانوی کوہ پیماؤں کی ٹیم میں شامل کرلیا گیا۔ اس ٹیم کی قیادت جون ہنٹ کے پاس تھی۔ ٹیم کے کل ارکان کی تعداد ڈیڑھ درجن تھی جن میں جون ہنٹ اور ہلاری کے علاوہ ٹوم بورڈیلان، چارلس ایونز فوٹو گرافر، الفریڈ گریگوری اور ہلاری کا دوست جارج لوے نمایاں تھے۔ اس زمانے میں چین کے سیاسی حالات کی وجہ سے تبت کی طرف سے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی، یہی وجہ تھی کہ برطانوی ٹیم نے چوٹی سر کرنے کے لیے نیپال کا انتخاب کیا۔ وہ لوگ مارچ 1951ء میں کلکتہ پہنچے، جہاں سے مقامیوں کی راہنمائی میں برطانوی ٹیم نے کھٹمنڈو کا پیدل راستہ اختیار کیا۔ کھٹمنڈو میں دو ہفتے کے آرام کے بعد وہ لوگ شمال کی طرف روانہ ہوئے۔ ہلاری نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر 52-1951ء کی گرمیوں کے دوران نیپال اور چین کے سرحدی علاقے میں مشق کے لیے چند آسان چڑھایاں چڑھیں جس سے اس تجربے میں اضافہ ہوا۔ اس دوران برطانوی ٹیم میں شیرپا قبائل سے تعلق رکھنے والے مقامی کوہ پیما تین زنگ نورگے (1914-1986) نے شمولیت اختیار کی۔ نورگے وہ شخص تھا جس نے 1952ء کی گرمیوں میں سوئٹزرلینڈ کی کوہ پیما ٹیم کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کی تھی۔ برطانوی ٹیم نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے لیے 1953ء کی گرمیوں کا انتخاب کیا۔ انہوں نے چوٹی کی طرف پیدل مارچ کرتے ہوئے مارچ 1953ء میں کھٹمنڈو سے 150 کلومیٹر مغرب اور ماؤنٹ ایورسٹ سے 25 کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع پہاڑی قصبے تھم جنگ میں اپنا پہلا پڑاؤ کیا۔ اس وقت ٹیم میں 362 مقامی مزدور، 20 شیرپا قبائلی راہنما، ایک شیرپا نیپالی کوہ پیما اور 17 یورپین (ہلاری سمیت) شامل تھے۔ ٹیم کو دو درجن کے قریب ٹٹوؤں اور گدھوں کی مدد بھی حاصل تھی جن پر قریب 10 ہزار پاؤنڈ وزن کے برابر ضروری سامان اور آلات لدے ہوئے تھے۔ تھیم جنگ میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے کوہ پیماؤں کی ٹیمیں قیام پذیر تھیں۔ مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے کوہ پیماؤں کے لیے قصبے سے ایورسٹ کی برف پوش چوٹی کا نظارہ پر جوش تھا۔ انہیں ایورسٹ کی چوٹی اپنی طرف بلاتی محسوس ہورہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کامیابی کے لیے دعا گو تھے، تاہم ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اسے سب سے پہلے اپنے وطن کا پرچم دنیا کے بلندترین مقام پر لہرانے کا موقع ملے۔

جون ہنٹ کی ٹیم نے اپریل کے وسط میں ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ انہوں نے 17600 فٹ (5360 میٹر) بلند کھمبو گلیشیر (Khumbu Glacier) پر اپنا بیس کیمپ قائم کیا۔ اس مقام پر بیشتر مزدور اور جانور کیمپ ہی میں رک گئے۔ برطانوی ٹیم نے مئی کے پہلے عشرے کے دوران 19600 فٹ (5970 میٹر) کی بلندی پر کیمپ ون لگایا اور وہاں کچھ وقت گزارا۔ انہوں نے دوسرا کیمپ 21300 فٹ (6500 میٹر) اور تیسرا کیمپ 24500 فٹ (7450 میٹر) کی بلندی پر قائم کیا۔ ان کی اگلی منزل ایورسٹ اور اس کے جنوب میں واقع چوٹی ماؤنٹ Lhotse کی 26100 فٹ (7950 میٹر) بلند ڈھلان تھی جہاں وہ مئی کے تیسرے عشرے کے دوران پہنچے۔ انہوں نے وہاں کیمپ نمبر چار قائم کیا۔ یہ ایورسٹ کی چوٹی سے پہلے لگایا گیا ان کا آخری کیمپ تھا۔ اس مقام سے دنیا کے بلندترین مقام پر جانے والا راستہ جنوبی کول (South Col) کہلاتا ہے۔ جون ہنٹ نے کیمپ نمبر چار میں قیام کے دوران ایورسٹ تک رسائی کے لیے دو دو کوہ پیماؤں پر مشتمل دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ پہلی ٹیم میں ٹوم بورڈیلان اور چارلس ایونز جبکہ دوسری ٹیم میں ایڈمنڈ ہلاری اور نیپالی کوہ پیما تین زنگ نورگے شامل تھے۔

برطانوی شہری ہونے کی وجہ سے چوٹی تک رسائی کا پہلا حق بورڈیلان اور ایونز کی ٹیم کو دیا گیا۔ ان دونوں نے 26 مئی کی صبح ماؤنٹ ایورسٹ تک رسائی کی کوشش شروع کی تاہم ایونز کے آکسیجن سسٹم میں خرابی ہوجانے کی وجہ سے وہ اوپر نہ چڑھ سکے اور اسی دن شام کے وقت کیمپ نمبر چار واپس پہنچ گئے۔ اگلے دو دن کے دوران چلنے والی تیز سرد ہواؤں نے کوہ پیماؤں کو کیمپ تک محدود رکھا جس کے بعد جون ہنٹ نے ہلاری اور نورگے پر مشتمل ٹیم کو ایورسٹ پر چڑھنے کا حکم دیا۔

28 مئی کی صبح ایڈمنڈ ہلاری اور تین زنگ نورگے تین مددگاروں جارج لوے، فوٹو گرافر الفریڈ گریگوری اور ایک مقامی مزدور اینگ نیما (Ang Nyima) کے ساتھ اپنی آخری منزل کی طرف بڑھے۔ ہلاری کی قیادت میں ایک رسی سے بندھے وہ لوگ پھونک پھونک کر قدم بڑھاتے آگے بڑھتے رہے۔ گو کہ اس وقت سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، تاہم درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے گرا ہوا تھا اور سرسراتی یخ ہوا ہڈیوں کو چیرتی محسوس ہورہی تھی۔ شام تک سب کچھ معمول کے مطابق رہا، یہاں تک کہ وہ 27900 فٹ کی اونچائی پر واقع ایک پتھریلی ڈھلان کے قریب پہنچ گئے۔ اس مقام پر مددگار گروپ واپس کیمپ نمبر چار کی طرف روانہ ہوگیا جس کے بعد ہلاری نے رات گزارنے کے لیے وہاں ایک چھوٹا خیمہ نصب کیا۔ اگلی صبح ہلاری کو خیمے کے باہر اپنے جمے ہوئے بوٹوں کی جوڑی ملی، جو اس کی بے پروائی سے باہر پڑی رہ گئی تھی۔ اس نے دو گھنٹے کی محنت کے بعد اکڑے ہوئے جوتوں کو سیدھا کیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور مہم کے آخری مرحلے کا آغاز کیا۔ دونوں ساتھی موٹے گرم لباس میں ملبوس تھے اور ان میں سے ہر ایک کی کمر سے 14 کلو وزنی سامان لدا ہوا تھا۔ وہ ہاتھوں میں آئس ایکس پکڑے، نپے تلے قدم اٹھاتے بلندی کی طرف گامزن تھے، یہاں تک کہ ایک 40 فٹ اونچی چٹان نے ان کا راستہ روک لیا۔ کسی پہرے دار کی طرح سینہ تانے کھڑی وہ چٹان ان کے اور ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کے درمیان آخری بڑی رکاوٹ تھی۔ ہلاری نے حواس برقرار رکھے اور اپنے پورے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے چٹان پر اپنا پہلا قدم رکھا۔ آج یہ تاریخی مقام "ہلاری کا قدم" (Hellary Step) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہلاری نے نورگے کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود دھیرے دھیرے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ وہ کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد بالآخر چٹان پر چڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نورگے کو اوپر آنے میں مدد دی۔ دونوں ساتھیوں نے سکون کا سانس لیا اور چند میٹر دوری پر واقع ایورسٹ کی چوٹی کی طرف دیکھا جس تک رسائی اب آسان تھی۔ ہلاری، نورگے سے سینئر تھا اور ٹیم کی قیادت کرتا آیا تھا۔ وہ چاہتا تو ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلا قدم رکھ سکتا تھا، تاہم اس نے فراخ دلی کا ثبوت دیا اور نورگے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر اپنی آخری منزل کی طرف بڑھا۔ انہوں نے 29 مئی 1953ء کے دن 11 بجکر 30 منٹ پر دنیا کے سب سے بلند مقام ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر ایک ساتھ اپنے تاریخی قدم رکھے۔ بعض یورپین ذرائع ہلاری کو چوٹی تک رسائی حاصل کرنیوالا پہلا فرد مانتے ہیں لیکن ہلاری کے مطابق اس نے اپنے نیپالی ساتھی کے ساتھ قدم ملا کر یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ ایڈمنڈ ہلاری نے چوٹی پر برطانیہ، نیوزی لینڈ اور نیپال کے پرچم لہرائے۔ اس نے آئس ایکس ہاتھ پکڑے ہوئے نورگے کی یادگار تصویر کھینچی، جو آج ایک تاریخی تصویر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہلاری کے مطابق ایورسٹ پر مختصر قیام اس کی زندگی کے خوشگوار ترین لمحے تھے۔ اس نے چوٹی سے نیپال اور چین کے

ماؤنٹ ایورسٹ کی تسخیر سے متعلق چند اہم واقعات

22-1921ء میں انگریز کوہ پیما جارج لیف میلوری کی طرف سے ایورسٹ سر کرنے کی ابتدائی کوششیں ناکام ہوگئیں۔

1924ء میں جان لیف میلوری نے تیسری کوشش کی جس میں وہ اپنے ساتھیوں سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

1937ء میں ایک برطانوی ٹیم 27 ہزار فٹ کی بلندی سے ناکام واپس لوٹی۔

1951ء میں ایک برطانوی ٹیم نے ماؤنٹ ایورسٹ کا سروے کیا۔

29 مئی 1953ء کو نیوزی لینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما ایڈمنڈ ہلاری نے اپنے نیپالی ساتھی تین زنگ نورگے کے ساتھ مل کر ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔

8 مئی 1978ء اطالوی کوہ پیما رین ہولڈ میس نر (Reinhold Messner) نے اپنے آسٹریائی ساتھی پیٹر ہیبلر (Peter Habeler) کے ساتھ بغیر آکسیجن سلنڈر استعمال کیے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا۔

1980ء میں پولینڈ سے تعلق رکھنے والے کوہ پیما لیزک چچ (Leszek Cich) نے اپنے ساتھی کریزٹوف ویلکی (Krzysztof Wielicki) کے ساتھ مل کر موسم سرما کے دوران ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی اولین مہم سرانجام دی۔

1996ء میں ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والے مختلف ممالک کے 15 کوہ پیما ہلاک ہوگئے۔

17 مئی 2000ء کو امریکا، آسٹریا، کینیڈا کی مشترکہ ٹیم کے رکن کے طور پر ناصر صابر، ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا پہلا پاکستانی تھا۔

14 مئی 2005ء میں ایک فرانسیسی ہوا باز ڈیڈیئر ڈیل سالے (Didier Delsalle) نے اپنے ہیلی کاپٹر Eurocopter AS 350 B3 کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ پر کامیاب لینڈنگ کی۔ اس نے وہاں چند منٹ گزارے اور کامیاب واپس لوٹ آیا۔

25 مئی 2008ء میں نیپالی کوہ پیما من بہادر شیر چن (Min Bahadur Sherchan) 76 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا دنیا کا سب سے معمر انسان تھا۔

20 مئی 2009ء انگریز مہم جو سر رالف فینس نے 65 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔

مئی 2010ء میں جورڈان رومیرو (Jordan Romero) 13 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والا دنیا کا کم عمر ترین انسان تھا۔

نیپالی کوہ پیما آپا شیرپا (Apa Sherpa) نے مئی 2010ء تک 20 مرتبہ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا ریکارڈ قائم کیا۔

جولائی 2010ء تک ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے والے کامیاب کوہ پیماؤں کی تعداد 2700 تھی۔

ٹیسٹ میچ

کھیلوں کی اصطلاح۔ جب کسی ملک کی ٹیم دوسرے ملک کا دورہ کرتی ہے تو کئی میچ کھیلتی ہے۔ ان میں سے کچھ تو علاقائی ٹیموں کے خلاف ہوتے ہیں اور کچھ میزبان ملک کی قومی ٹیم کے خلاف، یہ میچ ٹیسٹ میچ کہلاتے ہیں، کیونکہ ان میں دو ملکوں کی قومی ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتی ہیں۔ ایک دورے میں کئی ٹیسٹ میچ ہوسکتے ہیں۔ دورے کے ختم ہونے پر جو ملک زیادہ ٹیسٹ میچ جیتا ہو وہ مقابلہ جیت جاتا ہے۔ یوں تو ٹیسٹ میچ کی اصطلاح ہر کھیل کے لیے استعمال کی جاتی ہے، لیکن خصوصاً کرکٹ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ایک دورے کے درمیان عموماً (اس میں کمی بھی ہوسکتی ہے) پانچ ٹیسٹ میچ کھیلے جاتے ہیں۔ ان کو دوسرے میچوں کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کرکٹ ٹیسٹ میچ تین سے لے کر پانچ روز تک کھیلے جاتے ہیں۔

مرسلہ: شاہین ممتاز، سید آباد

سرحدی علاقوں کا نظارہ کیا۔ ہلاری کو اس مقام سے دنیا بہت چھوٹی دکھائی دی، اسے لگا جیسے وہ ہاتھ بڑھا کر آسمان چھو سکتا ہے۔ ہلاری اور تورگے نے ماؤنٹ ایورسٹ پر 15 منٹ گزارے، اور پھر نیچے اتر آئے۔ کیمپ نمبر چار کی طرف بڑھتے ہوئے ہلاری کی پہلی ملاقات خیمے کے باہر بے چینی سے ٹہلتے اپنے دوست جارج لوئے سے ہوئی، وہ لوئے پر نظر پڑتے ہی چلایا۔

"Well, George, we knocked the bastard off"

کیمپ نمبر چار میں ہلاری کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ جون ہنٹ نے ہلاری اور تورگے کو مبارک باد پیش کی اور مہم کی تکمیل کا اعلان کیا۔ وہ اپنی ٹیم کو لے کر کھٹمنڈو پہنچا جہاں اس نے ایک پرہجوم پریس کانفرنس میں اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔ ایڈمنڈ ہلاری اور اس کی ٹیم جون کے وسط میں لندن پہنچی جہاں ان کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ برطانیہ کی نئی حکمران ملکہ الزبتھ دوم جس کی تاجپوشی 2 جون 1953ء کو ہوئی تھی، نے مہم کی کامیابی کو اپنی مملکت اور تاج کے لیے نیک شگون قرار دیا۔ ملکہ نے ہلاری کے اعزاز میں منعقدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس کے شاندار کارنامے کو سراہا اور اسے "سر" کے خطاب سے نوازا۔

سر ایڈمنڈ ہلاری نے 3 ستمبر 1953ء کو نیوزی لینڈ میں لوئی میری روز سے شادی کی جس سے اس کا ایک بیٹا پیٹر (1954) سارہ (1955) اور بلنڈا (1959) ہوئے۔ اس نے نیوزی لینڈ کی طرف سے 1955ء میں دائرہ قطب شمالی میں مطالعاتی مہم سرانجام دی۔ اس کے ساتھ اس مہم میں انگریز ماہر ارضیات ویوین ای فوچز (Vivian E Fuchs) بھی شریک تھا۔ 1960ء میں ہلاری کی کوششوں کے نتیجے میں ماؤنٹ ایورسٹ کے قریب شیرپا قبائل کے قصبے کھم جنگ میں چھوٹے بچوں کے لیے جدید اسکول قائم ہوا اس نے بعد میں نیپال کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے "ہمالیہ ٹرسٹ" قائم کیا، جس کے تحت 2010ء تک نیپال میں 30 کے لگ بھگ تعلیمی ادارے قائم کردیے گئے تھے۔

1975ء میں ہلاری کی بیوی اور بیٹی بلنڈا ایک ہوائی حادثے کے نتیجے میں ہلاک ہوگئے۔ اسی سال ہلاری کی مہماتی زندگی سے متعلق کتاب Nothing Venture Nothing Win اور 1999ء میں View from the Summit شائع ہوئی۔ 1986ء میں ہلاری کے نیپالی ساتھی ٹین زینگ نورگے کا انتقال ہوا۔ ہلاری نے 21 دسمبر 1989ء کو ایک بیوہ خاتون سے دوسری شادی کی۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ ایڈمنڈ ہلاری کا بیٹا پیٹر اور ٹین زنگ نورگے کا بیٹا جیم لنگ (Jamling) بھی کوہ پیما ہیں۔ پیٹر نے 1990ء میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پہلی بار ماؤنٹ ایورسٹ سر کی۔

2003ء میں نیپال میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی پچاس سالہ تقریبات منائی گئیں۔ ان تقریبات کا شاندار آغاز اس وقت ہوا جب ہلاری کے بیٹے پیٹر اور تورگے کے بیٹے جیم لنگ نے ایک مشترکہ مہم کے دوران اپریل 2003ء میں ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا۔ اسی سال مئی کے دوران ایڈمنڈ ہلاری کو نیپال کی اعزازی شہریت دی گئی۔ اس نے جنوری 2007ء میں انٹارکٹیکا میں قطب جنوبی کی دریافت کے حوالے سے منعقدہ تقریبات میں شرکت کی۔ وہ اپریل میں اپنے آخری دورے پر کھٹمنڈو گیا۔ وہ نیپال سے نیوزی لینڈ واپس پہنچا تو اسے دل کی تکلیف شروع ہوگئی۔ ہلاری اگلے چند ماہ بیمار رہا یہاں تک کہ 11 جنوری 2008ء میں اس بلند حوصلہ انسان کا آک لینڈ (نیوزی لینڈ) میں انتقال ہوگیا۔

عزم و حوصلے کی نئی تاریخ مرتب کرنے والی روداد

ہمت مرداں

امجد رئیس

زندگی اور موت کے درمیان ایک کشمکش تھی۔ وہ تو پرواز سے واپس آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا حادثہ رونما ہوگیا مگر اس نے حوصلے کا دامن نہ چھوڑا بالآخر موت کو بھی پیچھے ہٹنا پڑا۔

37 سالہ والٹر وائٹ جونیئر، دو انجن کے بیچ کرافٹ ... (Beechcraft) میں سفر کررہا تھا۔ بارش تیز تھی اور وہ بے چینی کے عالم میں آبی چادر کے پار میامی کو تلاش کررہا تھا۔

نساؤ میں چوروں نے اس کے متعدد نیوی گیشن آلات چرالیے اور اس کی خبر تب ہوئی تھی جب وہ اڑان بھر چکا تھا۔ اس حالت میں مجبوراً پرواز تھا کہ اس کے پاس محض کمپاس اور ہاتھ میں ریڈیو تھا۔ وائٹ کا رخ گھر کی جانب تھا۔

اس نے اینڈروس کے جزیرے کو پار کیا تو تین ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی سے لہروں کو چٹانوں سے سر پٹختے دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ "Bimini" کے قریب ہے۔ تاہم بیمنی کے آثار اسے کہیں نظر نہیں آئے۔ اسے اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ اس وقت کس مقام پر ہے۔

وائٹ نے وائرلیس کے ذریعے مے ڈے کا پیغام ارسال کیا۔ یعنی ہنگامی مدد فراہم کی جائے۔ میامی کی ائرجیکا سے جواب آیا انہوں نے وائٹ کا پیغام کوسٹ گارڈ کو روانہ کر دیا تھا۔ کوسٹ گارڈ حرکت میں آگئی فوراً ہی ایک فالکن جیٹ فضا میں بلند ہوا جو امدادی کارروائیوں کے لیے مخصوص تھا۔

سفید اور نارنجی رنگ کا جیٹ سیاہ بادلوں سے نمودار ہوا تو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ وائٹ کے جہاز کا دایاں انجن پھڑ پھڑانے لگا تھا رات تیزی سے قریب تر ہو رہی تھی۔

''ہم تمہیں بہ آسانی نیچے اتار لیں گے۔'' فالکن کے کمانڈر لیفٹیننٹ اسٹیونس بلینکن شپ نے وائٹ کو تسلی دی۔'' جنوب مغرب سمت ''کے سال'' میں ایمرجنسی لینڈنگ اسٹرپ ہے۔'' اس نے وائٹ کو بتایا اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''جمے رہو، والٹر'' بلینکن شپ نے پھر کہا۔''چھ میل رہ گئے پھر تم محفوظ ہو گے۔''

''اسی وقت وائٹ کے جہاز کا دایاں انجن آخری بار کھانسا اور بایاں فیول ٹینک بھی خشک ہو گیا۔ خشک ایندھن کی تنگی نے دوسرے انجن کی سانس بھی روک لی اور جہاز کا رخ پانی کی جانب کر دیا۔ وائٹ نے رفتار کم سے کم کرنے کی کوشش کی اور چلایا۔''میں پانی میں جا رہا ہوں۔''

بلینکن کی سانس پھول گئی جب اس نے وائٹ کے جہاز کو سمندر سے ٹکراتے اور غائب ہوتے دیکھا۔ اس نے کم بلندی پر جائے حادثہ پر چکر لگایا لیکن مشین اور انسان دونوں غائب تھے۔

علاقے میں موجود ائرفورس سی۔130 ٹرانسپورٹ نے پیراشوٹ سمیت امدادی اشیا پھینکیں۔ تاہم فالکن کے عملے کو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لائف رافٹ بھی نظر نہیں آئی۔ نہ کسی قسم کی ایمرجنسی ٹرانسمیشن۔ انہیں محسوس ہوا کہ وائٹ ہلاک ہو چکا ہے۔ کو پائلٹ، مائیک فلاہرٹی نے ایندھن کی جانب توجہ دلائی۔ ایندھن کی سوئی اختتام کے قریب تھی۔ چھ بجے وہ ''کی ویسٹ'' کی جانب مڑ گئے۔

''ہم نے کوشش کی۔'' بلینکن شپ نے بد مزگی سے کہا۔''ہم ایندھن لے کر دوبارہ آئیں گے۔''

☆☆☆

جہاز سمندر سے ٹکرایا تو وائٹ کا سر انسٹرومنٹ پینل سے ٹکرا گیا۔ وائٹ نے دو فلیپر دبوچے اور لائف ویسٹ پھلانے کے لیے ٹیگ کھینچ لیا۔ کوسٹ گارڈ جیٹ کی تیز [illegible] پانی کے اندر آ رہی تھی۔ اس نے ایک فلیئر روشن کیا جبکہ دوسرا ہاتھوں میں ہی دم توڑ گیا۔ جہاز کو ڈوبنے میں چند سیکنڈ تھے۔

وائٹ کو ''سی سروائیول'' کی تربیت حاصل تھی۔ وہ بروقت ڈوبتے ہوئے جہاز سے نکل گیا۔ اسے اپنی توانائی محفوظ رکھنے کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن 30 منٹ بعد اس نے کپکپانا شروع کر دیا۔ وہ ابھی تک سطح آب سے نیچے تھا اور جانتا تھا کہ ڈھونڈنے والے اسے دیکھ نہیں سکتے۔ سطح آب کے اوپر نیچے ہوتے ہوئے اس نے ''کے سال'' کی جانب تیرنا شروع کیا۔

اگلے 6 منٹ میں اس کی ہمت جواب دے گئی۔ امید نے تیزی سے دم توڑنا شروع کر دیا تھا۔ معاً اس کی جیکٹ کا بایاں چیمبر نرم پڑنے لگا۔ وہاں سے بلبلے خارج ہو رہے تھے۔ سیچ بند کرنے سے پیشتر جیکٹ کا بایاں حصہ بے کار ہو گیا۔ وائٹ نے سوراخ پر منہ رکھ کر ہوا بھری اور سوراخ بند کرنے کے لیے انگلی کا استعمال کیا۔

پانی بے انتہا سرد تھا۔ اس کی پیشانی کا خون شارک کو متوجہ کر سکتا تھا۔ بہرحال اسے آخری دم تک لڑنا تھا۔ ہاتھ ڈالنا صریحاً خودکشی تھی۔

''اگر یہ میرا آخری وقت ہے، خدایا!'' اس نے آخری اور عظیم ترین طاقت کو پکارا''میں دعا کرتا ہوں کہ مرنے سے قبل میرے گناہوں کو معاف کر دینا۔''

لائف جیکٹ کے بغیر وہ زیادہ دیر جدوجہد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ائرلائن کا شناختی بیج شرٹ پر سے اتارا اور جیکٹ کے سوراخ پر چپکا دیا۔ اسے ٹریشا یاد آ گئی۔ بارہ سالہ جیفر اور دس سالہ والٹر یاد آیا۔ گو کہ ٹریشا سے علیحدگی ہو گئی تھی اور بچے ماں کے ساتھ ٹینیسی میں رہتے تھے۔

اس نے بیج کو جیکٹ پر چسپاں کیا اور اسے دبائے رکھنے کی کوشش کی۔ تاکہ ہوا کا اخراج بند رہے۔ گھڑی دیکھی آٹھ بج رہے تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ دس بجے تک جدوجہد جاری رکھ سکتا تھا۔

دفعتاً اس کے پیروں سے کوئی ٹھوس متحرک جسم ٹکرایا۔

شارک! اسے خیال آیا۔ انہوں نے مجھے تلاش کر لیا ہے۔ اس نے سوچا، اور وہ واپس آئیں گی۔

دس بجے اس نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے درمیانی شب کا ٹارگٹ منتخب کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ جیکٹ پھر لیک ہو رہی تھی اور ہوا بھرنے کی ٹیوب بھی الگ ہو گئی تھی۔ وائٹ نے منہ سے پھر ہوا بھری اور سوراخ پر انگلی رکھ دی۔ سر اس نے سطح آب سے اوپر رکھا تھا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ وہ سطح آب پر پشت کے بل لیٹ گیا۔ بارش کا پانی اس کی سوجی ہوئی زبان اور جلتی آنکھوں کو بھگو رہا تھا۔

جب بادلوں نے ذرا بکھر کر آسماں کا چہرہ دکھایا تو وائٹ کو ایک چمکتا ستارہ دوسروں سے الگ نظر آیا۔ اس کی نگاہ ستارے پر جم گئی۔ شاید یہ مجھے لینے آیا ہے۔ یہ مجھے میری منزل تک پہنچا دے گا۔ اس نے سوچا اور دعا کی ''پلیز گاڈ''

☆☆☆

بلینکن شپ نے ''کے ویسٹ'' سے ایندھن لیا اور دوبارہ ''کے سال'' کی جانب روانہ ہوا۔ اس بار اس کے ہمراہ ایک ہیلی کاپٹر بھی تھا۔ یہ نیوی کا ہیلی کاپٹر تھا اور سپاٹ لائٹ کی مدد سے تلاش میں آسانی فراہم کر سکتا تھا۔

وہ اندازے سے جائے حادثہ پر پہنچے تو کاپٹر کی روشنی طوفانی بارش، گرجتی موجوں اور تاریکی کو شکست دینے میں ناکام رہی۔ گرج چمک اضافی تھی اور نگاہ کی رسائی تقریباً صفر ہو گئی تھی۔ جیٹ نے کاپٹر کو اشارہ دیا اور وہ ناکام واپس چل پڑے۔ اب انہیں صبح آنا تھا۔ کیا اس وقت تک بہت دیر نہیں ہو جائے گی۔ لیفٹیننٹ نے سوچا۔

نیچے سمندر میں وائٹ کے بدن میں جان نہیں تھی لیکن [illegible] قوتِ ارادی اور جینے کی امنگ جواں تھی۔ آدھی رات گزری تو اس نے صبح تک کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلسل کوشاں تھا کہ اس کی [illegible] سے شارک کی تھرائی جبلی طور پر اس نے ہلاکت خیز سمندری مخلوق کو لات ماری۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ جیکٹ سے ہٹ گیا اور پانی اندر جانے لگا۔ اس نے جیکٹ کو [illegible] کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیکٹ اس کے بدن سے الگ ہو کر گہرائی کی طرف جانے لگی۔ اس نے غوطہ لگا کر اسے تھامنے کی کوشش کی اس کی انگلیوں نے ربر کو چھوا اور وہ لائف ویسٹ کے ساتھ دوبارہ سطح آب پر آ گیا۔ نیم ناکارہ جیکٹ اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ وائٹ نے گہرا سانس لے کر چہرہ پانی میں ڈبو دیا۔ بازو پھیلا دیے اور خود کو آگے دھکیلا سر باہر نکال کر سانس باہر پھینکی گہری سانس لے کر دوبارہ سر پانی میں ڈال دیا۔

وائٹ ''فلوٹ۔ اینڈ گلک'' کی تکنیک استعمال کر رہا تھا۔ اس طرح وہ ایک گھنٹا اور نکال سکتا تھا۔

جب اسے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے جیکٹ میں پھر ہوا بھری اور اس کے اوپر لیٹ گیا۔ اس نے لہروں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے کی جانب سرفنگ شروع کر دی۔ اصل خطرہ شارک کا تھا۔

☆☆☆

افق پر آفتاب نے کرنیں بکھیریں تو امید کی مدھم کرن نے انگڑائی لی۔ وائٹ نے آنکھیں سکیڑ کر آسمان کو دیکھا۔ تاہم اسے کوئی ائرکرافٹ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے واپس سمندر کی جانب نگاہ کی تو اسے اپنے سامنے لہروں کے

اوپر شارک کی پشت کا مخصوص کوہان نظر آیا۔ وہ چاقو کی مانند لہروں کو کاٹتا آرہا تھا۔ پھر اس کی بائیں کہنی سے شارک ٹکرائی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹا۔ اسی دوران دوسری شارک اس کے قریب سے گزری۔

وائٹ شارکوں کے نرغے میں آچکا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور پیٹ کے بل ہوگیا۔ معاً پانی کی نیلی چادر میں سے اس نے نیلی شارک کو نمودار ہوتے دیکھا جو سیدھی اس کی جانب آرہی تھی۔ معاً اس نے غوطہ لگایا اور نیچے کی جانب سے وائٹ کی ٹانگوں پر حملہ کیا۔ وائٹ نے ایک ٹانگ اوپر اٹھائی اور دوسری ٹانگ کی ایڑی شارک کی دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے پر ماری۔ شارک پیچھے ہٹی اور 20 فٹ کے دائرے میں اس کے گرد چکر کاٹنے لگی۔

دو مزید شارک اس کی طرف آئیں تاہم وائٹ کی ٹانگوں کی جنونی حرکت کی وجہ سے انہوں نے قریب آنے سے گریز کیا۔

وائٹ کے لیے نہایت حوصلہ شکن صورت حال تھی۔ طویل اور ناقابل یقین جدوجہد کے بعد بھی وہ قاتل شارکوں کے غول میں پھنس گیا تھا۔ اگلی بار کا حملہ بڑا ارداں تھا۔ وائٹ کی لات اس کی تھوتھنی کو مس کرتی ہوئی کوہان سے ٹکرائی اور وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا۔ لیکن اگلا منٹ بھیانک تھا اسے "ماکو شارک" کی چمکتی ہوئی نیلی دم نظر آئی۔ اس کی رفتار 90 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

شارک گویا سمندر کو پھاڑتی ہوئی نکلی تھی۔ اس کی سرد اور بے حرکت آنکھیں وائٹ کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں حیرت انگیز طور پر جس سرعت سے نمودار ہوئی تھی اسی برق رفتاری سے وہ غائب ہوگئی۔

وائٹ کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ آبی شکاریوں نے اس کی کمزوری کو سمجھ لیا تھا، اس کے جسم میں ایک کٹ لگنے کی دیر تھی اور پھر ان خون آشام بلاؤں کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ تبھی دور سے اسے ائیر کرافٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک پڑا۔ جیکٹ غائب تھی۔ وائٹ نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیٹ طیارے کو دیکھا۔ تاہم جیٹ پھر نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اگلے ہی منٹ وہ پھر نمودار ہوا۔ وہ آگے پیچھے ہوکر وائٹ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اسی وقت وائٹ کی نظر کچھ دوری پر بہتی جیکٹ پر پڑی۔ اس نے نارنجی رنگ کی جیکٹ کو پھر پالیا تھا جب کوسٹ گارڈ جیٹ نصف میل کے فاصلہ پر نظر آیا تو اس نے دیوانہ وار جیکٹ کو لہرانا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد ہی جیٹ اس کے سر پر تھا۔

وائٹ نے اپنا نصف کے قریب جسم پانی سے اوپر کرلیا۔ "وہ آخر مجھے کیوں نہیں دیکھ پارہے ہیں۔" وہ چیخا۔ جہاز میں "لیفٹنگ شپ" نیچے دیکھ رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ وائٹ کے جہاز کے ملبے کو پالے گا۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی انسان نظر آرہا ہے جو کوئی چیز لہرا رہا ہے۔

اس نے فوراً کمپیوٹر پر ہاتھ مارا اور پوزیشن محفوظ کی..... جیٹ آگے نکل گیا تھا۔ "وہ زندہ ہے۔" اس نے کوسٹ گارڈ کو ریڈیو پر پیغام بھیجا۔ "کیپ پارٹ... منٹ کے فاصلے پر..... کو پائلٹ نے وائٹ کے تعاقب میں شارک کو بھی دیکھ لیا تھا۔ "جلدی کرو۔" وہ چلایا۔ "شارک اس کے پیچھے ہے۔" اس نے دھوئیں کا گولا فائر کیا۔ اور ایک کنستر سمندر میں گرادیا۔

وائٹ کنستر کی جانب تیرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ انہوں نے لائف رافٹ کیوں نہیں پھینکی؟ جلد ہی اسے جواب مل گیا۔

ایک چمکتی سفید بوٹ پانی کو چیرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ پھر سیڑھی گرائی گئی اور وائٹ نے اسے تھام لیا۔ لیکن وہ اوپر چڑھنے کے قابل نہیں تھا۔

"ہے جیکٹ پھینک دو" کسی نے کہا۔

وائٹ ریلنگ تک پہنچ کر بوٹ میں جا گرا۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ جدوجہد ختم ہوتے ہی اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ آخری کام اس نے جو کیا وہ بوٹ کے ڈیک کو چومنا تھا۔

صبح کے 9 بج چکے تھے۔ وہ پندرہ گھنٹے سے زیادہ تیرتا رہا تھا۔ اوپر جیٹ فضا میں منڈلا رہا تھا۔ کو پائلٹ نے کمانڈر کی پشت پر ہاتھ مارا اور بلیین کن شپ کے دانت نکل آئے۔

اگلے روز وائٹ "کی ویسٹ" اسپتال میں تھا۔ اس کے والدین پہنچ چکے تھے۔ ٹریشا کئی گھنٹے سے اس کے پاس تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں زندہ ہوں۔" وہ بار بار یہی بات کہہ رہا تھا۔ پھر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ ٹریشا اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ کاؤچ پر والٹر وائٹ کی جیکٹ پڑی تھی جسے اس نے بوٹ پر چڑھتے وقت پھینکنے سے انکار کردیا تھا۔

اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسی نادر روزگار حال حال ہی نظر آتی ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے دور اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے آفاقی صاحب بھی ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درد داستاں سرگزشت

قسط 217

وہ پیارسے ، بابو صادق کہلاتے تھے۔ جب ہمارا صحافت اور فلمی دنیا سے تعلق ہوا تو لاہور کے ہر فلمی شخص کی زبان پر بابو صادق کا نام تھا۔ جسے بمبئی جانا ہوتا تھا وہ بابو صادق سے ضرور رجوع کرتا تھا۔ اگر کسی کو ہندوستانی فلموں کے حقوق خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ بھی یہی کہتا ہوا نظر آتا تھا "بس ، میں پرسوں بمبئی جارہا ہوں چند فلمیں خریدنی ہیں۔ بابو صادق کو پکڑ کر ساتھ لے جاؤں گا تو اچھا سودا ہو جائے گا۔"

ہم کہتے تھے کہ شاید بابو صادق فلموں کے سودے کراتے ہیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ بابو صادق دراصل ایک فلم ڈائریکٹر ہیں۔ فلمی دنیا میں ہدایت کار کی حیثیت سے وہ ایم صادق کے نام سے مشہور تھے۔ دراصل وہ اے آر کاردار کے اسسٹنٹ تھے اور اسسٹنٹ بھی بہت پرانے۔ جب ان کے بارے میں معلوم ہوا تو ہم نے ان کی فلمیں بھی دیکھیں جو بہت کامیاب تھیں۔ انہوں نے چند یادگار فلمیں بھی بنائی تھیں۔ مثلاً وہ فلم ''نمستے'' کے شریک ہدایت کار تھے جو بہت کامیاب اور دلچسپ فلم تھی۔ وہ رومانی، نغماتی، ڈرامائی ہر قسم کی فلمیں بناتے تھے اور کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ شاید آپ کو یاد نہ ہوگا کہ اپنے زمانے کی سپرہٹ فلم ''رتن'' کے ہدایت کار بھی ایم صادق ہی تھے۔ نوشاد اس فلم کے موسیقار تھے۔

رتن کی خوبی یہ تھی کہ اس کے بھی گانے ہٹ ہوئے تھے اور اس فلم نے ایم صادق اور نوشاد کے لیے دولت اور شہرت کے دروازے کھول دیے تھے۔ یہ ایک ڈرامائی کہانی تھی۔ فلم رتن ایم صادق نے اپنے محسن اور استاد اے آر کاردار کی منظوری حاصل کرنے کے بعد بنائی تھی۔ وہ مصنف بھی تھے اس لیے ان کی فلموں میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے۔ رتن نے مقبولیت کے جو ریکارڈ قائم کیے تھے وہ سالہا سال تک کوئی اور فلم نہیں توڑ سکا۔ اپنے شاگرد کی اس کامیابی پر اے آر کاردار بھی خوشی اور فخر سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جمنی دیوان اس کے فلم ساز تھے۔ نوشاد بھی اس زمانے میں کاردار فلمز کے ملازم تھے اور ''رتن'' کی موسیقی ترتیب دینے کی بھی انہوں نے کاردار صاحب سے اجازت لی تھی۔

اس فلم کی کہانی ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی کے گرد گھومتی تھی۔ ہیرو کا نام گووندا اور ہیروئن کا گوری تھا۔ فلم کے ہیرو کرن دیوان گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے صحافی کی حیثیت سے لاہور میں کچھ عرصے کام کیا۔ سورن لتا اس فلم کی ہیروئن تھیں جس نے انہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ فلم کا مرکزی خیال محبت کے گرد گھومتا تھا جو عشق کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ برصغیر کی فلموں کے رواج کے مطابق گووندا اپنی محبت کو حاصل کرنے میں ناکام رہا اور گوری کی شادی زبردستی کسی اور سے کرا دی گئی۔

فلم رتن اس زمانے میں صرف ستر ہزار روپے کی لاگت سے بنائی گئی تھی جو کہ اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ فلم مکمل ہوئی تو کوئی تقسیم کار اس کو خریدنے کے لیے تیار نہ تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ ایک فلاپ فلم ہے مگر فلم کی بے پناہ کامیابی نے سب کو حیران کر دیا۔ فلم کی کامیابی میں بہت بڑا ہاتھ نوشاد کا تھا جس کی موسیقی نے سارے ہندوستان پر جادو کر دیا تھا۔ یہ گانے تو شاید آپ کو آج بھی یاد ہوں گے۔

ساون کے بادلو
ان سے یہ جا کہو
تقدیر میں یہی تھا
ساجن میرے نہ رو۔ ساون کے بادلو

مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں
ہائے رام مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں
انکھیاں مل کے
جیا دھڑکا کے
چلے نہیں جانا

اے آر کاردار کو ایم صادق اپنا استاد اور محسن تسلیم کرتے تھے۔ اس زمانے میں لاہور فن کاروں کا مرکز تھا۔ یہ غالباً 1930ء کی دہائی کا زمانہ تھا جب لاہور میں فن کاروں کے ایک گروپ نے دھوم مچا دی تھی۔ اس گروپ میں اداکار نذیر، لالہ یعقوب، ہیرا لعل، ایم اسماعیل، ماسٹر غلام قادر اور لالہ یعقوب کی بیگم خورشید بانو بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ بی این بالی، فضل شاہ، ماسٹر غلام حیدر بھی اس کا حصہ تھے۔ اس گروپ کے روح رواں اے آر کاردار تھے جن کا پورا نام میاں عبدالرشید کاردار تھا مگر فلموں میں وہ اے آر کاردار کے نام سے بلندیوں پر پہنچے تھے۔ ان فن کاروں کے علاوہ ایم صادق، بے جے کے نندا بھی شامل تھے۔ ان سرپھرے نوجوانوں کے شوق اور جذبے نے فلمی دنیا میں بہت گہرا اثر چھوڑا اور سبھی نے نام پیدا کیا۔

ایم صادق لاہور کے بھاٹی دروازے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے بھی بہت نام کمایا۔ لاہور سے 1927ء میں میٹرک کرنے کے بعد انہیں خدا جانے کیا سوجھی کہ لاہور سے اٹھے اور جنوبی افریقا چلے گئے۔ اس زمانے میں بحری سفر کا رواج تھا جو بہت طویل وقت لیتا تھا لیکن سمندر کی تازہ اور بھیگی ہوئی ہوا اور مختلف قسم و مختلف ملکوں کے مسافروں سے مل کر بہت اچھا وقت گزر جاتا تھا۔

1967

بابو صادق اس وقت نوعمر تھے۔ میٹرک پاس لڑکے کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس زمانے میں پندرہ سولہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیا جاتا تھا۔

جنوبی افریقا جاتے ہوئے انہیں بہت سے لوگوں سے ملنے، بات چیت کرنے اور ان سے دنیا کے بارے میں جاننے کا موقع ملا جو آئندہ زندگی میں ان کے لیے بے حد مفید اور کارآمد ثابت ہوا۔ مشاہدہ وسیع ہوا، معلومات میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ کہ وہ گھر سے جانے کے غم کو بھول بیٹھے۔ بحری جہاز اور سمندری سفر نے انہیں وہ تربیت دی جس کے باعث ایک دن وہ معروف مصنف اور ہدایت کار بن گئے۔ افریقا جا کر انہوں نے روزی کمانے کے لیے انگریزی کمپنی میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت سے تین سال کام کیا لیکن اس کام میں ان کا دل نہیں لگا۔ فلموں میں دلچسپی رکھنے والے اور مصنف کا دل ایسے کاموں میں بھلا کب لگ سکتا تھا۔ آخر دل نہ لگا تو تین سال بعد واپس لاہور آ گئے۔ لاہور میں انہوں نے اے آر کاردار کے فلمی ادارے میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں ان کا دل لگتا تھا۔ لوگ جانے پہچانے اور دیکھے بھالے تھے اور پھر ان کا اپنا لاہور شہر تھا جس کے بغیر انہوں نے جنوبی افریقا میں تین بے مزہ سال گزارے تھے۔

بابو صادق 1930ء میں لاہور واپس آئے تھے۔ کاردار صاحب نے اس وقت لاہور میں ایک فلم ساز کمپنی قائم کر لی تھی۔ کاردار صاحب کو آغاز ہی سے فلموں سے دیوانگی کی حد تک وابستگی تھی۔ انہوں نے فلم پروڈکشن کی

دیکھ بھال کی ذمے داری ان کے سپرد کردی تھی۔ یہ کام زیادہ عرصے تک نہ چل سکا کیونکہ کاردار صاحب نے لاہور سے کلکتہ میں جاکر کام کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ ان دنوں فلمیں لاہور میں بنتی تو تھیں مگر ان کے لیے سرمایہ کلکتہ کے سیٹھ ہی فراہم کرتے تھے۔ کاردار صاحب بولتی ہوئی فلم بنانا چاہتے تھے جن کے لیے کلکتہ میں سہولتیں موجود تھیں۔ لاہور میں انہوں نے خاموش فلمیں بھی بنائی تھیں۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ انڈیا والوں نے آج اے آر کاردار کو فراموش کردیا ہے اور ابتدائی فلمیں بنانے والوں میں بھی ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ لاہور اور پاکستان والے انہیں ویسے ہی بھلا چکے ہیں کیونکہ انہوں نے بمبئی میں بسیرا کرلیا تھا۔ کاردار صاحب بابو صادق پر بہت بھروسا کرتے تھے بلکہ یہ ان کے دست راست ہی تھے۔ 1935ء میں کاردار صاحب نے اپنی سپرہٹ اور بے پناہ کامیاب فلم "باغی سپاہی" بنائی تھی جس نے پورے برصغیر میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کردیا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا بابو صادق ایک باصلاحیت مصنف بھی تھے۔ کاردار صاحب کے ساتھ رہ کر انہوں نے فلموں کی کہانیاں، اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کا ہنر سیکھا جس کا نتیجہ "باغی سپاہی" کی صورت میں سامنے تھا۔ انہوں نے مصنف کی حیثیت سے ملاپ اور مندر کی کہانیاں بھی لکھیں جن کے ہدایت کار کاردار صاحب تھے۔ کاردار صاحب نے کلکتہ سے بمبئی جاکر فلمیں بنانے کا ارادہ کیا تو بابو صادق بھی ان کے "ضروری سامان" میں شامل تھے۔

بمبئی میں کاردار صاحب بحیثیت ہدایت کار رنجیت مووی ٹون سے وابستہ تھے جو اس وقت ایک بہت بڑا فلم ساز ادارہ تھا۔ اس کمپنی کے لیے کاردار صاحب نے جن فلموں میں ہدایت کاری کی تھی ان میں ٹھوکر، ہولی اور پاگل جیسی کامیاب اور مقبول فلمیں بھی شامل تھیں۔ پاگل ہم نے بھی بچپن میں دیکھی تھی۔ یہ بڑی بامقصد اور دلچسپ فلم تھی۔ کہانی کا موضوع یہ تھا کہ ایک دولت مند شخص (اس زمانے کا سپر اسٹار موتی لعل) غریبوں کا بہت ہمدرد ہے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر وہ بے چین ہوجاتا تھا۔ غریب پروری میں وہ عجیب و غریب حرکتیں کرتا تھا۔ مثلاً ایک روز جاڑے کے دن تھے، بارش ہورہی تھی، ایک شخص برائے نام لباس پہنے سردی میں ٹھٹھرتا جارہا ہے، موتی لعل اپنا قیمتی اوور کوٹ اتار کر اس کو دے دیتا ہے اور خود بھیگتا ہوا گھر پہنچ جاتا ہے۔ ایک بار تو اس نے کپڑوں سے تقریباً محروم ایک شخص کو اپنا کوٹ، پتلون، قمیص یہاں تک کہ بنیان تک دے دیا اور محض جانگیہ پہنے ہوئے سڑکوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک غریب آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہارمونیم بجا رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک کپڑا بچھا ہوا ہے مگر کسی کو اس کا گانا پسند نہیں آتا اور کوئی اسے ایک پیسا تک نہیں دے رہا تھا۔ موتی لعل قیمتی سوٹ کا خیال کیے بغیر فٹ پاتھ پر اس کی جگہ بیٹھ کر ہارمونیم بجاتا اور گاتا ہے۔ گانا سن کر درجنوں لوگ اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ گانے کو پسند کرتے ہیں اور اس کے سامنے بچھے ہوئے کپڑے پر پیسوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ موتی لعل ساری رقم گانے والے کو دے کر چلا جاتا ہے۔

اس کے بددیانت رشتے دار جو اس کی دولت ہتھیانا چاہتے ہیں عدالت میں درخواست دیتے ہیں کہ یہ شخص پاگل ہوچکا ہے لہٰذا اسے پاگل خانے میں داخل کیا جائے اور اس کی جائداد اور دولت ہم رشتے داروں میں تقسیم کرادی جائے۔ مقدمہ چلتا ہے تو اس کے مخالف اس کی ہمدردی اور رحم دلی کے واقعات سنا کر گواہ پیش کرتے ہیں جو یہ گواہی دیتے ہیں کہ اپنے کپڑے دوسروں کو دے کر صرف جانگیہ پہن کر گھومتا ہے۔ سڑکوں پر گانے گا کر بھیک مانگتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں موتی لعل صحیح الدماغ انسان ثابت ہوتا ہے اور عدالت اس کی انسان دوستی کی تعریف کرکے اس کو بے قصور قرار دے کر اسے آزاد کردیتی ہے اور اس کے حریص بازاری رشتے داروں کو جیل بھیج دیتی ہے۔ اس زمانے میں اس قسم کی اصلاحی اور بامقصد فلمیں بنا کرتی تھیں جو دلچسپ بھی ہوتی تھیں اور فلم بین کو سوچنے پر مجبور کردیتی تھیں۔

بابو صادق نے محض کاردار ہی کی فلموں کی کہانیاں نہیں لکھیں بلکہ دوسرے ہدایت کاروں کی فلموں کی کہانیاں اور اسکرپٹ بھی لکھے۔ کیدار شرما جو بذات خود بہت اچھے مصنف اور ہدایت کار تھے ان کی فلم "نئی دنیا" کے مکالمے لکھے۔

1943ء میں کاردار نے اپنا ذاتی فلم ساز ادارہ کاردار پروڈکشنز بمبئی میں قائم کیا تو انہوں نے تمام ذمے داریاں اپنے دست راست اور قابل اعتماد معاون بابو صادق کو سونپ دیں۔ کاردار نے جب فلم "نمستے" بنائی تو نہ صرف بابو صادق اس کے مصنف تھے بلکہ وہ کاردار کے شریک ہدایت کار بھی تھے۔ مکمل ہدایت کار کے طور پر ان کی پہلی فلم "بہار" تھی۔ اس کے بعد انہوں نے "جیون" کی ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے۔ اسی سال 1944ء میں بابو صادق نے اپنی ذاتی فلم "رتن" بنانے کی اجازت حاصل کی جو برصغیر کی مقبول ترین فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کے بارے میں پہلے بتایا جاچکا ہے۔ لیکن قسمت ان کے ساتھ ایک اور کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ جب اے آر کاردار نے فلم "سیاں" بنانے کا ارادہ کیا تو اس فلم کے حوالے سے میاں کاردار اور بابو صادق میں اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ یہ اختلاف اتنا بڑھ گیا کہ سولہ سال کے طویل ساتھ کے بعد بابو صادق میاں کاردار سے علیحدہ ہوگئے۔ بابو صادق کو اپنے ساتھی کی کمپنی اور ساتھ چھوڑنے کا بہت صدمہ تھا۔

فلم "چودھویں کا چاند" کا پوسٹر

میاں کاردار سے علیحدہ ہونے کے بعد انہوں نے پہلی فلم جگ بیتی ڈائریکٹ کی۔ انہوں نے ملکہ پکھراج کی فلم ڈاک بنگلہ بھی ڈائریکٹ کی جو ایک کامیاب فلم تھی اس کے بعد بابو صادق نے کئی فلمیں پیش کیں جن میں "کاجل"، چار دن شامل ہیں۔

آزادانہ طور پر فلمیں بنانے کے بعد بابو صادق میں اعتماد آگیا اور انہوں نے 1949ء میں اپنی فلم ساز کمپنی بنائی۔ اس کمپنی کے لیے انہوں نے بہت اچھی اور کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان میں سبق، سیاں، شباب، ماہ خانہ، چھومنتر، دنیا رنگ رنگیلی، مائی باپ اور کھوٹا سکہ جیسی فلمیں شامل ہیں جنہوں نے بابو صادق کو ایک مستند فلم ساز، ہدایت کار اور مصنف کی حیثیت سے مشہور کردیا۔

1950ء میں انہوں نے دیوان پکچرز کے لیے فلم "انمول رتن" لکھی اور ڈائریکٹ کی۔ اس کے بعد کامیاب فلموں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوگیا۔ قسمت ان پر مہربان تھی۔ فلم بین ان کے نام سے بخوبی آشنا تھے۔ فلم سازوں کی کمی تھی نہ خود ذاتی فلم بنانے میں کوئی رکاوٹ، ان فلموں میں خزانہ، پرستان، انجمن، پونم، جوانی کی ہوا، جیسی کامیاب فلمیں بنا کر اپنے ذاتی فلم ساز ادارے کو بند کردیا۔ اس کے بعد وہ صرف مصنف اور ہدایت کار کے طور پر فلمیں بناتے رہے۔ بھوپ نم، ودر نبھا، تاج محل اسی دور کی فلمیں ہیں۔

بابو صادق کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے استاد کی تربیت کے مطابق فلمیں بناتے رہے۔ وہ کلکتہ اور بمبئی کے دوسرے ہدایت کاروں سے بھی متاثر تھے مگر میاں کاردار ہی کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ انہوں نے فلموں کے لیے جو کہانیاں لکھیں ان میں سوشل مسائل کے علاوہ نظام حکومت سے عوام کی مایوسی کا عنصر بھی نمایاں رہا۔ ہدایت کار کی حیثیت سے وہ ایک مکمل تکنیک کار تھے۔ طبقاتی فرق اور امیر غریب کا فرق ان کی فلموں کی پہچان تھا۔ ان کی فلموں میں تہذیب، شائستگی نمایاں تھی۔ ان کا تخیل بہت بلند تھا۔ مشاہدہ بھی گہرا تھا جو ایک ہدایت کار کی کامیابی کا راز ہوتا ہے۔ انہیں موسیقی اور عکاسی کا بھی شعور تھا۔ وہ حقیقت پسندی پر یقین رکھتے تھے اور روشنیوں اور اندھیروں کے امتزاج سے اپنی فلموں میں اک خوبصورت رومانی اور حقیقی ماحول پیدا کرتے تھے۔

جس فلم پر بابو صادق کو اپنے استاد محترم اور محسن سے اختلاف ہوا اور جو بعد میں سولہ سال کے طویل عرصے بعد علیحدگی کا سبب بنا دراصل وہ فلم "سیاں" تھی۔ بابو صادق اس وقت کامیابیوں اور کامرانیوں کے جھولے پر سوار تھے۔ ان میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوچکی تھی۔ "سیاں" کی کہانی اور موضوع بابو صادق کی دوسری فلموں سے قدرے

مختلف تھا۔ وہ رومانی اور معاشرتی فلمیں بناتے تھے جن میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ "سیاں" ایک مختلف انداز کی فلم تھی۔ موضوع یہ تھا کہ دو بھائی ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے ہیں جو غالباً کسی غریب رشتے دار کی بیٹی ہے۔ بڑا بھائی ایک شریف النفس اور بہت بااخلاق اور شائستہ انسان ہے جبکہ چھوٹا بھائی شوخ و شریر، چلبلا، آزادی کا دلدادہ اور فلرٹ قسم کا ہے۔ بڑے بھائی کا کردار اجیت نے بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ چھوٹے بھائی کا کردار رتن کو سونپا گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں زیادہ مقبول اور معروف اداکار نہیں تھا اور اس کی فلمیں زیادہ تعداد میں ریلیز نہیں ہوتی تھیں۔ "سیاں" میں قدرتی اور بے ساختہ اداکاری نے اسے راتوں رات شہرت سے ہم کنار کردیا لیکن المیہ یہ ہوا کہ جس طرح وہ "سیاں" کی وجہ سے عروج کو پہنچا تھا دیکھتے ہی دیکھتے فلمی دنیا سے غائب ہوگیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی زندگی کا بہترین کردار ادا کرچکا تھا۔

"سیاں" میں بڑا بھائی شرمیلا ہے اور اپنی محبت کا اظہار کرنے کی اس میں جرأت نہ تھی لیکن چھوٹا بھائی منہ پھٹ تھا۔ لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے من مندر میں بڑے بھائی کی تصویر سجا رکھی تھی لیکن اس زمانے کے فلمی دستور کے مطابق اظہار نہیں کرسکتی تھی۔

باپ بڑے بیٹے کی شادی ہیروئن سے کرنا چاہتا تھا لیکن ضدی اور ہٹ دھرم چھوٹا بھائی رکاوٹ بن کر سامنے آگیا اور باپ سے کہا کہ اس لڑکی کو میں پسند کرتا ہوں۔ اگر اس کی شادی ہوگی تو مجھ ہی سے ورنہ نہیں ہوگی۔ باپ بھی اکھڑ قسم کا ہٹ دھرم آدمی ہے۔ وہ بیٹے کو ڈانٹ دیتا ہے اور بڑے بیٹے سے ہیروئن کی شادی طے کردیتا ہے۔ جس روز ہیروئن دلہن بن کر شادی کے لیے تیار بیٹھی ہے رتن پچھلے دروازے سے اس کے کمرے میں داخل ہوجاتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ میری زندگی میں تم کسی اور کی نہیں ہوسکتیں۔ ہیروئن کے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ زبردستی اس کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھا کر لے جاتا ہے۔ باپ کو علم ہوتا ہے تو وہ آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور اپنے مسلح کارندوں کے ہمراہ تعاقب میں نکل جاتا ہے۔ رتن ہیروئن کو کم سے کم وقت میں بہت دور لے جانا چاہتا ہے اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگلوں میں پہاڑوں سے گزرتا ہے۔ یہ بہت خوبصورت مناظر تھے۔ خصوصاً رتن، اس کے والد اور تعاقب کرنے والوں کی شہسواری قابل تعریف تھی۔

بالآخر باپ کے ہرکارے اس کو گھیر لیتے ہیں۔ باپ بھی پہنچ جاتا ہے۔ گستاخ اور نافرمان بیٹے کو برا بھلا کہتا ہے کہ لڑکی کو فوراً میرے حوالے کردو۔ لیکن بیٹا انکار کردیتا ہے۔ گولیوں کا تبادلہ شروع ہوجاتا ہے۔ رتن کی نشانہ بازی سے سردار کے اہلکار ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں۔ رتن کو بھی گولیاں لگتی ہیں۔ برستی ہوئی گولیوں کی بارش میں رتن پہاڑی کی اوٹ سے فائرنگ کرتا ہوا باہر نکل آتا ہے۔ اس کو بے شمار گولیاں لگتی ہیں۔ ہیروئن بے اختیار اس کے پیچھے جاتی ہے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتی ہے۔ فائرنگ بند ہوجاتی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں رتن اور ہیروئن زخمی حالت میں زمین پر سسک رہے ہیں۔ اس موقع پر ہیروئن کو احساس ہوتا ہے کہ وہ دراصل رتن سے محبت کرتی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہیں مگر گھسٹتے ہوئے ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہیں۔ یہ بہت پراثر اور خوبصورت منظر تھا جو آج بھی آنکھوں میں گھوم رہا ہے۔

بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کے نزدیک پہنچ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دم توڑ دیتے ہیں۔ رتن کا باپ، بڑا بھائی اور دوسرے مسلح افراد جب موقع پر پہنچتے ہیں تو دونوں محبت کرنے والے جان سے گزر چکے ہیں۔

فلم "سیاں" کی کہانی سے متاثر ہوکر انڈیا اور پاکستان میں اور بھی فلمیں بنائی گئیں مگر "سیاں" کے معیار کو نہ پہنچ سکیں۔ ہم نے لڑکپن میں یہ فلم دیکھی تھی اور چھپ کر دیکھی تھی مگر آج تک اس کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔ فلم کی مکمل کہانی ہمیں یاد نہیں ہے لیکن پھر بھی یہ ہمارے دل اور ذہن سے نہیں نکل سکی۔

اداکار رتن ہمارے محبوب ترین اداکار تھے مگر پھر جس طرح اچانک فلمی افق پر نمودار ہوئے تھے اسی طرح غائب ہوگئے۔ یہ فلم تو بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ موسیقی بھی بہت اچھی تھی لیکن اس فلم نے بابو صادق اور ان کے گرو محسن اللہ مددگار سے آرکاردار کو ان سے دور کردیا۔

بابو صادق اس کے بعد بھی فلمیں بناتے رہے جن میں سے بیشتر بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اس حقیقت کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک ماہر اسکرین پلے اور ڈائیلاگ رائٹر اور بہت ہنرمند ہدایت کار تھے۔ تکنیک کے اعتبار سے ان کی فلمیں بے عیب ہوتی تھیں۔ یہ کہا جائے تو

غلط نہ ہوگا کہ استاد نے انہیں جو کچھ سکھایا انہوں نے اس سے بھی زیادہ سیکھا اور ان کی فلمیں ایک تربیت کی حیثیت رکھتی ہیں جن سے فلم کی ہدایت کاری کرنے والوں کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔

1970ء میں جونک غلغلہ مچ گیا کہ بابو صادق انڈیا سے واپس لاہور آرہے ہیں۔ لاہور جو کہ ان کی جنم بھومی تھا جہاں انہوں نے بچپن اور لڑکپن گزارا تھا، جہاں کے گلی کوچے وہ کبھی فراموش نہ کرسکے تھے۔

لاہور میں انہوں نے صادق آرٹ پروڈکشنز کے نام سے پنجابی فلم ساز ادارہ قائم کیا اور پاکستان میں اپنی پہلی فلم "بہارو پھول برساؤ" کا آغاز کیا۔ اسی زمانے میں ہماری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھاری بھرکم جسم اور [illegible] تھے۔ ان سے بات کرکے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص نے برصغیر کی فلمی دنیا میں کیسے کیسے کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ اس وقت ہم بھی فلمی مصروفیات کی وجہ سے ان سے زیادہ ملاقاتیں نہ کرسکے لیکن لاہور میں ان کے [illegible] دوست احباب اور مداح ان کی آمد پر بے حد خوش تھے۔ "بہارو پھول برساؤ" ایک بنیادی طور پر رومانی فلم تھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ بابو صادق نے بڑی دلچسپی سے فلم کی شوٹنگ کا آغاز کیا۔ لاہور کے فلم ساز، ہدایت کار اور فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے ان کی ہدایت کاری کے انداز کو دیکھنے کے لیے اکثر ان کے سیٹ پر موجود ہوتے تھے، بدقسمتی سے ہمیں یہ شرف حاصل نہ ہوسکا جس کی وجہ یہ تھی کہ 1970ء میں ہم دو فلموں کے اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھے۔ دوستی اور میرے ہم سفر۔ اس کے بعد ہم یونٹ کے ساتھ یورپ چلے گئے۔ واپس آئے تو خبر ملی کہ ہارٹ فیل ہوجانے کے باعث بابو صادق کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنی ہی مٹی میں دفن کیے گئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اس شعر کو غلط معنی میں نہ لیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بالآخر اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہیں۔

لاہور ان کا من پسند شہر تھا۔ دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بعد لاہور کی مٹی بالآخر انہیں کھینچ کر واپس لاہور لے آئی۔ ان کا انتقال لاہور میں 6 ستمبر 1971ء کو ہوا۔ اس کے بعد مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ان کی نامکمل فلم کو مکمل کس ڈائریکٹر سے کرایا جائے۔ قرعۂ فال اس وقت کے نامور ہدایت کار حسن طارق کے نام نکلا۔ طارق صاحب کے لیے یہ ایک فخر کا مقام بھی تھا اور پریشانی کا سبب بھی۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ مصنف اور ہدایت کار کی حیثیت سے بابو

صادق نے فلم بندی کے بارے میں کیا سوچا تھا۔ بہرحال، پرچہ پڑھا اور رکھ کر انہوں نے اس فلم کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا اور پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس طرح لاہور کے بھاٹی دروازے سے شروع ہونے والا بابو صادق کا سفر لاہور ہی پہنچ کر ختم ہوا۔

پنجاب خصوصاً لاہور فلم سازوں، ہدایت کاروں، موسیقاروں اور اداکاروں کے علاوہ گلوکاروں کی نہایت زرخیز جگہ رہی ہے۔ انڈین فلموں کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو لاہور کے ہندو اور مسلمان فن کاروں کی ایک طویل قطار نظر آتی ہے لیکن اب نہ جانے یہ زرخیز سرزمین بنجر کیوں ہو گئی۔ لاہور قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں بھی فلم سازی کا مرکز رہا ہے۔ بھارتی فلموں کی درآمد کے بعد پاکستان کی فلمی صنعت نے بہت تیزی سے ترقی کی یہاں تک کہ کم سرمائے اور لاگت کے باوجود پاکستانی فلمیں انڈین فلموں کے معیار سے کم نہ تھیں۔ ہر طرف فلمی گہما گہمی تھی۔ ہزاروں افراد کے لاکھوں اہل خاندان فلمی صنعت سے روزی حاصل کررہے تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ لاہور میں سات فلم اسٹوڈیو تھے جن میں ایورنیو اسٹوڈیو اور شاہ نور اسٹوڈیو ممتاز تھے اور بھارتی فلم اسٹوڈیوز سے کہیں زیادہ خوبصورت اور معروف تھے۔ جب فلموں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو سنیما گھروں کی تعداد کم پڑ گئی اور ہر شہر میں سیکڑوں معیاری سنیما گھر تعمیر ہو گئے جہاں ہر وقت فلم بینوں کا ہجوم رہتا تھا اور یہ بھی فلموں کی تعداد کے اعتبار سے کم پڑ گئے تھے۔ فلمی صنعت کے علاوہ اردگرد بھی بہت رونق تھی۔

پرانے لاہور کے دو علاقے فن کار اور ہنرمند پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ ایک بھاٹی دروازہ اور دوسرا موچی دروازہ۔ ان علاقوں نے بے شمار فلمی شخصیات، دانشوروں، مورخوں، مصوروں اور صحافیوں کو جنم دیا۔ فلمیں لاہور والوں کی مرغوب اور سستی ترین تفریح تھیں۔ لاہور برصغیر کا ثقافتی مرکز تھا۔ لیکن اب یہ سب خوبیاں کہاں چلی گئیں؟ لاہور نے مایہ ناز فن کار، گلوکار، ہدایت کار، ادیب، مصنف اور شاعر پیدا کرنے کیوں بند کر دیے۔ ذرا سوچیے اور پرانے ماضی کو زندہ رکھنے کے لیے عملی اقدامات اٹھایئے۔ ورنہ آج کل تو بقول غالب یہ حال ہو گیا ہے کہ

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نہ وہ سرور و شوق نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق رونق شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

پاکستان کی یاد رکھنے والی شامیں سب بھول چکے ہیں۔ شاید ان لوگوں کو یاد ہوں جنہوں نے جوانی میں یہ فلمیں دیکھی ہوں۔ آیئے۔ آج آپ کو کراچی میں بننے والی ایک فلم کی داستان سناتے ہیں جو موضوع کے اعتبار سے اچھی اور تحریر، پیشکش کے اعتبار سے قابل تعریف تھی۔ دراصل لاہور اس زمانے میں فلم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ کراچی کے جو فن کار، قلم کار، شاعر، ہو، آ کر بس گئے انہوں نے بہت شہرت اور دولت پائی لیکن جو لوگ کراچی ہی کو بمبئی جیسا فلمی مرکز بنانے کی خواہش میں یہ شہر چھوڑ کر لاہور فلم نگری میں نہ آئے انہیں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ صحیح معنوں میں حقدار تھے۔

ایسے ہی صاحب کمال لوگوں میں دانش دیروی بھی تھے۔ اول تو ان کا نام ہی کچھ نیا نیا اور انوکھا سا تھا دوسرے "دیروی" نے انہیں سمجھنے میں مزید دیر کر دی۔ مگر کراچی کی سرزمین کو نہ چھوڑنے والے تخلیق کاروں میں دانش دیروی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ہم بھی جب کراچی جاتے ایسٹرن فلم اسٹوڈیو یا چائے خانوں اور فلمی دفتروں میں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ ایک ہنس مکھ، ملنسار اور انکسار سے بھرپور انسان تھے۔ صحافی بھی تھے اور فلمی جرائد میں وہ "لکیرا خان فقیرا" کے نام سے طنزیہ کالم لکھتے۔ مگر ان کا پہلا اور آخری شوق یا جنون فلم تھا۔ وہ بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر تھے۔ کالم بھی سادہ اور پراثر لکھتے تھے۔ انہوں نے کراچی میں قیام کے دوران میں پچیس کے قریب فلمیں لکھیں۔ ان میں سے دو فلمیں ان کی ذاتی بھی تھیں۔

اس وقت پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے ہم جس فلم کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا نام "لاڈلا" تھا۔ اس زمانے میں کچھ عجیب سا نام تھا مگر فلم دیکھنے کے بعد اس کی مقبولیت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ فلم ایسٹرن پکچرز کے بینر کے نیچے بنائی گئی تھی۔ فلم کی کہانی، اسکرین پلے، مکالمے سب دانش دیروی نے لکھے تھے۔ وہ ان چند لکھنے والوں میں شامل تھے جنہیں اسکرین پلے لکھنے کا ڈھنگ آتا تھا۔

اس فلم میں مرکزی کردار شبنم اور وحید نے ادا کیے تھے۔ اس سے پہلے ان فن کاروں نے صرف دو فلموں میں کام کیا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے فلموں کے لیے یہ نہایت موزوں جوڑی ہے۔ ان کی اداکاری میں بناوٹ نہیں حقیقت نظر آتی تھی۔ اس فلم میں گیارہ نغمات تھے جو سب کے سب مقبول ہوئے۔ خصوصاً تنویر نقوی کی لکھی ہوئی اور رونا لیلیٰ کی گائی ہوئی ایک لوری نے بہت شہرت حاصل کی جو صبیحہ خانم پر فلمائی گئی تھی۔

"... چا چا چا پر رقص کریں گے۔ اب نہ کسی پہ مریں گے۔" احمد رشدی اس کے گلوکار تھے۔ یہ شبنم اور وحید پر فلمایا گیا تھا۔

میری تمنا ... میرے مشکل کشا
تو سدا ہے ... مرا

رونا لیلیٰ نے گایا تھا جبکہ

سبحان اللہ یہ چہرہ
اس پہ زلفوں کا پہرہ

رونا لیلیٰ کا گایا ہوا تھا۔ احمد رشدی بھی اس دوگانے میں شامل تھے۔ ایک اور گیت بہت پسند کیا گیا تھا۔

ساتھی رے۔ تیری یادوں سے ہر دم کھلیں
میرے سپنوں کی کلیاں

وحید اور شبنم پر فلم بند ہوا تھا۔ رونا لیلیٰ گلوکارہ تھیں۔

فلم کی کہانی بیان کرنے سے پہلے ہم دوسرے قصے سنیے۔ دراصل بات یہ ہے کہ فلم سب لوگوں کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے مگر اداکار و ہدایت کار اور موسیقار کے سوا کسی کا نام نمایاں نہیں کیا جاتا حالانکہ یہ ان کا حق ہے۔ اس فلم کے نغمات تنویر نقوی، صہبا اختر، کیفی رضوی، سرور انور اور عبید منان نے لکھے تھے۔ ہدایت کار اے آئی مدنی تھے۔ عکاسی علیم اللہ نے کی تھی۔

آیئے۔ اب چلتے ہیں فلم کی کہانی کی طرف مگر اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جب ہم نے فلم "..." 1970ء میں شروع کی تھی تو کیریکٹر ایکٹرز کے طور پر سنتوش کمار اور صبیحہ خانم سے بات طے ہو چکی تھی لیکن ہوا یہ کہ ہمارا ... مگر یہ دونوں کراچی سے واپس آنے کا نام نہ لے رہے تھے۔ ہم نے فون پر بہت تقاضے کیے۔ سنتوش صاحب اپنی عادت کے مطابق کہہ دیتے تھے۔ "مولانا بس ہم آ رہے ہیں مگر یہ فلم آخری مراحل میں ہے، اسے مکمل کرنا ضروری ہے۔" آخرکار ہم نے پریشانی میں درپن صاحب اور نیر بھابی کو ٹیلیفون کر کے ان سے بات کی۔

درپن صاحب بولے "آفاقی صاحب، بھائی جان بہت ناراض ہوں گے۔ میں کیسے ان کی جگہ کام کر لوں۔"

بھابی نیر سلطانہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اداکاری ترک کر چکی تھیں۔ ہم نے بہت منت سماجت سے انہیں رضامند

ٹائی (Tie)

کھیلوں کی اصطلاح، عام معنوں میں یہ لفظ میچ یا مقابلے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دو ٹیموں کے میچ کو ٹائی کہتے ہیں۔ کرکٹ میں یہ لفظ خاص معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر دونوں ٹیموں کی دونوں اننگز کا مجموعہ برابر ہو تو میچ ٹائی کہلاتا ہے۔ کرکٹ کی تاریخ میں 1960-61ء آسٹریلیا اور غرب الہند کے درمیان برسبین کا ٹیسٹ میچ ٹائی پر ختم ہوا۔ دونوں ٹیموں کا اسکور بالکل برابر (سات سو سینتیس رنز) تھا۔ ایک روزہ کرکٹ میچوں میں تو اس لفظ کا استعمال معمول بن گیا ہے۔

مرسلہ: نعمان شیخ، کمال پور

کیا اور ان ہی کے گھر سے سنتوش صاحب کو فون کر کے بتایا کہ "سزا" کی شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ آپ دونوں کے بعد درپن صاحب اور نیر بھابی ہی موزوں ہیں مگر وہ آپ کا کردار قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ سنتوش صاحب بولے۔ "مولانا۔ یہ معمولی فلم نہیں لاڈلا ہے۔ ہم آج کل اپنے لاڈ کرا رہے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "تو پھر درپن صاحب اور نیر بھابی کو آپ خود کہہ دیں کہ وہ ہماری شوٹنگ کرا دیں ورنہ ہم ٹرین کے نیچے کود کر جان دے دیں گے۔"

وہ بولے "مولانا۔ یہ بہت غلط طریقہ ہے ٹرین اکثر لیٹ ہو جاتی ہے۔ جان دینے کے اور بھی کئی معقول طریقے ہیں۔ میں آپ کو بتا دوں گا۔"

ہم نے کہا۔ "پہلے تو آپ درپن صاحب سے بات کریں۔" اور فون درپن صاحب کو تھما دیا۔ یہ ایک وضعدار خاندان تھا۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ درپن صاحب نے ساری ذمے داری ہم پر ڈال دی اور کہا کہ جب تک میں ہاں نہیں کروں گا یہ میرے گھر پر دھرنا دیے بیٹھے رہیں گے۔"

سنتوش صاحب بولے "فون آفاقی صاحب کو دو۔"

ہم نے فون پر بات کی تو بولے کہ مولانا آپ فلم ساز

ہیں یا غنڈے بدمعاش، اگر میرے "ہاں" کہنے سے آپ کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو سو بار ہاں۔ مہربانی فرما کر میرے بھائی کو مزید زیر بار نہ کریں اور دھرنا اپنے گھر جا کر دیں۔"

یہ واقعہ پہلے بھی بیان کر چکے ہیں مگر اس وقت اس کا تذکرہ برمحل تھا اس لیے "مکرر" عرض کر دیا۔

لاڈلا دانش دیروی کی دوسری ذاتی فلم تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے ایک فلم "اور بھی غم ہیں" بنائی تھی۔ یہ انتہائی معیاری فلم تھی جس کو صدر ایوب نے بھی دیکھا اور پسند کیا تھا۔ اس فلم پر دانش صاحب کو صدارتی ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد انہیں تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

(اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ دانش دیروی نے وہ تمغہ اپنے بیٹے ممتاز دانش جو آج کل پی ٹی وی کراچی میں انجینئر ہیں۔ ان کے بورڈ کی فیس جمع کرانے کے لیے اس گولڈ میڈل کو سنار کے پاس بیچا تھا۔ مدیر سرگزشت) یہ مقام افسوس نہیں تو اور کیا ہے کہ ایسے دانش ور اور بے بہا مصنف اور ہدایت کار کو آج کوئی یاد تک نہیں کرتا۔ مگر دانش صاحب اپنے حصے کا کام کر کے جا چکے ہیں۔ ان کے گنتی کے قدردان اس وقت بھی موجود ہیں اتنی لمبی چوڑی تمہید سے شاید آپ اکتا گئے ہوں گے۔ آپ کے صبر کا مزید امتحان لینے کی بجائے اب فلم "لاڈلا" کا ذکر سنیے۔

لاڈلا کا موضوع اور پیشکش دونوں انوکھی تھی۔ مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک بیٹے اور اس کی دو ماؤں کی کہانی ہے۔ ایک سگی ماں جس نے اس کو جنم دیا مگر مجبوراً اسے چھوڑ کر ملک سے باہر چلی گئی۔ دوسری ماں وہ ہے جس نے اس بچے کو تمام تر مشکلات کے باوجود پال پوس کر جوان کیا اور اس پر اپنی جان نچھاور کرتی ہے۔ یہ کردار صبیحہ خانم نے بہت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ دوسری ماں کے کردار میں طلعت صدیقی جلوہ گر تھیں۔ وہ ایک دولت مند، خود غرض اور مغرور عورت ہیں حالانکہ صبیحہ خانم کی بہن ہیں۔ بیٹے کے سگے ماں باپ بیس سال بعد پاکستان آتے ہیں تو پالنے والی ماں بہت پریشان ہوتی ہے، وہ اپنی بہن اور بہنوئی کو اپنے گھر کی جگہ کسی اور جگہ ٹھہراتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ بیٹا سگے ماں باپ کے سامنے نہ آئے ورنہ ان کی محبت تازہ ہو جائے گی۔ وہ سگے ماں باپ کے سامنے ان کے بیٹے کا ذکر تک نہیں کرتی لیکن تقدیر ایک روز بیٹے کو سگے ماں باپ کے سامنے لے آتی ہے۔ بیٹے کو یہ علم نہیں ہے کہ پالنے والی عورت اس کی حقیقی ماں نہیں ہے۔ پالنے والی ماں اپنی ہزار کوششوں کے باوجود بیٹے کو اس کے حقیقی ماں باپ کی نظروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتی۔ پالنے والی ماں کی حرکتوں کی بدولت بیٹا باپ مر جاتا ہے۔ بیٹا ایک دن اپنی حقیقی ماں کو شوہر کی قبر پر روتا اور فریاد کرتا ہوا دیکھتا ہے تو جان لیتا ہے کہ معاملہ کیا ہے اور اس کے حقیقی ماں باپ کون ہیں۔ وہ روتی ہوئی ماں کے پاس جا کر اسے "ماں" کہہ کر مخاطب کرتا ہے مگر وہ اس کو بیٹا کہنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بیٹا خون کے رشتے کی وجہ سے مجبور ہے اور اپنی سگی ماں کو منا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ غم پالنے والی ماں کو نیم پاگل کر دیتا ہے۔

فلم کا اختتام یہ ہے کہ سنتوش کمار بیٹے اور سگی ماں کو لے کر طلعت صدیقی کے گھر جاتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ انسان کو اتنا خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔ وہ طلعت صدیقی کو سمجھاتا ہے کہ اگر تم حقیقت بیٹے کو بتا دیتیں اور سگی ماں کے آنے پر بیٹے سے اس کو محروم رکھنے کی کوشش نہ کرتیں تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ دونوں بہنیں گلے مل کر روتی ہیں جبکہ بیٹا خوش ہے کہ اسے دو مائیں مل گئی ہیں اور اب وہ ان دونوں کا لاڈلا ہے۔ اس طرح کافی اتار چڑھاؤ کے بعد کہانی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ درمیان میں بہت جذباتی، حقیقی اور خوبصورت مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پالنے والی ماں اور جنم دینے والی ماں کے مناظر بہت پراثر اور ڈرامائی ہیں۔ بعض جگہ تو دیکھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں کیونکہ دونوں مائیں صرف محبت کی خاطر یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ فلم کے مکالمے دل پر اثر کرنے والے اور بہت جذباتی لیکن حقیقت سے قریب ہیں۔ بلاوجہ تھیٹریکل انداز پیدا کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر بھی کامیاب رہی تھی۔

اس فلم میں رومانی کردار وحید مراد اور شبنم نے بہت خوبصورتی سے نبھائے تھے۔ موسیقی بہت اچھی تھی۔ وحید مراد کو ڈانس کرنے کے مواقع بھی ملے جن کے ساتھ انہوں نے پورا انصاف کیا۔ یہ وہ دور تھا جب ابھی انڈین فلموں میں بھی ہیرو کے رقص کا رواج نہیں ہوا تھا۔ کئی مشہور ہیرو ایسے تھے کہ رقص کر ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ جتیندر ڈانس کر لیتے تھے مگر وحید مراد والی بات کہاں سے لاتے۔

جب فلم "نیا دور" میں دلیپ کمار نے دیہاتی رقص کیا تو فلم بین خوشی اور حیرت سے پاگل ہو گئے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ وہاں ہیرو کا ناچنا معمول بن گیا مگر وحید مراد جیسا کوئی ہیرو سامنے نہیں آیا۔

فلم میں "لاڈلا" کا مرکزی کردار وحید مراد نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ ایک مشکل اور نفسیاتی کردار تھا۔ مگر وحید مراد نے ہر منظر میں انصاف کیا تھا اور دو ماؤں میں بٹے ہوئے بیٹے کا کردار حقیقت پسند انداز میں نبھایا تھا۔ اس فلم کی عکاسی نے فلم کی کشش اور تاثر میں اضافہ کر دیا تھا۔ افسوس کہ فلم کے کیمرا مین محبوب علی جیسا عکاس لاہور نہ آیا ورنہ لاہور میں وہ بہت نام اور اونچا مقام پیدا کرتے۔

صبیحہ خانم، سنتوش کمار، طلعت صدیقی اور وحید مراد ہی دراصل اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ انہوں نے اپنے کرداروں کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔

لاڈلا، غالباً 1970-71ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی زمانے میں پاکستان میں کتنی معیاری اور بامقصد فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ مصنف اور ہدایت کار نئے نئے اور بامقصد موضوعات کی تلاش میں رہتے تھے اور پھر مہینوں اسکرپٹ پر بحث کرنے کے بعد فلم سیٹ پر جاتی تھی۔

"لاڈلا" کے تذکرے میں ہم نے اپنی فلم "سزا" کا تذکرہ بھی بیان کیا ہے۔ دراصل سزا اور لاڈلا بنیادی طور پر ایک ہی موضوع پر بنائی گئی تھیں لیکن کہانیوں کا انداز مختلف تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں فلموں میں مرکزی خیال ایک جیسا تھا مگر کافی مختلف بھی تھا۔ "لاڈلا" کی کہانی آپ سن چکے۔ اب فلم "سزا" کا مختصر خلاصہ بھی بیان کیا جا رہا ہے۔

اس فلم کی کہانی ہندوستان سے شروع ہوتی ہے جب فسادات میں لاکھوں افراد شہید ہوئے اور بے شمار گھر اجڑ گئے۔ سزا میں ہیروئن (نیر سلطانہ) کا بھائی طالش ایک ابن الوقت قسم کا آدمی ہے۔ پاکستان آ کر وہ فرضی کاغذات کی بنیاد پر جائداد وغیرہ حاصل کر کے دولت مند ہو جاتا ہے۔ پھر اس کو سیاست کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نام نہاد خود غرض اور جھوٹا سیاستدان بن کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے۔

اس کی جوان بہن فسادات کے زمانے میں لاپتا ہو گئی ہے۔ چند ماہ بعد بازیافتہ اغوا خواتین کے دفتر سے اس کو فون موصول ہوتا ہے کہ اس کی بہن کو بازیاب کرایا جا چکا ہے۔ بجائے خوش ہونے کے طالش اور اس کی بیوی کو فکر پڑ جاتی ہے کہ جب ہم بتائیں گے کہ طالش کی بہن اغوا ہونے کے بعد بازیاب ہو چکی ہے تو ہماری ساری عزت خاک میں مل جانے کی اور بدنامی بھی ہوگی۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق طالش بہن کو لینے جاتا ہے۔ بہن بھائی کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جاتی ہے مگر طالش، جھجک رہا ہے۔ بہن کہتی ہے کہ آپ کے لیے ایک تحفہ بھی لائی ہوں۔ گود میں چند ماہ کے بچے کو لے کر آتی ہے تو بھائی اور بھی زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔ بہن اور بھانجے کو لے تو جاتا ہے مگر بھائی اور بھاوج نیر سلطانہ کو سمجھاتے ہیں کہ اول تو تم اغوا ہو چکی ہو۔ اب یہ بچہ دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ کسی ہندو یا سکھ کا بچہ ہے۔

بہن کہتی ہے کہ بھابی تم تو جانتی تھیں کہ میں ماں بننے والی تھی۔ بھاوج کہتی ہے کہ ہاں میں تو جانتی ہوں مگر دنیا والے یقین نہیں کریں گے۔ بھائی سمجھاتا ہے کہ میں اس کی پرورش کا کہیں اور بندوبست کر دیتا ہوں۔ وہ اسی شہر میں رہے گا۔ ملتی رہنا، مناسب وقت آنے پر سچائی بتا دیں گے۔

اس طرح یہ بچہ ایک غریب عورت کے گھر پرورش پاتا ہے جس کا اپنا ایک بچہ (قوی) بھی ہے۔ غریب عورت کو کافی روپیا اور تسلی دے کر یہ لوگ اپنے گھر چلے جاتے ہیں مگر ماں کا دل بے قرار ہے۔ وہ موقع پا کر کھلونے اور تحفے لے کر بیٹے کے پاس جاتی ہے جس سے بھائی فکر مند ہوتا ہے کہ کہیں اس آمد و رفت سے راز کھل نہ جائے۔

بھائی چالاک اور خود غرض ہے۔ جب ایک نوجوان (درپن) کا ان کے گھر آنا جانا ہوتا ہے تو بھائی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بہن کی شادی درپن سے ہو جائے جو بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن جانے والا ہے۔ وہ بہن سے کہتا ہے کہ یہ بہت اچھا رشتہ ہے۔ وہ بھی یہی چاہتا ہے۔ تم شادی کر کے لندن چلی جاؤ۔ واپس آؤ گی

تو ہم تمہارے شوہر کو حقیقت بتادیں گے اور بیٹا تمہارے ساتھ ہی رہے گا۔ نیر کہتی ہے کہ درپن کو دھوکے میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ پہلے اس کو ساری حقیقت بتادیں۔ بھائی سمجھاتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ انسان بھی بدل جاتا ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ آجائے گا تو اطمینان سے اس کو بتادیں گے۔ غرضیکہ مجبور کرکے بہن کی شادی کرکے اس کو لندن رخصت کردیتا ہے۔ بھائی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ ایک مہینا گزرنے کے بعد جب غریب عورت خرچے کی رقم لینے آتی ہے تو بھائی کہتا ہے کہ دیکھو بھئی۔ ہمارا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف رحم دلی اور انسان دوستی کی خاطر ایسا کیا تھا۔ ہم اب کچھ نہیں دے سکتے تم اس کو پالو یا یتیم خانے میں داخل کردو۔

دراصل طالش کو یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر اس عورت سے جان نہ چھڑائی تو کسی وقت بھی راز فاش ہوسکتا ہے۔

غریب عورت جواب میں کہتی ہے کہ سیٹھ صاحب۔ اب وہ میرا بچہ ہے۔ جہاں ایک بیٹے کو دال دلیہ کھلا کر پال سکتی ہوں دوسرے کو بھی پال سکتی ہوں۔ عورت چلی جاتی ہے اور طالش بھی اطمینان کی سانس لیتا ہے۔

غریب عورت بچوں کو تعلیم تو دے نہیں سکتی البتہ انہیں جیسے تیسے پالتی ہے۔ دونوں میں بھائیوں کی طرح پیار ہے۔ قوی بھیک مانگنا اپنا پیشہ بنالیتا ہے۔ نیر کا بیٹا جمیل مصور بن جاتا ہے مگر گزارہ نہیں ہوتا۔ نیر تین سال بعد واپس آتی ہے تو بھائی سے اپنے بچے کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ رونا سا منہ بنا کر کہتا ہے کہ وہ عورت بہت لالچی نکلی۔ بے بی کو لے کر غائب ہوگئی۔ اس نے یہ شہر بھی چھوڑ دیا ہے۔

نیر کی بے بسی اور غم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا شوہر درپن بہت اچھا انسان ہے۔ اس کا تقرر جج کی حیثیت سے ہوجاتا ہے۔ ان دونوں کی ایک بچی بھی ہے۔ جمیل اپنی ماں اور بہن سے ملتا تو ہے مگر حقیقت سے بے خبر ہے۔ ایک دن اس کو حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ امیر عورت ہی اس کی حقیقی ماں ہے۔ وہ اس سے نفرت کرنے لگتا ہے اس کے آگے کہانی چلتی رہتی ہے۔

جمیل کو اپنی چھوٹی بہن سے بے پناہ پیار ہے۔ ایک بار اس کی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے جمیل سے ایک قتل ہوجاتا ہے۔ قوی اس کو سمجھاتا ہے کہ اگر تم عدالت میں کہہ دو کہ یہ لڑکی تمہاری بہن ہے اور اس کی عزت بچانے کے لیے تمہارے ہاتھ سے ان جانے میں یہ قتل ہوگیا تو تم بچ سکتے ہو۔ مگر جمیل صاف انکار کردیتا ہے اور کہتا ہے کہ جس بات کو میری ماں نے زندگی بھر دنیا سے چھپایا اگر میں بیان کروں تو میری ماں کے ساتھ بہن کی بھی بدنامی ہوگی۔ میری جان تو بے مقصد ہے مگر میں اپنی ماں اور بہن کی عزت اور خوشی برباد نہیں کرسکتا۔

درپن یہ گفتگو سن لیتا ہے اور اس دلیل پر جمیل معاف کردیا جاتا ہے۔ درپن اپنی بیوی سے شکایت کرتا ہے کہ اگر تم پہلے ہی مجھے حقیقت بتادیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ سب کتنی تکالیف سے بچ جاتے۔

اس فلم کا ایک منظر دہرانا چاہتا ہوں۔ ماں اپنی تصویر بنوانے کے لیے جمیل کے پاس جاتی ہے اور کہتی ہے کہ میں ایک ماں اور ممتا کی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔

جواب میں وہ کہتا ہے۔ جو چیز میں نے کبھی دیکھی نہیں اس کی تصویر کیسے بنا سکتا ہوں۔ یہ دونوں ماں اور بیٹے کی ہی کہانیاں ہیں مگر قطعاً مختلف "سزا" کئی اعتبار سے بہت نیا موضوع تھا جسے فلمانے کا ڈیوزیڈ احمد صاحب نے ہمیں مشورہ دیا تھا مگر ہم بضد تھے۔ سزا کو بہت کامیابی ملی لیکن ہمیں کچھ نہ ملا۔ اور یہ سب ہمارے دوستوں نے کیا۔ بہرحال اسی کا نام دنیا ہے۔

21 اپریل 2013ء کو شاعر مشرق، مفکر اسلام علامہ اقبال کا 75 واں یوم وفات تھا۔ علامہ اقبال ایک ایسی شخصیت تھے جن کے کلام نے ہم ہندوستانی مسلمانوں پر کوئی خاص اثر نہیں کیا حالانکہ اقبال کے عاشقوں اور مداحوں کی کمی نہیں ہے جو اٹھتے بیٹھتے اقبال کے اشعار پڑھتے اور سر دھنتے رہتے ہیں۔ یا پھر ریڈیو پاکستان سے ان کا کلام باقاعدگی سے نشر کیا جاتا ہے لیکن اقبال کو عام لوگوں تک پہنچانے میں سب سے زیادہ خدمات قوالوں نے سرانجام دی ہیں۔ علامہ کا احترام بھی ہم سب مسلمان کرتے ہیں اور ان سے دلی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کے کلام اور فلسفے کو زندگی میں اپنانے کا تعلق ہے اس معاملے میں ہم سب صفر ہیں۔ علامہ اقبال کے آبائی دیرینہ مکان کے بارے میں پچھلے دنوں یہ خبر آئی تھی کہ اس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کے زیر استعمال رہنے والا سامان کباڑ خانہ بن گیا۔ خود اس مکان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ مشرق کے عظیم ترین شاعر کی رہائش گاہ رہی ہے جس نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور قائداعظم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگلستان میں اپنی کامیاب وکالت چھوڑ کر

یہ ہے اسٹوڈیو

ہندوستان آئیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک قائم کرنے کے لیے ماحول سازگار کریں۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہم ان کا کلام و پیغام کس قدر کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کا یہ مکان ان کا آبائی مکان ہے۔ ان کے جد امجد جب کشمیر سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تو سیالکوٹ ہی ان کا پہلا پڑاؤ تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے سیالکوٹ شہر کے ایک محلے میں رہائش اختیار کی اور کافی عرصے تک اس کرائے کے گھر میں قیام پذیر رہے۔ علامہ اقبال کے دادا محمد رفیق نے سیالکوٹ کے محلہ چوڑی گراں میں یہ ذاتی مکان خریدا تھا جو آج بھی اقبال منزل کہا جاتا ہے۔ یہ جان کر آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ دو منزلہ اور صاف ستھرا مکان شیخ محمد رفیق نے صرف 150 روپے میں خریدا تھا۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ ہر چیز سستی تھی لیکن مسلمان اس قدر سستی اور کم قیمت جائداد بھی خریدنے کی توفیق نہیں رکھتے تھے۔

شیخ محمد رفیق کے دو بیٹے تھے۔ ایک شیخ نور محمد اور دوسرے شیخ غلام۔ اس زمانے میں پیدائش کا حساب رکھنے کا دستور نہیں تھا لیکن اندازہ یہ ہے کہ شیخ نور محمد 1840ء میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک خوش شکل انسان تھے۔ ان کی شادی ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی جو سمبڑیال میں واقع تھا۔ کہتے ہیں کہ شیخ نور محمد سے پہلے ان کے ماں باپ کے بچے پیدا ہوتے ہی وفات پاگئے تھے اس لیے ٹوٹکے کے طور پر ان کی ناک چھدوا کر اس میں نتھ پہنادی گئی جس کی وجہ سے وہ بچپن میں نتھو کہلاتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود تو تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر ان کی طبیعت دین اور روحانیت کی طرف مائل ہوگئی تھی اور وہ صاحب فہم اور صاحب رائے بھی مانے گئے تھے۔ وہ بہت پارسا اور نیک انسان تھے۔ تصوف کی طرف مائل ہونے کے بعد ان کی طبیعت میں مذہبی رجحان کا اضافہ ہوگیا تھا۔ شیخ نور محمد کی شادی امام بی بی سے ہوئی تھی۔

سیالکوٹ میں ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کافی عرصے تک مقیم رہے۔ شیخ نور محمد نے تحصیل روزگار کے لیے ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں کپڑے سینے کی ملازمت کرلی تھی، ان کی بیگم کے خیال میں یہ رزق حلال نہ تھا اس لیے وہ ان کی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی تنخواہ میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے شیخ نور محمد نے کپڑے سینے کی ملازمت ترک کرکے خود ہی کرتے بنانے شروع کردیے۔ وہ خود بھی کرتے پہنتے تھے۔ بچوں کے لیے ان کے بنائے ہوئے کرتے بہت پسند کیے جاتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ شیخ نور محمد کا سیا ہوا کپڑا پہننے والے بچے خوش قسمت ہوتے تھے۔

شیخ نور محمد نے اپنے کاروبار کو پھیلانے کے لیے برقعوں کی ٹوپیاں بنانا شروع کردیں۔ یہ کاروبار اتنا کامیاب ہوا کہ بہت جلد دکان میں کئی ملازم بھی رکھ لیے گئے۔ یہ کاروبار وہ اپنے مکان ہی کے ایک حصے میں کیا کرتے تھے۔ انہیں برقعوں کی ٹوپی بنانے کا موجد کہا جاتا تھا۔

یہ پس منظر اس مقصد سے بیان کیا جارہا ہے کہ علامہ اقبال کے خاندان کے کچھ گوشے بھی سامنے آجائیں جو کہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

شیخ نور محمد کو اللہ تعالیٰ نے پانچ اولادیں عطا کی تھیں۔ دو بیٹے شیخ عطا محمد اور شیخ محمد اقبال، شیخ محمد اقبال اپنے بھائی سے سات سال چھوٹے تھے۔

شیخ محمد اقبال کی پیدائش سے قبل ہی کچھ ایسی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا دنیا میں

آنے والا بچہ خصوصی صلاحیتوں کا حامل ہوگا۔

ایک ایسا واقعہ علامہ اقبال نے خود نذیر نیازی کو سنایا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ ایک روز میرے والد کچھ مٹھائی لے کر گھر آرہے تھے۔ راستے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک کتا بھوک سے بے تاب ہے اور اگر اسے فوری طور پر کھانا نہ ملا تو یہ مرجائے گا۔ والد نے ساری مٹھائی کتے کو کھلادی اور بعد میں اس کو پانی بھی پلایا۔ اس رات ان کے والد نے خواب میں دیکھا کہ ایک مکان میں مٹھائی کے طباق رکھے ہوئے ہیں۔ اس خواب سے انہیں یقین ہوگیا کہ ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔

اس زمانے میں کشمیر کے بنے ہوئے دھسّوں کی بہت مانگ تھی جو سردیوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک دھسّے کی قیمت دو روپے تھی۔ والد نے تین چار سو دھسّے تیار کرائے جن پر فی دھسّہ صرف آٹھ آنے لاگت آئی تھی۔ یہ دھسّے انہوں نے دو روپے فی دھسّہ فروخت کیے جس سے انہیں کافی منافع حاصل ہوا اسی زمانے میں علامہ اقبال کے بڑے بھائی بھی برسر روزگار ہوگئے اور گھر میں خوشحالی پیدا ہوگئی۔

علامہ اقبال کو بچپن ہی سے یہ احساس تھا کہ ان کے والد صاحب کشف وکرامات بزرگ ہیں۔ ایک بار انہوں نے اپنے ایک بے تکلف دوست کو بتایا کہ میری والدہ نے ایک بار سنایا کہ تاریک کمرے میں اچانک ایک نور ظاہر ہوا اور یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں سورج نکل آیا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے بھی اپنی کتاب "ذکر اقبال" میں ایک واقعہ درج کیا ہے۔ اقبال نے بتایا کہ دس گیارہ برس کی عمر میں رات کے وقت اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میری والدہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھیں۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ والد صاحب مکان کے صحن میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے اردگرد نور کا ہالا ہے۔ صبح میں نے والدہ سے اس بارے میں دریافت کیا۔ اس وقت والد صاحب انہیں اپنا خواب سنا رہے تھے جو انہوں نے بہ عالت بیداری دیکھا تھا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہوا ہے۔ قافلے میں ایک شخص بہت بیمار ہے۔ یہ سن کر کچھ ضرورت کی چیزیں تانگے میں رکھ کر قافلے کی طرف گیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ شخص واقعی بہت بیمار ہے اور صاحب ثروت بھی ہے۔

اس کے خاندان والوں نے بتایا کہ وہ اس کا علاج کرنے کے لیے ہی پنجاب آئے ہیں۔

والد نے وہاں پہنچتے ہی بیمار کے پاس جانے کی خواہش کی۔ مریض کے پاس گئے تو دیکھا کہ مریض کے اعضا بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر والد صاحب نے جیب سے ایک پڑیا نکالی جس میں کوئی پوڈر جیسی چیز تھی۔ مریض کے اعضا نکل گل چکے تھے۔ وہ پوڈر انہوں نے مریض کے متاثرہ اعضا پر مل دی اور کہا کہ خدا کے فضل سے مریض کو جلد شفا ہوجائے گی۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں کچھ پیش کیا جو انہوں نے قبول نہیں کیا۔ چند روز بعد وہ لوگ سیالکوٹ آئے اور بتایا کہ خدا کے فضل سے مریض صحت مند ہوچکا ہے۔

اقبال کے والد "میاں جی" کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی دیانت داری اور ایمانداری پر سب یقین کرتے تھے۔ اقبال نے اپنے والدین کی آغوش میں اور ایک پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ ایسے پاکیزہ ماحول میں پرورش پانے والا بچہ جب بہترین دینی اور دنیاوی تعلیم سے بہرہ ور ہو اور صاحب علم اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہو تو وہ بچہ ہوکر اقبال نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اقبال کی فارسی شاعری کا شہرہ ساری دنیا میں ہے۔ اہل ایران اقبال کو فارسی زبان کے نامور شاعروں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ اقبال کا کلام ایران میں عام ہے بلکہ پاکستان سے زیادہ مقبول ہے اور ایرانی انہیں کو ہی شاعر سمجھتے ہیں۔ کاش ہماری قوم بھی ریڈیو کے نغمات اور قوالیوں کی پابندیاں ختم کرکے اقبال کے کلام کی روح کو سمجھے اور اللہ تعالیٰ اس کو اقبال کے کلام سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆☆

مشرقی پاکستان اب بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہیں۔ قصوروار کون ہے؟ اس تفصیل میں جانا ضروری نہیں کیونکہ اب اس کہانی کا ہر پہلو منظر عام پر آچکا ہے۔

مشرقی پاکستان میں فلم سازی کا آغاز بنگلہ فلم سازی سے ہوا تھا۔ بنگلیوں نے لاہور اور کراچی کے فلمی نگار خانوں میں تعلیم وتربیت حاصل کی اور چھوٹے پیمانے پر بنگلہ فلمیں بنانے کا آغاز کیا۔ اس طرح ان کی فلم سازی نے جنم لیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ اردو فلمیں مغربی پاکستان

میں بھی دیکھی جاتی ہیں اور اردو فلم سازی ان کے لیے زیادہ منافع بخش ہوگی۔

لیکن مشرقی پاکستان میں اردو فلموں کی تیاری اور پھر ان کے فروغ میں سرفہرست قیام پاکستان کے بعد کلکتہ سے آنے والے وہ لوگ ہیں جو ڈھاکا میں اردو فلم سازی کا آغاز کرنے کے خواہش مند تھے۔ ان میں ایک نمایاں نام ہارون کا بھی ہے۔ ہارون ایک خوبرو اور شائستہ نوجوان تھے۔ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ ان کا تعلق کلکتہ کے ایک دولت مند گھرانے سے تھا جن کا وسیع کاروبار تھا۔

ڈھاکا میں اردو زبان میں بنائی جانے والی پہلی فلم "جاگو ہوا سویرا" تھی جو اختر کاردار نے بنائی تھی اور اس فلم نے دنیا بھر کے فلم میلوں میں کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے تھے۔ دنیا بھر میں اس فلم کی شہرت سے متاثر ہوکر مشرقی پاکستان میں اردو فلمیں بنانے کے تصور نے جنم لیا۔

کلکتہ سے فلم سے وابستہ جو لوگ ڈھاکا آئے تھے ان میں ہارون اور ان کا خاندان بھی شامل تھا۔ ہارون کا اس وقت تک فلمی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نذرالاسلام کے علاوہ پیش منظر بے پی اسلام بھی ڈھاکا آئے تھے۔ جب ان سے کچھ فلم سازوں نے بنگلہ فلم بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اردو فلم بنانا چاہتا ہوں جسے سارے پاکستان میں دیکھا جائے۔ بے پی اسلام کلکتہ میں بھی فلمی صنعت سے وابستہ تھے اور ان کا کافی نام بھی تھا۔ ڈھاکا کے فلم ساز بے پی اسلام سے فلم بنوانے پر بضد تھے۔ بالآخر سب نے بے پی اسلام کی خواہش کے مطابق اردو فلم بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے ایک کہانی کی ضرورت تھی جسے اردو میں فلمایا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بنگلہ زبان کے ایک ناول کا انتخاب کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس ناول کا اردو میں کون ترجمہ کرے؟ اردو رائٹرز اور شاعروں کی اس وقت ڈھاکا میں قلت تھی۔ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر سے ناول کا ترجمہ کرایا جو بے پی اسلام کو پسند نہیں آیا کیونکہ انہیں فلم کا اسکرین پلے وغیرہ لکھنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

خوش قسمتی سے ان ہی دنوں معروف شاعر سرور بارہ بنکوی بھی ڈھاکا پہنچ گئے۔ اگر سرور بارہ بنکوی کو مشرقی پاکستان کی اردو فلموں کے لیے "آکسیجن" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ بہت اچھے مصنف بھی تھے اور ان کی شاعری کے بارے میں تو دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔ سرور بارہ بنکوی ایک گورے چٹے، خوبرو اور انتہائی شائستہ انسان تھے۔ انہوں نے بہت جلد مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت میں اپنے قدم جمالیے کیونکہ ایک اچھا شاعر اور ادیب مشرقی پاکستان کو مل گیا تھا۔ درحقیقت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرور بارہ بنکوی نے ڈھاکا کے بنگالی فنکاروں کو نہ صرف اردو سکھائی بلکہ انہیں اردو کے صحیح تلفظ سے بھی آگاہ کیا۔ سوائے اداکار ہارون کے ڈھاکا کا کوئی اردو فلموں میں کام کرنے والا فن کار یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تعلیم اور تربیت میں سرور بارہ بنکوی کا نمایاں حصہ نہیں ہے، شبنم جو ایک زمانے میں اردو سمجھ تک نہیں سکتی تھیں، سرور بارہ بنکوی نے کچھ عرصے کی تربیت کے بعد انہیں اردو پڑھنا اور صحیح تلفظ کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی کرنا سکھادیا۔ گلوکاروں کو انہوں نے اردو کے صحیح تلفظ سے آگاہ کیا۔ اداکاروں کو اردو فقروں کی

ادائیگی کے ساتھ اردو تلفظ میں اردو بولنا اور پڑھنا سکھایا ورنہ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ بنگلہ لہجے میں اردو کے مکالمے بولتے تھے۔ سرور بارہ بنکوی نے ڈھاکا میں اردو فلمیں بھی بنائیں۔ ایک فلم بنانے کے لیے وہ لاہور بھی آئے تھے۔ انہوں نے ایک بہت حقیقت پسند فلم بنائی تھی۔ شبنم نے اس فلم میں بہت اچھی اداکاری کی تھی جس پر انہیں ایوارڈ بھی ملا تھا۔

بہرحال مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت کا تذکرہ ہو اور سرور بارہ بنکوی کا نام نہ آئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور بتادوں سرور صاحب ڈھاکا میں بے حد مقبول تھے۔ بنگلہ دیش کی فلمی صنعت کے لوگ سرور بارہ بنکوی کے احسان مند بھی تھے اور ان سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد سرور صاحب ڈھاکا گئے تو سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے سرور صاحب سے کہا کہ آپ بنگلہ دیش کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کیوں نہیں کرتے۔ یہاں کے نامور اداکار آپ کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔ فلم میں پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مقبول فن کار کام کریں گے اور آپ کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔

اس زمانے میں بنگلہ دیش کے ساتھ پاکستان کی مشترکہ فلم سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن بنگلہ دیشی دوستوں نے ان کی بہت مدد کی اور انہیں اپنی حکومت سے اجازت بھی دلادی۔ سرور صاحب اس فلم کی ابتدائی تیاریوں کے لیے لاہور آئے اور اسلام آباد میں متعلقہ حکام سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اس زمانے میں بڑے بڑے شاعر فلموں سے وابستہ تھے اور آئے دن کسی نہ کسی کے گھر مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی، مسرور انور، کلیم عثمانی وغیرہ ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

یہ تو ہم جانتے تھے کہ سرور بارہ بنکوی بنگلہ دیش کے ساتھ مشترکہ فلم سازی کے پروگرام بنا رہے ہیں لیکن دوسروں کی طرح ہمیں بھی یقین نہیں تھا کہ ان کا یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ ایک دن شام کو ہم مال روڈ کی ایک دکان میں کھڑے تھے۔ لیلیٰ بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ اچانک پائپ کے تمباکو آرین مور کی خوشبو آئی اور اس کے بعد کسی نے پیچھے سے ہماری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ نرم اور پرگوشت انگلیاں اور آرین مور کی خوشبو، ہم سمجھ گئے کہ یہ سرور بارہ بنکوی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ پلٹ کر دیکھا تو سرور صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''ارے آپ ڈھاکا سے کب آئے؟''

وہ بولے۔ ''ڈھاکا سے ابھی ہو آئے اور ...... سے بھی۔ آفاقی صاحب آپ کو معلوم ہے مجھے مشترکہ فلم بنانے کی اجازت مل گئی۔''

''یہ تو آپ نے بہت بڑی خوش خبری سنائی۔ ...... مبارک کرے۔''

''بس اب میں آج کل میں ڈھاکا جا رہا ہوں تاکہ ضروری انتظامات مکمل کرلوں۔ واپس آکر لاہور میں فلم کی شوٹنگ کا آغاز کروں گا۔''

''مگر اتنی جلدی کیا ہے۔ آیئے کسی ریستوران میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

وہ مسکرائے۔ ''اتفاق سے میں ایک ڈنر پر ہی جا رہا ہوں۔ چلیے ڈھاکا سے واپسی پر آپ کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ وعدہ رہا۔ بھابی بھی اس وعدے کی گواہ ہیں۔''

وہ بہت جلدی میں تھے۔ گلے ملے اور رخصت ہو گئے۔ اپنے تمباکو کی خوشبو ...... ہیں چھوڑ گئے۔ سرور صاحب پائپ پیا کرتے تھے۔ پیتے کیا تھے بس پائپ چسنی کی طرح ہر وقت ان کے منہ میں نظر آتا تھا۔ شاید وہ صبح ایک پائپ میں تمباکو بھرتے ہوں گے۔ اس کے بعد بس پائپ کو جلاتے رہتے تھے جو فوراً ہی بجھ جایا کرتا تھا۔ دراصل وہ پائپ کے کش نہیں لیتے تھے۔ دراصل انہیں آرین مور تمباکو کی خوشبو بہت پسند تھی۔ ہم نے بھی آرین مور کی خوشبو کے شوق میں ہی پائپ پینا شروع کیا تھا مگر ہم جب ایک بار پائپ سلگاتے تھے تو اس کو راکھ کرکے ہی چھوڑتے تھے، حالانکہ ہم تمباکو نوشوں کی طرح دھوئیں کو کھینچ کر پھیپھڑوں میں نہیں لے جاتے تھے۔ ہمارے دوست کہا کرتے تھے کہ آپ صرف منہ سے دھواں نکالنے کے لیے پائپ اور سگار پیتے ہیں۔

اگلے دن ہم نے اخبار میں خبر پڑھی کہ مشہور شاعر، مصنف اور نغمہ نگار سرور بارہ بنکوی ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پاگئے۔ یہ اس شخص کی کہانی ہے جس نے مشرقی پاکستان کے بنگالی فنکاروں کو اردو بولنا اور لکھنا سکھایا تھا۔ ہر بنگالی فنکار دل سے ان کی عزت کرتا تھا اور انہیں اپنا استاد تسلیم کرتا تھا۔ وہ ایک نیک دل، مخلص اور دھن کے پکے انسان تھے۔ افسوس کہ ان کی اتنی بڑی خدمت اور ریاضت کا اعتراف نہ تو پاکستان میں کیا گیا اور نہ ہی بنگلہ دیش میں۔

ویسے بھی بھارت نواز عوامی لیگ کی حکومت میں اردو کو اس سرزمین سے دیس نکالا مل چکا ہے۔

ذکر ہو رہا تھا مشرقی پاکستان میں بنائی جانے والی پہلی اردو فلم کا۔۔۔ بے بی اسلام جو کہ کلکتہ میں ایک تجربہ کار فلم ایڈیٹر تھے وہی اس فلم کی ہدایت کاری کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور ان ہی کا اصرار تھا کہ اگر وہ فلم بنائیں گے تو اردو میں۔ بے بی اسلام نے ڈھاکا یونیورسٹی کے پروفیسر صلاح الدین محمد سے اس سلسلے میں تعاون کی درخواست کی۔ پروفیسر صلاح الدین اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے مگر پھر وہی مسئلہ کہ فلم کا منظرنامہ اور اسکرپٹ لکھنے سے ہنر سے ناواقف تھے۔ بے بی اسلام نے اس کا حل یہ نکالا۔ پروفیسر صاحب ناول کا اردو میں ترجمہ کردیں باقی کام وہ خود دوسروں کی مدد سے کرلیں گے۔

خوش قسمتی سے ان ہی دنوں سرور بارہ بنکوی کا ڈھاکا جانا ہوا۔ وہ ڈھاکا ہی میں رہائش پذیر ہو چکے تھے۔ ان کا مقصد مشرقی پاکستان فلم انڈسٹریز کو مقبول اور ترقی دینا تھا۔ ڈھاکا کے علمی اور شاعرانہ حلقوں میں ان کی رسائی ہو چکی تھی۔ پروفیسر صلاح الدین محمد نے بنگلہ ناول کو اردو میں بہت اچھا ترجمہ کیا تھا۔ ان ہی کے مشورے پر اس فلم کے گانے، اسکرین پلے اور مکالمے لکھنے کی ذمے داری سرور بارہ بنکوی کو سونپ دی گئی۔ فلم کا نام ''تنہا'' منتخب کیا گیا۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ میں نے کبھی فلم کا اسکرپٹ، نغمات اور مکالمے نہیں لکھے۔ لیکن سب دوستوں کے اصرار پر سرور صاحب نے ''تنہا'' کا اسکرپٹ اور نغمات لکھے۔

کاغذی تیاریاں مکمل ہونے کے بعد اداکاروں کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ کلکتہ سے جو اردو بولنے والے ڈھاکا آئے تھے ان میں ایسے لوگ کافی تھے جو بہت اچھی اردو بول سکتے تھے۔ دراصل کلکتہ ایک بہت بڑا شہر تھا جس میں سارے ہندوستان بھر کے لوگ سمائے ہوئے تھے۔ دراصل قائداعظم کے منصوبے کے مطابق کلکتہ کو پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ کیونکہ ابتدائی پلان کے مطابق اکثریت والے پورے صوبے پاکستان یا ہندوستان میں شامل ہونے تھے لیکن پنڈت نہرو نے عین وقت صوبوں اور ضلعوں کی تقسیم کا بھی مطالبہ کروایا۔ کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قائداعظم نے یہ لولا لنگڑا پاکستان قبول ہی کیوں کیا تھا۔ انہیں یہ تجویز مسترد کردینی چاہیے تھی مگر قائداعظم جانتے تھے کہ انگریز حکومت نے برصغیر سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے اور وہ جلد سے جلد ہندوستان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ اگر قائداعظم اپنی بات پر اڑ جاتے تو یہ مسئلہ اٹک کر رہ جاتا اور انگریزوں کے پاس مزید مذاکرات کرنے کا وقت اور مہلت نہ تھی۔ یوں تو فلم اسکرپٹ سرور بارہ بنکوی نے لکھا تھا مگر چونکہ وہ فلم کی تکنیک سے بخوبی واقف نہ تھے اور اسکرپٹ لکھنے کا ان کے لیے پہلا موقع تھا اس لیے بے بی اسلام نے اسکرپٹ پر بذات خود نظرثانی کی اور فلم کا منظرنامہ اور

مکالمے خود لکھے۔ سرور صاحب ایک صاحب علم اور ذہین انسان تھے اس لیے بہت جلد انہوں نے فلم کے اسکرپٹ لکھنے پر عبور حاصل کرلیا بلکہ "استاد" کہلائے جانے لگے۔

اداکاروں کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو سرور صاحب ہارون کو ہیرو کے طور پر کاسٹ کرنے کے حق میں تھے۔ ہارون میں فلمی ہیرو والی تمام خوبیاں تھی۔ وہ خوبصورت مرد اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ۔ بہت اچھا ناک نقشہ، کھلتا ہوا رنگ۔ بات کرنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس وقت فلم "تنہا" کے لیے ہارون سے بہتر اداکار دستیاب نہیں تھا۔ سرور صاحب کے کلکتے کے زمانے سے ہارون اور اس کے خاندان سے ساتھ بہت مراسم تھے۔ کلکتہ میں ہارون کے والد کا اسٹیل کا بہت وسیع کاروبار تھا۔ جب وہ ڈھاکا آئے تو اسی کاروبار سے وابستہ رہے۔ ڈھاکا میں انہیں "آئرن کنگ" کہا جاتا تھا۔ بے پناہ دولت مند اور بہت وسیع تعلقات رکھنے والے بااخلاق انسان تھے۔

سرور صاحب نے جب ہارون کے سامنے فلم کا تذکرہ چھیڑا اور اس کو فلم کا ہیرو بننے کی دعوت دی تو ہارون نے انکار کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے والد اور گھر والے رضامند نہ ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے کاروبار میں بہت زیادہ مصروف تھا چونکہ ڈھاکا میں نئے سرے سے اسٹیل انڈسٹری قائم کرنی تھی لیکن سرور صاحب کہاں ماننے والے تھے۔ اپنی پرکشش گفتگو اور گھریلو مراسم کے ذریعے انہوں نے ہارون کو بالآخر فلم "تنہا" کا ہیرو بننے پر رضامند کرلیا۔ جس وقت مشرقی پاکستانی فلموں کی تاریخ لکھی جائے گی تو وہاں کی پہلی اردو فلم "تنہا" کے ہیرو کے طور پر ہارون ہی کا نام لکھا جائے گا۔

فلم کی ہیروئن کے لیے سرور صاحب نے شمیم آرا کو رضامند کرلیا۔ وہ ان دنوں لاہور کی فلموں میں بہت مصروف تھیں مگر سرور صاحب کی خوش بیانی نے انہیں بھی شیشے میں اتارلیا۔ کراچی سے اداکار (اور ہدایت کار) شیخ حسن اور نینا کا انتخاب کیا۔ دیگر فن کار ڈھاکا ہی سے لیے گئے تھے۔ کہنے کو تو تنہا کے مصنف اور ہدایت کار بے بی اسلام تھے لیکن مشورے سرور بارہ بنکوی کے چلتے تھے۔ ہم ان دنوں شمیم آرا کی ایک فلم کا اسکرپٹ لکھ رہے تھے اس لیے ہم بھی ڈھاکا جاکر شاہ باغ ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ شمیم آرا صبح سے رات تک فلم کی شوٹنگ میں مصروف رہتی تھیں اور ہم ہوٹل میں بیٹھے اسکرپٹ لکھتے رہتے یا پھر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ گپ شپ کرتے رہتے تھے۔ بنگالی صحافیوں اور ادیبوں سے ہمارے گہرے مراسم ہوگئے تھے۔ فلمی حلقوں میں بھی کافی دوستیاں ہوگئی تھیں۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا۔ شام کو شمیم آرا شوٹنگ سے فارغ ہوکر آتیں تو فلمی شخصیات کی جانب سے دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تنہا کی تکمیل میں توقع سے زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ اس لیے فلم کے بارے میں لوگوں کی دلچسپی کم ہوگئی تھی۔ "تنہا" ایک ترقی پسند خیال پر بنائی گئی تھی۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کو عموماً پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ شہرت بھی "تنہا" کے لیے کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس سے پہلے ڈھاکا میں اے جے کاردار کی فلم "جاگو ہوا سویرا" بن کر دنیا بھر میں مشہور ہوچکی تھی اور فلم کے مکالمے اور نغمات (غالباً صرف دو گانے تھے) فیض صاحب نے ہی لکھے تھے لیکن "جاگو ہوا سویرا" دراصل مغربی پاکستان کی فلم تھی۔ فن کار دونوں جگہوں کے اس میں شامل تھے۔ یہ مچھیروں کی زندگی، غربت اور مجبوریوں کے بارے میں تھی۔ فلم کے برطانوی کیمرا مین نے عکاسی بھی بہت اچھی کی تھی اور صحیح معنوں میں ایک عالمی معیار کی فلم تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کی پہلی اردو فلم کا اعزاز "تنہا" کو ہی حاصل ہے۔ اس فلم کے آغاز سے حوصلہ پاکر کلکتہ سے ڈھاکا آنے والے دوسرے تجربے کار اور ہنرمندوں نے بھی فلم سازی شروع کردی۔ ظہیر ریحان کی رنگین فلم "سنگم" "تنہا" سے پہلے ہی نمائش کے لیے پیش کی جاچکی تھی مگر اولیت کا اعزاز "تنہا" کو ہی حاصل ہوا۔ اسی دور میں نذرالاسلام اور دوسرے تجربے کار لوگ بھی ڈھاکا پہنچ چکے تھے اور اردو فلمیں بنانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ہارون اپنی کاروباری مصروفیات اور عدم دلچسپی کے باعث زیادہ عرصے تک فلموں میں اداکاری نہ کرسکے "تنہا" نے درمیانی بزنس کیا تھا۔ ہارون نے ڈھاکا کی پانچ فلموں میں اداکاری کرنے کے بعد اداکاری کو خیرباد کہا۔ ہارون کی فلموں میں "یہ بھی ایک کہانی" اور "کارواں" بھی شامل ہیں۔ پہلی فلم تو ناکام ہوگئی مگر فلم "کارواں" کی شوٹنگ نیپال میں کی گئی تھی اس لیے پسند کی گئی۔

ہارون کی آخری فلم "آخری اسٹیشن" تھی جس میں شبنم نے ایک بنگالی لڑکی کا کردار بہت ہی خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ یہ فلم صحیح معنوں میں بین الاقوامی معیار کی فلم تھی اس

کے فلم سازوں میں سرور بارہ بنکوی، خان عطا الرحمٰن، ایم ہے حسن شامل تھے۔ آخری اسٹیشن، کی کہانی اردو کی معروف ناول نویس ہاجرہ مسرور کے ناول "آخری اسٹیشن" سے اخذ کی گئی تھی۔ آخری اسٹیشن، 1965ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ آخری اسٹیشن میں رومانی کردار رانی اور ہارون نے ادا کیے تھے لیکن فلم کی کہانی کے مرکزی کردار شبنم اور بنگال کے اداکار اکبر تھے۔ افسوس یہ ہے کہ اتنے عرصے قبل ایک انوکھے موضوع پر فلم بنانے والے سرور بارہ بنکوی کے اس کارنامے کو سراہا نہیں گیا۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ فلم حقیقت پسند تھی جس میں بنگلہ دیش کی حقیقی زندگی کی عکاسی کی گئی تھی۔ ملک کی بدنامی کے بہانے اس فلم کو سنسر نے کاٹ چھانٹ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری حکومت اور سنسر بورڈ کی پالیسی ہمیشہ ناقابل فہم رہی ہے۔ ریاض شاہد نے "امن" کے نام سے مقبوضہ کشمیر کے بدنصیب اور مظلوم لوگوں کے حق میں فلم بنائی تو سنسر نے اس پر پابندی عائد کردی۔ کافی قطع برید کے بعد اس فلم کو "یہ امن" کے نام سے پیش کیا گیا مگر اس فلم کی روح نکل چکی تھی۔ سرور بارہ بنکوی کی فلم "آخری اسٹیشن" کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ پھر جاگو ہوا سویرا، کو سنسر کے غیر پاس کیوں کردیا گیا۔ یہ کہانی بھی پاکستان میں غربت کی داستان تھی مگر اسے عالمی میلوں میں فخر سے پیش کیا گیا۔

اداکارہ بشریٰ انصاری کے والد ادیب اور صحافی احمد بشیر نے ممتاز مفتی کی کہانی پر مشتمل فلم "نیلا پربت" بنائی تھی۔ اس فلم پر فحاشی کے علاوہ اور بھی الزامات لگا کر چار بار سنسر کیا گیا اور اس کا حلیہ بدل دیا گیا۔ اس فلم میں محمد علی، حسنہ، جمال ایرانی اور آغا طالش اہم اداکار تھے لیکن دراصل فلم کا مرکزی کردار آغا طالش تھے جنہوں نے فلم میں لاجواب اداکاری کی تھی۔

ہم ہماری حکومتی اور سنسر پالیسی کو عجوبے ہی کہہ سکتے ہیں۔ سنسر کے اس رویے کے باعث پاکستانی فلم سازوں نے مختلف اور حساس موضوعات پر فلمیں بنانے سے توبہ کرلی۔ اس کے برعکس انڈیا میں پاکستان کے خلاف کھلم کھلا پروپیگنڈا اور قابل اعتراض فلمیں بنتی رہیں مگر ہماری حکومت نے یہ پالیسی نہیں بدلی۔ اس سے پہلے خلیل قیصر کی فلم "شہید" پر بھی بہت اعتراضات کیے گئے تھے۔ اعتراض یہ تھے کہ ان فلموں کی وجہ سے پاکستان کے خارجہ

سرور بارہ بنکوی

تعلقات برطانوی حکومت کے ساتھ خراب ہوجائیں گے۔ کتنی ستم ظریفی کی بات ہے کہ پاکستانی فلم سازوں، ہدایت کاروں اور لکھنے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔

☆☆☆

آج کل جبکہ کلاسیکی موسیقی اور سازندے ناپید ہوتے جارہے ہیں، استاد فقیر حسین سارنگی نواز کا دم غنیمت ہے۔ ناصر کاظمی نے کہا تھا

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی کے زمانے میں یہ ممکن تھا لیکن آج کے دور میں کسی ہنرمند، فن کار اور شاعر و ادیب کے جانے کے بعد اس کا نعم البدل ہی نظر نہیں آتا۔ یہ ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ ایک تصور ہے کہ کسی شخص کے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ کوئی اور اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ جو لوگ خود کو ناگزیر سمجھتے اور کہتے ہیں وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ ناگزیر لوگوں سے دنیا کے قبرستان بھرے ہوئے ہیں اور دنیا کا کاروبار اسی طرح چل رہا ہے۔

استاد فقیر حسین سارنگی نوازی میں کمال رکھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کل ان کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا سارنگی نواز نظر نہیں آتا۔ ہوسکتا ہے اللہ کی مہربانی سے اچانک ایک نہیں، کئی سارنگی نواز منظر عام پر آجائیں۔ ہمارے ملک میں فن اور فن کاری کی قدردانی اور سرپرستی نہ تو حکومت کرتی ہے، نہ کوئی ثقافتی سرکاری ادارے اور نہ ہی کوئی صاحبِ ذوق۔ اگلے زمانے میں راجا مہاراجا اور نواب جنہیں ہم برا کہتے اور سمجھتے ہیں وہ کھیلوں اور فنونِ لطیفہ کی قدردانی کرتے تھے اور اہلِ کمال فنکاروں کو مالا مال کردیتے تھے۔ راجوں مہاراجوں کے زمانے کی خامیاں اپنی جگہ لیکن اہلِ فن اور اہلِ ہنر لوگوں کو وہ اس طرح نوازتے تھے کہ ہر طرف سے بے نیاز کردیتے تھے۔

استاد فقیر حسین ریڈیو پاکستان کے کلاسیکی پروگرام "آہنگِ خسروی" میں حصہ لے کر نمایاں ہوئے۔ سارنگی ایک مختصر سی گردن رکھنے والا ساز ہے لیکن اس چھوٹے سے ساز کو جب کوئی ہنرمند استعمال کرتا ہے تو سننے والوں پر سحر طاری کردیتا ہے۔ سارنگی دراصل مشرق اور جنوبی ایشیا کا ساز ہے۔ مثلاً نیپال، پاکستان، ہندوستان میں اسے بہت پسند کیا جاتا ہے اور کئی ہندوستانی اور پاکستانی سارنگی نوازوں نے عالمی شہرت پائی اور بہت عزت حاصل کی۔ سارنگی میں تار ہوتے ہیں جنہیں انگلیوں سے چھیڑ کر سارنگی نواز مختلف قسم کی موسیقی پیدا کرتا ہے۔ پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ یہاں متعدد نامور اور ہنرمند سارنگی نوازوں نے جنم لیا جن میں استاد نبی بخش خاں، استاد نتھو خاں، استاد غلام محمد خاں، استاد ناظم علی خاں، استاد وحید رنجش بالوے خاں، استاد شرف الدین خاں، استاد غلام حسین جو کچھ عرصہ قبل ڈھاکا میں انتقال کر گئے جہاں وہ تقاریب میں حصہ لینے گئے تھے۔ استاد چھیرو خاں، استاد اللہ رکھا خاں، (جو آج بھی ریڈیو پاکستان سے سارنگی نوازی کرتے ہیں) استاد بندو خاں وغیرہ۔ مذکورہ بالا سارنگی نوازوں نے اس فن کے ماہرین کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ ان سب کا انداز مختلف تھا۔ استاد غلام محمد کی سارنگی میں بہت زیادہ مٹھاس تھی۔ ان سب سارنگی نوازوں نے ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم کے ساتھ سنگت کی ہے۔ استاد نزاکت علی خاں، سلامت علی خاں کے ساتھ بھی نامور سارنگی نوازوں نے سارنگی کا جادو جگایا۔

ہندوستان میں جن سارنگی نوازوں نے نام پیدا کیا ان میں استاد بڑے صغیر الدین خاں (کلکتہ والے) استاد شکور خاں، پنڈت رام نرائن، استاد سلطان، پنڈت گوپال مسرا بنارس والے۔ کانپور کے استاد غلام صابر خاں اور ان کے استاد بڑے صابری خان، استاد سلطان خاں نے بھی اس شعبے میں بہت نام پیدا کیا۔ استاد سلطان خاں نے فلموں میں بھی سارنگی نوازی کی۔ موسیقار خیام کی فلم امراؤ جان ادا کے نغمات میں ان ہی کی سارنگی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ فلم سے اتنے متاثر ہوئے کہ گلوکار بن گئے۔ ان کا ایک البم بھی زیرِ تکمیل ہے۔ ان کا گایا ہوا نغمہ "پیا بسنتی رے" بہت مقبول ہوا۔ استاد سلطان علی خاں کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شہزادہ چارلس، جارج مائیکل، گولڈی ہان، جارج ہیری سن جیسی شخصیات ان کی مداح ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے ان کی سارنگی نوازی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہالی ووڈ کے معروف گلوکاروں نے بھی استاد اکبر علی خاں، ذاکر حسین اور پنڈت روی شنکر کے فن سے استفادہ کیا ہے۔ میڈونا کے علاوہ چند اور مشہور ہالی ووڈ کے گلوکاروں اور موسیقاروں نے بھی ان لوگوں کے ساتھ کام کیا۔ مشرق اور مغرب کے سازوں کی آمیزش سے جو نتیجہ سامنے آیا اس کو یورپ و امریکا میں بھی پسند کیا گیا اور برصغیر میں بھی اس کو سراہا گیا۔ استاد نصرت علی خان نے بھی مغربی موسیقاروں، گلوکاروں اور سازندوں کے ساتھ مل کر ایسے کامیاب تجربات کیے تھے کہ اہلِ مغرب تو ان کے دیوانے ہوگئے تھے۔

سارنگی ہندوستان کا ساز ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق سارنگی راون کے زمانے میں ایجاد ہوئی تھی۔ راون شیو دیوتا کا بہت عقیدت مند اور پجاری تھا۔ راون نے جوشِ عقیدت میں اپنے جسم کی رگوں کی مدد سے سارنگی بنائی تھی۔ وہ شیو دیوتا کو خوش کرنے کے لیے جو بھجن گاتا تھا اس میں سارنگی کو ساز کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا کہنا ہے کہ سارنگی ایک خالص اسلامی ساز ہے جس کی ایجاد بھی مسلمانوں ہی نے کی ہے۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو ہندوؤں کے دوسرے عقیدوں کے مطابق سارنگی کو راون سے منسوب کرنا کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ ایک طرف تو ہندو راون سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اس کے پتلے جلاتے ہیں کیونکہ خود ہندو عقیدے کے مطابق راون ہی رام چندر جی کی محبوب بیوی سیتا کو بھگا کر لے گیا تھا۔ سیتا کو بارہ سال راون کے ساتھ رہنا پڑا لیکن ہندوؤں کا عقیدہ ہے

فلمی دنیا میں 62 سالہ کنٹری بیوشن پر علی سفیان آفاقی کو خراج

کسی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کیلئے مرنے کا انتظار کیا جاتا ہے، مجھے زندگی میں اعزاز دیا گیا، علی سفیان آفاقی

راون کے پاس رہ کر بھی سیتا پاکیزہ اور پارسا رہی تھی۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کسی اور شخص کی بیوی کو کوئی اس کے شوہر سے چھین کر لے اڑے مگر اس کی جسمانی رعنائی اور خوبصورتی کے باوجود اس کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ تو پھر راون کو سیتا کو بھگا کر لے جانے کا مقصد کیا تھا۔ اگر اسے دیوی سمجھ کر سیتا کی پوجا ہی کرنی تھی تو اس کو بھگا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہندو مذہبی کتابوں میں درج واقعات اور داستانوں کی طرح یہ بھی ایک ناقابل یقین کہانی ہے۔ راون کو ہندو ولن اور شیطان صفت انسان سمجھتے ہیں جبکہ سری لنکا والوں کے نزدیک راون ان کا ہیرو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سیتا جی اپنی مرضی سے راون کے ساتھ گئی تھیں۔ اتنی مدت تک جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے کے بعد بھی ان دونوں کا رشتہ پاکیزہ اور بے داغ کیسے ہو سکتا تھا۔ سری لنکا کی آبادی کی اکثریت سینالی قوم پر مشتمل ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سری لنکا کے باشندے بھی ہندو ہیں حالانکہ یہ درست بات نہیں ہے۔ سری لنکا والوں سے بھارت کی نفرت اور دشمنی بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے۔ سری لنکا اور بھارتی صوبے تامل ناڈو کے درمیان ایک مقام پر صرف 25 میل کا فاصلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سری لنکا میں تاملوں نے بغاوت کی تو انہیں اسلحہ اور فوجی امداد تامل ناڈو سے ہی فراہم کی جاتی تھی۔ بعد میں باغیوں کو کچلنے کے بہانے ہندوستان کی فوج نے سری لنکا میں مقامی آبادی پر بہت ظلم ڈھائے تھے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔

دراصل سارنگی کی دریافت ایران میں ہوئی تھی۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی سارنگی استعمال کی جاتی تھی۔ آغاز میں اس کو استادوں کا استاد ساز کہا جاتا تھا۔ سارنگی بھی ستار کی طرح ایک بہت شیریں آواز والا ساز ہے۔ ستار کی ایجاد کو حضرت امیر خسرو سے بھی منسوب کیا جاتا ہے جو موسیقی سے بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اور بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے کئی ساز اور راگ بھی ایجاد کیے تھے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جب ہندوستانی اور پاکستانی سازندے اور موسیقاروں نے یورپ جانا شروع کیا تو ان کی موسیقی کو بہت پسند کیا گیا۔ پاکستانی فنکاروں نے یورپ اور امریکا میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ برطانوی خصوصاً برصغیر کی موسیقی کے بہت دلدادہ تھے۔ راگ، تان، طبلہ، سارنگی اور ستار انگریزوں کو بہت مرغوب تھے۔ اب تو کلاسیکی موسیقی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ ٹیلی وژن اور ریڈیو نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ ہمارا پی ٹی وی جو کہ قومی ادارہ ہے اس نے کلاسیکی اور ایسی موسیقی کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ پوپ میوزک ہی ہماری قومی موسیقی ہے۔ دن رات اوٹ پٹانگ پوپ گانے اور گانے والوں کی اچھل کود بڑے اہتمام سے پیش کی جاتی ہے۔ اگر کلاسیکی موسیقی پیش بھی کی جاتی ہے تو بہت رات گئے۔ شاید اس لیے تاکہ عوام اس سے لطف اندوز نہ ہو سکیں اور رفتہ رفتہ اس کو فراموش ہی کر دیں۔ کلاسیکی موسیقی کو نظرانداز کرنے کے اس زمانے میں استاد فقیر کا دم بہت غنیمت ہے۔ انہوں نے استاد غلام شبیر سے تربیت حاصل کی تھی۔ وہ بہت سے راگوں کے ماہر ہیں۔ استاد فقیر کے والد بھی ایک سارنگی نواز تھے۔ ان کا نام خیر دین تھا۔ استاد خیر دین کے والد یعنی فقیر الدین کے دادا بھی سارنگی نواز تھے۔ استاد فقیر دین نے غیر ممالک میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے چین، سنگاپور، جاپان، اور ملیشیا میں بھی پروگراموں میں حصہ لیا اور داد و تحسین حاصل کی۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے تو یوں تو سبھی ساز میٹھے اور پرکشش ہوتے ہیں لیکن ستار، سارنگی اور بانسری کی بات ہی الگ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کوئی موسیقار جب اپنی طرز میں ستار، سارنگی یا بانسری کی آواز شامل کر دیتا ہے تو اس کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ یوں تو سبھی نامور موسیقاروں نے ان سازوں کو اپنی طرزوں میں استعمال کیا ہے لیکن خواجہ خورشید انور نے بانسری کا استعمال برمحل اور نہایت حسین انداز میں کیا ہے، وہ اچھوتا ہے۔

ہندوستان کے سارنگی نواز بسم اللہ خان کی سارے زمانے میں دھوم تھی۔ وہ بنارس کے رہنے والے تھے اور بنارس کے لوگ اس پر فخر کرتے تھے۔ انہوں نے ساری دنیا میں سارنگی نوازی کا مظاہرہ کیا اور داد پائی۔ گزشتہ سال جب ان کا انتقال ہوا تو سارے ہندوستان میں ان کا سوگ منایا گیا۔ بنارس میں تو تین دن تک ہڑتال کی گئی۔ ان کی تدفین کے موقع پر مسلمان اور ہندو سب ہی شریک تھے۔ افسوس کہ سارنگی اور دوسرے کانوں کو بھلے لگنے والے سبھی ساز اور کلاسیکی موسیقی ایک جانے بوجھے منصوبے کے تحت ختم کی جا رہی ہے اور ہم خاموش تماشائی ہیں۔

جاری ہے

سیفٹی ریزر

اختر شہاب

یہ ایک ایسا آلہ ہے جو آج بہت زیادہ گھروں میں استعمال ہو رہا ہے۔ ہر بڑی کمپنی کروڑوں کی تعداد میں ایسے ریزر روزانہ کی بنیاد پر تیار کرکے بازار۔ ۔ میں بھیجتی ہیں۔ اس قسم کے آلے کی کیا تاریخ ہے۔ ایک مختصر سا جائزہ۔

ایک دلچسپ سی تحقیقی تحریر

شیونگ میٹریل بنانے والی دنیا کی بڑی اور اولین کمپنیوں میں سے ایک کمپنی میں صحافیوں کی ایک جماعت کے ہمراہ میں بھی آئی تھی اور ہمیں جو معلومات دی جا رہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ معلومات کا جو ایک دریا بہایا جا رہا تھا وہ ہمیں محو حیرت کر رہا تھا۔ یہ معلومات اس کمپنی کا نمائندہ ہمیں دے رہا تھا جس کے لیے اس کی صنعتی معلومات کی مخبری یا اس کے راز افشا ہونا اس کمپنی کے لیے ایٹمی حملے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ ہمیں معلومات فراہم کر رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ وہ معلومات تھیں جن کے افشا ہونے سے ان کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ 2006ء کے اواخر میں اس کمپنی نے 5 بلیڈ والا ریزر فیوژن محض دو مہینوں میں یورپین اور آسٹریلین مارکیٹ میں لانچ کر کے بہت بڑا جوا کھیلا تھا مگر عوام کی طرف سے اسے بھرپور پذیرائی ملی۔ شیونگ کی گلوبل مارکیٹ ایک اندازے کے مطابق 9 بلین ڈالرز سے زائد ہے اور انڈیا اور چائنا میں اس مارکیٹ میں مزید اضافے کا امکان ہے۔

کیلی داس نے جو کمپنی کی گلوبل کمیونیکیشن کی ڈائریکٹر ہے انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری کمپنی میں ملازموں کو نوکری سے جلد فارغ کرنے کا رواج نہیں ہے۔ آپ کی جس سے بھی ملاقات ہوگی وہ یہاں کے پرانے ملازم ہوں گے۔ 895 ملازموں نے زندگی کے 13800 سال اس کمپنی کو دیے ہیں۔

ان میں سے بہت سوں کو 1975ء سے 1987ء تک کے وہ سیاہ دن بھی یاد ہیں جب ڈسپوزیبل بلیڈوں کی اچانک آمد نے کمپنی کی شہرت کو گہنا دیا تھا اور مارکیٹ میں اس کی برتری کو 45 فیصد کم کردیا تھا لیکن پھر ہم نے سنبھالا لیا اور 1990ء میں سنسر نامی بلیڈ متعارف کرایا جو دو بلیڈ کا حامل پہلا ریزر تھا جس کے ہیڈ میں اسپرنگ موجود تھا۔ اس نے شیونگ کی دنیا میں ایک نیا ٹرینڈ سیٹ کردیا۔ ایک بزنس تجزیہ نگار نے سنسر کی لانچ کو کاروبار کی دنیا کی تاریخ میں سب سے کامیاب پیش کش قرار دیا۔

داڑھی مونڈنے کی تاریخ بہت پرانی ہے 3000 قبل مسیح میں چقماق کے تیز پتھر اور تیز دھار سیپیاں مردوں کے چہرے اور جسم کے بال صاف کرنے میں استعمال ہوتے تھے۔ گو کہ یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا مگر لوگ جاذب نظر دکھائی دینے کے لیے اس عمل کو انجام دیتے تھے جس سے چہرے کی جلد چھل جاتی تھی اور نشوز ابھر آتے تھے، چہرے پر خون کی رنگت ابھر آتی تھی اور اس دور میں اس کو مردانہ خوبصورتی کہا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے 323 ق م میں سکندر اعظم نے اپنی فوجوں کو کلین شیو کرنے کا حکم دیا تاکہ جنگ کے دوران مخالف فوجی انہیں داڑھی سے پکڑ کر نہ کھینچ سکیں۔ یہ فیشن بڑھنے لگا تو 300 قبل مسیح میں روم میں پیشہ ور حجاموں نے اپنی دکانیں کھول لیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آلات بھی بدلتے رہے تیز دھار والے پتھروں اور سیپیوں کی جگہ تیز چاقوؤں نے لے لی۔

1762ء میں فرانسیسی حجام جین جیکس پیریٹ نے پہلا سیفٹی گارڈ ریزر متعارف کرایا۔ جسے عرف عام میں ہم استرا کہہ سکتے ہیں مگر اس کی دھار تیز رکھنے کا راز صرف اس کے خاندان تک محدود تھا 1847ء میں ولیم ایس ہینسن نے کنگھی کے دانتوں جیسی پکڑ والے آلے کی ایجاد کرکے اسے رجسٹرڈ کرایا۔ ان دانتوں کے درمیان تیز دھار جا پھنسائی جا سکتی تھی اسے سیفٹی ریزر کا نام دیا۔ پھر 1880ء میں مزید ایک قدم بڑھا، مگر 1880ء میں فیڈرک اور اوٹو کمپن آف بروکلین نے اسے مزید بہتر بنا کر پیش کیا۔ پھر 1801ء میں ولکنسن سورڈ جسے شیک بھی کہا جاتا تھا۔ شاہ جارج سوئم کو تیز دھار شیونگ فراہم کرکے شیونگ میٹریل سپلائی کرنے والے پہلے سوداگر کا اعزاز حاصل کرلیا مگر اب بھی شیونگ ایک تکلیف دہ عمل تھا، جلد چھل جاتی تھی، نشوز ابھر آتے تھے۔ پھر کسی نہ معلوم شخص نے جھاگ لگا کر شیو کرنے کا تجربہ کیا اور یہ تجربہ ہر دل عزیز ہوگیا۔ 1870ء تک شیونگ صابن اور آفٹر شیو لوشن گھر گھر استعمال ہونے لگے تھے۔ 1878ء تک تیز دھار کی اکی پتی (بلیڈ) استعمال ہورہی تھی جسے بار بار بدلنا پڑتا تھا۔ اسی دوران امریکن ایور ریڈی کمپنی نے ایسی پتی پیش کی جس کی دھار دیرپا تھی۔ جیم کٹلری کمپنی نے ''جیم'' کے نام سے مزید دیرپا دھار کی پتی ایجاد کرلی۔ اسی دوران شیک ریزر کمپنی نے 1920ء کو خود سے بدلنے والا بلیڈ ایجاد کرلیا جس کے دونوں طرف دھار تھی۔

1895ء میں امریکا میں سلفری میلز مین کنگ کیمپ جلیٹ نے ایک ڈسپوزایبل ریزر بنایا جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی تجربے کی بنیاد پر 1920ء میں جرمنی میں حجاموں نے شیونگ سوپ میں تیل یا کریم ملا کر شیو کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اسے رولز رائس شیونگ کا نام دیا تھا جو صرف امراء کے لیے مختص تھا وہ کنگ کیمپ جلیٹ کے ریزر ہی استعمال کرتے تھے۔ اس کمپنی کے ریزر پوری دنیا میں مقبول تھے۔ کئی دیگر کمپنیوں نے بھی ریزر بنانے کی شروعات کردی تھی پھر بھی اس کمپنی کی مقبولیت کسی طور کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

بازار میں مقابلہ شروع ہوا تو کمپنی نے تجربات کا دائرہ بڑھا دیا۔ کئی ایک قسم کے ریزر بنائے مگر اسٹین لیس اسٹیل بلیڈ اپنی افادیت کی وجہ سے جزلاینک رہا۔ ان تجربات کو کامیابی عطا کرنے کے لیے 1932ء میں انہوں نے نیلے رنگ کا بالتو ریزر متعارف کرایا جس نے خریداروں کو مداح بنالیا پھر 1956ء میں اسٹین لیس اسٹیل بلیڈ متعارف کرایا پھر 1970ء میں دیر پا ٹیکنسن بلیڈ متعارف کرایا پھر 1971ء میں GII ریزر متعارف کرایا۔

1977ء میں کمپنی نے کنٹور نامی پہلا دھرے والے بلیڈ مارکیٹ میں لاکر دھوم مچادی اور 1990ء میں جب سنسر متعارف ہونے سے ماڈرن شیو کا دور شروع ہوا۔

1992ء میں شیک نے پروٹیکو نامی ریزر لانچ کیا اور 1995ء میں جلیٹ نے ماخ 3 لانچ کیا پھر 2000ء میں جلیٹ نے فیوژن متعارف کرایا۔ اس طرح جلیٹ نے اپنا کھویا ہوا اعزاز پھر سے حاصل کرلیا۔

جلیٹ ہر سال اور کبھی کبھی سال میں کئی کئی بار صحافیوں کو بلا کر پریس شو کا انعقاد کرتی ہے۔ اس بار میں بھی شو میں شریک ہونے کے لیے اپنے اخبار کی طرف سے آئی تھی۔

☆☆☆

شیونگ کمپنی کے مرکزی ہال میں داخل ہونا اور اس میں پہنچنا ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹی وی کے ''ون مین شو'' کے تماشائیوں میں شامل ہوں۔ آدھے گھنٹے کے اسکٹ کامیڈی پروگرام میں انہوں نے عورتوں کی بجائے مردوں کو ہی تضحیک کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد ہمیں بہت تیزی سے فیکٹری کے اسٹیل کی دیواروں سے گھرے ہوئے ایک سیکشن میں لے جایا گیا تاکہ ہم سب سے زیادہ بکنے والے ریزر کو بنتا ہوا دیکھ سکیں۔ ماخ 3 مارکیٹ میں لانچ ہونے کے بعد صرف 7 سالوں میں 9 بلین ڈالر سے زائد میں فروخت ہوا۔

کاسترو نے ہمیں بتایا ''جلیٹ کمپنی ہر سال اسٹیل کے اتنے لچھے استعمال کرتی ہے جسے کرۂ ارض کے گرد 20 مرتبہ لپیٹا جاسکتا ہے۔'' اس کے بعد ہمیں وہاں لے جایا گیا جہاں ہاتھ روم میں اچھے صحت مند ٹیسٹر حضرات صابن لگائے مضحکہ خیز شکلیں بنائے دو انجان ریزروں سے شیو کررہے تھے تاکہ وہ ان کی کوالٹی کو جانچ سکیں۔ ایک اچھے ریزر میں 60 کے قریب خوبیاں ہونی چاہئیں مثلاً ریزر گالوں پر آرام سے پھسلتا ہوا چلے، شیونگ بلیڈ کا سرا آرام اور تیزی سے حرکت کرے۔ چہرے کی ناہموار جگہوں پر کٹ لگائے بغیر شیو کرسکے۔ شیو کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے سے چہرہ چکنا محسوس ہو اور بال کی سختی غائب ہو وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ٹیسٹر حضرات شیو کے بعد اس ریزر کی خوبیوں اور خامیوں کو سامنے رکھ کے کمپیوٹر میں فیڈ بھی کررہے تھے۔ کمپنی نے ان ماہرین سے 9000 سے زائد ٹیسٹ کرائے اور ان ماہرین نے فیوژن پر ماخ 3 کو ترجیح دی۔

ڈاکٹر ہزرڈ چک جو جلیٹ شیونگ ٹیکنالوجی میں وائس پریذیڈنٹ ہیں اور ان کے پاس مکینکل اور ٹیکنیکل انجینئرنگ کی ڈگری ہے۔ اس وقت تازہ تازہ شیو کرکے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ریزر کی کارکردگی محض بلیڈوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہوتی اس کی چند اور بھی وجوہات ہیں۔ وہ کیا وجوہات ہیں انہوں نے یہ راز ظاہر کرنے سے گریز کیا۔ انہوں نے ہمیں 1930ء کی ایک ملٹی بلیڈ ریزر کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا ''فیوژن ٹیکنالوجی کو 70 سے زائد پیٹنٹ سے محفوظ کیا گیا ہے ان میں سے کچھ منظور ہوگئے ہیں اور کچھ زیر غور ہیں۔''

''آپ شاید سمجھ رہے ہیں کہ پانچ بلیڈ کا ریزر کوئی نئی بات ہے۔ جی نہیں! یہ کوئی نیا آئیڈیا نہیں ہے۔'' ہزرڈ چک

سنگل بلیڈ: آج کل ڈسپوزیبل میں ملتا ہے۔ بہت جلدی کند ہوجاتا ہے۔ حساس جلد والوں کو کٹ شیو ملتی ہے۔

ڈبل بلیڈ: برطانیہ کے اخبارات میں آیا ہے کہ 93 سالہ جارج طرجلیٹ کا 1929ء کا بنایا ہوا سیفٹی ریزر ابھی تک استعمال کررہا ہے۔ یعنی قابل اعتماد ہے۔

تھری بلیڈ: ماخ 3 پہلا بلیڈ ہے جس میں تیز دھار والی پتیاں استعمال ہوئی ہیں۔ بلیڈ کا دھرا اس کے نچلے حصے میں ہے جو بلیڈ کو پینٹ برش کی طرح استعمال کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

چار بلیڈ کواٹرو اور شک کمپنی کے بلیڈوں کی فروخت 800 ملین ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔

ہائی بلیڈ اس میں ماخ 3 کی نسبت 30 فیصد نزدیک بلیڈ لگایا گیا ہے بلیڈوں کے نزدیک ہونے کے سبب شیو کرتے وقت شیونگ کی طاقت برابر تقسیم ہوتی ہے۔ اس کے نیچے ایک چھوٹا بلیڈ بھی ہے جو رواں صاف کرنے کے کام آتا ہے۔

☆☆☆

○ عام آدمی اپنی زندگی میں 20,000 مرتبہ شیو کرتا ہے۔ یوں وہ آئینے کے سامنے 3000 گھنٹے کھڑا ہوتا ہے۔

○ 90 فیصد سے زائد نوجوان چہرے پر آنے والے بالوں کو تراشتے رہتے ہیں۔ خواہ مونچھیں ہوں، ٹھوڑی یا گال کے بال ہوں یا ٹھوڑی اور ہونٹوں کے درمیان والی جگہ کے بال ہوں۔

○ مرد سالانہ 90 بلین ڈالر شیو پر خرچ کرتے ہیں۔

○ اپنی پوری زندگی میں انسان چہرے کے جو بال صاف کرتا ہے اگر ان کی لمبائی ناپی جائے تو وہ 8 میٹر طویل ہوگی۔

○ امریکا میں سب سے زیادہ چوری جلیٹ کے ماخ 3 بلیڈ کی ہوتی ہے۔

☆☆☆

نے بتایا۔ ”ہم اس ٹیکنالوجی پر تقریباً 10 سال سے کام کررہے ہیں۔ اس کی تیاری اور اسے 2006ء میں امریکا میں لانچ کرنے میں 1 ملین ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔ اور اسے ساری دنیا میں پھیلانے میں 18 ماہ لگے۔“

جب جلیٹ نے یہ اعلان کیا کہ ہم مارکیٹ میں 5 بلیڈوں والا ریزر لارہے ہیں تو میڈیا نے نہ صرف اس کا مذاق اڑایا بلکہ اسے پاگل پن سے بھی تعبیر کیا۔ اس بارے میں اکنامک میگزین نے لکھا کہ اگر اسی طرح بلیڈوں کی تعداد بڑھتی رہی تو 2100ء تک مرد حضرات 14 بلیڈوں والا ریزر استعمال کررہے ہوں گے۔

ایک اور امریکی صحافی اینڈریو سارتن نے کچھ اس طرح تنقید کی کہ میرا خیال ہے پہلے دو بلیڈ بال کو کھینچنے اور بال کی گانٹھ کو نکالنے کے لیے ہیں جبکہ باقی دو غیر متوقع بالوں کی صفائی کے لیے مگر پانچویں بلیڈ کا آخر کیا مصرف ہے یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ پانچواں بلیڈ ماحولیاتی اثر کے بیان کو لکھنے کے لیے استعمال ہوا ہو۔

اسی قسم کے ری ایکشن کا سامنا جلیٹ کمپنی پچھلے تیس سالوں سے کررہی ہے۔ ایسی ہی تنقید امریکی کامیڈی شو سیٹرڈے نائٹ میں 1975ء میں بھی ہوئی تھی جب جلیٹ نے 2 بلیڈ کا ریزر مارکیٹ میں ڈالا تھا۔ انہوں نے کہا کہ 2 بلیڈوں کے بعد اب 3 بلیڈ والا ریزر بھی آئے گا، اور ہم نے ماخ 3 لانچ کرکے ان کا منہ بند کردیا۔ ان نقادوں کا کیا ہے وہ تو کہتے ہی رہتے ہیں۔ ہمیں تو صارفین کا ردِعمل دیکھنا ہے اور انہوں نے 2006ء میں فیوژن کے مارکیٹ میں آنے کے بعد جب اس کا تجربہ کیا تو انہوں نے اپنے بٹوؤں کا منہ کھول دیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے بٹوؤں سے ہمارے حق میں ووٹ ڈال کر اس کا جواب دیا اور پہلے سات ماہ میں 220 ملین ڈالرز کی بکری ہوئی۔

بہت سے نقاد جلیٹ کو ”معمولی تبدیلی سے کمائی“ کا ملزم قرار دیتے ہیں۔ معمولی تبدیلی سے کمائی، ایک اصطلاح ہے جو سب سے پہلے جوتے بنانے والی انڈسٹری میں متعارف ہوئی جنہوں نے اسپورٹس شوز میں محض معمولی سی تبدیلیاں کیں اور ان کا بڑھا چڑھا کے پروپیگنڈا کرنے کے بعد جوتوں کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ کردیا۔

”لیکن جلیٹ میں ایسا نہیں ہے۔“ ہزرڈ چک بولا ”مردوں کے لیے شیونگ بہت سی تعیشات میں سے ایک ہے۔ ہم نے فیوژن میں بلیڈ کو ماخ 3 کی نسبت 0.45 ملی میٹر قریب لگایا ہے۔ جس سے شیو کرتے وقت بالوں پر پڑنے والے دباؤ میں تقریباً 40 فیصد کمی ہوئی ہے جس سے شیو کرنے میں مزہ آنے لگا ہے۔ ویسے بھی ریزر بلیڈ انسانی ٹشو پر بالوں کو کاٹنے والی نازک ترین چیز ہے۔ اس میں معمولی سی انیس بیس کی بیشی چہرے کو زخمی کرسکتی ہے۔ ہم بار بار تبدیلیاں نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی نیا بلیڈ لانچ کرنے یا پرانے میں تبدیلی کے کام کو ہلکے طور پر لیتے ہیں۔ ہم یہ کام پوری احتیاط اور دیانتداری سے کرتے ہیں اور ہم نے فیوژن میں 5 بلیڈ لگائے ہیں ان میں کوئی بھی اضافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کا اپنی جگہ ایک اہم رول ہے۔“

نقادوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ جلیٹ نے جب ماخ 3 لانچ کیا تو اس بات کی پبلسٹی میں لاکھوں ڈالر صرف کیے کہ ”ماخ 3 بہترین ہے“ وہی جلیٹ اب فیوژن کو بہترین کہہ رہی ہے۔ جلیٹ کی دونوں باتوں میں سے کس کو سچ سمجھا جائے اور آیا اگر جلیٹ جب کوئی نیا بلیڈ لانچ کرے تو وہ اس کو بھی بہترین قرار دے گی سو جلیٹ کی کس بات کو سچ مانا جائے۔ چپ برخ جو گلوبل پرسنل گرومنگ نامی ایسوسی ایشن کے صدر ہیں، کہتے ہیں کہ ہمارا ماٹو ہے کہ ہمیں بہتر سے بہترین شیو کی طرف جانا ہے۔ نقادوں کی اس تنقید کا جواب یہ ہے کہ فیوژن کے آنے تک ماخ 3 ہی بہترین تھا اب اور اگر ہمیں شیو کرنے کا کوئی بہتر طریقہ نظر آتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہیں نہ کہیں موجود ہے تو ہمیں اسے ڈھونڈنے اور اسے کام میں لانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر یہ کام فیوژن یا کوئی اور ریزر کررہا ہے تو یہ تو اچھی بات ہے۔

یہ بات تو فیوژن نے ثابت کردی ہے کہ شیونگ ان چند ایک کاروباروں میں سے ہے جن میں مہنگی ترین پروڈکٹ بیسٹ سیلر ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ جلیٹ والوں کا کہنا ہے کہ ہم اس وقت تک اپنی کوئی نئی پروڈکٹ مارکیٹ میں نہیں لاتے جب تک اس کی قائم مقام پروڈکٹ کو اپنے ابتدائی مراحل میں لانا شروع نہ کردیں۔ ہزرڈ چک نے نئی پروڈکٹ کا آئیڈیا دیتے ہوئے کہا کہ میں اس سے زیادہ آپ کو نہیں بتا سکتا کہ ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف کرانے میں اور بھی عوامل ہوتے ہیں محض بلیڈوں کی تعداد ہی کافی نہیں ہوتی۔

13 دسمبر 2006ء کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ امریکی ایتھلیٹ ڈینیل سیلنچی اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف تھی اور کچھ ضروری خطوط کا جواب دے رہی تھی۔ اس کی عمر صرف تیس سال تھی اور غیر شادی شدہ تھی۔ اس کا معمول تھا کہ وہ علی الصباح بیدار ہوتی، اپنی ڈاک دیکھتی، ضروری خطوط کے جوابات دیتی، پھر اپنے پالتو کتے تیز کے ساتھ جاگنگ کے لیے نکل جاتی۔

اس دن موسم خاصا خوش گوار تھا۔ ڈینیل نے سوچا کہ آج کینیسین کے علاقے میں جاگنگ کی جائے۔ کینیسین (امریکا) کا یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اور تقریباً ایک ہزار مربع میٹر پر پھیلا ہوا ہے۔

وہ ابھی لیپ ٹاپ پر مصروف ہی تھی کہ اس کا پالتو کتا تیز وہاں آگیا اور باہر جانے کے ارادے سے ڈینیل کو کھینچنے کی کوشش کی۔ وہ پیار بھرے انداز میں بھونک بھی رہا تھا اور باہر جانے کی ضد بھی کررہا تھا۔

”اچھا بابا! ابھی چلتی ہوں۔“ ڈینیل نے کہا۔ ”ایک

بے زباں ہمدرد

امیمہ سلیم

وہ ہر روز چہل قدمی کی خاطر گھر سے نکلتی تھی، اس دن بھی اپنے عزیز از جان کُتّے کے ساتھ نکلی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے۔ وہ ایک بڑے حادثے کا شکار ہونے والی ہے۔

منٹ صبر کرو، میں اس خط کا جواب تو مکمل کرلوں۔"
"بھوں۔ بھوں۔۔" ٹیز نے پھر اس کی آستین پکڑ کر کھینچی۔
"ٹیز!" ڈینیل نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ "صبر سے کام لو۔ میں نے کہا نا ابھی چلتے ہیں۔"
ٹیز گویا اس کی بات سمجھ گیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔
ڈینیل نے ای میل کا جواب مکمل کیا اور لیپ ٹاپ بند کردیا۔
ٹیز ایک مرتبہ پھر بے چینی سے چکر لگانے لگا۔
ڈینیل نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولی۔ "ٹیز! آج ہم لمبی سیر پہ جائیں گے۔ یوں بھی آج کل چھٹیاں ہیں۔"
ٹیز نے پھر بے صبری کا مظاہرہ کیا۔
"اچھا بابا، پہلے مجھے کچھ کھا تو لینے دو۔" ڈینیل مسکرائی۔
اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سینڈوچ پکڑا، اپنی پینٹ کی نچلی جیب میں جو اس کے گھٹنے کے پاس تھی، اس میں پانی کی ایک بوتل رکھی۔ بقیہ ضروری سامان اس کی گاڑی میں تھا۔
اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "چلو ٹیز!"
ٹیز اس سے پہلے ہی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ ڈینیل نے اس کے لیے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ سینڈوچ بھی کھا رہی تھی۔ ٹیز بھی اس سینڈوچ میں اس کا حصے دار تھا۔
جلد ہی وہ چھوٹی بڑی بے شمار پہاڑیوں سے گھرے ہوئے کینسین کے ریگستانی علاقے میں پہنچ گئے۔ وہ پہاڑی سلسلہ بھی عجیب تھا۔ اس کے چاروں طرف چھوٹی بڑی بے شمار بھوری بھوری چٹانیں تھیں اور درمیان میں نرم اور کہیں کہیں سے ریتیلی زمین تھی۔
گاڑی ایک جگہ روک کر ڈینیل گاڑی سے اتری تو اس کے پیچھے پیچھے ٹیز بھی چھلانگ لگا کر باہر آگیا۔
ڈینیل نے ٹیز کو ایک پیٹ ہاؤس سے اس وقت خریدا تھا جب وہ محض چند ہفتے کا پلا تھا۔ اب وہی اس کی تنہائی کا ساتھی اور اس کا سب سے بہترین دوست تھا۔

گاڑی سے نکلتے ہوئے ڈینیل نے احتیاطاً اپنی جرسی بھی لے لی تھی لیکن اسے پہننے کے بجائے کمر سے باندھ لیا تھا۔
پھر اس نے معمول کے مطابق جاگنگ شروع کردی۔ ڈینیل عالمی شہرت یافتہ ایتھلیٹ تھی اور کئی بین الاقوامی مقابلوں میں انعامات حاصل کرچکی تھی۔ اس لحاظ سے وہ نہ صرف اپنی ریاست بلکہ ملک بھر میں معروف تھی۔
اس نے ہلکی رفتار سے دوڑتے ہوئے کہا۔ "آؤ ٹیز! آج دوڑنے کا مقابلہ ہوجائے؟"
کتے نے ہلکی سی "بھوں" سے اس کی بات کا جواب دیا اور گولی کی طرح وہاں سے نکل گیا۔
وہ بہت تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ ڈینیل جانتی تھی کہ جس طرف ٹیز جارہا ہے، وہ خاصا مخدوش پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس طرف تو وہ خود بھی آتے ہوئے احتیاط کرتی تھی۔
اس نے چیخ کر ٹیز کو آواز دی۔ "ٹیز! آگے مت جاؤ۔"
لیکن کتا اس کی نظروں سے اوجھل ہوچکا تھا۔ اس نے شاید اس کی آواز ہی نہیں سنی تھی۔
ڈینیل ایک مرتبہ پھر چیخی۔ "ٹیز۔۔۔ ٹیز! واپس آجاؤ۔"
اچانک اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز آئی۔ وہ پوری قوت سے چیخی۔ "ٹیز" اور دیوانہ وار اس طرف بھاگی جدھر سے آواز آئی تھی۔
اچانک اسے ٹیز نظر آگیا۔ وہ ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر جمپ لگا رہا تھا۔
ڈینیل کا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا۔ اس نے زوردار انداز میں آواز دی۔ "ٹیز!" اور اس طرف بھاگی۔
اچانک اس کا پاؤں پھسلا لیکن اس نے فوراً ہی اپنا توازن بحال کیا اور رک کر ٹیز کو پھر آواز دی۔ اس بھاگ دوڑ میں اس کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔
اس مرتبہ کتے نے اس کی آواز سن لی اور وہ تیزی سے اس کی طرف آگیا۔ اس کے آنے سے پھر پہاڑیوں سے چند پتھر لڑھکے لیکن ٹیز اچھلتا کودتا اس تک پہنچ گیا اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔
"تم بہت برے کتے ہو۔" ڈینیل نے ناراضی سے کہا۔ "میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں۔ تم میری آواز نہیں سن رہے تھے؟"

ٹیز یوں سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے ڈینیل کی بات سمجھ رہا ہو اور اپنے کیے پر شرمندہ ہو۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ ٹیز اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔
"چلو، اب دوسرے راستے پر چلو!" ڈینیل نے کہا۔ "بے وقوف! یہ علاقہ مخدوش ہے۔"
کتا اچھلتا ہوا واپس بھاگا۔ ڈینیل نے بھی واپسی کا رخ کیا اور ابھی چند ہی قدم بھاگی تھی کہ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کے پاؤں کے نیچے آنے والا ایک پتھر اس طرح پھسلا تھا کہ ڈینیل اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ اس نے اردگرد کی چٹانوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔
اس کے نتیجے میں وہ ایک بلند پہاڑی چوٹی سے کچھ دور تک نیچے کی طرف پھسلتی گئی۔ اس پہاڑی چوٹی کی بناوٹ ایسی تھی کہ اس کی ڈھلان کچھ میٹر بعد اچانک ختم ہوگئی اور ڈینیل لمحے بھر کو ہوا میں معلق ہوگئی۔ اس نے ہاتھ پاؤں مارے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تقریباً ساٹھ فٹ کی بلندی سے دھڑام سے زمین پر جاگری۔
اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی اور وہ چند لمحوں کو ہوش وحواس کھو بیٹھی۔ لیکن صرف چند لمحے بعد ہی اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کی کمر اور جسم کے نچلے حصے میں شدید تکلیف ہورہی تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ شدت کرب سے چیختی ہوئی پھر زمین پر گر پڑی۔
ڈینیل خاصی مضبوط قوتِ ارادی کی حوصلہ مند لڑکی تھی۔ ایتھلیٹ کی حیثیت سے اس نے اپنا نام یوں ہی نہیں کمایا تھا۔
اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے جسم کی قوت کو مجتمع کیا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ دور دور تک بے آب و گیاہ چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہاں چند چیلوں اور گدھ نما پرندوں کے علاوہ کسی متنفس کا وجود بھی نہیں تھا۔ اس کا کتا ٹیز بھی اوپر ہی کہیں رہ گیا تھا۔
ڈینیل نے جسم کی پوری قوت مجتمع کرکے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کرب ناک انداز میں چیختی ہوئی پھر زمین پر گر گئی۔ اس کا نچلا جسم تقریباً بے جان ہورہا تھا۔ اس کے پیر حرکت تو کررہے تھے لیکن اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے جسم کو کہاں اور کس قسم کی چوٹ آئی ہے۔ خاص طور پر اس کی کمر کا دایاں حصہ اور بایاں پاؤں تو تقریباً مفلوج ہورہے تھے۔

اس نے زمین سے سر ٹکا کر اپنی ہمت ایک مرتبہ پھر مجتمع کی اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "ہمت کرو ڈینیل! کسی کو بھی علم نہیں ہے کہ تم کینسین کے اس پہاڑی سلسلے کی طرف آئی ہو۔ ہمت کرو اور کسی نہ کسی طرح اپنی گاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرو۔"
اس کے اندازے کے مطابق اس کی گاڑی وہاں سے تقریباً تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی لیکن خاصی بلندی پر تھی۔ اسی وقت ٹیز اسے ڈھونڈتا ہوا دوسرے راستے سے وہاں تک آگیا اور دیوانہ وار اس کے ہاتھ اور منہ چومنے لگا۔
"میری مدد کرو ٹیز!" ڈینیل نے کتے سے زیادہ خود سے کہا۔ "مجھے ہر حال میں رات ہونے سے پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔ پلیز میری مدد کرو، مجھے راستہ بتاؤ۔"
کتا اس کے اشارے پر ایک طرف بھاگنے لگا۔ اس بے زبان کو کب خبر تھی کہ اس کی میلوں تک بے تکان دوڑنے والی مالکہ اس وقت اپنے پیروں پر کھڑی ہونے سے بھی معذور ہے۔
وہ کچھ دور تک دوڑتا ہوا گیا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ ڈینیل اس کے پیچھے نہیں آرہی ہے تو وہ واپس آگیا اور اس کے نزدیک ہی منڈلانے لگا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ فاصلہ گھسٹ گھسٹ کر طے کرنا پڑے گا۔" ڈینیل نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "لیکن میں کتنی دور تک گھسٹ سکوں گی اور کب تک... سورج غروب ہونے سے پہلے تو میں کسی بھی حال میں اپنی گاڑی تک نہیں پہنچ سکوں گی۔" ڈینیل نے مایوسی سے سوچا۔ "اور اگر میں گاڑی تک پہنچ بھی گئی تو اسے ڈرائیو کیسے کروں گی؟ نہیں ڈینیل! یہ ناممکن ہے۔"
"یہ ناممکن نہیں ہے۔" ڈینیل اپنی بات کے جواب پر خود ہی چیخی۔ "میں گاڑی تک ضرور پہنچوں گی۔ یہ میں کیسی مایوسی کی باتیں کررہی ہوں۔ ایک مرتبہ ٹارگٹ تک پہنچ جاؤں پھر کچھ اور سوچوں گی۔"
ٹیز بہت غور سے اپنی مالکہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ اس کی مالکہ اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہوسکتی، اور ہسٹیریا کی کیفیت میں مبتلا ہے۔
اس وقت اس پہاڑی سلسلے کینسین کا درجہ حرارت چھبیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ دھوپ میں اتنی تپش تو نہیں تھی لیکن ڈینیل کو تکلیف کے باعث سورج کی وہ گرمی بھی گراں گزر رہی تھی۔

اس نے جسم کا سارا زور لگایا اور کسی نہ کسی طرح اوندھی ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن اس نے اپنی چیخوں اور کراہوں کو اپنے حلق میں گھونٹ لیا۔ اب وہ سینے اور پیٹ کے بل گھسٹنے کو تیار تھی۔

ٹیز غور سے اس کی تمام حرکات دیکھ رہا تھا۔ اگر ڈینیل کے پاس ایک رسی ہوتی تو شاید ٹیز اسے کسی نہ کسی طرح کھینچ کر گاڑی تک پہنچا دیتا۔

اس نے ایک ایک انچ کرکے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شدید تکلیف محسوس ہوئی لیکن یہ تکلیف بہرحال اس ویرانے میں بے یار و مددگار مرنے سے کہیں بہتر تھی۔

ایک ایک انچ کرکے سرکتے ہوئے اس نے بہ مشکل تمام دو ڈھائی سو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔

سورج اب مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور دھوپ کی تمازت ختم ہوگئی تھی۔

ڈینیل نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر خود کو پھر سیدھا کیا اور بری طرح ہانپنے لگی۔ اس مشقت میں اس کے نچلے جسم میں تو شدید تکلیف ہورہی تھی، اس کی کہنیاں اور بازو بھی اُدھڑ گئے تھے۔

اسے شدید پیاس کا احساس ہورہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی ملٹی پاکٹ پینٹ میں گھٹنے کی جیب میں پانی کی بوتل تھی۔ اگر اس کے گرنے میں وہ بوتل اس کی جیب سے نکل نہیں ہوگی تو اب بھی اس کی جیب میں موجود ہوگی۔

اس کا ہاتھ تو جیب تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کے لیے اسے خاصا آگے جھکنا پڑتا۔ اس نے ایک مرتبہ کوشش کی بھی لیکن اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ وہ بری طرح نڈھال ہوگئی۔

خوش قسمتی سے اس کا دایاں پاؤں اتنا ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے پاؤں اٹھانے کی کوشش کی، اسے تکلیف کا احساس ہوا لیکن وہ تکلیف کی پروا کیے بغیر پاؤں کو اوپر اٹھاتی رہی لیکن پھر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ پانی کی بوتل اس کی جیب میں پھنسی ہوئی تھی۔ اگر جیب ڈھیلی ہوتی تو وہ بوتل پھسل کر نیچے گر جاتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ پانی کی بوتل کا اوپری حصہ جیب سے باہر تھا۔

اس نے داہنے پاؤں کا گھٹنا دوسری مرتبہ موڑنے کی کوشش کی لیکن ایسا کرنے کی وجہ سے اس کی چیخیں نکل گئیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ٹیز اس کی طرف دوڑا اور اپنی زبان سے اس کے آنسو اور چہرہ چاٹنے لگا اور اپنی بے قراری کا اظہار کرنے لگا۔

اس ویرانے اور تنہائی میں اس کتے کا دم بھی غنیمت تھا۔ ٹیز کے ہمدردانہ رویے سے ڈینیل کو دلی سکون ملا۔

پھر اچانک ہی گویا معجزہ ہوگیا۔ اس نے اپنا دایاں پاؤں سیدھا کیا تو پانی کی بوتل پاکٹ سے نکل آئی اور لڑھکتی ہوئی اس کے ہاتھ کے نزدیک پہنچ گئی۔

ڈینیل نے دیوانہ وار بوتل کو تھام لیا اور مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انسان جب کسی ابتلا اور مصیبت میں ہوتا ہے تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اسے بہت حوصلہ دیتی ہیں اور اسے ان چیزوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے جو عام زندگی میں کسی بھی طور نہیں ہوسکتا۔

ڈینیل نے پانی کی بوتل کھولی اور اس کے کئی گھونٹ ایک ساتھ چڑھا گئی۔

اچانک اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”بس کرو ڈینیل! تمہارے پاس پانی کی یہی مقدار ہے اور ابھی تمہیں تقریباً پندرہ کلومیٹر تک پیٹ اور سینے کے بل گھسٹنا ہے۔“

پانی پیتے پیتے ڈینیل رک گئی۔ اس نے بہ مشکل تمام خود پر قابو پایا تھا اور خود کو مزید پانی پینے سے باز رکھا تھا۔

اس نے بوتل کا ڈھکن مضبوطی سے بند کیا اور اس مرتبہ اسے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

پانی پینے سے اسے اپنے جسم میں ایک نئی توانائی کا احساس ہوا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنے ”سفر“ پر روانہ ہونے کے لیے ہمت مجتمع کررہی تھی۔

وہ جسم کی پوری قوت مجتمع کرکے ایک مرتبہ پھر اوندھی ہوئی۔ چند لمحے تک تکلیف کی شدت پر قابو پاتی رہی، پھر ایک ایک انچ کرکے آگے سرکنے لگی۔ وہ سرکتے سرکتے سر اٹھا کر یہ بھی دیکھتی تھی کہ ابھی کتنا فاصلہ باقی ہے؟

سورج غروب ہونے کی تیاری کررہا تھا اور فضا میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ وہ دسمبر کا سرد مہینا تھا لیکن کیلیفورنیا میں امریکا کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں نسبتاً سردی کم ہوتی ہے۔

وہ دم لے کر ایک مرتبہ پھر بہت آہستگی سے آگے کھسکنے لگی۔ اس کی رفتار تو کچھوے اور چیونٹی کی رفتار سے بھی کم تھی۔

یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے کہ دنیا کی مانی ہوئی ایتھلیٹ جو سو میٹر کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرسکتی تھی، آج کس کسمپرسی کے عالم میں اپاہجوں کی طرح زمین پر گھسٹنے پر مجبور ہے۔

”رونے اور افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا ڈینیل!“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”تمہیں ہر حال میں گاڑی تک پہنچنا ہے۔“

اب اسے بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اس بے آب و گیاہ علاقے میں پانی تو میسر تھا نہیں، کھانے کو کہاں سے ملتا۔ ڈینیل کی گاڑی میں البتہ کھانے کی باسکٹ موجود تھی لیکن وہاں تک پہنچنا ہی تو ایک مسئلہ تھا۔

سورج بالآخر آہستہ آہستہ غروب ہوگیا اور ہر طرف تیزی سے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں بھی اچانک اضافہ ہوگیا۔ اتنی شدید سردی تھی کہ اتنی کڑی مشقت کے باوجود ڈینیل سردی کے باعث بجنے لگی۔

اچانک اسے اس سوئٹر کا خیال آیا جو اس نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا۔ اس نے جسم کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر سوئٹر کی گرہ کھولی اور اسے اپنے پیٹ کے نیچے سے نکالنے کے بعد آگے کی طرف کھینچ لیا۔ وہ اون کا پوری آستین کا خاصا گرم سوئٹر تھا۔ ڈینیل نے کسی نہ کسی طرح وہ سوئٹر پہن لیا۔ سوئٹر پہن کر اسے خاصی طمانیت کا احساس ہوا اور ہڈیوں میں کاٹ ہونے والی سردی چند لمحے کو رک گئی اور وہ دوبارہ آگے کی طرف کھسکنے لگی۔

ٹیز اس کے ساتھ تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈینیل کو اٹھا کر گاڑی تک لے جائے۔ وہ بار بار جانے والے راستے پر جاتا تھا اور پھر واپس آجاتا تھا۔ گویا ڈینیل کو بتا رہا ہو کہ اس طرف جانا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ ڈینیل اب تکلیف کی شدت سے نڈھال ہوچکی تھی۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کا زخم کس نوعیت کا ہے؟ البتہ اس کے جسم سے خون نہیں نکلا تھا۔ ڈینیل کے خیال میں یہ زیادہ خطرناک تھا۔ اس کے زخمی جسم سے خون بہہ کر اندر ہی کہیں جمع ہورہا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک ایک انچ سرکتی رہی۔

پھر سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ ڈینیل کو اس بات کا احساس اس وقت ہوا جب اس کی بوتل کا پانی جم گیا۔ گویا درجہ حرارت صفر ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی گر گیا تھا۔

سردی سے بچاؤ کے لیے اس کے جسم پر ناکافی کپڑے تھے۔ اس کی پینٹ بھی زیادہ گرم نہیں تھی اور ٹی شرٹ اور سوئٹر بھی اس بلا خیز سردی کو روکنے میں ناکام تھا۔ سردی اتنی بڑھ گئی کہ نہ صرف ڈینیل کا جسم کانپنے لگا بلکہ اس کے دانت بھی بجنے لگے۔

اس میں اب مزید آگے بڑھنے کی ہمت ہی نہیں تھی اور اس پر غنودگی طاری ہورہی تھی۔ ”کیا میں مر رہی ہوں؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”یا یہ بے ہوشی ہے؟“

موت تو دونوں صورتوں میں یقینی تھی۔ ڈینیل نے سفر کا ارادہ ملتوی کردیا اور کھسکتی ہوئی ایک چٹان کی آڑ میں چلی گئی لیکن سردی نے وہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اسے اب یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ اگر درجہ حرارت مزید گر گیا تو اس کے جسم میں دوڑتا ہوا خون آہستہ آہستہ منجمد ہوجائے گا۔ پھر اس نے زمین پر سر ڈال دیا اور سوچا کہ اگر زندگی رہی تو بقیہ سفر صبح دن کے اجالے میں طے کرے گی۔

ٹیز بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ کتے اور انسان کے جسم کی حرارت نے گویا اس سردی کو شکست دے دی۔

صبح کے آثار نمودار ہوئے تو ڈینیل کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس میں سر اٹھانے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھایا تو اسے خوشی ہوئی کہ اس کا دورانِ خون منجمد نہیں ہوا ہے۔ اس کے جوڑ بھی کام کررہے تھے۔

اس نے کئی دفعہ اپنی بانہوں کو گردش دی اور اسے ہر مرتبہ زندگی کا احساس ہوا لیکن ابھی اس میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ بری طرح تھکی ہوئی وہاں بے جان لاش کی طرح پڑی رہی۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس علاقے میں جنگلی جانور اور حشرات الارض نہیں تھے ورنہ اب تک ڈینیل کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا۔

ایسے علاقے میں عموماً بھیڑیے اور گیدڑ وغیرہ ہوتے ہیں لیکن وہاں ایسا کوئی جانور نہیں تھا ورنہ اسے بچانے میں ٹیز بھی اپنی جان سے جاتا۔ حشرات الارض اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے۔ اندھیرے میں کوئی سانپ یا بچھو اسے بہت آسانی سے ڈس سکتا تھا۔

جب سورج مزید کچھ اوپر آیا تو درجہ حرارت بھی بڑھنے لگا اور ڈینیل کو بھی دھوپ کی تمازت سے توانائی کا احساس ہونے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا وہ سفر شروع کردیا جسے دنیا کا سب سے سست رفتار سفر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ایک ایک انچ سرک رہی تھی لیکن ابھی اس کا حوصلہ جوان تھا۔

اس نے پیچھے مڑ کر اس لیے نہیں دیکھا کہ اسے یہ احساس نہ ہوجائے کہ اس نے اب تک کتنا سفر طے کیا ہے،

اس نے دن بھر میں برائے نام سفر طے کیا تھا لیکن اسے امید تھی کہ آج کے دن وہ اپنی ہمت اور قوتِ ارادی کے بل پر گاڑی تک ضرور پہنچ جائے گی۔

وہ گھسٹتی رہی، سورج سر پر آیا تو اس کی تمازت سے اس کے جسم میں مزید توانائی بھر گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو بوتل تھی اس کا پانی جو برف بن چکا تھا ایک مرتبہ پھر پانی میں تبدیل ہو گیا۔

اب تک شدید خواہش کے باوجود اس نے پانی نہیں پیا تھا۔ دوپہر تک وہ بری طرح نڈھال ہو گئی اور جسم سے پسینا بہنے لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے اور اس نے سوچا کہ اب مجھے چند گھونٹ پانی پی لینا چاہیے۔

پانی پینے کے لیے وہ ہمت کر کے ایک مرتبہ پھر سیدھی ہوئی اور ایک چٹان سے سر لگا دیا۔ چند لمحے تک وہ اپنی سانسیں درست کرتی رہی، اوندھا اور سیدھا ہونے میں اسے شدید تکلیف ہوتی تھی لیکن اس کا جسم شاید اس تکلیف کا عادی ہو گیا تھا۔

وہ سیدھی ہو کر لیٹی تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا پیٹ کچھ بھاری بھاری ہو رہا ہے۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کا پیٹ اچانک بڑھ گیا ہو، وہ انتہائی اسمارٹ اور ورزشی جسم کی مالک تھی، ایتھلیٹ تو یوں بھی اسمارٹ ہی ہوتے ہیں، پھر اس کا پیٹ کیوں بڑھ رہا تھا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک ہولناک خیال آیا، کہیں میرے جسم کے زخمی حصے سے خون بہہ کر میرے پیٹ میں جمع تو نہیں ہو رہا؟ یہ خیال آتے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔ اگر ایسا تھا تو یہ صورتِ حال بہت خوف ناک تھی، خون کے لوتھڑے جسم میں جمع ہو کر انسان کے اعضائے رئیسہ کو شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اگر خون کا کوئی چھوٹا سا لوتھڑا بھی اس کی شریان میں داخل ہو جاتا تو چند ہی لمحوں میں حرکتِ قلب بند ہونے سے اس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔

اس نے ان تمام خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور خود سے کہا۔ "مجھے ابھی زندہ رہنا ہے، مجھے آخری لمحے تک موت سے لڑنا ہے۔ ہاں، اگر اس ویرانے میں موت میرا مقدر ہے تو اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔" اس نے سوچا، "میں نے آخر ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں مجھے اس قسم کی موت دی جا رہی ہے۔"

اس نے بوتل کھول کر منہ سے لگائی اور پانی پینے لگی۔ دھوپ کی تمازت اور کڑی مشقت کی وجہ سے اسے اتنی شدید پیاس کا احساس ہو رہا تھا کہ وہ پانی پیتی ہی چلی گئی۔ خیال تو اسے اس وقت آیا جب اس نے پانی کی بوتل کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا۔

اسے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا، ابھی اسے پانی بچا کر رکھنا چاہیے تھا۔ ابھی کئی کلومیٹر کا سفر باقی تھا جو اسے ایک ایک انچ رینگ کر طے کرنا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، غلطی تو اس سے ہو چکی تھی۔ اس نے پانی کی بوتل پھینکنے کا ارادہ کیا، پھر یہ سوچ کر اپنے ارادے سے باز رہی کہ کیا پتا آگے کہیں پانی کا کوئی چشمہ ہو؟ ویسے یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔ صحرا میں بھٹکنے والوں کو بھی سراب دکھائی دیتے ہیں اس طرح اسے بھی پانی کے چشمے کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس بے آب وگیاہ علاقے میں پانی نہیں ہے ورنہ کوئی درخت، کوئی خودرو پودا تو ہوتا۔

اس نے ہمت کر کے ایک مرتبہ پھر خود کو اوندھا کیا اور اپنا سانس بحال کرنے کے بعد پھر آگے کی طرف گھسٹنے لگی۔

ایک گھنٹے تک گھسٹنے کے بعد اسے پھر شدید پیاس کا احساس ہوا۔ کڑی مشقت سے پسینا پانی کی طرح اس کے جسم سے بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم میں تیزی سے پانی کی کمی واقع ہو رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر میں گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئی تو یا تو ڈی ہائیڈریشن (پانی کی کمی) سے مر جاؤں گی یا پھر شدید سردی میں میرا خون منجمد ہو جائے گا۔ موت دونوں صورتوں میں مقدر تھی۔

اس نے سوچا اگر مرنا ہی ہے تو پھر اس وقت تک کوشش کرنا چاہیے جب تک میرا سانس باقی ہے یا جب تک مجھ میں زمین پر گھسٹنے کی سکت ہے۔

وہ ایک نئے ولولے اور حوصلے سے آگے گھسٹنے لگی۔ ٹیز کبھی اس کے نزدیک آ جاتا تھا، کبھی اس سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا تھا۔ جیسے وہ اپنی مالکن کی بھی خود مدد کرنا چاہتا ہو۔

ٹیز دوڑتے دوڑتے اچانک رک گیا اور ایک گڑھے سے پانی پینے لگا۔

پانی کا وہ گڑھا ڈیل سے چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ پانی دیکھ کر اس کے جسم میں ایک نئی توانائی آ گئی اور وہ اس گڑھے کی طرف گھسٹنے لگی جس میں کبھی بارش کا پانی جمع ہو گیا ہو گا۔

گڑھے کے نزدیک پہنچ کر اسے شدید مایوسی ہوئی۔ گڑھے کا پانی انتہائی گدلا تھا اور وہ انسان تو انسان کسی جانور کے پینے کے قابل بھی نہیں تھا لیکن پیاس کی

شدت سے ڈینیل کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پانی کی بوتل اس گڑھے میں ڈال کر بھری۔ گڑھے میں پانی بہت کم تھا اس لیے بوتل آدھی سے زیادہ نہیں بھری لیکن اس کا پانی دیکھ کر ڈینیل کو توانائی آ گئی۔ وہ انتہائی گدلا اور بدبودار پانی تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے بوتل ہونٹوں سے لگائی اور پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔

اسے بہت زور سے ابکائی آئی لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ اس سے اتنا ہوا کہ اس کی کھوئی ہوئی توانائی فوری طور پر بحال ہونے لگی اور وہ ایک مرتبہ پھر ایک ایک انچ کر کے آگے بڑھنے لگی۔

سورج آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کر کے غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا اور فضا میں ایک مرتبہ پھر خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈینیل نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے یہ لگا جیسے اس کی منزل اب بھی اتنی ہی دور ہو جتنی کل تھی۔ اس نے دو روز میں بہ مشکل سو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا۔

سورج آہستہ آہستہ غروب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ڈینیل کی مایوسی بھی بڑھ گئی۔ اب اس نے سنجیدگی سے غور کیا کہ اگر آج رات بھی مجھے اس سردی کا سامنا کرنا پڑا تو شاید صبح تک میں زندہ نہ رہ سکوں۔

دن بھر کی مشقت کے بعد وہ بری طرح نڈھال ہو گئی تھی۔ آج دوسرا دن بھی گزر گیا تھا اور اس کے منہ میں غذا کا ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔

اس نے پانی کی بوتل سے ہی کچھ پانی پیا اور سر زمین پر ٹیک دیا۔

سردی کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا اور ڈینیل کانپ رہی تھی۔ اس کے دانت سردی کی شدت سے بج رہے تھے۔ اسے یقین ہو گیا کہ آج ضرور میرے جسم میں خون منجمد ہو جائے گا۔ اس نے آخری بار آسمان کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ سردی کی شدت اس کی ہر تکلیف پر حاوی آ گئی تھی۔

اس وقت بھی ٹیز اس کے پاس بیٹھا تھا اور ڈینیل کو اس جانور کے جسم کی حرارت سے کچھ سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

رات یوں ہی سوتے جاگتے بلکہ نیم غشی کی حالت میں گزر گئی۔

صبح کا اجالا پھیلا تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ یہ بھی گویا اس کی قوتِ ارادی کا کمال تھا یا پھر قدرت کا کوئی معجزہ کہ انتہائی شدید سردی کے باوجود اس کے جسم کا خون منجمد نہیں ہوا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنا ایک ہاتھ اٹھایا پھر دوسرا اٹھایا اور باری باری دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اس بات کا یقین کرنے لگی کہ میں نہ صرف زندہ ہوں بلکہ میرے جسم کا اوپری حصہ اب بھی فعال ہے۔

اچانک اس کے سر کے اوپر سے کوئی ہوائی جہاز گزرا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔ "بچاؤ... بچاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ٹیز بھی زور زور سے بھونکنے لگا لیکن ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کرنے والے ہوائی جہاز کے مسافر یا عملہ اسے بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔

اس نے ایک دفعہ پھر خود کو گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کے نڈھال جسم نے مزید مشقت سے انکار کر دیا اور وہ باوجود کوشش کے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی۔

اس کی مایوسی انتہا تک پہنچ گئی اور اس نے اپنا جسم سیدھا کر کے سر زمین پر لگا دیا۔ دور سے دیکھنے پر وہ کوئی لاش ہی لگ رہی تھی۔ بس سانسوں کی آمد و رفت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے جسم میں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔

☆☆☆

اس کے چند دوستوں نے اس کے گھر میں فون کیا، اس کے سیل فون پر کال کی لیکن جواب نہیں ملا۔ ایسا گزشتہ دو دن سے ہو رہا تھا۔ ان ہی میں سے کسی نے پولیس میں اس کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔

ڈینیل خاصی معروف شخصیت تھی۔ یوں بھی امریکی پولیس ہر قسم کے معاملات کو سنجیدگی سے لیتی ہے۔

سارجنٹ نے فوراً تمام اہلکاروں کو اس کی گم شدگی کی رپورٹ دی اور ساتھ ہی ریسکیو کے عملے کو بھی اطلاع دے دی۔

اس کے چند دوستوں کو اندازہ تھا کہ ڈینیل اکثر کینسین کے علاقے میں جاتی ہے۔

ریسکیو کے عملے کے سربراہ جان مارشل نے فوری طور پر سرچ ٹیم تشکیل دی اور بہت تیزی سے ڈینیل کی تلاش شروع کر دی گئی۔

ریسکیو ٹیم کا پہلا ہدف کینسین کے علاقے کا وہ پہاڑی سلسلہ تھا جہاں ڈینیل کے دوستوں کے مطابق وہ اکثر جا

کرتی تھی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ لوگ ڈینیل کی کار تک پہنچ گئے۔

وہاں پہنچ کر انہوں نے اردگرد کا جائزہ لیا اور ٹیم کے ایک سینئر ممبر گبن برٹ نے کہا۔ "یہ پہاڑی سلسلہ بیس کلو مربع میٹر پر محیط ہے۔ اسے تلاش کرنے میں کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ اگر اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو ہمیں دعا کرنا چاہیے کہ ہم بروقت اس تک پہنچ سکیں۔"

اس کے پاس پہاڑی علاقوں میں چلنے والی مخصوص گاڑی تھی۔ اس نے دوربین سے اردگرد کا ماہرانہ جائزہ لیا، پھر جان مارشل سے کہا۔ "میں اس طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں اگر ڈینیل کا کوئی سراغ ملے تو تم مجھے وائرلیس پر اطلاع دے دینا۔"

ٹیم کے دوسرے ممبر مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ گبن برٹ کا رخ اس طرف تھا جہاں ڈینیل پڑی ہوئی تھی لیکن وہ ابھی وہاں سے چند کلومیٹر کی دوری پر تھا اور گبن برٹ کے پاس جو گاڑی تھی اس کی رفتار اتنی نہیں تھی کہ وہ جلد وہاں پہنچ سکتا۔

☆☆☆

اسی وقت ڈینیل کو پھر ہوائی جہاز دکھائی دیا وہ بے اختیار چیخی۔ "ہیلپ... ہیلپ ...... بچاؤ .... بچاؤ۔" اس کی آواز کی بازگشت فضاؤں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

اس نے مایوسی کے عالم میں اپنے کتے ٹیز سے کہا۔ "ٹیز! پلیز جاؤ اور میرے لیے مدد لے کر آؤ، پلیز جاؤ۔"

ٹیز کتا اس کا اشارہ سمجھ گیا اور سست روی سے ایک طرف روانہ ہوا پھر اس کی طرف پلٹ آیا گویا وہ اپنی مالکہ کو اس عالم میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ڈینیل اس دفعہ غصے میں چیخی۔ "ٹیز، جاؤ!"

ٹیز نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

ٹیز کے جانے کے بعد ڈینیل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنے ایک ہمدم اور دمساز کو بھی روانہ کر دیا تھا، کتے کو بھیجنے کے بعد اسے شدید افسوس ہوا کہ اس کی موت کے وقت اس کا چہیتا ٹیز بھی اس کے پاس نہیں ہوگا۔ وہ بے چارہ تو اس کے کہنے پر وہاں سے چلا گیا تھا ورنہ اگر مدد لانا اس کے بس میں ہوتا تو وہ دو دن پہلے ہی لا چکا ہوتا۔

ڈینیل نے جذباتی انداز میں ٹیز کو آوازیں دیں۔ "ٹیز... ٹیز ... واپس آ جاؤ پلیز ... واپس آ جاؤ ٹیز ... میں تنہا نہیں مرنا چاہتی ... تم تو میرے سب سے بہترین دوست ہو۔ میں نے تمہیں بھی خود سے دور کر دیا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اب اس سے نقاہت اور ڈی ہائیڈریشن کے باعث آنکھیں کھولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں پہلے ہی جواب دے چکے تھے اب ہاتھ بھی جواب دے رہے تھے۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس نے مایوس ہو کر پھر زمین پر سر ڈال دیا۔

☆☆☆

جان مارشل نے دوربین سے دیکھا کہ بہت دور کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "دیکھنا، مجھے کوئی چیز حرکت کرتی نظر آ رہی ہے۔"

اس کے ساتھی نے دوربین آنکھوں سے لگائی اور بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! مجھے بھی کوئی چیز دکھائی دے رہی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں ہو رہا کہ وہاں کیا ہے؟"

چند منٹ بعد جان مارشل نے اس حرکت کرتی ہوئی چیز کو فوکس کرنے کے بعد کہا۔ "مجھے تو کوئی کتا لگ رہا ہے جو تیز رفتاری سے ادھر ہی آ رہا ہے۔"

اس کے ساتھی سائمن نے بھی دوربین کو فوکس کیا اور کہا۔ "جی سر! وہ لائٹ براؤن کلر کا کتا ہے۔ بہت تیز رفتاری سے ادھر آ رہا ہے۔"

جان مارشل نے چند منٹ کے بعد واضح انداز میں کتے کو دیکھا اور وائرلیس پر گبن برٹ کو پیغام دیا۔ "مسٹر گبن! تم جس طرف جا رہے ہو، اس طرف سے مجھے ایک کتا اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کتے کا دھیان رکھنا۔"

"سر! مجھے بھی ڈینیل کے دوستوں سے معلوم ہوا ہے کہ ڈینیل نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ کاش یہ ڈینیل ہی کا کتا ہو اور ہمیں کوئی نشان دہی کر سکے۔"

"گبن برٹ نے اپنی کارٹ (خصوصی گاڑی) کی رفتار کچھ بڑھا دی اور دوربین آنکھوں سے لگا لی۔

ایک موڑ مڑتے ہی اسے کتا نظر آیا جو بہت تیزی سے اوپر کی سمت جا رہا تھا۔

"اے ... ڈاگ" گبن برٹ چیخا لیکن کتا اس پر دھیان دیے بغیر بہت تیز رفتاری سے آگے نکل گیا۔

کمن برٹ نے وائرلیس پر جان مارشل کو بتایا۔ "سر! ایک لائٹ براؤن کتا میرے سامنے سے گزرا ہے لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ ڈینیل کے دوستوں نے اس کتے کا نام بھی بتایا تھا جو میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔"

"اگر یہ ڈینیل کا کتا ہے تو اس کا نام ٹیز ہے۔ تم کتے کا پیچھا کرو اور اسے آواز دو۔"

کمن برٹ نے اپنی کارٹ کا رخ اس سمت موڑ دیا جدھر کتا جا رہا تھا، جلد ہی کتا اسے نظر آ گیا۔ کمن برٹ پوری قوت سے چیخا۔ "ٹیز.... ٹیز!"

کتا اپنا نام سن کر رکا اور تیزی سے کمن برٹ کی طرف آنے لگا۔

وہ کمن برٹ کے نزدیک آ گیا اور واپس اس سمت ہو لیا جدھر سے وہ آیا تھا۔ کمن برٹ نے اپنی کارٹ اس کے پیچھے لگا دی، مشکل یہ تھی کہ کتے کی رفتار بہت تیز تھی۔ کمن برٹ کی کارٹ اس رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی لیکن اس کی کوشش تھی کہ کتے کو اپنی نظر میں رکھے۔

کتا خود بھی رک کر اس کا انتظار کرتا تھا، پھر تیزی سے دوڑنے لگتا تھا۔

☆☆☆

ڈینیل نے پہلے کتے کے بھونکنے کی آواز سنی، وہ بے تابی سے ڈینیل کے اردگرد چکر کاٹ رہا تھا۔ پھر اس کے کانوں میں کمن برٹ کی مخصوص گاڑی کی آواز آئی۔ وہ جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے چیخی۔ "ہیلپ.... ہیلپ"

کمن برٹ نے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس کے ساتھ ہی کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز کمن برٹ کے کانوں میں آ گئی۔ اس نے اپنی کارٹ کا رخ اسی جانب موڑ دیا۔

ڈینیل ایک مرتبہ پھر چیخی۔ "ہیلپ...... ہیلپ...... بچاؤ...... بچاؤ...... کوئی ہے، مجھے بچاؤ، پلیز!"

اس مرتبہ کمن برٹ کو کتا اور ڈینیل دونوں دکھائی دے گئے۔ وہ اپنی کارٹ دوڑاتا ہوا ڈینیل کے پاس پہنچ گیا۔

ڈینیل کے جسم میں گویا نئی زندگی دوڑ گئی۔ اس نے بے اختیار کتے کو چوما اور بولی۔ "تم ایک بہت اچھے دوست ہو، شکریہ دوست، تم نے میری جان بچالی۔" اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"ٹیز واقعی بہت بہترین دوست ہے۔" کمن برٹ نے کہا۔ "اگر یہ نہ ہوتا تو ہم اتنی جلدی تمہارا سراغ نہ لگا سکتے۔ جب تک ہم سراغ لگاتے بہت دیر ہو چکی ہوتی۔" کمن برٹ نے پیار سے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

پھر اس نے وائرلیس پر جان مارشل کو رپورٹ دی کہ مجھے ڈینیل مل گئی ہے لیکن وہ شدید زخمی ہے، بغیر اسٹریچر کے یہاں سے نہیں لے جائی جا سکتی۔

"او کے، میں فوری ایمبولینس اور اسٹریچر لے کر آ رہا ہوں۔"

آدھے گھنٹے بعد جان مارشل اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس دوران ہی کمن برٹ، ڈینیل کو پانی پلا چکا تھا اور اب اس کے جسم میں خاصی توانائی دکھائی دے رہی تھی۔

فوراً ہی ڈینیل کو اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔ جان مارشل نے کہا۔ "میں تمہاری ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ منفی صفر درجے سینٹی گریڈ میں اتنی زخمی حالت میں زندہ رہنا اور آگے بڑھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"مسٹر مارشل!" ڈینیل نے کہا۔ "میں ایتھلیٹ ہوں اور ایتھلیٹ آخری وقت تک جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔"

☆☆☆

فوراً ہی ڈینیل کو اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ گرنے سے نہ صرف ڈینیل کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے بلکہ اس کے بائیں کولہے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی ہے۔

تین ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد ڈینیل کو وہاں سے فارغ کر دیا گیا لیکن ڈاکٹر نے بتا دیا کہ ممکن ہے ڈینیل کو اب بقیہ زندگی وہیل چیئر پر گزارنا پڑے۔

ڈینیل ہار ماننے والی نہیں تھی، اس نے چھ ماہ کے اندر اندر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا شروع کر دیا۔

اور چھ ماہ گزرنے کے بعد وہ بہت آسانی سے اپنے پیروں پر چلنے لگی۔

ڈینیل اب بھی جاگنگ کرتی ہے۔ وہ اب ایتھلیٹ تو نہیں ہے لیکن ایک عام آدمی سے بہتر زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے دو پیارے پیارے بچے اور محبت کرنے والا شوہر ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا دوست اور ہمدرد ٹیز ہے جو آج بھی ڈینیل کے ساتھ سائے کی طرح رہتا ہے۔ اس نے واقعی اس محاورے کو درست ثابت کر دیا ہے کہ کتا اور گھوڑا انسان کے بہترین دوست ہیں۔

ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد بٹ صاحب بے چین ہو کر اچانک کھڑے ہو گئے اور ٹہلنے لگے۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب کیا زیادہ ناشتا کر لیا ہے ہضم کرنے کی پرابلم درپیش ہے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "ہاضمہ میرا خدا کے فضل سے بہت اچھا ہے۔ یہ ہم کشمیریوں پر اللہ کی طرف سے خاص عنایت ہے۔ دراصل میں بور ہو رہا ہوں۔"

سب حیران رہ گئے۔ شعیب مرزا نے کہا۔ "آپ

ایک ہی دن میں استنبول جیسے شہر سے بور ہوگئے؟"

"جی نہیں میں بور اس لیے ہو رہا ہوں کہ استنبول جیسے عجیب وغریب اور قابل دید شہر میں آنے کے بعد بھی ہم ہوٹل کے اندر بیٹھے ہیں۔ اگر ہوٹل ہی میں وقت گزارنا تھا تو ہم استنبول کیوں آئے ہیں؟"

خان صاحب بولے۔ "بٹ صاحب خدا کا خوف کیجیے۔ آپ کو استنبول آئے ہوئے ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ کل آپ جو دیکھ سکتے تھے وہ دیکھ لیا۔ آج ابھی آپ نے ناشتا کیا ہے۔ ناشتا ختم ہوچکا۔ اب ہم استنبول کی سیر کے لیے نکلیں گے۔"

"تو پھر نکلیے۔ یہ ہوٹل تو مجھے قید خانہ لگنے لگا ہے۔"

"بٹ صاحب، ایسے خوبصورت حسین قید خانے آپ نے دنیا میں کہیں دیکھے یا سنے ہیں؟"

شعیب مرزا نے کہا۔ "میں آپ کو ایک دلچسپ اور عجیب بات بتاؤں! استنبول میں ایک قید خانے کو ہوٹل اور ریسٹورنٹ بنادیا گیا ہے۔ یہ شہر کا بہت مہنگا ہوٹل اور ریستوران ہے۔"

"قید خانے کو ریستوران اور ہوٹل میں تبدیل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا استنبول میں جگہ کم ہے۔ پھر تو کسی ہوٹل کو بھی قید خانہ بنانا چاہیے۔" شعیب مرزا مسکرائے۔

"قید خانے کو ہوٹل اور ریستوران کیوں بنایا گیا اس کا مجھے بھی علم نہیں ہے لیکن اس قید خانے یعنی ریستوران میں کئی بار میں نے کھانا کھایا ہے۔ یہ مہنگا ضرور ہے لیکن یہاں لذیذ ترین کھانا ملتا ہے۔"

بٹ صاحب ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔ "تو پھر دیر کیوں کر رہے ہیں۔ آئیے قید خانے نما ہوٹل دیکھنے چلتے ہیں۔ میں آج کی سیر کا آغاز قید خانے سے ہی کرنا چاہتا ہوں۔"

خان صاحب کب چپ رہنے والے تھے۔ "بٹ صاحب، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ کو قید خانے جانے کا اتنا شوق ہے۔ فکر نہ کیجیے لاہور واپس چل کر آپ کو کوٹ لکھپت جیل یا کیمپ جیل میں داخل کرادیں گے۔ وہاں کے جیلر میرے اچھے واقف کار ہیں۔"

"ظاہر ہے مجرم یا مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے ہی جیلروں سے دوستی کرتے ہیں۔ مگر میری بات سن لیجیے بھائی، یہ جیلر کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ کسی وقت ان کی کھوپڑی گھوم گئی تو آپ جیل خانے میں ہی نظر آئیں گے۔"

ہوٹل سے باہر نکلے تو اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ ٹیکسی سے جائیں، بس سے جائیں یا ٹرام استعمال کریں۔ بٹ صاحب ٹرام کا نام سن کر مچل گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ استنبول کی ٹرام میں سوار ہوکر کراچی کی مرحوم ٹرام کی یادیں تازہ کرنا چاہتے ہیں۔ خان صاحب بس کے حق میں تھے۔ ہمارا ووٹ کسی کے حق میں نہ تھا۔ شعیب مرزا کی تجویز تھی کہ کچھ دیر پیدل چلتے ہیں پھر جو سواری مناسب ہوگی اس میں بیٹھ جائیں گے۔ آپ کو پتا ہے کہ ہم پاکستانی ہنسی مذاق اور پیار محبت کی بات بھی کرتے ہیں تو اونچی آواز میں جس سے گمان گزرتا ہے کہ شاید کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔ ترک بہت نرم گفتار لوگ ہیں۔ اونچی آواز میں بات کرنا خصوصاً سڑک پر ان کے لیے ناقابل تصور ہے۔ ہم نے دیکھا کہ چند ترک مرد اور خواتین کن انکھیوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے گزر گئے۔

جس وقت بٹ صاحب اپنی پاٹ دار آواز میں کراچی کی ٹراموں کا تذکرہ کر رہے تھے اچانک ہم نے دیکھا کہ دو پولیس والے اپنی مخصوص وردیوں میں نمودار ہوئے اور ہم لوگوں کی طرف آئے۔ ترکی میں پولیس والوں کو Polis لکھا جاتا ہے۔ یعنی نام تو وہی پولیس ہے مگر ہجے بدل گئے ہیں۔ دوسرے آزاد ملکوں کی طرح ترکش اپنی قومی زبان ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسی زبان میں دکانوں کے بورڈ لکھے نظر آتے ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو ایسے ملکوں میں جاکر اپنے آپ کو جاہل ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ خوبی ہمارے ملک ہی میں ہے کہ انگریزی بولنا ہی فخر سمجھتے ہیں۔ یہاں تو جاہل رکشا والے بھی انگریزی سمجھتے ہیں۔

پولیس والے سرخ وسفید رنگت کے قد آور لوگ تھے۔ ترکی میں ہم نے دیکھا کہ پولیس والے کسی قسم کا اسلحہ یہاں تک کہ انگریزوں کی طرح چھوٹا سا ڈنڈا بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ پولیس والے بہت اخلاق سے لوگوں سے بات کرتے ہیں لیکن ان کا رعب اتنا ہے کہ اگر دو پولیس والے پندرہ بپھرے ہوئے مسلح افراد سے کہیں کہ ہتھیار ہمارے حوالے کردو اور پولیس اسٹیشن چلو تو کسی کی مجال نہیں کہ انہیں رعب دکھائے یا ان کی ہدایت کی پابندی نہ کرے۔

پولیس والے بہت اطمینان سے ہم لوگوں کے پاس آئے۔ انہیں دیکھ کر بٹ صاحب بھی خاموش ہوگئے۔

پولیس مین نے کہا "خوش آمدید!"

جواب میں ہم سب نے السلام علیکم کہا۔

"آپ مسلمان ہیں؟" انہوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"جی ہاں، ہم پاکستانی ہیں۔"

یہ سن کر وہ مسکرائے۔ دونوں نے آگے بڑھ کر ہم لوگوں سے مصافحہ کیا اور خوش ہوکر دہرایا۔ "پاکستان، برادر مرحبا۔"

ہم نے بھی ان سے سیکھا ہوا ٹیکسی مرحبا کہہ دیا۔

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ایک پولیس والے نے پوچھا "کیا کوئی جھگڑا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ دراصل ہم لوگ آپس میں بحث کر رہے تھے۔ ہم سب دوست ہیں۔ دوستوں میں کیسا جھگڑا۔"

پولیس والا مسکرایا۔ "مہربانی، اپنی آواز ہلکی رکھا کیجیے۔ استنبول میں اونچی آوازوں میں بات کرنے والوں کو دیکھ کر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی جھگڑا ہو رہا ہے۔"

ہم سب شرمندہ ہوگئے۔ ہم لوگ واقعی تہذیب اور اخلاق کے بارے میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ تمیز اور تہذیب کو ہم نے خدا حافظ کہہ دیا ہے۔

ہم نے پولیس والے سے کہا۔ "سوری آفیسر، آیندہ ہم خیال رکھیں گے۔"

"آپ کا شکریہ۔" اس نے انگریزی میں کہا۔ "اللہ حفاظت کرے آپ کی۔"

پولیس والے تو رخصت ہوگئے مگر کچھ دیر ہم لوگ خاموش رہے پھر خان صاحب بولے۔ "بڑے افسوس اور شرمندگی کی بات ہے۔ آخر ہم لوگ اخلاق کو کیوں بھول گئے ہیں؟"

موقع سے فائدہ اٹھا کر شعیب مرزا نے کہا۔ "آیئے تو پھر ٹیکسی لے لیتے ہیں۔"

اس بار کسی نے بحث نہیں کی۔ مرزا صاحب کے اشارے پر ایک "ٹاکسی" آکر رک گئی۔ ہم سب لوگ اس میں سوار ہوگئے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سفید بالوں والا صاحب شخصیت کا مالک تھا۔ کوئی بہت ہی بڑا ریٹائرڈ افسر نظر آتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا "خوش آمدید!"

ہم لوگ پریشان ہوئے کہ ہم کو جواب میں کیا کہنا چاہیے۔ بہرحال ہم نے بھی انہیں "خوش آمدید" کہہ دیا۔

مرزا صاحب نے ہم لوگوں سے پوچھا۔ "باسفورس چلیں؟ مسالا بازار یا جیل ہوٹل؟"

سب نے کہا "جیل ہوٹل۔"

ٹیکسی والے نے مسکرا کر سر ہلایا اور ٹیکسی چل پڑی۔

استنبول کی کشادہ اور نہایت صاف ستھری سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ خان صاحب نے کہا۔ "مرزا صاحب، جیل خانے کو ہوٹل بنانے کی کیا تک تھی؟"

وہ بولے۔ "استنبول میں تاریخی مقامات کو کسی نہ کسی طرح تزئین، ترمیم اور مرمت کے ساتھ بہت احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔"

"مگر جیل خانہ تاریخی عمارت کیسے ہوگیا؟"

"یہ جیل خانہ ایک سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ شہر کے ایک اچھے اور خوبصورت علاقے میں ہے اس لیے بلدیہ نے جیل کسی اور جگہ منتقل کردیا اور اس کو بہت شاندار ہوٹل بنادیا۔"

ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی سے ہم لوگ اترے۔ ترک کرنسی کا حساب ہمارے بس کی بات نہ تھی ڈھیر سارے نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیے۔ اس نے مسکرا کر کچھ نوٹ ہمیں واپس کردیے اور ساتھ ہی میں کچھ چھوٹے نوٹ بھی دے دیے۔

ہم نے کہا۔ "انہیں ٹپ دینے کی ہمت نہیں ہو رہی۔"

بٹ صاحب بولے۔ "ٹپ شاید انہوں نے خود ہی کاٹ لی ہے۔"

ٹیکسی والے نے ہمیں خدا حافظ کہا اور مسکراتے ہوئے چلا گیا۔

اب جو سامنے والی شاندار اور خوبصورت عمارت کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ دراصل سارا ملک ترکی خصوصاً استنبول سلطنتِ عثمانیہ اور بازنطینی دور کی انتہائی خوبصورت اور پرشکوہ عمارتوں سے بھرا پڑا ہے۔ عثمانی حکمران مغلوں سے بھی زیادہ خوش ذوق تھے۔ ان کے تعمیر کردہ شہر، قلعے، حویلیاں، محلات انتہائی دلکش ہیں۔ مرزا صاحب نے ہم سے کہا کہ چاندنی راتوں میں استنبول دنیا کے حسین ترین شہروں میں نمایاں ہے۔ چاند کی چودھویں کو استنبول کا نظارہ نہ کرنا ایک "جرم" کے برابر ہے۔ چاندنی میں شہر کی پانچ سو سے زائد پرانی اور نئی مساجد کے حسین گنبد اور مینار ایک عجیب ماحول طاری کردیتے ہیں۔

خان صاحب فوراً حساب لگانے لگے کہ چاند کی چودہ تاریخ کب آئے گی اور کیا ہم اس وقت استنبول میں ہوں

گے بھی یا نہیں۔ اس جیل خانے کی عمارت میں تبدیلیاں ہونے کے بعد یہ انتہائی شاندار ہوٹل نظر آتا ہے جو عثمانی طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس ہوٹل سے کچھ فاصلے پر دریا کے کنارے کچھ گاؤں تھے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر آس پاس کا منظر ایک طلسماتی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ یوں تو استنبول میں ہوٹلوں، کلبوں اور ریستورانوں کی کمی نہیں ہے لیکن بقول مرزا صاحب خود شہر کے لوگ اور دوسرے شہروں اور ملکوں سے آنے والے سیاح بھی یہاں ایک بار کھانا کھانا ضروری سمجھتے ہیں۔

مرزا صاحب بولے "یہ ہوٹل ترکی کے مخصوص اور لذیذ کھانوں کے لیے مشہور ہے۔ حالانکہ لوگوں کو یہ احساس بھی رہتا ہے کہ وہ ایک جیل خانے میں کھانا کھا رہے ہیں، یہ ہوٹل سلطان احمد کے علاقے میں ہے۔ کچھ فاصلے پر بلیو مسجد ہے۔ آیا صوفیہ کی حسین عمارت بھی یہاں سے نظر آجاتی ہے۔ یہ استنبول کا ایسا علاقہ ہے جو ہر قابل ذکر مقام سے نزدیک ہے بلکہ یہاں بیٹھ کر ان تاریخی نادر عمارتوں کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔"

ہوٹل کے اندر کی سجاوٹ بہت خوبصورت ہے۔ ترکی کے کسی بھی شہر یا عمارت کے لیے یہ کہنا کہ وہ نہایت صاف ستھری ہے بے معنی ہے کیونکہ صفائی کے اعتبار سے ترک سچ مچ کے مسلمان ہیں۔ نہایت صفائی پسند، لباس مشرقی یا پھر مغربی مگر صاف شفاف۔ نہایت خوش اخلاق تحمل اور آہستگی سے بات کرنے والے۔ بٹ صاحب استنبول کی یہ خوبیاں دیکھ کر بہت مرعوب ہوئے اور بولے۔ "آفاقی صاحب، استنبول تو یورپ کا کوئی شہر لگتا ہے۔"

خان صاحب نے فوراً ٹوکا۔ "یورپ کے شہروں میں ایسی خوبصورت قدیم عمارتیں نہیں، نہ باسفورس، نہ مشرق اور مغرب کا سنگم۔"

ہال میں داخل ہوتے ہی ایک خوش لباس ویٹر نے ہمیں ایک کھڑکی کے سامنے لے جا کر بٹھا دیا جہاں سے نہ صرف ہوٹل کا اندرونی منظر بلکہ باہر کا حسن بھی نظر آتا تھا۔ میز کے گرد کرسیوں کی جگہ کشن لگے ہوئے نرم صوفہ نما کرسیاں تھیں جس پر بیٹھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہے ہیں۔

ہیڈ ویٹر دوبارہ نوٹ بک لے کر آگیا۔ وہ بہت کم انگریزی جانتا تھا لیکن خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ شعیب مرزا تھے جو ترکی کی ٹانگ توڑ کر اپنا مطلب سمجھا دیتے تھے۔

ایک ایک خوبصورت مینو کارڈ ہم سب کو پیش کر دیا گیا۔ دراصل امیروں کا پسندیدہ ہوٹل ہے اس لیے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ بھی بہت زیادہ ہے۔

مرزا صاحب نے مینو پڑھ کر ہمیں بتایا کہ یہاں پر کو اسنیکس بھی مل سکتے ہیں۔ ٹھنڈے مشروبات اور مختلف قسم کے سوپ بھی ہیں۔

ہم نے کہا "مرزا صاحب بلاوجہ وقت ضائع نہ کیجیے۔ یہ بتائیے کہ کھانے میں کیا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولے۔ "اس سے پہلے میں نے جو چیزیں آپ کو بتائی ہیں وہ سب بھی کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ آگے سنیے۔ یہاں آپ کو ترکی کھانے بھی ملیں گے اور بازنطینی لذیذ کھانے بھی مل جائیں گے۔" اس کے بعد انہوں نے کھانوں کی فہرست بھی پیش کرنی شروع کردی۔

خان صاحب بولے "یار مرزا صاحب، ہمارے صبر کا مزید امتحان نہ لیجیے۔ یہ کام ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ یہ سب کھاتے رہے ہیں۔ خود ہی آرڈر دے دیجیے۔"

بٹ صاحب فوراً بول پڑے۔ "مگر گوشت حلال ہو، کسی چیز میں ناجائز چیز شامل نہ ہو۔ مینڈک، کیکڑا، جھینگے وغیرہ بالکل نہ ہوں۔"

مرزا صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب یہ ایک اسلامی ملک ہے۔ یہاں کوئی چیز آپ کو ایسی نہیں ملے گی جسے عام مسلمان پسند نہیں کرتے۔ آپ چپ چاپ دیکھتے رہیے اگر اعتراض ہو تو بتا دیجیے گا۔"

مرزا صاحب نے ڈونر کباب، کوفتے اور شیش کباب اور ترکی نان کا آرڈر دیا۔

ایران کی طرح ترکی میں بھی نان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جو سب کی سب انتہائی لذیذ ہوتی ہیں۔ دستور ہے کہ ریستوران میں کھانے کا آرڈر دینے کے بعد جب تک کھانا آئے اس سے پہلے ایک ٹوکری میں نان کے کٹے ہوئے ٹکڑے رکھے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مکھن بھی۔ سلاد بھی ایک پلیٹ میں آجاتی ہے۔ جب تک کھانا آئے آپ ان چیزوں سے دل بہلاتے رہیں۔ بٹ صاحب کو نان اور مکھن اس قدر پسند آیا کہ مسلسل کھاتے رہے یہاں تک کہ سارے نان ختم ہوگئے۔

خان صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب، یہ نان صرف چکھنے کے لیے آئے تھے۔ آپ نے تو سارے ختم کر دیے اب کھانا کیسے کھائیں گے؟"

بٹ صاحب نے ایک چھوٹی سی ڈکار لی اور بولے۔ "خان صاحب، آپ کشمیریوں کو نہیں جانتے۔ یہ ساری دیگ بھی کھا جاتے ہیں اور ہضم بھی کر لیتے ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "ہمارے ایک پروفیسر کہا کرتے تھے کہ ہر انسان کے پیٹ میں ہر قسم کے کھانوں کے لیے علیحدہ خانہ ہوتا ہے۔ مثلاً آپ پیٹ بھر کر پلاؤ کھا لیتے ہیں لیکن پھر روٹی بھی کھا لیتے ہیں۔ چاول اور روٹی کے بعد اب پیٹ میں گنجائش نہیں رہتی مگر جب میٹھا آتا ہے تو آپ میٹھا بھی کھا لیتے ہیں۔ اب آپ کا پیٹ بالکل فل ہو چکا ہے لیکن پھل اور خشک میوہ پیش کیا جائے تو آپ وہ بھی ختم کر دیتے ہیں۔ اتنا کھانے کے بعد اب آپ کے پیٹ میں سانس لینے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی لیکن چائے یا کافی پیش کی جائے تو آپ وہ بھی پی جاتے ہیں۔"

اتنی دیر میں کھانے کی مختلف ڈشز آگئیں۔ کبابوں کی خوشبو سے لاہور کے سیخ کباب یاد آگئے۔ کوفتے ہمارے جیسے ہی تھے مگر شوربہ کم تھا۔

مرزا صاحب نے کہا "یہاں کھانا کھانے کا لطف یہ ہے کہ کھڑکیوں میں سے آیا صوفیہ کے خوبصورت گنبد بھی نظر آجاتے ہیں۔ سلطان احمد مسجد کے مینار بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چاندنی رات میں مسجد کے مینار اور آیا صوفیہ کا گنبد دنیا کا سب سے خوبصورت نظارہ پیش کرتا ہے۔ میں تو چاندنی رات میں یہ منظر ضرور دیکھتا ہوں۔"

بٹ صاحب بولے۔ "مرزا صاحب آپ نے کبھی چاندنی میں تاج محل دیکھا ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ چاندنی میں اس کا حسن بے مثال ہوتا ہے۔"

مرزا صاحب نے کہا۔ "بدقسمتی سے میں چاندنی رات میں تاج محل نہیں دیکھ سکا۔ آپ نے دیکھا ہے؟"

بٹ صاحب کا جواب تھا۔ "جی نہیں۔"

"تو پھر آپ تعریفیں کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں نے فلموں میں دیکھا ہے اور اخباروں میں پڑھا ہے۔"

ایک تو کھانا بہت لذیذ تھا۔ پھر کھانا پیش کرنے کا طریقہ اتنا دلکش تھا کہ جی چاہتا تھا اس زیبائش کو ہی دیکھتے رہیں۔

خان صاحب نے کہا۔ "آپ کا مطلب ہے کھانے کی ونڈو شاپنگ کرتے رہیں۔ مگر یاد رکھیے، کھانا کھائیں یا نہ کھائیں اس ونڈو شاپنگ کا بل ضرور دینا پڑتا ہے۔"

ابھی کھانا شروع نہیں ہوا تھا کہ ایک خاتون سفید قمیص اور نیلی اسکرٹ پہنے ہوئے تشریف لائیں اور مسکرا کر "خوش آمدید" کہنے کے بعد پوچھا۔ "آپ کھانے کے ساتھ موسیقی پسند کریں گے؟"

مرزا صاحب نے اس کا ترجمہ ہم سب کو سنایا۔

بٹ صاحب بول اٹھے۔ "ضرور، واہ کیا بات ہے میوزک کی؟"

"کس قسم کا میوزک آپ کو پسند ہے؟"

بولے۔ "جو اچھا ہو۔ یعنی کانوں کو اچھا لگے۔"

خاتون ترجمہ سن کر مسکرائیں۔ بولیں "ترکش میوزک یا عرب میوزک؟"

بٹ صاحب نے کہا۔ "مجھے تو غزلیں پسند ہیں، یا پھر پکا گانا۔"

"غزلیں۔ جس میں عورتوں کی تعریف ہوتی ہے یا اظہار محبت؟"

"بالکل صحیح سمجھیں آپ۔"

"مگر ہمارے پاس تو کوئی غزل نہیں ہے آپ انگلش میوزک سن لیجیے۔"

"ہرگز نہیں۔ انگریزی سے مجھے نفرت ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ انگریزوں کی زبان ہے۔"

مرزا صاحب نے وضاحت کی "ان کا مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں ڈھائی سو سال غلام رکھا۔ ہمیں ان کی ہر چیز سے نفرت ہے۔"

خاتون حیران ہو کر بولیں "مگر آپ دو ڈھائی سال تک غلام کیوں رہے۔ جنگ کر کے انہیں اپنے ملک سے باہر کیوں نہیں نکال دیا۔"

"کیونکہ ہمارے پاس کوئی مصطفیٰ کمال نہیں تھا۔"

وہ بولیں۔ "آپ سچ کہتے ہیں۔ جو ترک مصطفیٰ کمال کو سیکولر کہتے ہیں اور خلافت ختم کرنے کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں وہ بھی دل سے تسلیم کرتے ہیں کہ آج کا آزاد اور خوددار ترکی مصطفیٰ کمال پاشا ہی کی دین ہے۔ اچھا تو پھر میں آپ کے لیے ترک میوزک لگا دیتی ہوں۔ ٹھیک ہے؟"

"جی، بالکل ٹھیک۔"

بٹ صاحب جھٹ بول پڑے۔ "جیسا دیس ویسا بھیس۔"

خاتون نے حیرت سے بٹ کی طرف دیکھا کہ مطلب کیا ہے اس کا۔ مرزا صاحب نے کہا۔ "یہ ہماری اردو زبان کا ایک محاورہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں بھی

رہو وہاں کے لوگوں کی طرح رہو۔"

کھانا بہت لذیذ تھا... پلاؤ کی قسم کے چاول تھے۔ مختلف قسم کے کباب تھے۔ دہی بہت میٹھا تھا۔ پنیر کئی قسم کا تھا لیکن انتہائی نمکین اور کڑوا۔ ہم نے جب بھی ترکی کا پنیر کھایا پچھتائے۔ دیکھنے میں تو یہ بہت دلکش ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس صرف پنیر ہی کھائے جاؤ مگر ایک لقمہ بھی حلق سے نہیں اترتا۔ ہم نے کئی ترکوں سے پوچھا کہ آپ اتنے میٹھے لوگ ہیں مگر آپ کا پنیر اتنا کڑوا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا جواب ہمیں ہمیشہ یہی ملا کہ بس شروع ہی سے یہ دستور ہے۔ ترکوں کو زیادہ نمکین پنیر ہی اچھا لگتا ہے۔"

ہم سب نے جیل ہوٹل اور اس کے کھانے کی بہت تعریف کی۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ استنبول میں یورپ اور ایشیا کے بہترین ہوٹل اور ریستوران ہیں۔ دنیا بھر سے دولت مند ترین لوگ یہاں اپنے ذاتی بحری یا ہوائی جہازوں میں آتے ہیں اور شہر کے خوبصورت اور پُرسکون مناظر کے ساتھ ساتھ بہترین ریستورانوں کے کھانوں سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہاں کی نائٹ لائف بھی بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ یورپ کے شہروں سے بالکل مختلف ہے۔ اچھے ہوٹلوں میں عموماً صوفہ نما اور کشن والے صوفے ہوتے ہیں جن پر بیٹھ کر کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ قدیم دیوان نما صوفے ہوتے ہیں جو ترکی کے ریستورانوں کی علیحدہ خصوصیت ہے۔ یہاں کا ایک مشہور ریستوران "واک" بھی ہے۔ کسی دن آپ کو وہاں بھی لے جاؤں گا۔" مرزا صاحب بولے۔ "اس ہوٹل کے اسنیکس بہت مشہور ہیں، اور یہ مختلف اقسام کے ہوتے ہیں۔ یہاں کی ترکش ڈش "سوشی" سارے شہر میں مشہور ہے۔ رات کو میوزک اور ڈانس بھی ہوتے ہیں جو مہمان کرتے ہیں۔ استنبول کے ایک اور معروف ریستوران کا نام 360 ہے۔"

"عجیب وغریب نام ہے۔" ہم نے کہا "اگر نمبروں پر ہی نام رکھنا تھا تو 786 رکھ لیتے۔"

"ارے نہیں، یہ بہت ماڈرن ریستوران ہے۔ اس نام کی بے حرمتی ہوتی، اس ریستوران کی دیواریں شیشے کی ہیں جہاں سے باسفورس اور استنبول شہر کے مناظر نظر آتے ہیں۔ رات کے وقت تو یہ پریوں کے دیس جیسا لگتا ہے۔"

بٹ صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ بولے۔ "مرزا صاحب، آج مجھے معلوم ہو گیا کہ مغلوں نے کئی سو سال حکومت کرنے کے بعد ہندوستان کی حکومت کیوں کھوئی؟"

"اچھا مجھے بھی بتائیے۔"

"ضروری کام اور باتیں چھوڑ کر عیش وعشرت، کھانوں کی سیکڑوں قسمیں دریافت کرنے لگے۔ کھانے کا شوق پیدا ہوا تو سب جنگ وجدل بھول کر کھانے پینے، ناچ رنگ میں مصروف ہو گئے۔"

مرزا صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب کھانے پینے سے کوئی نہیں مرتا ہے بشرطیکہ اعتدال قائم رکھے۔ مغلوں کی آخری نسلیں سب کچھ بھول کر صرف کھانے پینے اور گانے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ آپ ترکی کو دیکھیے، کھانے پینے میں بھی آگے اور ترقی میں اس سے بھی زیادہ آگے۔ ترقی اور آسائش ساتھ ساتھ چلنا چاہیے۔ ریستوران میں بہترین دہی میں تر کیے ہوئے کباب نہایت لذیذ ہیں، یہاں کا پیرا کا کرسپ (روٹی) نہایت باریک اور کرکرا ہوتا ہے۔ کریم کے ساتھ تیار کیے ہوئے پھل اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ دیکھ کر ہی منہ میں پانی آجاتا ہے۔"

خان صاحب بولے "منہ میں پانی تو بہت آچکا، ہم کھانا بھی آجائے تو بہتر ہوگا۔"

کھانا واقعی بہت مزیدار تھا۔ ہوٹل سے باہر نکلے تو بٹ صاحب نے بطور خاص فور سیزن ہوٹل کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر بنوائی تاکہ یادگار رہے گا کہ ہم نے جیل میں کھانا کھایا تھا۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب آپ فکر نہ کیجیے، ہم آپ کو لاہور کے کسی بھی جیل میں جب آپ چاہیں ڈنر کھلا دیں گے۔"

اس علاقے میں شاندار ہوٹلوں اور ریستورانوں کی کمی نہیں ہے۔ نزدیک ہی استنبول کی مشہور سڑک استقلال کدیسی ہے۔ جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے اس سڑک پر ہر قسم کا ٹریفک بند ہے۔ چوڑے چوڑے فٹ پاتھوں پر سیاح اور مقامی لوگ گھومتے پھرتے ہیں۔ اس سڑک پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت کھوکھا نما دکانیں بھی ہیں۔ یہاں تازہ بھنے ہوئے پاپ کارن، کھانے پینے کی دوسری ہلکی اشیا اور مختلف اسنیکس دستیاب ہو جاتے ہیں۔ استقلال کدیسی (روڈ) ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں سے آپ شہر کا نظارہ بھی کرتے ہیں۔ اس علاقے کو اگر فوڈ اسٹریٹ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ریستوران یہاں بہت زیادہ ہیں اور ہر ریستوران میں مختلف قسم کا کھانا ملتا ہے۔ ویسے بھی لوگ اور خواتین گلوں میں ٹرے لٹکائے ہوئے کھانے کی مختلف چیزیں فروخت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر قسم کے مشرقی کھانوں کے لیے استنبول کو اب ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

ہوٹل سے اب کہاں جائیں؟ ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے اور مشورے کر رہے تھے کہ ایک ترک نوجوان سامنے سے آئے اور مرزا صاحب کے گلے لگ گئے۔ ہم لوگ تو حیران رہ گئے کہ یہ کون صاحب ہیں اور اس بے تکلفی کا سبب کیا ہے؟

مرزا صاحب نے ان صاحب سے گلے ملنے کے بعد تعارف کرایا کہ یہ مراد ہیں جنھیں ترکی میں مرات کہا جاتا ہے۔ مرات تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ ہم تینوں سے بھی وہ ملے اور کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ آپ کی زبان اردو میں ترکی کے دس ہزار سے زیادہ الفاظ ہیں لیکن ہم لوگ پھر بھی اپنی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔"

ہم نے کہا۔ "ہم آئندہ ترکی سیکھنے کی کوشش کریں گے اور آپ اردو سیکھیے۔"

"مرحبا! ضرور ایسا کرنا چاہیے۔"

فیصلہ یہ ہوا کہ اب ہم لوگ باسفورس کی سیر کو چلیں گے۔ باسفورس وہ خلیج ہے جو مشرقی اور مغربی استنبول کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ان دونوں حصوں کو آپس میں ملانے کے لیے ایک کشادہ پل ہے جسے باسفورس برج (پل) کہا جاتا ہے۔ یہ پل 1973ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پر سے گزریں تو دونوں جانب باسفورس کا نیلا پانی نظر آتا ہے۔ باسفورس کو اگر استنبول کے ماتھے کا جھومر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ باسفورس نے استنبول کو ایک نئی شناخت دے دی ہے۔ شاید ہی شہر کا کوئی حصہ ہو جہاں سے باسفورس نظر نہ آئے۔ اس میں بڑے بڑے بحری جہاز ہر وقت رواں دواں رہتے ہیں۔ سیاحوں اور سیر وتفریح کرنے والی کشتیاں بھی ہر وقت سمندر کے سینے پر تیرتی نظر آتی ہیں۔ تفریحی کشتیاں رات کو بھی سیاحوں کو باسفورس کی سیر کراتی ہیں۔ یہ روشن، جگمگاتی ہوئی کشتیاں اور ان میں بجایا جانے والا میوزک ماحول کو ایک طلسمی کیفیت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ استنبول میں رہ کر آپ کو باسفورس کا کوئی نہ کوئی حصہ نظر نہ آئے۔ باسفورس کے دونوں حصوں کو جوڑنے والا کشادہ پل 1040 میٹر طویل ہے۔ یہ دنیا میں اس قسم کا چوتھا بڑا پل ہے۔ باسفورس کے آس پاس محلات، بلند وبالا خوبصورت عمارتیں، ہوٹل، رہائش گاہیں اور دور تک پھیلے ہوئے شہر کی گلابی چھتوں اور سفید رنگ روغن والی عمارتیں اس نظارے میں کچھ اور اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اس لیے شہر کے مکانات بھی نشیب وفراز میں بنائے گئے ہیں۔

بٹ صاحب بار بار ہر ایک سے پوچھتے رہے کہ وہ سات پہاڑیاں کہاں ہیں جن پر یہ شہر آباد ہے۔

خان صاحب تنگ آکر بولے۔ "بٹ صاحب آپ جس ڈھلوان والی سڑک سے گزر رہے ہیں یہ بھی ایک پہاڑی ہے۔"

ہم لوگ باسفورس برج سے گزرے۔ یہ دو طرفہ ہے اور ہر طرف چار لین پر ٹریفک چلتی رہتی ہے۔ ہم نے یہاں کبھی ٹریفک کا ہجوم یا ٹریفک کی بدنظمی نہیں دیکھی حالانکہ پولیس کا ایک سپاہی بھی نظر نہیں آتا۔ استنبول جرائم سے پاک شہر ہے۔ عموماً لوگ دکانوں اور مکانوں کو تالے نہیں لگاتے۔ کار پارک کر کے اسے مقفل کرنا ضروری نہیں ہے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب انگریزی اخبار کی تلاش میں تھے۔

"انگریزی اخبار کا آپ کیا کریں گے؟"

"اخبار کو پڑھتے ہیں۔ اسے الماریوں میں نہیں بچھاتے۔"

انگریزی اخبار ملا تو یہ دونوں حضرات اس پر ٹوٹ پڑے اور شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ یہاں تک کہ اشتہارات اور اخبار کی پرنٹ لائن بھی پڑھ لی۔

"آپ اخبار میں کیا پڑھ رہے ہیں۔" ہم نے پوچھا۔

"خبریں۔ ہمیں اخبار میں ایک بھی جرم یا قتل کی خبر نہیں ملی۔"

بٹ صاحب بولے۔ "میرا خیال ہے کہ یہ غیر ملکیوں پر اپنے ملک کا بہتر تاثر ڈالنے کے لیے جرائم کی خبریں چھاپتے ہی نہیں ہیں۔"

اس پل سے گزر کر ہم سریار پورٹ پہنچ گئے۔ یہ ایشیا کا حصہ کہلاتا ہے۔ اس کے نزدیک ہی مشہور مسالا بازار واقع ہے۔

مراد بھی اب ہمارے ساتھ ہو گئے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ مسالا بازار ضرور دیکھیے۔

بٹ صاحب بولے۔ "دیکھیے صاحب ہم کو پاکستان

میں مسالا یا تو باورچی خانے میں نظر آتا ہے یا کھانے کی پلیٹ میں۔ بازاروں میں بھی مسالا فروخت ہوتا ہے لیکن یہ کام خواتین کرتی ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "یہ تو اس بازار کا پرانا نام ہے۔ اب تو یہ گرینڈ بازار کہلاتا ہے اور یہاں دنیا بھر کی ہر چیز ملتی ہے۔ کیا آپ کو قالینوں کا شوق ہے؟"

"شوق؟ ارے میں تو قالینوں کا عاشق ہوں۔ میرے گھر میں فرش پر بھی قالین نظر آتے ہیں اور دیواروں پر بھی۔"

مرزا صاحب بولے۔ "تو پھر چھت نے کیا قصور کیا ہے۔ چھت پر آپ نے قالین کیوں نہیں آراستہ کیے۔"

"آپ کے مشورے پر غور کروں گا۔"

ترکی میں ہاتھ کے بنے ہوئے قالین بہت خوبصورت اور مہنگے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ ترکی میں بھی قیمتوں کے معاملے میں لین دین اور کمی بیشی کا رواج ہے۔ اگر ایک قالین کی قیمت دس ہزار طلب کرتے ہیں تو تجربہ کار لوگ وہی قالین دو ہزار میں خرید لیتے ہیں۔

یہ جگہ گولڈن ہارن کے نزدیک ہی ہے۔ دراصل اس جگہ باسفورس ایک خنجر کی شکل میں نظر آتا ہے اس لیے اس کو گولڈن ہارن اور اردو میں سنہری سینگ کہتے ہیں۔

مراد نے یہ تصحیح کی کہ مسالا بازار اور گرینڈ بازار دو الگ الگ بازار ہیں اور دیکھنے کے قابل ہیں۔ آپ کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا خریدیں اور کیا نہ خریدیں۔ قدیم نوادرات کے علاوہ جدید اشیا بھی یہاں مل جاتی ہیں۔

خان صاحب نے فیصلہ کیا کہ بازاروں کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا۔ فی الحال باسفورس کی بحری سیر کے لیے جانا چاہیے۔

بٹ صاحب بولے۔ "نہیں، ہمیں سب سے پہلے توپ کاپی میوزیم جانا چاہیے۔ مراد نے کہا کہ توپ کاپی واقعی قابلِ دید میوزیم ہے لیکن یہ اس قدر لمبا چوڑا ہے کہ اگر صحیح معنوں میں دیکھنا چاہیں تو اس کے لیے کئی دن درکار ہوں گے۔

ہم نے کہا۔ "باسفورس تو ہم نے ہر جگہ سے دیکھ لیا۔ کیوں نہ ہم کوئی نئی اور عجیب و غریب جگہ دیکھیں۔"

"تو پھر ہم آپ کو انڈر گراؤنڈ شہر دکھائیں گے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔ بھائی میں ابھی زندہ ہوں، زندہ درگور نہیں ہونا چاہتا۔"

"فکر نہ کیجیے آپ زندہ درگور نہیں ہوں گے۔ یہ قبریں نہیں ہیں۔ ایک ایسا شہر ہے جو زمین کے اندر بنایا گیا ہے۔"

اس جگہ جانے کے لیے بس یا ہوائی جہاز استعمال ہوتا تھا۔ ہمیں جہاں جانا تھا اس کا نام قیسری ہے۔ ہمارے ملک میں تو خواتین کے ملبوسات کے لیے ایک کپڑا ہے، کیسریا ہے۔ مگر یہ کیسریا نہیں، کیسری ہے۔ اور کیسری ترکی میں زعفرانی کو کہتے ہیں۔ بس بہت اچھی اور صاف ستھری کیونکہ استعمال کرنے والے مسافر بھی بہت شائستہ، تمیز دار اور مہذب ہیں، بسوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی فیکٹری سے بن کر آئی ہے۔

کیسری ایک الگ تھلگ علاقہ ہے۔ مراد نے بتایا کہ یہاں انتہائی قدیم تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ رہتے ہیں جنہیں آپ قبائلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ چار ہزار سال قبل از مسیح سے اس علاقے میں رہتے ہیں لیکن انہوں نے اپنی عادات اطوار اور رسم و رواج میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہی لباس، وہی حلیہ، وہی لمبے لمبے بال۔ ان کی آبادیاں جو قدیم زمانے کی مٹی اور پتھروں کی جھونپڑیوں پر مشتمل ہیں دریائے سرخ کے کنارے آباد واقع ہیں۔ دریائے سرخ کو اس لیے یہ نام دیا گیا ہے کیونکہ پہاڑوں سے بارش میں بہہ کر آنے والی سرخ مٹی اس کے پانی میں شامل ہو جاتی ہے اور یہ دریا ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد بلیک سی میں جا گرتا ہے۔

ہم لوگوں نے ان سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر ان کا رویہ ایسا تھا جیسے ہم انہیں نظر ہی نہیں آ رہے۔ ہماری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی ہم سے نظر ملا بھی لیتا تو ہم لوگوں کے سلام یا سوال کے جواب میں خاموشی سے گزر جاتا تھا۔

بٹ صاحب بولے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ گونگے بہروں کا قبیلہ ہے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "اور ان میں کچھ ایسے بھی شامل ہیں جنہیں ہم نظر ہی نہیں آتے۔"

بٹ صاحب بولے۔ "یہ تو عجیب نسل کے لوگ ہیں یا تو یہ سب مرد ہیں یا سب کی سب عورتیں ہیں۔"

"وہ کیوں؟"

"بھائی، غور سے دیکھ کر بتائیے کہ آپ کو ان میں عورت کون نظر آتی ہے اور مرد کون۔"

ان کی یہ بات کافی حد تک درست تھی۔ سبھی کی چوٹیاں لمبی لمبی تھیں۔ انہوں نے پتوں اور گھاس کا لباس پہنا ہوا تھا۔ شاید یہ ان جانوروں کی کھالیں تھیں جو وہ کھانے کے لیے شکار کرتے تھے۔ ان کے قد و قامت بھی ایک جیسے تھے۔ سبھی مضبوط، تندرست اور لمبے تڑنگے تھے۔ کسی میں عورتوں والی نزاکت نظر نہیں آتی۔

"بھائی یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟" خان صاحب حیران ہو کر بولے۔

"خان صاحب یہ مت بھولیے کہ یہ چار ہزار سال قبل مسیح کے لوگ ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی چار ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہ سچ ہے۔ اتنے ہزار سال کے بعد انسان زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ یار چار ہزار سال تک تو کوئی لوہے کی عمارت بھی قائم نہیں رہ سکتی، یہ تو پھر انسان ہیں۔"

مرزا صاحب نے کہا۔ "میرے خیال میں تو یہ کوئی بھوتوں کی بستی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔"

بٹ صاحب نے فوراً بلند آواز میں لاحول پڑھنی شروع کر دی۔

خان صاحب نے مشورہ دیا۔ "بھوتوں سے بچنے کے لیے لاحول نہیں آعوذ باللہ من شیطان الرجیم پڑھنا چاہیے۔"

ہم نے کہا۔ "جو بھی چاہیں پڑھیں مگر اس مُردوں کی بستی سے تو باہر نکلیں۔"

ہم لوگ لاحول اور مختلف آیات پڑھتے ہوئے یہاں سے نکل پڑے۔ کار میں بیٹھ کر مراد نے کہا۔ "اب آپ یہاں تک آگئے ہیں تو انڈر گراؤنڈ شہر بھی دیکھ لیں۔"

"بھائی آپ کیسی پُراسرار جگہ ہمیں لے کر آئے ہیں۔ یہ تو بھوتوں کی بستی ہے۔ کوئی مُردوں کا شہر ہے۔"

"ارے یہاں مُردے نہیں ہوتے۔ یہ تو ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ بلکہ ایک پُراسرار جگہ ہے۔"

یہ جگہ کیسی ہی ہے۔ خدا جانے کس زبان کا یہ لفظ ہے اور اس کے معنی کیا ہیں۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ ایک انوکھی جگہ ہے۔ یہاں زمین کے اندر ہی اندر زمین کھود کر لمبی لمبی سرنگیں اور عجیب و غریب کمرے بنے ہوئے ہیں۔ آپ نے اگر زمین کے اندر چیونٹیوں کے گھر دیکھے ہوں تو یہ اسی قسم کی جگہ ہے۔ اوپر سے زمین ہموار ہے مگر اس کے اندر سرنگیں اور رہائش گاہیں ہیں جن میں اب کوئی نہیں رہتا۔ یہ چوہے کے بل یا چیونٹیوں کے گھروں جیسی جگہ ہے۔ ان گھروں کی دو دو تین منزلیں بھی ہیں۔ بعد میں کچھ بزرگوں نے ہمیں بتایا کہ ہزاروں سال پہلے لوگوں نے حملہ آوروں یا دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ خفیہ زیرِ زمین شہر آباد کیا ہوگا۔ اس پچاس میٹر طویل سرنگ میں بہت سے گھر ہیں۔ دو منزلہ گھروں تک جانے کے لیے سیڑھیاں بھی ہیں اور ان سیڑھیوں میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کے لیے چمنیاں بھی بنائی گئی ہیں۔ گھروں کی مختلف بالائی منزلوں کو آپس میں ملانے کے لیے بھی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جب انہوں نے یہ شہر بنایا ہوگا تو ظاہر ہے کہ زمین کے اندر تو اندھیرا ہی ہوگا۔ اس اندھیرے میں انہوں نے تیروں یا نیزوں کی مدد سے یہ راستے کھودے ہوں گے۔

آئرزراک (آئرز چٹان)

آسٹریلیا میں الائس سپرنگ سے 280 میل کی دوری پر واقع ایک قدیم چٹان کا نام۔ آسٹریلوی باشندے اسے یولورو Uluru کا نام دیتے ہیں۔ اس چٹان کی بلندی 1142 فٹ یا 348 میٹر، محیط ساڑھے پانچ میل ہے۔ یہ 3.6 کلومیٹر یا 2-1/4 میل لمبی، 2.4 کلومیٹر یا 1-1/4 میل چوڑی ہے۔ اپنے محیط کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی چٹان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چٹان چھ کروڑ سال پرانی ہے۔ اسے عجائباتِ عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ چٹان لوہے کی بھاری مقدار پر مشتمل ہے اور ہوا اور نمی کی وجہ سے اس پر گہرے سبزی مائل بھورے رنگ کی تہ چڑھی ہوئی ہے۔ سورج کی روشنی میں یہ سرخ دکھائی دیتی ہے۔ اسے سب سے پہلے ولیم کرسٹی گوسے نے 1873ء میں سر کیا تھا۔ آسٹریلیا کے حکمران ہنری آئرز کے نام پر اس کا نام آئرزراک رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: مریم اسد، ڈی آئی خان

کیونکہ اس زمانے میں اس مقصد کے لیے جدید ترین آلات اور مشینیں تو نہیں تھیں پھر بھی انہوں نے زمین کے اندر ایک خفیہ پناہ گاہ بنائی جو اُن کے دشمنوں کی نظروں سے اوجھل تھی۔ جو اس شہر میں خطرے کے وقت اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ خدا جانے کھانے پینے کا انہوں نے کیا بندوبست کیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ضرورت کے وقت کے لیے ان کمروں میں کھانے پینے کا سامان ذخیرہ کر لیتے ہوں۔ یہ جگہ واقعی حیران کن اور انتہائی پُراسرار ہے۔

یکایک بٹ صاحب فوجیوں کی طرح تن کر کھڑے ہوئے اور فوجی سلیوٹ مارتے ہوئے کہا۔ ''آئی سلیوٹ یو۔''

''کس کو سلیوٹ کر رہے ہیں آپ؟''

''ان جواں ہمت اور ذہین لوگوں کو جنہوں نے ہزاروں سال پہلے زمین کے اندر یہ شہر بنایا جو آج بھی ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ انسان واقعی اللہ کا خلیفہ ہے۔''

ہم لوگ خدا کی قدرت اور انسان کی عقلمندی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد اس زمین دوز شہر سے باہر آئے تو ہر طرف روشنی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ساحل کی طرف سے آتی ہوئی تازہ ہوا نے ہم سب کے ہوش وحواس بہت جلد بحال کر دیے۔

لوگوں نے مسالا بازار اور گرینڈ بازار دیکھنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا تھا۔ اس شام یا اگلی صبح ازمیر جانے کا ارادہ تھا۔

مراد تو ہم کو اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا تھا مگر جاتے ہوئے اپنا فون نمبر دے گیا اور کہا کہ جب بھی آپ کو میری ضرورت ہو اس نمبر پر ٹیلی فون کر لینا۔ میں الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔

خان صاحب کو یہ فکر تھی کہ ازمیر کے لیے ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کرالی جائیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں سیٹ ہی نہ ملے اور ہمارا پروگرام خراب ہو جائے۔

مرزا صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ''خان صاحب، آپ ہوائی جہاز کی سیٹوں کی فکر نہ کیجیے۔ ترکی میں اندرونی پروازوں کا بندوبست بہت اچھا اور دن کے وقت مختلف شہروں کے لیے ٹرکش کی پروازیں جاری رہتی ہیں۔ آیئے تو کہیں چل کر چائے کافی پیتے ہیں تاکہ طبیعت ہشاش بشاش ہو جائے۔''

یکایک مرزا صاحب نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''اُفوہ کتنی بڑی بھول ہو گئی۔''

کیا ہوا؟ کیا اپنا والٹ زمین دوز شہر میں بھول آئے۔

''نہیں بھائی، مجھ سے بہت بڑی غلطی بلکہ گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ میں بھول ہی گیا کہ سب سے پہلے مجھے آپ کو حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر لے جانا چاہیے تھا۔''

''واقعی، یہ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔'' خان صاحب بولے۔ ''میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا کہ استنبول جا کر سب سے پہلے ہم حضرت ایوب انصاریؓ شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے۔''

''مگر آپ ڈائری پڑھنا بھول گئے۔'' بٹ صاحب طنز آمیز لہجے میں بولے۔ ''ماشاءاللہ کتنا اچھا حافظہ ہے۔''

کوئی استنبول جائے اور حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کی زیارت نہ کرے یہ کیسے ممکن ہے۔ استنبول شہر یوں تو مساجد کا مرکز ہے لیکن یہاں دو مقامات ایسے ہیں جو سب سے زیادہ متبرک اور مقدس ہیں۔ ان میں ایک تو یہ سلطان کی مسجد ہے جو حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار سے متصل ہے۔ بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے۔

یہاں پہنچ کر انسان پر ایک عجیب روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دنیا کے جھمیلوں سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے اور ایک جذب کا عالم طاری ہو گیا ہے۔ گولڈن ہارن سے کچھ فاصلے پر مسجد ابو ایوب ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مقام مسلمانوں کے مقدس ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ گولڈن ہارن یعنی قرنِ زریں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ قرنِ زریں کسی زمانے میں سلطانوں کے کھیلوں اور شہسواری کے لیے بہت کھلا میدان تھا۔ جب آبادی میں اضافہ ہوا اور سلطانوں کا دور بھی ختم ہو گیا تو اس کا پانی گندہ بلکہ دلدل کی طرح ہو گیا ہے جو ایک جھیل میں جا کر گر جاتا ہے۔ اس پانی کو صاف کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ابھی تک اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی ہے لیکن آئندہ چند سالوں میں یہ منصوبہ ضرور پورا ہو جائے گا۔

مسلم زائرین جن میں ہزاروں سیاح اور بے شمار مقامی زائرین بھی ہوتے ہیں، صبح سے رات تک یہاں حاضری دیتے اور فاتحہ پڑھتے نظر آتے ہیں۔ ترکوں کا کہنا ہے کہ سلیمانیہ پُرشوکت ہے، سلطان احمد کی مسجد خوبصورتی میں بے مثال آپ ہے لیکن مسجد ایوب ایک مقدس مقام ہے۔

مزار پر عورتوں اور مردوں کی تعداد تقریباً برابر ہوتی ہے۔ عورتیں سیاہ برقعے پہن کر آتی ہیں۔ یہاں آنے والی

عورتوں کو پہلے ہی ہدایات کر دی جاتی ہیں کہ وہ اس مسجد اور مزار کا پورا خیال رکھیں، مناسب لباس زیب تن کریں۔ یہاں فوٹو بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ خصوصاً نماز پڑھتی خواتین کی تصویر بنانا سخت منع ہے۔ یوں تو مسجد میں شب و روز ہجوم رہتا ہے لیکن جمعہ کے روز تو یہاں عید کا سماں ہوتا ہے۔ مسجد کے آس پاس ہزاروں کبوتروں کا ڈیرا ہے جنہیں آنے والے اپنے ہاتھ سے دانہ ڈالتے ہیں اور یہ کبوتر بھی انسانوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ان کے ہاتھوں، کندھوں اور سروں پر بے تکلفی سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور دانہ چگتے رہتے ہیں۔ یہ کبوتر ہر وقت ان کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں جیسے وہ آنے والوں کا ساتھ ہی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ مسجد ایوب کو سلطان محمد فاتح نے پندرہویں صدی میں تعمیر کرایا تھا۔

حضرت ایوب انصاریؓ کے بارے میں بھی جانتے ہیں جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے وہ انصار میں شامل تھے۔ جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے تشریف لائے تو ہر انصاری کی خواہش تھی کہ وہ ان کے میزبان بنیں لیکن رسول اکرمؐ نے یہ فیصلہ خود کرنے کے بجائے اپنی اونٹنی پر چھوڑ دیا کہ جس گھر کے سامنے یہ اونٹنی بیٹھے گی اسی گھر کو اللہ کے رسولؐ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔ اونٹنی آہستہ آہستہ ہر طرف گھومتی رہی۔ ایک دو جگہ رک بھی گئی مگر آخر حضرت ایوب انصاریؓ کے گھر کے سامنے آ کر بیٹھ گئی تو پھر اٹھی نہیں۔ اس طرح حضرت ایوب کا مرتبہ صرف میزبان رسولؐ کا تھا بلکہ وہ ایک بزرگ اور صاحب تحریر صحابی بھی تھے۔ رسول کریمؐ انہیں سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

رسول اللہؐ نے قسطنطنیہ واستنبول کو مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کرنے کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ کئی سلاطین نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن قلعے کی انتہائی مضبوط دیواروں اور مقامی لوگوں کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت ایوب انصاریؓ اپنی ضعیفی کے باوجود ایک معرکے میں فوج کے ساتھ شریک ہوئے۔ کئی ماہ تک محاصرہ جاری رہا مگر کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ قلعے کے اوپر سے پتھر، تیر بہت تیزی سے برسائے جا رہے تھے۔ وہ قسطنطنیہ کے پہلے محاصرے کے دوران ہی زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔ یہ محاصرہ تو کامیاب نہ رہا لیکن حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار قسطنطنیہ کے قلعے کی دیوار کے باہر بنایا گیا چونکہ عربوں کا عزم تھا کہ ایک دن مسلمان انشاءاللہ قسطنطنیہ کو ضرور فتح کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ سلطان محمد نے بالآخر قسطنطنیہ کو فتح کر لیا اور یہ انتہائی مضبوط و مستحکم شہر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا لیکن حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار شہر کی فصیل کے سائے میں ہی موجود ہے۔ یہ ایک مقدس ترین مقام ہے جہاں لوگ فاتحہ پڑھنے اور مرادیں مانگنے کے لیے آتے ہیں شادی شدہ جوڑے نکاح کے بعد یہاں حاضری دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ اب استنبول کہلاتا ہے۔ ہم نے جب اس شہر کا باقی ماندہ قلعے اور فصیل کا حصہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ اس قدر مضبوط قلعے کو سلطان نے کیسے فتح کر لیا بہرحال وہ ایک علیحدہ داستان ہے۔ لیکن استنبول میں سمندر کے کنارے اس پُرشکوہ اور ناقابلِ تسخیر قلعے کے کافی حصے آج بھی موجود ہیں جنہیں حکومت نے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ استنبول کی بعض اہم شاہراہوں سے گزرتے ہوئے بھی پرانے قلعے کے دروازے اور دیواریں نظر آتے ہیں لیکن اتنی اچھی حالت میں کہ انہیں دیکھ کر رشک آتا ہے۔ ان دروازوں کے نیچے سے کشادہ خوبصورت سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتی ہے۔

خان صاحب نے یہ سب دیکھا تو کہا۔ ''دیکھیے ہم نے اپنے پرانے قلعے کی فصیلوں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا ہے۔ لاہور شہر کے بارہ تاریخی دروازے کاروباری مرکز بن گئے ہیں مگر پرانے تاریخی دروازوں کی طرف نہ حکومت توجہ دیتی ہے نہ شہریوں نے دی۔ لاہور کی بلدیاتی انتظامیہ اور شہریوں کو استنبول آ کر یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ زندہ قومیں اپنی پرانی یادگاروں کو کس طرح سنبھال کر رکھتی ہیں اور ان پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن ہم نیا نو دن پرانا سو دن والا مقولہ بھول چکے ہیں۔ دولت کی ہوس نے ہم کو ہر چیز سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ہمارے قدیمی شہر، تاریخی عمارتیں، نوادرات سے بڑھ کر قیمتی اور ان مول خزانے، دولت کے لالچ میں ہم مسمار کر کے زیادہ پیسا کمانے کے لالچ میں انہیں کمرشل پلازوں اور شاپنگ سینٹرز میں تبدیل کر رہے ہیں کیونکہ تاریخ جائے بھاڑ میں۔ قدیم تاریخی عمارتیں، محلے اور عمارتیں جا رہی ہیں۔ ہمیں تو اس وقت دولت کمانے کا نادر موقع مل رہا ہے نا۔ ہماری حکومتیں اور بلدیاتی ادارے بھی ان کی حفاظت پر توجہ نہیں دیتے۔ پرانے لاہور شہر اور فصیل اور دروازوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ یہ کھنڈر، کباڑ خانے یا تجارتی مرکز

بن چکے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے انہیں جان سے بھی عزیز سمجھ کر اور سینت سینت کر رکھا ہے۔ استنبول کا پرانا علاقہ دیکھیے، قلعہ دیکھیے، قلعے کے دروازے دیکھیے، لگتا ہے جیسے انہیں کوئی بنا سنوار کر رکھتا ہے۔

ہم اطالیہ گئے تو کسی اور کام سے تھے مگر انگریزی جاننے والا ایک ٹیکسی ڈرائیور ہمارا ساتھی بن گیا۔ وہ سارے دن تقاضا کرتا رہا کہ چلیے پرانا شہر تو دیکھیے۔ آخر شام کو کاموں سے فارغ ہو کر ہم اطالیہ کے پرانے شہر میں گئے تو یوں لگا جیسے وقت تھم گیا ہے۔ وہی پرانا ماحول، پرانی گلیاں، بازار، قہوہ خانے درختوں کے سائے میں قہوہ پیتے ہوئے قدیم لباس میں ملبوس لوگ۔ وہی پرانی دکانیں، ہوٹل، عمارتیں لیکن انتہائی صاف ستھری۔ گلیوں میں اپنے گھروں کی دیواروں سے جھانکتی اور ہمسائیوں سے باتیں کرتی ہوئی عورتیں۔ کمال ہے۔ واقعی اگر ہم یہ پرانا شہر نہ دیکھتے تو پرانے ترکی کی تصویر نہیں دیکھ سکتے تھے۔

پیرس، لندن، روم اور دنیا کے دوسرے ممالک نے اپنی پرانی عمارتوں کو چھیڑا تک نہیں ہے۔ انتہائی قیمتی علاقوں میں وہی پرانے طرز کی دو منزلہ عمارتیں۔ نئے شہر انہوں نے ان حدود سے باہر آباد کیے ہیں تاکہ قدیم ماحول پراگندہ نہ ہو۔ عمارت کی بیرونی عمارت میں تبدیلی پر جرمانہ ہوتا ہے اور اس کو دوبارہ اپنے خرچے پر ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان کے اندر آپ جو چاہیں تبدیلیاں کریں لیکن بیرونی حصے برآمدے، ستون، دروازے وہی پرانے لیکن نئی حالت میں۔ پرانے علاقوں کے سفر معلوماتی اور پُرلطف ضرور ہوتے ہیں لیکن وہاں جا کر اپنی پسماندگی، ناقدری کا احساس شدت سے ہوتا ہے اور دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔

استنبول صحیح معنوں میں مشرق اور مغرب کا امتزاج ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب معاشرہ ہے جس میں ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ سڑکوں اور تمام مقامات پر آپ کو جینز میں ملبوس خواتین بھی اپنی تراشی ہوئی زلفیں لہراتی نظر آجائیں گی۔ مغربی اسکرٹ اور بلاؤز بھی عورتوں کا پسندیدہ لباس ہے۔ بہت سی عورتیں سروں کو رومالوں سے ڈھانپے نظر آتی ہیں۔ عبا اور برقع پوش خواتین بھی استنبول میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ یہاں پانچ سو سے زائد مساجد ہیں جو نمازیوں سے بھری رہتی ہیں۔ گرجا گھروں کو اتوار کے روز عورتوں مردوں اور بچوں کے قافلے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مقدس مزارات بھی

ہیں اور شراب خانے بھی کھلے ہوئے ہیں مگر کسی کو بہکتے لڑکھڑاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی ٹہلنے نکلتا ہے تو خوش مزاج اور خوش اخلاق پولیس کا سپاہی اچانک کہیں سے نمودار ہو جائے گا اور بہکنے والے کو بڑے پیار سے اپنے ساتھ لے جا کر اس کی کار میں یا پھر پولیس کار میں بٹھا کر اس کے گھر پہنچا دے گا۔

ہم لوگ تو خیر پہلی مرتبہ یہ منظر دیکھ کر کچھ حیران ہوئے تھے لیکن بٹ صاحب کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ معاہدے کے مطابق مسلسل لاحول پڑھتے رہے اور مشرقی لباس میں ملبوس خواتین کو دیکھ کر سبحان اللہ کہا کرتے تھے۔

”بھئی، یہ کیا اسلامی ملک ہے۔ ان مادر پدر آزاد عورتوں کو روکنے والا کوئی نہیں ہے؟“

خان صاحب نے کہا۔ ”بٹ صاحب دراصل یہاں ہر فرقے کے علما نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی کو حکومت کی اجازت کے بغیر کسی کے خلاف اعتراض کرنے یا فتویٰ دینے کا حق ہے۔ وہ صرف مسجدوں میں اسلامی تعلیمات دے سکتے ہیں۔ فرقہ واریت یا نفرت پھیلانا جرم ہے۔ سیاست کے بارے میں بھی علما تبصرہ نہیں کر سکتے، نہ ہی اپنی سیاسی پارٹی بنا سکتے ہیں اور نہ ہی الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”مرزا صاحب اور مراد نے ...“ ”اگر یقین نہ ہو تو آپ خود تصدیق کر لیجیے۔“

”بھئی مجھے تو آپ پر پورا یقین ہے، سچ کہہ رہے ہیں یا جھوٹ۔“

”بٹ صاحب، مجھے آپ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”کچھ لوگوں کی عادت جھوٹ بولنے کی ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ کو بھی سچ سمجھ کر ہی بولتے ہیں۔“

سب کا خیال تھا کہ اب بھی ہوٹل واپس جانا چاہیے لیکن خان صاحب اور بٹ صاحب کی فرمائش تھی کہ ایک بار باسفورس کی سیر اور کر لیں۔ باسفورس کی سیر تو ہمیں بہت اچھی لگی تھی مگر تھک گئے تھے پھر سوچا کہ باسفورس کی تازہ ہوا اور خوشنما مناظر بار بار دیکھنے کو تو شاید نہ ملیں۔ باسفورس کی سیر کشتی اور فیری میں کرنے کا بھی رواج ہے۔ یہ فیری نما کشتی کیٹامران کہلاتی ہے۔

ایک ٹورسٹ پورٹ وہ مقبول جگہ ہے جہاں سے باسفورس جانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ بے حد صاف ستھری اور خوبصورت جگہ ہے جسے پنجابی میں پتن کہتے ہیں۔ یہاں سیاحوں اور مقامی لوگوں کا ہر وقت مجمع لگا رہتا ہے۔ اس کو ٹرک پورٹ بھی کہتے ہیں۔

بٹ صاحب بولے۔ ”بھئی ہم تو باہر سے آئے ہیں یہ مقامی لوگ ہر وقت باسفورس کی سیر کرنے کے لیے کیوں تیار رہتے ہیں۔“

ہم لوگ بھی ٹکٹ خرید کر کیٹامران (فیری) میں سوار ہو گئے۔ عرشے پر قدم رکھتے ہی تازہ ہوا نے جادو کا اثر کیا، ساری تھکن ... غائب ہو گئی۔ اب سمندر کی ہوا تھی اور آس پاس کے حسین مناظر۔ باسفورس کی سیر کرتے ہوئے ساحل پر بنے ہوئے محلات بے حد دلکش لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر محلوں سے باسفورس کو دیکھا جائے تو یہ منظر بھی قابل دید بلکہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ہم نے یورپ میں بھی فیری میں سفر کیے ہیں مگر یہ حسن اور جاذبیت کہیں نظر نہیں آتی۔

خان صاحب شہر کی خوشحالی دیکھ کر بہت حیران اور خوش تھے۔

ہم نے کہا۔ ”بھائی، اتنی معمولی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہاں کے سیاسی رہنما اور حکمران کرپشن نہیں کرتے۔ نہ ہی وہ اپنی جائز اور ناجائز دولت بیرونی ملکوں میں رکھتے ہیں۔ نہ ہی ان کے بچے دوسرے ملکوں میں تعلیم حاصل کر کے وہیں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے ملک میں کیڑے بھی نہیں ڈالتے۔ وزیراعظم اور دوسرے حکمران سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ملک کے لیے اور اپنے لیے کفایت شعاری کرتے ہیں۔ یہاں پیسے اور پیشے کے حوالے سے کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے۔ چھوٹے اور غریب آدمی بھی بڑے لوگوں سے بے تکلفی سے بات چیت کرتے ہیں۔ یہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ہر شخص دوسرے کا شکریہ ادا کرتا رہتا ہے۔ مرحبا اور خوش آمدید کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔“

بٹ صاحب نے فوراً بات کاٹ دی۔ ”بس بس، بہت ہو گئی تم نے تو ریکارڈ ہی چلانا شروع کر دیا مگر آپ جو کہہ رہے ہیں سو فیصد سچ ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”... کیا ہمارا ملک بھی کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی امیر غریب اور چھوٹے بڑے کی

تفریق مٹ جائے۔"

"بس کرو بھائی، اب تم اپنا ریکارڈ نہ شروع کر دینا۔ تم دونوں تو اس وقت گراموفون لگ رہے ہو۔" بٹ صاحب بولے۔

"ہاں اور آپ مجھے گراموفون کے سامنے بیٹھ کر گانا سننے والے ڈاگی لگ رہے ہیں۔"

"سنبھل کر بات کیجیے۔ آپ مجھے کتا کہہ رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں، میں نے تو ڈاگی کہا ہے۔ کتنا پیارا لفظ ہے۔ انگریز تو اپنے ڈاگی پر جان دیتے ہیں۔ اپنی ساری جائداد اس کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔"

یہ بحث ہم لوگوں نے خود ہی بند کر دی چونکہ عرشے پر خوب رونق اور گہما گہمی ہو گئی تھی۔ شاید سبھی لوگ ٹھنڈی ہوا کھانے کے لیے اور باسفورس میں روشنی کے چلتے پھرتے جہاز دیکھ کر دل خوش کرنے نکل آئے تھے۔

بٹ صاحب بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب کو شاید لاحول پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا۔"

بٹ صاحب۔ "آپ شوق فرمائیے۔ ذرا ادھر اُدھر نظر دوڑائیے۔"

بٹ صاحب تو جیسے ہماری اجازت کے منتظر تھے۔ انہوں نے گلے میں لٹکا ہوا معمولی سا کیمرا سنبھالا اور تصویریں بنانے کے بہانے خواتین کے مجمع میں گھس گئے۔ چند تصاویر بنانے کے بعد آئے اور بولے۔ "آفاقی صاحب، یقین کیجیے یہاں تو لاحول پڑھنے کا بہت سامان ہے۔ ویسے سبحان اللہ کی بھی کافی گنجائش ہے۔"

ہم نے کہا۔ "تو پھر جاؤ، اپنی ڈیوٹی پوری کرو۔"

وہ فوراً رخصت ہو گئے۔

کچھ دیر بعد بہت خوش خوش آئے، کہنے لگے۔ "ماشا اللہ! بڑی اچھی جگہ ہے یہ تو۔ اگر استنبول میں کہیں بھی نہ جائیں اور باسفورس کی سیر کو آ جائیں تو کافی ہے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "آفاقی صاحب، آپ تو کہتے تھے کہ ترک پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں مگر یہاں تو کوئی ہمیں گھاس ہی نہیں ڈال رہا۔"

ہم نے کہا۔ "خان صاحب کیا آپ نے کسی کو بتایا ہے کہ پاکستانی ہیں۔ آپ اپنے ماتھے پر ایک بورڈ لکھوا لیجیے کہ میں پاکستانی ہوں تو پھر آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

کہنے لگے۔ "واقعی بہت اچھا خیال ہے مگر فیری پر تو بورڈ بنانے والا ملے گا نہیں۔ استنبول واپس چل کر سب سے پہلا کام یہی کریں گے۔"

اور بٹ صاحب اپنے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور ایک طرح مغرب زدہ لڑکی کو اکیلا دیکھ کر اس کے پاس پہنچ گئے۔

"ایکسکیوز می، کیا آپ تکلیف کر کے میری دو چار تصویریں بنا سکتی ہیں؟"

اتفاق سے وہ انگریزی بھی جانتی تھیں۔ فوراً رضا مند ہو گئیں۔ "آف کورس، میرے لیے باعث مسرت ہو گا۔"

لڑکی نے ان کی چند تصاویر بنائیں پھر بولی۔ "آپ سینٹرل ایشیا یا اٹلی سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"جی نہیں، میں پاکستانی ہوں۔"

لڑکی نے بے اختیار ان سے ہاتھ ملایا۔ "اوہ پاکستان! برادر۔"

بٹ صاحب نے فوراً ان سے کہا۔ "میرے ساتھ دوسرے پاکستانی دوست بھی ہیں۔ آیئے ان سے بھی ملیے۔"

وہ فوراً چل پڑیں۔ پوچھنے لگیں۔ "آپ تو بہت گورے ہیں۔ یورپین لگتے ہیں۔"

"دراصل میں کشمیری ہوں۔ کشمیر کو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بھی کہا جاتا ہے۔ کشمیر کو سب دنیا کی جنت کہتے ہیں مگر ہندوستان نے ہمارے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"ہاں، مجھے معلوم ہے۔ کیا سارے پاکستانی ایسے ہی گورے چٹے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔"

"دراصل پاکستان میں کئی نسلیں آباد ہیں، مثلاً ایرانی، یونانی، افغانی، ترک۔ پاکستانی ان سب کی کاک ٹیل ہے۔"

"ہاؤ ناکس! واقعی وہ تو دیکھنے کے لائق ملک ہے۔"

"پاکستان بھی دنیا کا خوبصورت ترین ملک ہے۔ پہاڑ، دریا، چشمے، ندیاں، سرسبز وادیاں، سمندر، جھیلیں کیا کچھ نہیں ہے پاکستان میں، اور وہاں ہر موسم ہوتا ہے۔ گرمیوں میں گرمی، سردیوں میں سردی، برسات میں بارش، خزاں کے زمانے میں خزاں اور وہاں بہار کا موسم بھی ہوتا ہے۔ ہر موسم میں پھول کھلتے ہیں اور ہاں، پاکستان میں سمندر بھی ہے۔"

"پھر تو میں پاکستان ضرور دیکھوں گی۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ہمارے پاس آ گئے۔

(جاری ہے)
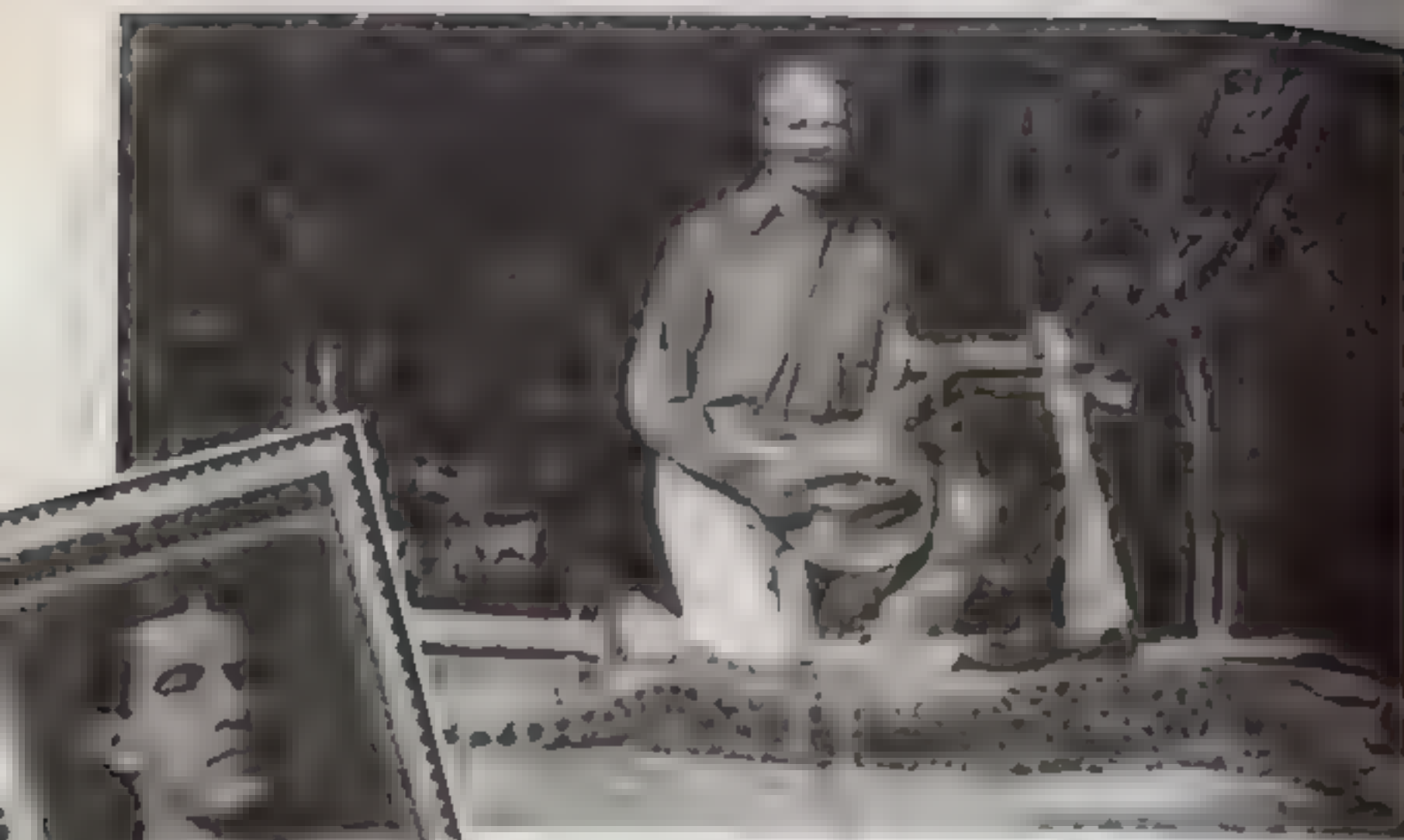
مہا شکاری

اقبال احمد

اس کا نام سنتے ہی ذہن میں آدم خور شیروں کی شبیہ ابھر آتی ہے کیونکہ اس نے برصغیر میں آدم خور شیروں کے شکار کی ایک تاریخ مرتب کی ہے۔ اس نے ہی برصغیر کے جنگلوں کی پہچان عالمی طور پر کرائی۔ بلاشبہ وہ مہا شکاری تھا۔ اس کی داستانِ شکار تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو کر مقبولیت کے اوج پر پہنچی۔

ایک عالمی شہرت یافتہ شکاری کا مختصر سا تذکرہ

جم کاربٹ کو مرے ہوئے حالانکہ 138 برس گزر چکے ہیں، لیکن وہ اب بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ خاص طور پر کماؤں اور گڑھوال کے لوگ اسے تا قیامت فراموش نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہ ایک مہا شکاری تھا جس نے زندگی کو اجیرن کرنے والے درندوں سے انہیں بچایا تھا۔ اس کے علاوہ ساری دنیا اس کے کارناموں کی بنا پر اس کی شیدائی ہے۔ ایک ریکارڈ کے مطابق اس نے 33 آدم خوروں کو موت کے گھاٹ اتارا جنہوں نے مجموعی

طور ڈیڑھ ہزار افراد کو لقمہ تر بنایا تھا۔

ایڈورڈ جیمز کاربٹ 25 جولائی 1875ء کو نینی تال کے علاقے نگلش میں پیدا ہوا تھا۔ جم کاربٹ کا خاندان تیرہ افراد پر مشتمل تھا۔ ترتیب کے اعتبار سے جم کا نمبر آٹھواں تھا۔ اس کا باپ ولیم کرسٹوفر کاربٹ اور ماں میری جین کاربٹ تھی۔ ان کا خاندان آئرلینڈ سے 1862ء میں ہجرت کرکے برٹش انڈیا آیا تھا۔

نینی تال ایک خوب صورت پہاڑ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ ہے۔ آباد علاقے کے درمیان اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی کئی میل لمبی اور چوڑی ایک جھیل ہے جس کی گہرائی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چاروں طرف اوپر سے نیچے تک پہاڑوں پر رہائشی مکانات بنے ہوئے ہیں۔ جن کی روشنیوں کا عکس رات کے وقت نہایت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے۔ فضا شیشم، چیڑ اور مختلف قسم کے پہاڑی درختوں اور پودوں کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ بے شمار لوگ موسم گرما میں تبدیلی آب و ہوا اور پُرسکون وقت گزارنے کے لیے آتے ہیں۔

ولیم کاربٹ نے پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔ اس وقت اس عہدے کی عزت تھی اور تنخواہ بھی معقول تھی۔ آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ جاڑوں میں یہ خاندان ہمالیہ کی ترائی میں چلا جاتا تھا، جہاں ان کا ایک کاٹیج ''اروونڈل'' کے نام سے تھا۔ اب اس جگہ کا نام تبدیل کرکے کالا ڈھنگی رکھ دیا گیا ہے۔ (اب اس کاٹیج کو حکومت انڈیا نے شائقین کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور عجائب گھر بنا دیا ہے)

جب جم کی عمر صرف 4 برس تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کے بڑے بھائی ٹام نے نینی تال کے پوسٹ آفس میں اپنے باپ کی جگہ پر پوسٹ ماسٹر کا عہدہ سنبھال لیا۔ وہ بہرحال کم عمر تھا، مگر اس نے ایک بڑے کنبے کا بار سنبھال لیا۔ وہ کم عمر تو تھا، لیکن باحوصلہ اور بلند ارادہ بھی تھا۔ حیرت انگیز بات ہے کہ ٹام نے محض چھ برس کی عمر میں ایک چیتا شکار کیا تھا۔ ٹام کی بینائی غیر معمولی طور پر تیز تھی اور وہ کافی فاصلے کی چیزیں آسانی سے دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس طرح سے وہ انتہائی خفیف سے خفیف آوازیں بھی سننے پر قادر تھا۔ اس کی یادداشت عمدہ تھی۔ اس کا مشاہدہ دوسروں سے سوا تھا اور وہ قدرتی طور پر عام لوگوں کی نسبت زیادہ حوصلہ مند اور نڈر تھا۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے موسیقی اور گائیکی کی طرف توجہ دی تو اس میں بھی نام پیدا کیا۔ اکتسابی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 22 سال کی عمر میں اس نے شمالی مشرقی ریلوے بہار میں ملازمت کرلی۔ اس کے علاوہ نینی تال میں اس نے کافی عرصے تک جائداد کا کاروبار بھی کیا۔

وہ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں شریک ہوا اور اس نے جنگ سے بے پناہ تجربات حاصل کیے۔ عہدے کے اعتبار سے وہ لیفٹیننٹ کرنل تھا اور جنگل میں جانے والے فوجیوں کے دستے تیار کیا کرتا اور انہیں خصوصی تربیت دیا کرتا تھا۔ ان خدمات کے صلے میں اسے متعدد اعزازات اور میڈلز سے نوازا گیا۔

☆☆☆

جم کی ماں کو اپنے شوہر کی وفات سے دلی صدمہ ہوا۔ اسے اب تیرہ بچوں کو نہ صرف یہ کہ پروان چڑھانا تھا، بلکہ انہیں زیور تعلیم سے بھی آراستہ کرنا تھا۔ جب کہ حکومت سے ملنے والی پنشن بے حد قلیل تھی۔ جم کا کہنا تھا ''میری ماں کوئی معمولی خاتون نہیں تھیں۔ ان میں جون آف آرک کا سا حوصلہ اور حالات سے مقابلہ کرنے کی بے پناہ جرات تھی۔''

1924ء میں جب اس کی ماں جین کاربٹ کا انتقال ہو گیا تو گھر کو اس کی ہمشیرہ میگی نے سنبھال لیا۔ جم اور اس کی بہن میگی نے طے کیا کہ انہیں اپنے خاندان کی کفالت کرنا ہے، اس لیے وہ دونوں شادی نہیں کریں گے۔ اپنی ماں کی طرح میگی میں بھی حوصلے اور عزم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس موقع پر وہ پیچھے ہٹ گئی تو ان کے خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اسے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر سب کی کفالت کرنی ہے۔ کام کرنا اور دوسروں کے کام آنا اس کے خمیر میں شامل تھا۔ ہر چند کہ وہ ڈاکٹرنی یا حکیم نہیں تھی لیکن اس نے ایک حکیم کے ساتھ چند ماہ بیٹھ کر امراض کی شناخت اور دوا دینا سیکھ لی۔ چنانچہ وہ غریب اور مفلس عورتوں کا علاج مفت کیا کرتی تھی۔ جنگ عظیم کے دوران میگی کالا ڈھنگی والے کاٹیج میں تنہا رہتی تھی۔ اس کے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی جب کہ قریب ترین آبادی چودہ میل دور تھی لیکن اپنی حفاظت کے لیے جم کو بھی پریشانی نہیں ہوئی اس لیے کہ اسے اپنے ہندوستان کے غریب لوگوں پر بھروسا تھا۔

کالا ڈھنگی کے چاروں طرف جنگل تھا جہاں درندے بھی گھومتے پھرتے تھے۔ جم چونکہ سیلانی طبیعت کا مالک تھا، اس لیے زیادہ تر وقت گھومنے پھرنے میں گزرتا۔ اسے پرندوں کے انڈے جمع کرکے کھانے کا شوق تھا۔ اس کے بڑے بھائی ٹام کو شکاریات سے شغف تھا اور سبھی کو بخوبی معلوم تھا کہ وہی اسے اچھی رہنمائی کرسکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے چھوٹے بھائی جم کی تربیت کی اور اسے شکاریات کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا۔

میگی کو شکاریات سے دلچسپی نہیں تھی، البتہ وہ قدرت کے حسین مناظر کو دیکھنے کی دیوانی تھی۔ وہ جم کو اپنے ساتھ لے کر جنگل میں گھومتی رہتی اور اسے جانوروں کے نام بتایا کرتی تھی۔ جم جنگل سے اتنا شناسا ہو گیا تھا کہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی آوازیں اپنے منہ سے نکالا کرتا تھا۔ دلچسپ بات یہ کہ پرندے اس کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے بچپن ہی میں جان لیا تھا کہ اس علاقے میں ایک سو اٹھ قسم کی چڑیاں رہتی ہیں۔

اپنی اس تکنیک کو اس نے شیروں کو شکار کرنے میں بھی استعمال کیا۔ جب جم شیرنی کی آواز اپنے منہ سے نکالا کرتا تھا تو شیر اس کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے پھر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے چڑیوں کی بولی کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ اگر کوئی چیتا یا شیر میری طرف آرہا ہوتا تو میں چڑیوں کی آواز سن کر اندازہ کرلیا کرتا تھا کہ کوئی درندہ اس طرف قدم رنجہ فرما رہا ہے، لہٰذا اپنی بندوق کی نال اس طرف کر دیتا اور چیمبر کو گولیوں سے بھر لیتا تاکہ آنے والے کی بھرپور خاطر تواضع کرسکوں۔

تھوڑے دنوں کے بعد جم کی واقفیت ایک شوقیہ شکاری سے ہو گئی، جس کا نام کنور سنگھ تھا۔ وہ لائسنس کے بغیر شکار کیا کرتا تھا۔ کنور سنگھ ذات کا ٹھاکر اور چاندنی گاؤں کا مکھیا تھا۔ جم نے اس کے بارے میں لکھا ''وہ اچھا آدمی تھا یا برا مجھے نہیں معلوم، جو بات اس کی پسند آئی وہ یہ تھی کہ کالا ڈھنگی کا واحد اور نہایت کامیاب ہانکا دینے والا تھا اور میرے بڑے بھائی ٹام کا شیدائی تھا۔ ٹام کے ساتھ اس نے بہت شکار کیا تھا۔''

وہ اور دوسرے گورے لڑکے کالا ڈھنگی کے جنگلات میں گھوما کرتے تھے اور مقامی بچوں کے ساتھ گھل مل جاتے تھے جس کے نتیجے میں انہیں ہندوستانی بولیوں سے بڑی حد تک واقفیت ہو گئی تھی۔ جم کو سارے انڈیا میں کہیں بھی زبان سمجھنے میں پریشانی نہیں اٹھانا پڑی۔ ان کے عادات، رہن سہن اور طور طریق سے کم حقہ واقفیت کی بنا پر وہ لوگوں میں بلاتکلف گھل مل جایا کرتا اور انہیں دوست بنا لیا کرتا تھا۔

تعلیم بہرحال اس کے لیے اہمیت رکھتی تھی، اس لیے جم نے اوک اوپننگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ اسکول بعد میں فلینڈرا ستھم کالج نینی تال میں ضم کر دیا گیا۔ پھر اس کا نام ہالٹ دار اسکول پڑ گیا۔ آج کل اسے برلا ودیا مندر نینی تال کہتے ہیں۔ جب جم کی عمر 19 برس ہو گئی تو اس نے اسکول چھوڑ دیا، اس لیے کہ گھر کے حالات درست ہونے میں ہی نہیں آرہے تھے۔ تیرہ بچے کہاں سے کھاتے پیتے؟ اس کے علاوہ ان کی تعلیم کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے؟

اس نے شمال مشرق ریلوے میں ملازمت کرلی اور مانک پور (پنجاب) میں فیول انسپکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ آگے کی کہانی خود اس کی زبانی سنیے۔

''میں نے فیول انسپکٹر کی حیثیت سے ریلوے کے محکمے میں ملازمت کرلی تو اٹھارہ ماہ جنگل میں گزارنا پڑے۔ وہاں ... میں نے پانچ لاکھ مربع فٹ شیشم کی لکڑی کٹوائی جو ایندھن کے طور پر بھاپ سے چلنے والے انجنوں میں جلائی جاتی تھی۔ درختوں کو کاٹ کر انہیں گرایا جاتا تھا اور اس کے بعد سکھا کر ان کے ٹکڑے کر دیے جاتے۔ ان ٹکڑوں کی لمبائی چھتیس انچ سے زیادہ نہ ہوتی۔ پھر انہیں بیل گاڑیوں پر لادا جاتا اور دس میل دور اسٹیشن پر بھجوا دیا جاتا۔ وہاں ان کا ذخیرہ ہوتا اس کے بعد پیمائش کرکے وہاں سے انہیں ریل کے ڈبوں میں لاد کر جہاں جہاں لکڑی کے ایندھن کی ضرورت ہوتی بھجوا دیا جاتا۔

وہ اٹھارہ مہینے میرے لیے تکلیف دہ تھے، اس لیے کہ میں جنگل میں تنہا تھا۔ دور و نزدیک کوئی نہیں، بس اپنا کام کیے جاؤ۔ مگر میری صحت ٹھیک تھی، اس لیے کام میں دل لگا رہا۔ اس کے علاوہ جنگل میں شکار بھی تھا۔ بارہ سنگھا، جنگلی مرغی اور سور کافی تعداد میں تھے۔ جنگل کے کنارے دریا تھا جہاں سے مچھلیاں مل جاتی تھیں۔ چاندنی راتوں میں مچھلی کا شکار کھیلنا کافی رومان پرور ہوتا ہے۔

جنگل کے کافی جانور مجھ سے مانوس تھے، وہ میری چھولداری میں آجاتے اور ہفتوں وہاں پڑے رہتے۔ جب بچے جوان ہو جاتے تو انہیں خود ہی جنگل میں چھوڑ آتا یا وہ چلے جاتے۔ البتہ بارہ سنگھے کے ایک بچے نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، غالباً اسے مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔

وہ انسانوں میں رہتا تھا، اس لیے اسے انسانوں سے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ ایک روز میں ڈیوٹی سے واپس آیا تو میں نے اسے اپنے بستر کے قریب بیٹھے پایا۔ اس کے دونوں پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک

رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مجھے اطلاع مل گئی کہ کسی شخص نے اسے جنگلی سمجھتے ہوئے ڈنڈا مار دیا تھا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہ شخص بھی آ گیا۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ معافی مانگنے کے لیے آیا ہے۔ میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اندر آ کر اس نے بتایا کہ وہ جنگل کی طرف سے اس کے کھیت میں آ گیا تھا۔ اس نے ڈنڈا مار کر اسے بھگانا چاہا۔ جب وہ زخمی ہو گیا تو اس کا پیچھا کیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اس چھولداری میں داخل ہوا تو احساس ہوا کہ بارہ سنگھا پالتو ہے۔

اس شخص مالک رام نے کہا کہ دوسرے دن وہ ایک اور شخص کو ساتھ لائے گا جو ہڈیاں جوڑنے کا ماہر ہے۔ میں نے بارہ سنگھے کو بستر پر لٹا دیا اور دودھ پلایا۔ دوسرے دن مالک رام اس شخص سکینہ کو لے آیا۔ اسے حکمت کا تجربہ تھا اور یہ بات اس کے چہرے پر بھی لکھی تھی۔ اس نے مجھ سے سنجیدگی اور بردباری سے بات کی۔ اس کے کپڑوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مفلس اور نادار ہے۔

اس نے بارہ سنگھے کے پاؤں کا معائنہ کیا اور کہا کہ وہ دو گھنٹے کے بعد آئے گا۔ اپنے کہنے کے مطابق وہ دو گھنٹے کے بعد سن کے ڈنٹھل لے کر آ گیا۔ جن کے اوپر سے اس نے چھلکا اتار دیا تھا۔ کسی چیز کی لئی اور ارنڈ کی پتیاں، اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا کچھ۔

میں بارہ سنگھے کو گود میں لے کر بیٹھ گیا تو سکینہ نے بتایا کہ اس کے پیروں کی ہڈیاں اس کے گھٹنوں اور کمر کے درمیان سے ٹوٹی تھیں اور مجروح مقامات کی کھال چھل... گئی تھی۔ سکینہ نے نہایت آہستگی سے بل سیدھے کیے اور پھر گھٹنوں سے کمروں تک لئی لگا دی۔ پھر ارنڈی کے پتے رکھ کر ڈنٹھلوں کو زخموں پر سیٹ کر کے سن کی رسی سے باندھ دیا۔

دوسرے روز اس نے پٹیاں تبدیل کر دیں۔ یہ سلسلہ چار دن تک چلتا رہا۔ چوتھے دن اس نے لکڑی کی پھچیاں زخموں پر باندھ دیں تو بارہ سنگھا اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔

اس شخص سکینہ کی اجرت ایک روپیہ تھی، جو میں نے اسے ادا کی۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ دو روز بعد بارہ سنگھا اچھلنے کودنے لگا تو مجھے از حد خوشی ہوئی۔

میں نے اب تک جو کام کیا تھا میں اس سے لطف اندوز ہوا تھا۔ جب کام ختم ہو گیا اور لکڑی کے بجائے کوئلے کے انجن استعمال کیے جانے لگے تو میرا کام بھی ختم ہو گیا۔ میرے حساب کی کتاب بالکل درست تھی اور میرا ضمیر بھی مطمئن تھا۔

میں صبح نو بجے سمستی پور پہنچ گیا۔ پہلے تو چپراسی نے بتایا کہ صاحب مصروف ہیں۔ پھر نصف گھنٹے کے بعد مسٹر اکبر تک جانے کی اجازت دے دی۔ وہ لوکوموٹو ڈیپارٹمنٹ، نارتھ ویسٹرن ریلوے کے سب سے بڑے افسر تھے۔ انہوں نے نہایت عرق ریزی سے میرا حساب کتاب چیک کیا۔ میں نے کتنی لکڑی کٹوائی اور کہاں کہاں بھیجی۔ اس کے بعد مجھ سے کہنے لگے کہ اب ادارے کو آپ کی ضرورت نہیں ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔ اس کے احکامات آپ کو کسی دن مل جائیں گے۔ میں نے اپنا ہیٹ اٹھایا اور ان سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

ایک ہفتے بعد ریلوے کی طرف سے خط ملا کہ ابھی مجھے رخصت نہیں کیا جا رہا ہے، میں کام جاری رکھوں، لیکن اس کی نوعیت مختلف ہو گی۔ میں مزید ایک برس تک ریلوے کے مختلف کام نمٹاتا رہا۔ اس کے بعد ہدایت دی گئی کہ میں مکمہ گھاٹ جا کر کشتیوں کے سپرنٹنڈنٹ اسٹور سے ملوں۔

نارتھ ویسٹرن ریلوے گنگا کی وادی کے درمیان سے گزرتی تھی۔ وہ دریا تک جا کر ختم ہو جاتی اس کے بعد اس کا انجن کشتیوں کے ذریعے دوسرے کنارے تک پہنچا دیا جاتا۔ وہاں ایک لائن پہلے سے بنی ہوئی تھی۔ وہ انجن اس پر چلنے لگتا۔ اس کا مال کشتیوں کے ذریعے ہی دوسری طرف پہنچا دیا جاتا۔

میں سمستی پور سے علی الصباح روانہ ہوا اور چھوٹی لائن کے آخری اسٹیشن پہنچ کر ایس ایس گورکھپور نامی کشتی میں سوار ہوا۔ اسٹور انچارج کو میری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ وہ ریلوے کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میں نے اسٹور اور شیڈز کا اچھی طرح سے معائنہ کیا۔ شیڈز کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ بہت بڑی تعداد میں مال بھرا ہوا ہے جو دوسرے کنارے پر نہیں پہنچ سکا۔ کاروبار معطل ہو چکا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ مکمہ گھاٹ میں مجھے نگران انسپکٹر کی حیثیت سے متعین کیا گیا ہے۔ میرا کام یہ ہو گا کہ میں مال کو دریا کے دوسرے کنارے اتروا کر مال گاڑی میں لدواؤں۔ میری تنخواہ سو روپے سے بڑھا کر ڈیڑھ سو روپے کر دی گئی ہے۔

مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ کیسا کام ہے اور کس انداز سے کرنا ہو گا۔ پھر یہ کہ مزدور کہاں سے آئیں گے؟ وہاں کا انچارج جوزف نامی شخص تھا۔

اس نے بتایا کہ سامان کو ایک کنارے سے دوسرے تک پہنچانے کے لیے اسٹیمر اور بادبانی کشتیاں تھیں۔ اس کے علاوہ مال گاڑی کے ڈبے بھی کشتیوں میں لاد کر ریلوے کے دوسرے کنارے تک لائے جاتے تھے۔ مجھے اس کام کی نگرانی کرنا تھی۔ اس نے کہا کہ فصل کٹنے کے دوران مزدوروں کی کمی کی وجہ سے سامان کی نکاسی نہیں ہو پاتی اور ڈھیر لگ جاتے تھے۔ اس نے کہا کہ اس وقت بھی اتنا سامان شیڈز میں رکھا ہے کہ مال گاڑی کے چار سو ڈبوں میں آ جائے گا جو بے کار کھڑے ہیں۔ اور ایک سو ڈبے دوسرے کنارے پر ہیں تاکہ انہیں کشتیوں پر ادھر لایا جائے۔

میری عمر اس وقت اکیس برس تھی۔ جوزف نے مشورہ دیا کہ میں سمریا گھاٹ جا کر وہاں سے سیدھا گورکھ پور جاؤں اور متعلقہ حکام سے کہہ دوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

دوسرے دن میں سمریا گھاٹ تو نہیں گیا، لیکن میں نے شیڈز کا غور سے معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جوزف نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ شیڈز میں تقریباً پندرہ ہزار ٹن سامان جمع تھا۔ جسے دوسرے کنارے تک پہنچانا مذاق نہیں تھا۔ اب گرمیوں کا موسم آنے والا تھا اور اس موسم میں کام کرنا ایک عذاب تھا مگر میں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا اور تہیہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، اسے کر کے رہوں گا۔

میرا دائرہ کار دوسرے کنارے تک تھا۔ میں نے ایک روز پہلے سے ملاقات میں لگایا۔ اس کے بعد مزدوروں سے ملا جو لیبر کمپنی کے تحت کام کرتے تھے۔ ان سب کی کنٹرولنگ سال کمپنی تھی۔

میں نے کچھ اشخاص کو نمبردار مقرر کیا اور ان سے مزدوروں کو لانے کا کہا۔ جن میں عورتیں اور مرد شامل تھے۔ میں نے گورکھ پور ہیڈ کوارٹر کو تار کے ذریعے بتا دیا کہ میں نے اس مال کو دوسرے کنارے تک ڈھونے کی ذمے داری قبول کر لی ہے۔

سب سے پہلے میں نے شیڈز میں سے گندم، نمک اور شکر اٹھوا کر کھلے میدان میں رکھوا دی اس طرح سے جگہ پیدا ہو گئی تو اس کے بعد سامان کی ترسیل شروع ہوئی اور کافی جگہ بن گئی۔ میں نے ریلوے ہیڈ کوارٹر کو لکھا کہ اب سامان کی بکنگ کھول دی جائے جو دو ہفتوں سے بند پڑی ہے۔ اب شیڈز میں جگہ ہو چکی ہے۔

ابتدائی تین ماہ میں مزدوروں نے نہایت وفاداری سے کام کیا اس لیے کہ دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں انہیں اجرت زیادہ مل رہی تھی۔ میں نے ان کی تعداد کم کر دی تھی اور کام زیادہ لیا تھا۔

میرے ٹھیکا لینے سے پہلے چار یا پانچ لاکھ ٹن سامان مکمہ گھاٹ سے گزر رہا تھا، میرے ٹھیکا لینے پر ایک کروڑ ٹن سامان وہاں سے گزرنے لگا۔

غیر شادی شدہ اشخاص اور ان کے ملازمین کی طرز زندگی اور عادات عموماً مستحکم ہو جاتی ہیں چنانچہ یہی حال میرا بھی تھا۔ علاوہ ان ایام کے جب کام کی زیادتی ہوتی عموماً آٹھ بجے گھر واپس آ جاتا۔ اور ملازم جو میرا منتظر ہوتا مجھے دیکھتے ہی پانی بھرنے والے کو آواز دے کر میرے نہانے کا پانی غسل خانے میں رکھنے کی ہدایت کرتا۔ چاہے سردی ہو یا گرمی میں گرم پانی سے غسل کرتا تھا۔

مکان کے تین کمرے تھے جن کا رخ برآمدے کی طرف تھا۔ اس میں ایک بیٹھنے کا کمرا، ایک کھانے کا اور ایک سونے کا تھا۔ سونے کے کمرے سے ملحق ایک غسل خانہ تھا۔ اس میں دو دروازے تھے، جب کہ ایک کھڑکی اور دروازہ برآمدے میں کھلتا تھا، دوسرا غسل خانے میں جانے کے لیے تھا۔

غسل خانے میں ایک باتھ ٹب تھا جس میں بیٹھ کر میں غسل کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک لکڑی کا پائیدان جس میں سوراخ تھے اور دو مٹی کے گھڑے جن میں ٹھنڈا پانی بھرا رہتا تھا۔ جب بہشتی غسل خانے میں گرم پانی کا بندوبست کر دیتا تو میرا ملازم غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیتا اور میرے جوتے پالش کرنے کے لیے باورچی خانے میں چلا جاتا۔ پھر جب میں غسل کر لیتا تو میں آواز دے کر اسے بلا لیتا اور کھانا لگانے کے لیے کہتا۔

ایک رات جب میرا ملازم غسل خانے کا دروازہ باہر سے بند کر کے چلا گیا تو میں نے ایک چھوٹی لالٹین اپنی سنگار میز سے اٹھائی اور غسل خانے میں لے گیا اور اسے نچلی دیوار پر رکھ دیا۔ وہ چھ انچ اونچی تھی۔ وہ غسل خانے کو نصف حصے میں تقسیم کرتی تھی۔ میں نے مڑ کر غسل خانے کی چٹخنی اندر سے لگا دی۔ ہندوستان کے دروازے ٹیڑھے میڑھے ہوتے ہیں، اس لیے جب تک ان میں اندر سے چٹخنی نہ لگائی جائے وہ بند نہیں ہوتے۔ اس روز گھاٹ پر میں نے کافی دوڑ بھاگ کی تھی اور پسینا بہایا تھا، اس لیے خوب صابن لگایا تاکہ جسم کی کثافت دور ہو جائے۔

جب میں نے صابن کو پائیدان پر رکھنے کے لیے

آنکھیں کھولیں اور پائیدان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو یہ دیکھ کر خون رگوں میں منجمد ہوگیا کہ ایک کوبرا سانپ میرے پیروں سے چند انچ کے فاصلے پر تھا اور رفتہ رفتہ اپنے پھن کو اٹھا رہا تھا۔ صابن لگانے سے پیشتر میں نے جسم پر خوب پانی ڈالا تھا، وہ غالباً اس کے جسم پر بھی پڑ گیا تھا اور اس کے غصے کا سبب بنا تھا۔ وہ کوبرا تھا، اس لیے کہ اس کا پھن کافی چوڑا تھا اور وہ اپنے مکروہ منہ سے زبان نکال کر لپلپا رہا تھا۔ مجھے اس کے زہریلے دانت صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے بچنے کا درست طریقہ یہ تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو بدستور حرکت دیتا رہتا اور اپنے پیروں کو بتدریج سکیڑتا رہتا پھر ٹب سے نکل کر الٹے قدموں دروازے تک جاتا اور اس کی کنڈی کھول کر باہر چلا جاتا۔

اس کے برعکس میں نے یہ کیا کہ دونوں ہاتھ ٹب کے کناروں پر رکھا اور زور دے کر کھڑا ہوگیا۔ پھر اس چھوٹی سی دیوار پر کھڑا ہوگیا مگر پاؤں پھسل گیا۔ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اٹھا تو کہنی سے پانی گرا اور لالٹین بجھ گئی۔ اب غسل خانے میں گھپ اندھیرا چھا گیا اور میرا دل اس طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے ریلوے کا انجن!

اب میں اس چھوٹے سے غسل خانے میں بند تھا اور میرے ساتھ ہندوستان کا سب سے زہریلا سانپ موجود تھا۔ صرف ایک لمبا قدم مجھے دونوں دروازوں میں سے کسی ایک کے پاس پہنچا سکتا تھا۔ لیکن گھپ تاریکی کی بنا پر یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ سانپ کس طرف ہوگا۔ اگر میں پاؤں بڑھاتا تو میرا پاؤں سانپ پر پڑ جاتا۔ اگر نہ بھی پڑتا تو یہ اندیشہ تھا کہ جب میں دروازے پر پہنچ کر کنڈی کھول رہا ہوں گا تو سانپ بھی وہاں سے باہر نکلنے کے لیے بیٹھا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں میری یقینی موت کے امکانات تھے۔

ملازمین کے کوارٹر وہاں سے ساٹھ گز دور تھے، اس لیے اگر میں چیختا چلاتا تو وہاں تک آواز نہیں جا سکتی تھی۔ میرے بچنے کا واحد حل یہ تھا کہ میں انتظار کروں۔ پھر میرا ملازم تشویش میں مبتلا ہوکر خود وہاں آجائے اور کھانے کے بارے میں پوچھے۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ میرا کوئی دوست اچانک وہاں آجائے۔

میں نے سنا تھا کہ بعض اوقات سنگین باتوں کے مقابلے میں انسان معمولی باتوں سے شکست کھا کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ تاریکی میں عجیب خیالات آرہے تھے۔ میرے جسم سے صابن بہہ رہا تھا اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سانپ اسے چاٹ رہا ہو۔

آخر وہی ہوا، میرا ملازم وہاں آکر آوازیں دینے لگا۔ میں نے اسے دروازے پر بلایا اور اسے ایک لالٹین اور سیڑھی لانے کی ہدایت کی۔ کافی دیر بعد سیڑھی کے دیوار پر گھسٹنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک لالٹین کو کھڑکی کے قریب لایا گیا۔ لیکن روشنی اندر نہیں آئی۔ چھت البتہ روشن ہوگئی۔

میں نے ملازم سے کہا کہ وہ کھڑکی کا شیشہ توڑ کر لالٹین اندر لائے۔ شیشہ توڑا گیا مگر لالٹین اندر نہ آسکی۔ اسے بجھا کر ٹیڑھا کیا گیا پھر اندر لاکر جلایا گیا۔ یہ سارا کام ملازم نے کیا۔ جب روشنی ہوئی تو میں نے دیکھا کہ سانپ دروازے کے پیچھے ٹھیک میرے پیروں سے دو فٹ کے قریب لیٹا ہے۔

میں نے جھک کر غسل کرنے والا بھاری پٹڑا اٹھایا اور اس پر گرا دیا۔ نشانہ ٹھیک رہا۔ وہ سانپ کے پھن سے کچھ آگے گرا۔ سانپ نے اسے کاٹنا شروع کر دیا اور دم اس پر مارنا شروع کر دی۔ میں برآمدے کے دروازے کی طرف لپکا۔ پھر اسے کھول کر میں باہر چلا گیا۔ وہاں ریلوے کے بہت سے ملازمین لالٹینیں لیے کھڑے تھے کیوں کہ میرے اور سانپ کے بارے میں خبریں پھیل چکی تھیں۔

سب نے زندہ بچ رہنے پر مبارک باد دی۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ جب آخری آدمی بھی رخصت ہوگیا تو پتا چلا کہ میں تو برہنہ کھڑا ہوں اور جسم پر لگا ہوا صابن خشک ہوچکا ہے۔ سانپ غسل خانے کے اندر کیسے چلا گیا، یہ پتا نہ چل سکا۔ ممکن ہے وہ چھت سے نیچے ٹپک گیا ہو، اس لیے کہ چھت پھونس کی بنی ہوئی تھی جہاں چڑیوں کے گھونسلے تھے۔"

☆☆☆

وہیں میری دوستی ریمزے سے ہوئی۔

ریمزے کمشنر کا جج ہونے کے علاوہ مجسٹریٹ، پولیس آفیسر جنگلات اور انجینئر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت سی ذمے داریاں تھیں جس کے لیے اسے ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ سفر کے دوران لوگوں کی ایک بڑی نفری اس کے ساتھ چلتی تھی اور اپنے مسئلے مسائل بیان کرتی تھی۔ دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی اس کے روبرو پیش کیے جاتے تھے۔ وہ چلتے پھرتے عدالت سجالیا کرتا تھا۔

پہلے تو فریادی اور گواہوں کی شنوائی ہوتی اس کے بعد مدعا علیہ اور اس کے گواہ پیش ہوتے۔ پھر مباحثے اور سوچ بچار کے بعد اسی وقت فیصلہ سنا دیا جاتا۔ جرمانہ ہوتا ورقید نہ

بھی ہوتی تھی۔ میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو جرمانہ سنا ہو اور اس نے ادا نہ کیا ہو یا قید ہونے کی صورت میں خود نزدیک ترین جیل پہنچ کر قید نہ کاٹی ہو۔

انہی دنوں جو دل چسپ مقدمہ پیش کیا گیا وہ راجیش کی طرف سے کالو کے خلاف تھا۔ جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ کالو نے اس کی بیوی دمنتی کو اغوا کرلیا ہے۔ یہ کوئی ایک ہفتے کی بات ہے جب اس نے دمنتی پر ڈورے ڈالنا شروع کیے تھے۔ اس نے اپنی بیوی دمنتی کو بہت سمجھایا اور دھمکیاں بھی دیں، لیکن اس کا نتیجہ الٹا ہی نکلا اور اس کی بیوی دمنتی نے اس کی جھونپڑی چھوڑ کر کالو کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

ریمزے نے پوچھا کہ کالو کہاں ہے؟ جواب میں کالو مجمع کے ایک گوشے سے کھڑا ہوگیا اور اس نے اعتراف کیا کہ وہ کالو ہے۔ مجمع میں خواتین اور مرد گہری گہری سانسیں لے رہے تھے جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس رومان انگیز مقدمے میں دل چسپی لے رہے ہیں۔

ریمزے نے پوچھا کہ راجیش اس کے خلاف جو کچھ کہہ رہا ہے کیا یہ درست ہے؟

اس کے جواب میں کالو نے اعتراف کیا۔ کہ درست ہے۔ دمنتی اس کی فراہم کردہ جھونپڑی میں مقیم ہے لیکن یہ الزام غلط ہے کہ اس نے دمنتی کو اغوا کیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ دمنتی کو اس کے شوہر کو واپس کرنے پر تیار ہے؟

کالو نے جواب دیا کہ یہ دمنتی کا معاملہ ہے۔ اس کا جہاں جی چاہے رہے۔ وہ اپنی مرضی سے آئی ہے، وہ اسے مجبور کیوں کرے؟

ریمزے نے پوچھا کہ دمنتی کیا یہاں ہے تو خواتین میں سے ایک عورت نے کھڑے ہوکر کہا ہاں میں دمنتی ہوں سرکار آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟

وہ ایک خوش شکل عورت تھی جس نے ترائی میں رہنے والی عورتوں کی طرح اپنے بالوں کا اونچا سا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ وہ صاف ستھری انگیا پہنے ہوئے تھی اور لباس کو مکمل کرنے کے لیے اس نے لہنگا پہنا ہوا تھا۔

ریمزے نے پوچھا کہ اس نے اپنے خاوند کو کیوں چھوڑا؟ تو دمنتی نے جواب دیا کہ راجیش ایک غلیظ اور منحوس شخص ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر خود ہی اندازہ لگا لیجیے۔ دو سال پہلے میری اس سے شادی ہوئی تھی، اس وقت سے اس نے مجھے ایک جوڑا بھی بنا کر نہیں دیا ہے۔ یہ گلوبند، چوڑیاں اور موتیوں کا ہار مجھے کالو نے بنا کر دیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ راجیش کے پاس جانے پر آمادہ ہے تو اس کا جواب تھا کہ کوئی اسے اس پر مجبور نہیں کرسکتا۔

قدیم قبیلہ جو ترائی کے صحت مند ماحول میں رہتا ہے دو باتوں کے لیے مشہور ہے۔ اول یہ کہ لوگ صفائی پسند ہیں دوم یہ کہ عورتوں کو مکمل آزادی ہے۔ اسی لیے دمنتی نہایت بے باکی سے اس مجمع میں جہاں تین انگریز بھی تھے، اپنا مقدمہ لڑ رہی تھی۔

راجیش سے ریمزے نے پھر پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس کے جواب میں راجیش نے جواب دیا کہ وہ تو انہیں بڑی سرکار سمجھ کر یہاں آیا ہے، وہ الٹا اس سے پوچھ رہے ہیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ لوگ میری بیوی واپس نہیں دلوا سکتے تو پھر جرمانہ ہی دلوا دیجیے۔ ریمزے نے پوچھا کہ تمہیں کتنی رقم چاہیے؟ اس پر راجیش نے جواب دیا کہ ڈیڑھ سو روپے۔ مجمع نے شور مچا دیا کہ رقم زیادہ ہے، لڑکی اس کے لائق نہیں ہے۔

اب ریمزے نے کالو سے دریافت کیا کہ کیا وہ دمنتی کے لیے اتنی رقم دینے کو تیار ہے؟ کالو نے کہا راجیش نے اپنی بیوی کو سو روپے میں خریدا تھا، اب دو سال کے بعد اس کے ڈیڑھ سو روپے کیوں مانگ رہا ہے؟ یہ زیادتی ہے۔ وہ دمنتی کے لیے پچاس روپے دینے کو تیار ہے۔

ریمزے نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ کالو دمنتی کے لیے 75 روپے ادا کرے۔ کالو نے اپنی کمر میں بندھی ایک تھیلی ریمزے کے قدموں میں الٹ دی۔ اس میں سے چاندی کے باون روپے نکلے۔ باقی رقم اس کے ساتھیوں نے چندہ کرکے دے دی۔ رقم راجیش کو دے دی گئی جو اس نے گنی اور کہا کہ پوری ہے۔

خواتین میں ایک عورت جو سب سے افسردہ معلوم ہوتی تھی الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ وہ نقاہت کی وجہ سے اپنے پاؤں پر بھی کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس نے نحیف سی آواز میں کہا کہ سرکار میرا کیا ہوگا؟

ریمزے نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے جواب دیا کہ وہ کالو کی بیوی ہے۔ اس کی رنگت سفید تھی، لیکن وہ بے حد کمزور تھی۔ اس کے پاؤں میں سوجن بھی تھی، جو ترائی میں رہنے والوں کو اکثر ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ چوں کہ کالو نے دوسری بیوی خرید لی ہے، لہٰذا اسے اب کام کرکے گزارا کرنا پڑے گا۔ جس کی اجازت اس کا بیمار جسم نہیں دے

رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اگر وہ کام نہیں کرے گی تو فاقوں سے مر جائے گی۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

یہ ایسی پیچیدہ صورت حال تھی کہ ریمز بے کے بچھے بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جب اس نے مقدمے کا فیصلہ سنایا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کالو کی پہلی بیوی بھی وہاں موجود ہے۔ مجمع پر ایک تکلیف دہ خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ اچانک دجشتی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس عورت کے قریب جا کر بولی۔ "دومت، میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ جو کچھ کالو ادا کرے گا میں اس میں سے تمہیں نصف دینے کا وعدہ کرتی ہوں۔ اب چپ ہو جاؤ۔ تم بے گھر و بے سہارا نہیں ہو۔"

☆☆☆

میں اس مقدمے کا آنکھوں دیکھا گواہ ہوں مگر ریمز بے کے ساتھ زیادہ دن رہ نہ سکا اور جنگلات کا محکمہ چھوڑ کر برٹش انڈین آرمی میں ملازم ہو گیا۔ فوج اس زمانے میں معتبر اور باعزت ادارہ ہوا کرتا تھا اور سول حکومت کے ماتحت رہنے کو اچھا سمجھتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں میں کیپٹن تھا اور میری ماتحتی میں 500 فوجی تھے اور میری . ور کو کماؤن کی سترویں کور رکھا جاتا تھا۔ جنگ کے بعد مجھے ترقی دے کر میجر بنا دیا گیا اور شمالی مشرقی فرنٹیئر کمانڈر کی حیثیت سے 114 ویں لیبر بٹالین کا اعلیٰ عہدے دار بنا کر افغانستان بھیج دیا گیا جہاں تجربات میں بے پناہ اضافہ ہوا۔

وہ نئی طرح کے لوگ تھے اور ان کا رہن سہن سب سے جدا تھا۔ نیک، سادہ لوح اور شرم و حیا رکھنے والے مگر اپنے وطن کے لیے لڑنا اور اپنی جان قربان کرنا بھی خوب جانتے تھے۔

میں برٹش آرمی کے تحت وہاں متعین کیا گیا تھا اور بٹالین کی رہنمائی چرچل جیسا جہاں دیدہ شخص کر رہا تھا۔ چرچل نے پٹھانوں کو برطانیہ کا دست نگر کرنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ جس کا اعتراف اس نے اپنی کتاب "میں اور پٹھان" میں بھی کیا۔

1929ء سے لے کر 1936ء تک میں نے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ تانگانیکا، افریقہ میں گزارا جہاں میں نے ہر قسم کا شکار کیا اور اپنے تجربات میں اضافہ کیا۔ جنگل بہرحال میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے وہاں کا ماحول مجھے شہروں سے زیادہ پسند آیا۔

اس دوران میں میں نے کالامنجاروں کے پہاڑوں پر کافی اور مکئی کی کاشت کی نگرانی بھی کی۔ اس طرح سے مجھے زراعت کا بھی تجربہ ہو گیا۔ چوں کہ افسران کو معلوم تھا کہ میں شکاری ہوں، لہٰذا وہ اتر پردیش میں ایسے علاقوں میں مجھے بطور خاص بھیجا کرتے جہاں آدم خور شیروں یا چیتوں نے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہوتا تھا۔

میں نے 1907ء اور 1939ء کے دوران 33 آدم خوروں کو شکار کیا۔ ریکارڈ کے مطابق میں نے جن آدم خوروں کو شکار کیا انہوں نے مجموعی طور پر 1500 مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہلاک کیا تھا۔ پہلا شیر میں نے چمپاوت میں ہلاک کیا تھا جس نے چار سو چھتیس افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے اپنی شکاری زندگی میں صرف شیر ہی نہیں بلکہ چیتے اور تیندوے بھی ہلاک کیے تھے۔ میرے بارے میں مشہور زمانہ اخبار آبزرور کی رائے یہ تھی کہ میں جنگل کے ایک ایک گوشے سے واقف تھا اور درندوں کے نام انگلیوں کے پوروں پر تھے۔

اپنی ایک کتاب میں، میں نے لکھا ہے کہ جب انسان غور و فکر میں مبتلا ہو تو عجیب عجیب قسم کے خیالات رونما ہوتے ہیں۔ ایک بار میں شیر کے بارے ہوئے سانبھر کے برابر زمین پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے شیر آرہا ہے۔ پھر وہ قریب آگیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب میری قوت برداشت جواب دے گئی تو میں نے بندوق تھامی اور تیزی سے گھوما۔ معلوم ہوا کہ وہاں شیر تو نہیں ہے البتہ میرے سر پہ ایک بڑا اودخت پر بیٹھا اس کی سوکھی چھال کتر رہا تھا۔

ایک واقعہ اور سنیے کہ جب میں شیر کے مارے ہوئے شکار کے پاس بیٹھا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ شیر کب واپس آئے اور میں اس کا شکار کروں۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا جانور آرہا ہے۔ میں نے بندوق سنبھال لی اور مڑا۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری آنکھوں سے چند انچ کے فاصلے پر ایک بڑی چیونٹی ایک تنکے پر رینگ رہی ہے۔ اسی طرح سے میرے دماغ میں سلطانہ ڈاکو بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے چند افراد کو آگ تاپتے دیکھا تو یہ خیال آیا کہ انہوں نے اپنی رائفلیں دیوار سے ٹکائی ہوئی ہیں، لیکن جب میں نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ تو کلہاڑیاں ہیں، جن سے لوگ درخت کاٹتے ہیں۔

1910ء میں میں نے ضلع نینار میں ایک ایسے چیتے کو ہلاک کیا جس نے ریکارڈ کے مطابق 400 انسانوں کو موت سے ہمکنار کیا تھا۔ 1926ء میں میں نے دوسرے چیتے کو رودرپریاگ میں ہلاک کیا جو کیدارناتھ اور بدری ناتھ کے مندروں میں جانے والے زائرین کو ہڑپ کر جاتا تھا۔ اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے سوا سو افراد کے خون سے پیاس بجھائی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے جن مشہور و معروف آدم خوروں کو اپنا نشانہ بنایا ان میں تیلا دیس، موہن، مین حسین، مکتشو ار اور چوگرا تیگر شامل ہیں۔

وہ سارے آدم خور جنہوں نے ایک عالم میں دہشت پھیلائی ہوئی تھی، ان کی موت کے بعد جب ان کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو یہ ثابت ہوا کہ وہ کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا تھے۔ ممکن ہے وہ اس کا ذمے دار بنی نوع انسان کو سمجھتے ہوں۔ ان کے جسم میں کوئی چوٹ لگ گئی اور مندمل نہ ہو سکی یا خارپشت کے کانٹے ان کے جسم میں اس طرح سے پیوست ہو گئے کہ نکل نہ سکے۔ میں نے ایک چیتے کو ہلاک کیا تو اس کے ماتھے میں ایک گولی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ غالباً اسی بنا پر وہ آدم خور بن گیا۔ میں نے اپنی کتاب میں لکھا "جس شکاری نے اس پر فائر کیا اس نے بے پروائی سے کام لیا اور اسے مشتعل کر دیا۔ چنانچہ وہ چیتا لوگوں پر اپنا غم و غصہ نکالنے لگا۔"

میں زمین پر کھڑے ہو کر شکار کیا کرتا تھا اور اس سلسلے میں کسی کی مدد نہیں لیا کرتا تھا۔ تنہا شکار کرنے کا عادی تھا۔ بعض اوقات میرے ساتھ ایک چھوٹا سا کتا روبن بھی ہوا کرتا تھا۔ میں نے ان علاقوں میں عزت و توقیر پائی جن علاقوں میں اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے آدم خوروں کو موت کا نشانہ بنایا۔ میرے پیش نظر انسانی زندگی اہم ہوتی جس کے لیے میں نے اپنی جان کی پروا نہ کی۔

اپنی زندگی کا بیشتر حصہ میں نے گرنی ہاؤس میں گزارا۔ ہمارا خاندان جس میں ماں میری جین کاربٹ اور میری ہمشیرہ مارگریٹ ونفرڈ کاربٹ جسے پیار سے میگی کہا جاتا تھا اسی مکان میں سکونت پذیر رہے ہیں۔

میرا قد چھ فٹ اور ایک انچ تھا۔ اپنی نیلی آنکھوں کے سبب حسین کہا جا سکتا تھا۔ میں عموماً ڈھیلے ڈھالے کپڑے اور ہیٹ پہنتا تھا۔ جنگل میں داخل ہوتے وقت سر پر ہیٹ ضرور ہوتا تھا۔ جاڑے کا موسم میں عام طور پر کالا ڈھونگی میں گزارتا تھا۔ مجھے خاص طور پر مصنف بننا پسند تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مصنفوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ وہ مارے مارے نہیں پھرتے تھے۔

جب فوج سے ریٹائر ہو گیا تو میں نے اپنے شکاری تجربات سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لیے شکاریات پر کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ میں ایک ماہر فوٹو گرافر بھی بن چکا تھا، اس لیے میں نے اپنی کتابوں کو تصاویر سے بھی مزین کیا تھا۔

لوگ مجھے نجات دہندہ مانتے تھے اور بہت عزت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں بھگوان کا سادھو (بزرگ) ہوں۔ بہت سے لوگ میرا نام غلط انداز سے لیا کرتے تھے اور مجھے محبت سے "کارپٹ صاحب" کہا کرتے تھے۔ مزاج کے اعتبار سے بڑی حد تک میں شرمیلا تھا، لیکن اپنے ہندوستانی دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور میں خصوصیت کے ساتھ ایسے شیروں کا شکار کرنا پسند کرتا تھا جو آدم خور ہوتے تھے۔ ہندوستان میں عرصہ دراز تک رہنے کی وجہ سے مجھے ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کی رسومات سے بڑی حد تک واقفیت ہو گئی

مفتی صدرالدین خان، آزردہ

((1789-1868)) عالم اور شاعر۔ مولوی لطف اللہ کشمیری کے بیٹے تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا فضل امام سے تعلیم حاصل کی اور صدرالصدور کے عہدے پر فائز ہوئے، جو اس وقت سب سے بڑا منصب سمجھا جاتا تھا۔ درس و تدریس کا شغل بھی جاری رہتا تھا۔ نواب یوسف علی خان والیٔ رام پور، نواب صدیق حسن خان رئیس بھوپال اور سرسید احمد خان ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ 1857ء کے ہنگامے کے بعد نصف جائیداد ضبط ہو گئی۔ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں اصلاح پہلے شاہ نصیر سے اور آخر میں میر نظام الدین ممنون سے لیتے رہے۔ کلام دیوان کی صورت میں مرتب نہیں ہوا۔ شعرائے اردو کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا، جو اب ناپید ہے۔

مرسلہ: عنایت مسیح، شیخوپورہ

تھی۔ میں ان کے جذبات و احساسات سے بھی اچھی طرح سے آگاہ تھا۔ چنانچہ درندوں کو شکار کرتے وقت میں بعض اوقات اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے جب مجھے ایک چیتے کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ اس نے اب تک دس افراد کو کھالیا ہے تو میں نے اسے شکار کرنے اور وہاں کے رہنے والوں کو ایک عظیم مصیبت سے نجات دلانے کے لیے بندوق اٹھالی۔ یہ قصہ میں نے اپنی کتاب "کماؤن کا آدم خور" میں بیان کیا ہے۔ میری دوسری کتاب "رودرا پریاگ کا آدم خور چیتا" ہے، جس میں میں نے ایک آدم خور چیتے کا احوال درج کیا ہے جس نے 220 لوگوں کو ہلاک کردیا تھا۔ لوگ اس کی وجہ سے تاریکی میں جانے سے خوف کھانے لگے تھے۔ وہ چیتا کھڑکی سے کمروں میں داخل ہوجاتا تھا اور انسانوں کو ہلاک کردیتا تھا۔ اس لیے علاقے کے 300 شکاریوں کو بندوقوں کے لائسنس دیے گئے لیکن کامیابی کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ بعد ہے کہ اس چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے دس ہزار روپے کی رقم انعام میں مقرر کی گئی۔ مگر کوئی اس رقم کو جیتنے کا خود کو اہل ثابت نہ کرسکا۔

ایک شکاری نے چیتے کو ہلاک کرنے کے لیے پوٹاشیم سائنائڈ کا زہر بھی جانوروں کے جسموں پر لگا کر انہیں کھلے عام چھوڑ دیا کہ جب چیتا انہیں کھانے آئے گا تو ہلاک ہوجائے گا۔ مگر چیتے کی عیاری کے سبب یہ حربہ بھی ناکام رہا۔ (واضح ہو کہ پوٹاشیم سائنائڈ ایسا زہر ہے جس کا ذائقہ آج تک نہیں معلوم ہوسکا ہے۔ زبان پر رکھتے ہی زہر اتنی تیزی سے جسم میں پھیل جاتا ہے کہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا)

ایک بار جب برطانیہ کی پارلیمنٹ میں بحث ہوئی تو میرا نام تجویز کیا گیا کہ چیتے کے شکار کے لیے مہم پر مجھے بھیجا جائے۔ اس لیے کہ انڈیا جب برطانیہ کی راج دھانی میں شامل ہے تو حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے لوگوں کی جان و مال کو بھی تحفظ دے۔ چنانچہ مجھے اس چیتے کو شکار کرنے کے لیے اس علاقے میں جانا پڑا۔ ایک موقع پر میں نے مشاہدہ کیا کہ جن راستوں پر چل کر میں چیتے کو تلاش کرتا رہا تھا ٹھیک انہی راستوں پر چیتا بھی چلتا رہا تھا، تاکہ اسے میرا اتا پتا مل جائے۔ یقیناً اس نے میری بو سونگھ لی تھی۔

اس آدم خور کو شکار کرنے کے ایک اور موقع پر جب میں ایک اونچی جھونپڑی میں بیٹھا تھا تو بارش ہونے لگی اور تاریکی پھیل گئی۔ چیتا چونکہ خود مجھے تلاش کررہا تھا، اس لیے ٹھیک اسی جھونپڑی کے نیچے آگیا جہاں میں اس وقت موجود تھا۔ تاریکی کی بنا پر چیتے نے ادھم نہیں مچایا اور جب تاریکی دور ہوئی اور بارش ختم ہوگئی تو وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس طرح سے میں بال بال اس کا شکار ہونے سے بچ گیا۔

پورے ایک سال کی محنت شاقہ اور حکمت عملی کے بعد وہ چیتا ایک رات آم کے درخت سے بندھی ہوئی ایک بکری کو شکار کرنے کے لیے آیا تو میں نے اسے شکار کرلیا۔ میں نے اس بارے میں اپنی کتاب میں لکھا "آہ! کاش کہ کوئی اور بھی اس وقت وہاں موجود ہوتا جب میں اس بوڑھے چیتے کو گولی مارنے جارہا تھا۔ اس کی تھوتھنی خاکستری تھی اور مونچھیں بے حد گھنی۔ وہ واقعی انڈیا کا سب سے قابلِ نفرت درندہ تھا جس کا میں نے نشانہ لیا۔"

جب اس مردہ چیتے کو نمائش کے لیے لایا گیا تو ہزاروں افراد جمع ہوگئے اور انہوں نے مجھ پر گلاب کی پتیاں نچھاور کیں اور کاربٹ صاحب کے نعرے لگائے۔ ایک ماہ بعد حکومتِ برطانیہ نے مجھے دس ہزار روپے کا گرانقدر انعام ایک تقریب میں دیا۔

میری عادت تھی کہ کسی بھی علاقے کے رہنے والے جب تک مجھے یقین دہانی نہ کرادیتے کہ فلاں علاقے میں ایک آدم خور شیر، چیتے یا تیندوے نے لوگوں کا جینا حرام کردیا ہے، اس وقت تک میں ان پر اپنی بندوق نہیں اٹھاتا تھا۔

میں نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ جب ایک شیر آدم خور بن جاتا ہے تو دن دہاڑے بھی بستیوں پر حملہ کرکے انسانوں کو ہلاک کردیتا ہے، لیکن چیتا رات ہی کو شکار کرنے کے لیے آتا ہے، وہ دن میں کسی بستی میں داخل ہونے کا رسک نہیں لیتا۔

اپنی ایک اور کتاب میں میں نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ میں نے جنگل کی زندگی میں تین بار چڑیل کی "آواز" سنی اور ایک بار اسے دیکھا بھی تھا۔ وہ ایک اُلو تھا، جس کا رنگ سنہری تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا اُلو کبھی نہیں دیکھا۔ میں اسے گولی مارنا چاہتا تھا، لیکن اتنا اندھیرا تھا کہ میں اس کا ٹھیک طریقے پر نشانہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس کی "آواز" اتنی ہیبت ناک تھی کہ میرا کلیجہ دہل گیا اور رگوں کا خون خشک ہوگیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ میرے مکان کے برآمدے سے کچھ فاصلے پر ایک درخت پر بیٹھا تھا۔

ایک بار میں نے ایک چڑیل کو عورت کے روپ میں

دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بہت سحر تھا۔ میں مچان پر بیٹھا تھا اور وہ میرے ایک ملازم کو اپنی آنکھوں سے تکتی اور گھورتی رہی، جیسے کہ سانپ پرندوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر مسحور کرلیا کرتا ہے۔ جب میں نے اس چڑیل پر بندوق چلائی تو وہ چیختی ہوئی غائب ہوگئی۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ اگر کوئی چڑیل سامنے آجائے تو اس کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اپنا سر کمبل جیسی کسی چیز میں چھپا لینا چاہیے۔

فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے نہ صرف یہ کہ بہت سی کتابیں لکھیں بلکہ ہندوستان کی جنگلی زندگی کو محفوظ کرنے کے لیے جدوجہد میں حصہ لیا۔ کیونکہ شکار کرنے کا مقصد درندوں کو اندھادھند ہلاک کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ البتہ انہیں زندہ پکڑنے کے بعد چڑیا گھروں میں رکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر میں بنگال ٹائیگر کو زندہ رکھنے کی وکالت کرتا ہوں۔ میرا موقف یہ ہے کہ اگر اس درندے کو محض شوق کی خاطر شکار کیا جاتا رہا تو روئے زمین سے اس کی نسل معدوم ہوجائے گی۔

☆☆☆

میں نے اپنا پہلا کیمرا 1920ء میں خریدا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے دوست فریڈرک والٹر چیمپئن سے متاثر تھا جو شیروں کی تصاویر کھینچ کر مارکیٹ میں اچھے داموں سے فروخت کیا کرتا تھا۔ حالانکہ جنگل کے بارے میں اس کی معلومات زیادہ نہیں تھیں۔ میں نے سوچا کہ یہ کام تو مجھے کرنا چاہیے، اس لیے کہ جانوروں کی تصاویر کھینچنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میری کھینچی ہوئی تصویروں کی لوگوں نے بہت تعریف کی تو میں نے فوٹوگرافی کو ترجیح دی۔ گویا میں نے بندوق ایک طرف رکھ دی اور کیمرا سنبھال لیا اور "دھائیں دھائیں" کے بجائے "کلک۔ کلک" کرنے لگا۔

میں جانوروں کی نفسیات سے واقف ہوں کہ جانور شرمیلے ہوتے ہیں۔ ان کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ہلاکت خیز نہ ہوجائیں۔

کسی اخباری نمائندے نے مجھ سے پوچھا کہ شیر تو ایک درندہ ہے۔ اس کی درندگی سے بچنا چاہیے۔ وہ انسان کو بے دردی سے چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔

میں نے جواب دیا کہ شیر کسی آدمی پر اس وقت تک حملہ نہیں کرتا جب تک کہ انسان کوئی کارروائی کرکے اسے مشتعل نہ کردے۔

وہ افراد جو جنگل کے علاقوں میں رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کا سامنا شیر سے ہوجائے تو اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، کیوں کہ شیر اپنا راستہ چلتا ہوا گزر جائے گا بشرطیکہ اسے چھیڑا نہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ شیر اپنی فطرت کے اعتبار سے انسان دشمن جانور نہیں ہے۔ شیر کے لیے "آدم خور" لفظ محض اتفاقی معنوں میں درست ہے۔ شیر پیدائشی طور پر آدم خور نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض نادان انسانوں کی بے ہنگم کارروائیاں کسی شیر کو آدم خور بنادیتی ہیں۔ کسی شیر کو آدم خور بنانے والے اکثر وہ اناڑی شکاری ہوتے ہیں جو اپنے نشانے پر یقین کیے بغیر شیر پر گولی چلادیتے ہیں۔ وہ شیر کو ہلاک کرنے کے شوق میں گولی تو چلادیتے ہیں، مگر مہارت نہ ہونے کے سبب ان کی گولی نشانے پر نہیں بیٹھتی اور چھوتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ شیر بجائے مرنے کے زخمی ہوجاتا ہے۔

اس قسم کا زخمی شیر انسان کا دشمن ہوجاتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی انسانی صورت کو دیکھتا ہے اسے اپنا دشمن سمجھ کر اس پر حملہ کردیتا ہے اور اسے ختم کردیتا ہے۔ دوسرے درندہ صفت جانوروں کا بھی یہی حال ہے۔

میں نے نہ صرف یہ کہ جانوروں کی تصاویر اتارنے کا پیشہ اختیار کیا بلکہ یہ تحریک چلانا بھی شروع کردی کہ درندوں کو تفریحاً ہلاک نہ کیا جائے ورنہ ان کی نسلیں معدوم ہوجائیں گی۔ اس سلسلے میں میں نے ایک تنظیم بنائی پھر اس تنظیم کی کئی کانفرنسیں اترپردیش میں منعقد کیں۔ میرا مطالبہ تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ وائلڈ لائف کو تحفظ دے۔ میں نے اپنے دوست چیمپئن کی مدد سے کماؤن (انڈیا) کے پہاڑوں میں حکومت پر زور دے کر پہلا نیشنل پارک بنوایا۔ یہ پارک نیپال کی سرحد کے قریب ہے۔ اس کا رقبہ 520 مربع میل ہے جہاں شیر، چیتے اور دوسرے درندے آزادانہ گھومتے پھرتے ہیں اور کوئی شکاری انہیں شکار نہیں کرسکتا۔ لوگ صرف اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر گھوم پھر سکتے ہیں اور ان درندوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ (جم کاربٹ کی وفات کے ایک سال بعد اس پارک کو اس کے نام پر رکھا گیا۔ مدیر)

1947ء میں جب انڈیا نے آزادی حاصل کرلی تو دوسرے گورے لوگوں کی طرح سے میں نے بھی انڈیا کو چھوڑ دیا اور اپنی بہن میگی کے ساتھ کینیا چلا گیا جو اب بھی برطانیہ کے زیر تسلط تھا۔ کینیا اپنے حسین قدرتی مناظر کی وجہ سے

بہت مشہور ہے۔ چونکہ میں بنیادی طور پر شکاری تھا، اس لیے وہاں پہنچ کر بھی میں نے جانوروں کے تحفظ کی حمایت میں آواز اٹھانا جاری رکھی۔ میں اور میگی اس دوران ایک ہوٹل کے لان میں برگد کے مضبوط درخت کی شاخوں پر بنائے گئے جھونپڑے میں رہتے تھے۔ اسی دوران یعنی 5 اور 6 فروری 1952ء کو شہزادی الزبتھ وہاں آکر ٹھہری۔ اس نے جو درخت جھونپڑی کے بارے میں سنا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ مجھے بھی اس انوکھی جگہ پر ٹھہرنے کا موقع دیا جائے۔

میں نے اس کی اجازت دے دی۔ اتفاق سے اسی دوران شہزادی کے باپ یعنی جارج ششم کا انتقال ہوگیا۔ شہزادی واپس لندن چلی گئی۔ مگر میں نے اس ہوٹل کی مہمانوں کی کتاب میں اس واقعہ کو منفرد انداز میں لکھا ہے۔

"دنیا کی تاریخ میں ایسا تحیر خیز واقعہ کبھی پیش نہیں آیا ہوگا کہ جب ایک شہزادی برگد کے درخت پر چڑھ کر جھونپڑے میں ٹھہری اور جب دوسرے دن نیچے اتری تو شہزادی سے ملکہ بن چکی تھی۔ خدا ملکہ کی حفاظت کرے۔"

جم کاربٹ جب اپنی چھٹی کتاب مکمل کر چکا تو اس پر دل کا دورہ پڑا۔

یہی دل کا دورہ اس کے انتقال کا باعث بنا۔

☆☆☆

اسے سینٹ پیٹرز کے انجیلکن چرچ، نائیری میں انیس اپریل 1955ء کو دفن کیا گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ مرنے سے پیشتر وہ ایک بار پھر انڈیا جائے، لیکن اس کی علالت نے اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔

نائیری (کینیا) میں اس نے اپنے دوست کنور سنگھ کے لیے ایک چوپال بنوائی تھی جس میں علاقے کے لوگ آکر بیٹھتے اور اپنے مسائل بیان کرتے۔ اس نے نائیری کے گرد بہت لمبی دیوار بھی تعمیر کرائی تھی تاکہ علاقے کے لوگ جنگلی درندوں سے محفوظ رہ سکیں۔ اس دیوار کی لمبائی ساڑھے چار میل تھی۔

اس کی پہلی کتاب "کوماں کا آدم خور" انڈیا میں شائع ہوئی اور بے حد مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور امریکا میں بھی اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی ڈھائی لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ بعد میں اس کو دنیا کی 27 زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کی چوتھی کتاب "جنگل کی پہچان" کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ مجموعی طور پر اس نے چھ کتابیں لکھیں، جن میں سے تین کو اس کی سوانح حیات کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔

اس کی کتابیں پڑھ کر لوگ حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ وہ اتنی زندگی سے قریب تر ایسی کتابیں جزئیات کے ساتھ کیسے لکھ لیتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جم اپنی یادداشتوں کو ایک ڈائری میں لکھتا رہتا تھا۔ پھر جب وہ کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ کرتا تھا تو اس ڈائری کو کھول کر سامنے رکھ لیتا تھا۔

اس کی جنگل ایڈونچر کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائمز اخبار نے لکھا کہ جم کاربٹ کا انداز تحریر مشہور زمانہ مصنف رڈیارڈ کپلنگ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مگر رڈیارڈ کپلنگ نے جنگل دیکھا تھا اور فرضی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ جب کہ جم کاربٹ نے حقیقت نگاری کی ہے۔ اس کے شکار کے قصے پڑھتے ہی سر آرتھر کانن ڈائل کا سنسنی خیز ناول "ہاؤنڈز آف باسکرویلز" یاد آجاتا ہے۔ جم کی کتابوں میں ہمالیہ کی منظر نگاری غیر معمولی ہے۔ اس لیے اس نے وہاں ایک بڑا عرصہ گزارا تھا۔

چین اور انڈیا کے بہت سے شیروں کی قسموں کا نام جم کاربٹ پر رکھا گیا۔ یقیناً ان کے حوالے سے وہ تاقیامت ہماری یادوں میں بسا رہے گا۔

1994ء اور 2002ء میں اس کی اور اس کی بہن کی قبروں کا جائزہ لیا گیا اور جیری اے جلیل نے ان کی مرمت کرائی جو جم کاربٹ فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر ہے۔

اس کی زندگی پر چار فلمیں بھی بنائی جا چکی ہیں۔ 1948ء میں اس کی کتاب پر ہالی ووڈ کے ایک ڈائریکٹر بائرون ہاسکن نے فلم بنائی جس میں سابو نے جنگل مین کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ فلم مقبول ہوئی اور اس نے باکس آفس پر اچھا بزنس کیا۔ جم کاربٹ نے فلم دیکھنے کے بعد تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "اس فلم میں جو شیر دکھایا گیا ہے وہ بلاشبہ اصلی ہے اور یقیناً وہ درندہ ہے لیکن اس نے انسانوں سے زیادہ اچھی اداکاری کی ہے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔"

1986ء میں بی بی سی نے ایک ڈراما انڈیا کا آدم خور پیش کیا جس میں فریڈرک ٹریوس نے جم کاربٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ برطانیہ میں 2002ء میں کرسٹوفر ڈھل کو لے کر ایک فلم بنائی گئی جس کا نام "شیروں کی ریاست" رکھا گیا۔ 2005ء میں ایک نئی فلم تیار کی گئی جس میں جم کاربٹ کا کردار جیسن فلیمنگ نے ادا کیا تھا۔

نسرین عثمانی

قتل وخون ریزی، لوٹ مار اب زندگی کا حصہ بن چکا ہے۔ امریکی ریاست میں رہنے والے آنند کو بھی کب معلوم تھا کہ اس کے پاس جو چند سو ڈالرز ہیں ان کی خاطر دو لٹیرے اس کی جان لینے کی کوشش کریں گے۔ دو دو گولیاں اس کے سر میں اتار دیں گے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون مار سکتا ہے۔ سر میں دو گولیاں لگنے کے بعد بھی وہ زندہ رہا۔

امریکا کے کرب زدہ معاشرے کی ایک جھلک

یہ 23 جولائی 1980ء اتوار رات گیارہ بجے کا واقعہ ہے۔ ڈومینو پیزا ریستوران کا ملازم آنند اپنے ایک ہاتھ میں پیزا اور دوسرے ہاتھ میں پیپسی کے چھ کارٹن تھامے ایک اپارٹمنٹ کی دوسری منزل سے گزر رہا تھا۔ اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھ میں سامان زیادہ تھا۔ اس کے پاس اس فلیٹ کا پتا تھا جہاں سے پیزا اور پیپسی کے کارٹن پہنچانا تھے۔

چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے وہ فلیٹ مل گیا۔ اس نے کارٹن اپنی بغل میں دبائے اور پیزا والے ہاتھ سے دروازے پر دستک دی۔ جب کسی عورت نے اندر سے استفسار کیا تو اس نے جواب میں کہا۔ "میں ڈومینو پیزا لایا ہوں، مادام!"

"دفع ہوجاؤ یہاں سے، میں نے تو ایسا کوئی آرڈر نہیں دیا ہے۔" اندر سے خشک اور کھردری آواز آئی۔ دروازہ کھولنے کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔

آنند وہاں سے پلٹ آیا اور آزردگی سے خودکلامی میں

ہوا۔ "لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں جانور نہیں انسان ہوں۔ ایسا مذاق بھلا کس کام کا؟ اس دوران میں کوئی اور کام کر لیتا۔"

وہ 23 برس کا ایک صحت مند لڑکا تھا جس کے ارادے بلند اور حوصلے جوان تھے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ اس نے گریجویٹ کر لیا تھا اور اس کا نام لاء کالج کی ویٹنگ لسٹ پر تھا۔ اس کو قانون پڑھنے میں دلچسپی تھی تاکہ بعد میں لوگوں کو قانون و انصاف کی راہ پر چلا سکے۔ سرِدست اس نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیزا کی ایک دکان پر ملازمت کر لی تھی اور عموماً آرڈر پر مال پہنچایا کرتا تھا۔ لوکل زبان میں وہ "پاپا ہروالا" تھا۔

جب آنند زینے اتر کر پارکنگ لاٹ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ برآمدے کی طرف سے ایک آواز آئی۔ "لڑکے! مجھے ایک پیزا کی ضرورت ہے۔ کیا تمہارے پاس پیزا ہے؟"

وہ ایک منحنی سا آدمی تھا جس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا سا پتلون اور کاٹن کی قمیص تھی، برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ آنند اس کے قریب چلا گیا۔ "کیا تم نے ہی پیزا کا آرڈر دیا تھا؟" اس نے پوچھا۔ "اوپر رہنے والی خاتون نے کہا کہ میں نے آرڈر نہیں دیا ہے؟"

"ہاں، دراصل میں نے اس کا فون استعمال کیا تھا۔" اس شخص نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "رقم میری گرل فرینڈ کے پاس ہے جو پارکنگ لاٹ میں موجود ہے، تم ذرا یہاں ٹھہرو۔"

وہ آدمی مڑا اور عمارت کے پیچھے چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔ اب اس کے ساتھ پستہ قامت کا ایک شخص تھا جس نے کیپ لگائی ہوئی تھی۔

"پیزا کو گھاس پر رکھ دو۔" پہلے والے نے جس کے رخساروں پر ہلکی داڑھی تھی سرد لہجے میں اسے حکم دیا۔ جب آنند اس کے حکم کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا تو وہ اپنے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا بولا۔ "لڑکے ہم تم سے مذاق نہیں کر رہے ہیں۔"

آنند تذبذب میں مبتلا تھا کہ پستہ قامت شخص نے اپنی جیب سے چھوٹی نال کا ریوالور نکال لیا، جس کی نال کا رخ آنند کے سینے کی طرف تھا۔ آنند کے رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

اس نے پیپسی کے ڈبے اور پیزا گھاس پر رکھ دیے۔ اسے یاد آیا کہ اسی طرح سے ایک ہفتے قبل ایک پیزا پہنچانے والے کو بھی ریوالور کی نال پر لوٹا گیا تھا۔ اس نے قیاس لگایا کہ یہ وہی لوگ ہیں۔

وہ پیزا گھاس پر رکھنے کے بعد سست رفتاری سے سیدھا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ داڑھی والے نے درشتی سے کہا۔ "اب اپنا پرس اور کار کی چابیاں میرے حوالے کر دو اور سمجھ دار کہلاؤ۔"

آنند نے اپنا پرس اور چابیاں جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیں۔ ہنڈا کار اس کے والد کی تھی۔ داڑھی والے نے دونوں چیزیں جھپٹ کر لے لیں اور تیزی سے پارکنگ لاٹ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کی کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں لے آیا۔

پستہ قامت شخص نے آنند کو کار کی طرف دھکا دیا۔ آنند چند قدم آگے بڑھا تو اس نے کار کی ڈکی کھول دی اور ریوالور کی نال اس کی کمر میں چبھو کر درشتی سے کہا۔ "اچھے بچوں کی طرح اس میں لیٹ جاؤ۔" آنند ہچکچایا تو وہ بولا۔ "چلو جلدی کرو تم کیا جانتے نہیں ہو کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کچھ کر سکتے ہیں؟"

آنند اسلحے کے بل پر ہونے والی وارداتوں کے بارے میں اچھی طرح سے جانتا تھا، اس لیے سہم کر رہ گیا۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا تھا اور پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ وہ ریوالور کے سامنے ان کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ ڈکی میں لیٹ گیا تو پستہ قامت نے ڈکی کو بند کر دیا۔ آنند تاریکی میں ملفوف ہو گیا۔

کار پارکنگ لاٹ سے روانہ ہوئی تو آنند کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس نے ایسی صورتِ حال کا کبھی سامنا نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں نے کار کا ریڈیو آن کر دیا تھا، اس پر مائیکل جیکسن کا ایک دل آویز نغمہ اس کی سماعت میں رس گھول رہا تھا۔

جب ابتدائی ہیجان خیز لمحات گزر گئے تو آنند نے خود کو پُرسکون رہنے کی تلقین شروع کر دی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اضطراب میں مبتلا رہا تو کوئی کام ڈھنگ سے نہ کر سکے گا۔ جب اس پر دمے کا دورہ پڑتا تھا تو وہ ہلکے ہلکے سانس لے کر اپنے سینے کو معتدل کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اس وقت بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس وقت دورہ پڑ جائے۔

بچپن کے دنوں کے واقعات اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔ جب وہ دس برس کا تھا تو اس کا بھائی اسے والد کی کار کی ڈکی میں بند کر دیتا تھا۔ بعض اوقات شرارتاً اور کبھی تربیت دینے کے لیے کہ اگر تم پر ایسا کوئی برا وقت پڑا تو تم کیا کرو گے اور اس صورتِ حال کا مقابلہ کیوں کر کرو گے؟

جب آنند رو یا چیخا تو اس کے بڑے بھائی نے اسے بتایا کہ ڈکی سے نکلنے کا طریقہ کیا ہے۔ اب اس بات کو تیرہ برس گزر چکے تھے، آنند نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ اس نے دماغ پر زور دینا شروع کر دیا۔ موسیقی اس کے ذہن پر برا اثر ڈال رہی تھی، لہٰذا اس نے اپنے کان بند کر لیے تاکہ منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہو۔

اس نے سوچا مجھے روشنی چاہیے تاکہ ڈکی کا جائزہ لے کر کوئی قدم اٹھا سکوں۔ کار کی عقبی روشنی کے قریب اس کا سر تھا، اس لیے روشنی اندر نہیں آ پا رہی تھی۔ اس نے بلب کو اندر لانے کے لیے دو اسکریو ڈھیلے کرنا شروع کر دیے۔ جب یہ مرحلہ گزر گیا تو اس نے تاریں اندر گھسیٹ لیں تو بلب بھی ڈکی میں آ گیا اور وہ چھوٹی سی جگہ روشن ہو گئی۔ وہاں ایک محدود سی روشنی پھیل چکی تھی۔

اب اسے تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ اس نے ڈکی میں بچھے ہوئے قالین کا ایک گوشہ ہٹایا اور اس پائپ کو تلاش کیا جس سے بارش کے دنوں میں گاڑی کا پانی باہر نکال جاتا ہے۔ جب اس نے پائپ کو گھسیٹ لیا تو خلا پیدا ہو گیا اور تازہ ہوا اندر آنے لگی۔ آنند نے چند گہرے سانس لیے تو اس کا سینہ معتدل ہو گیا۔ اس چھوٹی سی جگہ کا حبس بھی بتدریج دور ہونے لگا۔

اب دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ وہ اس ڈکی کو کھول کر ہی باہر نکلتا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو اسے وہ اوزار نظر آ گیا جس سے لاک کو کھولا جا سکتا تھا۔ شاید اس نے کسی مصلحت کے تحت اسے وہاں رکھ دیا تھا اور فراموش کر بیٹھا تھا۔

اس نے اندازہ لگایا کہ کار کی رفتار بہت تیز ہے اس سبب جب کہیں ڈرائیور کو بریک پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے تو کار کو جھٹکا لگتا ہے۔ آنند نے سوچا کہ کار کی ایک لائٹ خراب ہو چکی ہے تو ممکن ہے پولیس والوں کی نگاہ اس پر پڑ جائے اور وہ اس کار کو روک لیں تو اس وقت وہ کار سے نکل جائے گا۔ اسے معلوم تھا کہ جب وہ ڈکی کو کھولے گا تو ڈیش بورڈ پر لائٹ جل جائے گی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے

ہوئے شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ کسی نے ڈکی کو کھولا ہے۔ بہرحال اسے کسی خاص موقع کا انتظار تھا۔

آنند نے لاک کھولنے والے اوزار کو ہاتھ میں لے لیا اور پوری طرح سے تیار ہو گیا۔ مگر خوش قسمتی کی دیوی ابھی اس سے دور تھی۔ جب کار کے پہیے چرچرائے اور کار رک گئی تو اس کے دروازے فوراً... کھل گئے۔ پھر ڈکی کو کھولا گیا۔ پستہ قامت والے کی صورت نظر آئی۔ اس نے گونج دار آواز میں کہا۔ "باہر آ جاؤ۔"

آنند باہر آ گیا اور حکم کے مطابق کار میں جا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ پستہ قامت اس کے بالکل ٹھیک پیچھے بیٹھ گیا۔ آنند نے سوچا اس وقت ان کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ ہونا چاہیے۔ اس لیے وہ قدرے مسکرایا اور گردن گھما کر بولا۔ "تمہارا شکریہ دوست! میں اس تنگ و تاریک ڈکی میں سکڑا سمٹا پڑا تھا۔" اس نے چند ثانیوں تک انتظار کیا کہ ان کی طرف سے کوئی جواب آئے، لیکن کار میں سناٹا طاری رہا۔ وہ پھر بولا۔ "میں جانتا ہوں میرے لیے صورتِ حال گمبھیر ہے، یقین کرو اگر میرے پاس کچھ اور رقم ہوتی تو میں تمہیں دے دیتا۔"

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے داڑھی والے شخص نے کہا۔ "خاموش بیٹھو! تمہاری زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔"

کار ایک جھٹکے سے چل پڑی۔ اس وقت وہ شہر کی جن شاہراہوں سے گزر رہی تھی، وہ آنند کے لیے اجنبی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ لوگ اسے کہاں لے آئے ہیں؟ بالآخر کار ایک جگہ ٹھہر گئی۔ وہاں سے سڑک دو حصوں میں منقسم ہو جاتی تھی۔ آنند کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ ریوالور والے نے اسے اشارہ کیا کہ وہ اس گڑھے میں جا کر لیٹ جائے جو کار سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔

آنند اس گڑھے میں جا کر اوندھے منہ لیٹ گیا، ہر چند کہ ایک خودرو پودا اس کے سینے سے رگڑ کھا کر چبھ رہا تھا لیکن اس نے برداشت کیا۔ وہ کچھ کہہ کر ان لوگوں کے غصے کو ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ "تھوڑی دیر یہاں پڑے رہو، اس کے بعد اٹھ کر چلنا شروع کر دو۔ ہم تمہاری کار کی چابیاں اگنیشن میں ہی چھوڑ دیں گے۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ موت سے مصافحہ کرنا پڑے گا۔"

آنند اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک دھماکا ہوا، شعلہ چمکا اور اس کی نگاہ خیرہ کر گیا۔ پھر اس نے اپنی کھوپڑی

میں ناقابلِ برداشت تکلیف محسوس کی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور اس کے چہرے کے دائیں جانب تکلیف ہونے لگی۔ ممکن ہے اس پستہ قامت نے فائر کیا ہو۔ آنند صحیح اندازہ نہیں لگا سکا کہ صورتِ حال کیا ہے۔ وہ اوندھے منہ گھاس پر گر پڑا۔ اس کا جسم کرب ناک کیفیت سے دوچار تھا۔ پھر کوئی چیز اس کی تھوڑی سے ٹکرائی اور وہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا۔ اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تحقیق کے مطابق رہزنی کی یہ وارداتیں 27 سالہ لیمون اور 28 سالہ پرائس کر رہے تھے۔ انہوں نے علاقے کے بہت سے اسٹورز کو لوٹا تھا اور خاص طور پر ان کی نگاہ ان لڑکوں پر ہوتی تھی جو پیزا وغیرہ گھر تک سپلائی کرتے تھے۔

داڑھی والا لیمون اب تک ہاتھ پاؤں بچا کر کام کر رہا تھا اور پولیس کے پاس اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ البتہ پستہ قامت پرائس بہت سی وارداتوں میں ملوث تھا اور اپنے سیاہ کارناموں کی وجہ سے پولیس کو مطلوب تھا۔ جب کہ اس کی عمر محض سترہ برس تھی کہ اس نے وارداتیں کرنا شروع کردی تھیں۔

ایک ماہ پیشتر جب ان دونوں کی جیبیں خالی ہوگئیں تو انہوں نے پیزا سپلائی کرنے والے لڑکوں کو اغوا کرکے ان کی جیبیں خالی کرنا شروع کردیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اسمیل نامی لڑکے پر ہاتھ ڈالا تھا، جو کار کی ڈگی کو کھول کر فرار ہوگیا۔ انہوں نے اس پر فائر کیا تھا لیکن گولی اس کے بازو پر لگی، وہ مرنے سے بچ گیا۔

اس بار واردات ان کے لحاظ سے اچھی رہی اس لیے کہ ان کے پاس رقم سے بھرا ہوا ایک پرس اور ایک کار ہاتھ آگئی تھی، جب کہ اس واردات کا کوئی عینی شاہد نہیں تھا۔

☆☆☆

جب آنند کی آنکھ کھلی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ جیسے اس کی توانائی کسی نے سلب کر لی تھی۔ اس سے سانس نہیں لیا جا رہا تھا۔ اس کی سماعت میں اب تک فائر کا دھماکا گونج رہا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھپکائیں تو منظر غیر واضح تھا۔ شاید خون آنکھوں تک چلا گیا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ وہ بری طرح سے زخمی ہے اور اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اگر خون زیادہ بہہ گیا تو اس کے زندہ رہنے کے امکانات کم ہی تھے۔ اس نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور اسے گزشتہ سے یاد آیا۔ اس کی کار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ وہ کسی نامعلوم سمت میں جا چکی تھی۔

اس نے سڑک پر چلنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں ہاتھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ اس کی نقاہت میں وقت گزرنے کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے قدم سڑک پر صحیح انداز سے نہیں پڑ رہے تھے، وہ لڑکھڑا رہا تھا۔

وہ سڑک سے ہٹ کر پختہ روش پر آگیا۔ دو کاریں سڑک سے گزریں تو آنند نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور آواز دینا چاہی، لیکن ہاتھ اٹھانے میں اسے دیر ہوگئی اس لیے کہ وہ زخمی تھا اور ہاتھ پوری طرح سے اٹھ نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے منہ سے نکلنے والی آواز بھی غیر واضح اور نحیف تھی۔ یقیناً وہ کار ڈرائیوروں کی سماعت تک نہیں پہنچی ہوگی۔

اس نے اپنے منہ کو چھوا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دانتوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ خون وہیں سے ٹپک رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے، اسی لیے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تیسری بار ایک کار سڑک پر سے گزری تو اس نے آواز دی، لیکن وہ صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ آنند نے کسی سے مدد لینے کا ارادہ ترک کردیا اور بدستور چلتا رہا۔ وہ چل نہیں رہا تھا بلکہ گھسٹ رہا تھا۔

پھر ایک کار اس پختہ روش پر آگئی۔ اس کے ڈرائیور نے بریک لگائے لیکن وہ آنند سے چند فٹ آگے نکل گئی۔ خوف و دہشت کی ایک لہر آنند کے رگ و پے میں دوڑ گئی، اس لیے کہ اس کار کی ایک ٹیل لائٹ غائب تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کار اسی کی تھی۔ بلاشبہ وہ قاتل اس کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور بچ کر جا رہا ہے۔ ان کے ہاتھ سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ پولیس کے نرغے میں آجاتے۔

آنند نے اپنی رفتار تیز کردی اور نکاسی کے ایک پائپ کے پیچھے چلا گیا۔ کار رک گئی اور وہ دونوں اتر پڑے جنہوں نے تھوڑی دیر ہی پہلے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے جوتوں سے دھمک پیدا کرتے ہوئے اس کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ آنند آگے بڑھا تو اسے خاردار تاروں کی باڑھ نظر آئی۔ وہ باڑھ ایک مکان کے گرد کھڑی تھی۔ آنند نے اسے کئی جگہوں سے چھو کر دیکھا تو ایک مقام پر وہ ٹوٹی ہوئی ملی۔ وہاں اتنی گنجائش تھی کہ ایک آدمی گزر سکے۔ وہ اندر چلا گیا۔

وہ مکان کا لان تھا۔ آنند ایک قد آور پودے کے پیچھے چھپ گیا۔ اسے توقع تھی کہ تاریکی کی وجہ سے اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن وہ وہاں رکتے نہیں تھے۔ دوسری صورت میں ان کے ہتھیار دندناتے اس کے پیٹ میں جا سکتے تھے۔

قدرت اسے سلامت رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے اور ان کے گمان میں بھی نہیں آیا کہ وہ خاردار باڑھ کے پیچھے جا کر کسی پودے کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ وہ بڑبڑاتے رہے اور مغلظات بکتے رہے۔ پھر مڑے اور کار کی طرف چل پڑے۔ چند ثانیوں بعد کار اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے چلی گئی۔

آنند نے اٹھنا چاہا، لیکن اس بار اٹھنا اس کے لیے دشوار ثابت ہوا، اس لیے کہ اس کی توانائی مفقود ہو چکی تھی اور ہاتھ پیر جواب دے چکے تھے۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ جب جان لوٹ آئی تو وہ کراہتا ہوا اٹھا۔ وہ پختہ روش پر چلا گیا، لیکن اس نے سڑک سے خود کو دور ہی رکھا۔ اس لیے کہ اب وہ اچھی طرح سے آگاہ ہو گیا تھا کہ اس کے قاتل اسی علاقے میں گھوم رہے ہیں اور اس کی جان کے درپے ہیں لہٰذا اسے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیے کہ وہ ان کی دسترس میں چلا جائے۔ اب اس کی گلوخلاصی اسی صورت میں ممکن تھی کہ وہ مسلسل چلتا رہے اور اپنی جان بچانے کے لیے کوئی کمین گاہ بھی تلاش کرتا رہے۔

☆☆☆

اس کے خاندان میں سب ہی تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار تھے۔ وہ انڈیا سے ہجرت کرکے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے تعلیم کو اپنا منتہا اور مقصد بنا لیا تاکہ کوئی معاشی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ آنند کے باپ نے انجینئرنگ میں ماسٹرز کیا تھا اور اسی بنا پر وہ ایک کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا اور توقع تھی کہ وہ جلد ہی ڈاکٹر بن جائیں گے۔ آنند کے بھائی اس کے گھر والے آئیڈیل تھے اور وہ ان کی پیروی کرکے مستقبل کا شان دار بنا سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ چلتا رہا۔ جب تھک جاتا تو کسی مکان یا دکان کی آڑ میں بیٹھ جاتا اور سستانے لگتا۔ اس طرح سے اس نے دو میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ بالآخر وہ ایسی جگہ پہنچ گیا جس کے گرد و پیش سے وہ واقف تھا۔ اسے لوپ 820 کہا جاتا تھا۔ اس نے ایک کھمبے سے ٹیک لگائی اور دعا کرنے لگا کہ گشتی پولیس کی کوئی گاڑی وہاں آجائے۔

کافی دیر کے بعد پولیس کی ایک گاڑی وہاں آگئی۔ اس کی چھت پر لگی گھومتی ہوئی روشنی اسے دلاسا دے رہی تھی۔ آنند جانتا تھا کہ وہ موت کے منہ میں پہنچ کر واپس آگیا ہے۔ جب افسر نے اتر کر اس سے ماجرا دریافت کیا تو اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”دو رہزنوں نے میرے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے۔“ افسر نے اس کے شکستہ ڈھانچے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”اور میں ان دونوں کا حلیہ بیان کرسکتا ہوں۔“

اس نے اپنی کار ہنڈائی کا لائسنس نمبر لکھوایا اور پولیس کی گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

آنند پر حملے کے دو دن بعد پولیس کو اپنے ایک مخبر سے اطلاع ملی کہ ایک مشتبہ شخص مارکیٹ میں گھومتا ہوا پایا گیا ہے۔ ان دونوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ آنند نے انہیں فوٹو گراف سے شناخت کرلیا۔ پولیس نے ان سے پوچھ گچھ کی اور سابقہ وارداتوں کے بارے میں ان کے بیانات ریکارڈ کیے۔

پولیس نے آنند کو اسپتال میں داخل کرایا جہاں اس کے سر سے اعشاریہ 22 کی دو گولیاں نکالی گئیں۔ ڈاکٹر حیران تھے اتنا ہولناک حادثہ ہونے کے باوجود وہ زندہ کیسے رہا؟ گولیاں دماغ کے پردے سے آدھے آدھے سی ایم کے فاصلے پر رہ گئیں تیسری گولی اس کی تھوڑی میں لگی تھی جسے بعد میں نکالنے کا پروگرام تھا۔ اس کی سماعت اور بینائی کا بھی علاج کیا گیا۔ ان دونوں چیزوں پر بھی بھیانک اثر پڑا تھا۔

ڈاکٹروں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے آپریشن کئی مراحل میں ہوں گے۔ سب سے آخر میں جبڑے کو ٹھیک کیا جائے گا۔ اس کے اہلِ خانہ کئی بار اسے دیکھنے کے لیے اسپتال آچکے تھے۔ اس کے والد نے کہا کہ ہم ہجرت کرکے امریکا تو آگئے ہیں، لیکن لاقانونیت نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دراصل ہم ایک جرم قبول معاشرے میں رہتے ہیں۔ کسی کو لاقانونیت کرتے دیکھتے ہیں تو منہ موڑ لیتے ہیں کہ ہم سے کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حقائق سے گریز ہے۔ اگر ہم جرم کو رد کریں تب ہی اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ ہم جرائم کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے کے عادی ہیں۔“

آنند نے دھیرے سے کہا۔ ”مگر میں قانون پڑھ کر جرم کے خلاف جہاد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“

”قادرِ مطلق تمہیں اپنے ارادوں میں کامیابی عطا کرے۔“

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 75
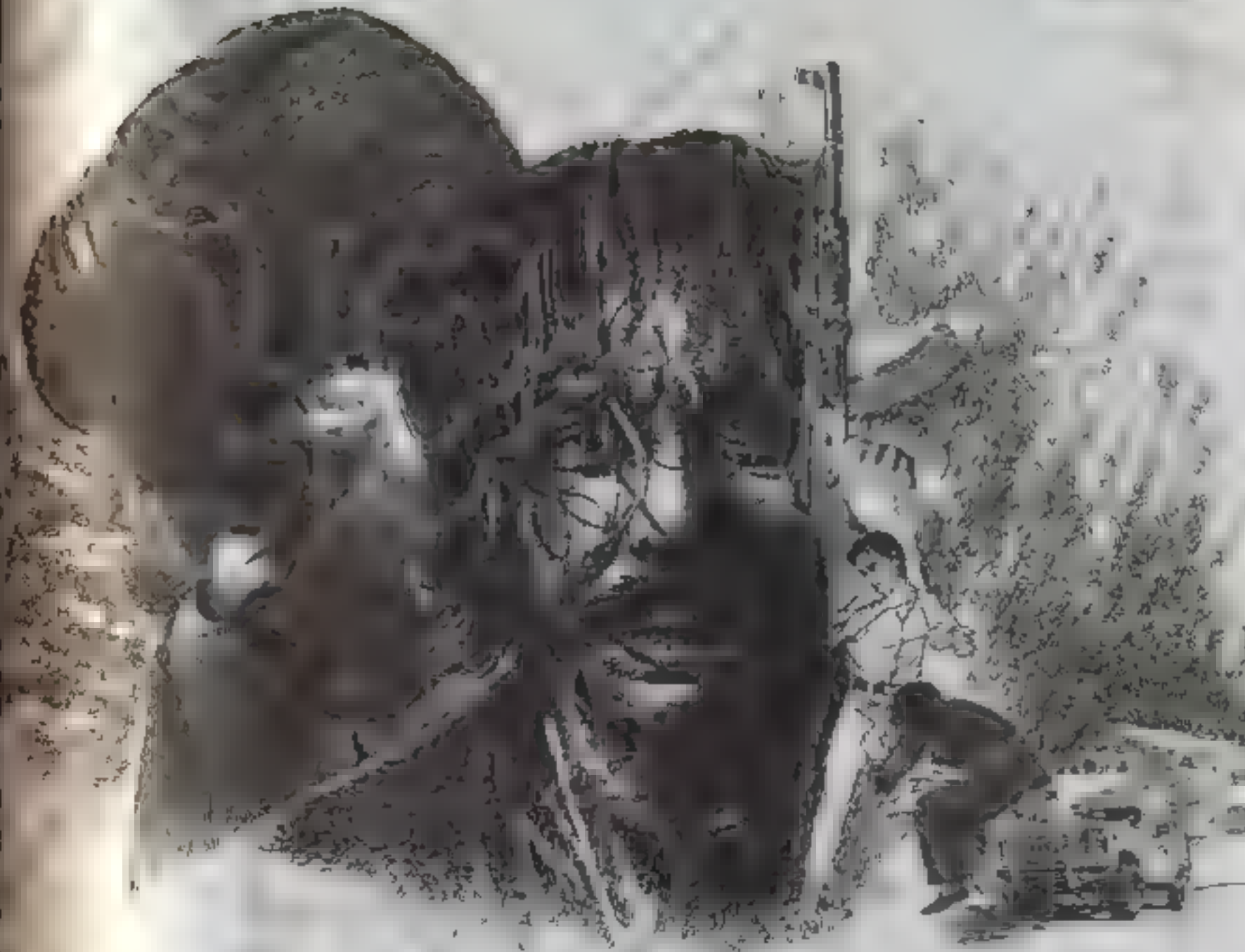
وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں، اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری بجائے میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ دشمنی میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور زیب داد جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت ہند کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جا کر بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ ہیرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ذیوڈ شاہ کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، ہمت شاہ کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بھی بلوا لیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہمت شاہ نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانہ بنایا تھا کہ فتح خان کے آدمی نے ہمت شاہ کو گولی مار دی۔ مرتے وقت ہمت شاہ بڑبڑایا "تاریخ ... ہکسٹ" دم توڑتے ہمت شاہ کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ تبھی ڈیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ رانا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں گل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم چترال جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس دور پھینک دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو ہمارے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرو سنگھ نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ گیا۔ ٹی وی دیکھا تو ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ بیلی کا پٹر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضل کا تھا۔ ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ فاضل قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضل نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضل نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضل کو زخمی کر دیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ لے آئے اور ابھی بیٹھے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس" ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کر لیا۔ راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کر کے نادر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر ایک دوسرے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی جو لڑکی بہرہ تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو سنگھ بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو سنگھ ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ تبھی میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ ایک نئی کوٹھی کرائے پر لی تو وہ ڈاکوؤں کا اڈا ثابت ہوئی۔ ان کے چھپے ہوئے خزانے پر ہم نے قبضہ کر لیا اور کوٹھی خالی کر آئے۔ ڈاکوؤں نے مکان مالک کو اغوا کر لیا۔ ہم اسے رہا کرانے ان کے مرکز پر پہنچے اور زبردست مقابلے کے بعد مکان مالک کو رہا کرا کر آ رہے تھے کہ کسی جیپ نے ہمارے راستے کو روک لیا۔ تبھی سامنے سے بھی گاڑیاں آ گئیں اور ان لوگوں نے ہمیں گھیرنے والی گاڑیوں کے نرغے سے نکال لیا۔ ہم کوٹھی پر پہنچے تو حویلی بھیج کر بانی اور جیرو کو بلوا لیا۔ سفیر کو حق بھیجا تھا اسے ایئرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں یک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ بیلی کاپٹر پر جو شخص آیا ... دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔

اب آگے پڑھیں

وہ راج کنور تھا۔ وہی راج کنور جو مجھے انڈیا میں ملا تھا اور جس نے اپنے بڑے بھائی کے لیے میرے جسم سے خون نچوڑ لینا چاہا تھا بلکہ خاصا خون نچوڑ لیا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بچ گیا ورنہ ان لوگوں نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ راج کنور کے بڑے بھائی کو جسے سب بڑے کنور کہتے تھے، اسے ایک سانپ نے ڈس لیا تھا جس کے پورے جسم پر کوڑھ جیسا مرض چھا گیا تھا۔ یہ آہستہ آہستہ اس کے جسم کو گلا رہا تھا۔ سندھو نامی ماہر سپیرا اس کا علاج کر رہا تھا اور اس نے بڑے کنور کے مرض کا علاج بھی دریافت کر لیا تھا۔ اس کے علاج کے لیے ایسے فرد کا خون درکار ہوتا تھا کہ جسے شیش ناگ قسم کے سانپ نے ڈسا ہو اور وہ بچ جائے۔ اس کے خون میں کچھ ایسی خاصیت پیدا ہو جاتی جو بڑے کنور کے علاج کے لیے بنائی جانے والی دوا کا خاص جز و بن جاتا تھا جیسے حکیم قاؤس کی دواؤں میں اس پراسرار وادی سے آنے والا خاص پتھر استعمال ہوتا تھا۔

بدقسمتی سے مجھے انڈیا میں ایک سانپ نے ڈس لیا تھا اور اس کے دانتوں سے کوئی چار گنا زیادہ زہر میرے جسم میں اتار دیا تھا۔ ایک تو قدرت کی طرف سے میرا وقت نہیں آیا تھا دوسرے میں سپیرے سندھو کو مل گیا۔ یہ اصل میں اس کا ایک سانپ تھا جس نے مجھے ڈسا تھا، اس کی تلاش میں سندھو کو میں مل گیا اور اس نے میرا علاج کیا تھا۔

جب میں سندھو کے ہاتھ لگا تو اس کی کم عمر بیٹی اوشا مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی اور اس نے میری مدد کی کوشش بھی کی لیکن بدقسمتی سے ہم دونوں پکڑے گئے اور کنوروں کے قبضے میں چلے گئے۔ اس کے بعد وہاں ہنگامہ ہوا اور میں وہاں سے نکل گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کنوروں، سندھو اور اوشا پر کیا گزری تھی۔ صرف سندھو کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ ہنگامے میں مارا گیا ہے لیکن یہ بھی یقینی نہیں تھا۔ بعد میں رانا صاحب نے تصدیق کی کہ کنور خاندان بچ گیا تھا اور کنوروں کی بہن سمادھنا ہمارے ساتھ آ گئی تھی۔ اب وہ سعدیہ تھی اور اس کا کنوروں سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس نے خود یہ تعلق توڑا تھا۔ زمین اور ہیروں کے لالچ میں انہوں نے بے شمار قبائلیوں کا قتل عام کرایا تھا اور اب وہ زمین اور ہیروں کی کان یقیناً ان کے قبضے میں تھی۔ وہ پہلے سے بہت طاقتور بن چکے تھے اور اس کا ثبوت راج کنور کی یہاں آمد تھی۔ وہ مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"شہباز جی کیا پہچانا نہیں مجھے جو ایسے دیکھ رہے ہو؟"

"شیطان کو میں ہر روپ میں پہچان لیتا ہوں۔" میں نے ویسی آواز میں کہا۔ "تمہیں تو میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

اس کا چہرہ بگڑا تھا۔ "آج بھی تمہاری زبان بہت تیز ہے۔"

"کام کی بات کرو۔" میں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "بڑے صاحب نے بتایا ہے کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔"

اس بات پر تاہم اسے خیال آیا کہ وہ کس لیے یہاں آیا تھا۔ اس کی ہیلی کاپٹر سے آمد بتا رہی تھی کہ وہ قانونی طریقے سے سرحد پار کر کے نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ہیلی کاپٹر نے ہماری فضائی حدود کی خلاف ورزی کی تھی اور اب پورے دھڑلے سے اس سرزمین پر موجود تھا۔ مجھے افسوس ہوا میں .... ممتاز کو صرف ایک مخصوص ذہنیت کا سیاست دان سمجھتا تھا لیکن کنور کی یہاں موجودگی بتا رہی تھی کہ وہ اس زمین کا غدار بھی ہے ورنہ ایک بھارتی جاگیردار اور سیاست دان کی موجودگی کو کیا کہا جا سکتا تھا۔ مگر یہ سب میں نے دل میں سوچا تھا اور اپنی زبان اور تاثرات کو قابو میں رکھا تھا۔ کنور نے سر ہلایا۔ "یہ درست ہے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ تم جانتے ہو تم بھارتی حکومت کو مطلوب ہو اور تم پر دہشت گردی کے بے شمار الزامات ہیں...."

"انہیں میں اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "کنور میں نے کہا نا.... کام کی بات کرو۔"

"مہاشے جی۔" وہ پھر تپ گیا۔ "یہاں تم ایک قیدی ہو اس لیے زیادہ بڑھ کر مت بولو۔"

"ٹھیک ہے میں قیدی ہوں۔ اس سے تمہیں کیا؟"

"ممتاز صاحب... میرے اچھے واقف کاروں میں سے ہیں۔ ہم ایک جیسے لوگ ہیں۔ میں نے ان سے کہا اور انہوں نے تمہیں تلاش کر لیا۔"

گویا... ممتاز نے اسے یہ کہا تھا کہ اس نے مجھے تلاش کیا ہے۔ میں نے سوچا مگر راج کنور کی بات کی تردید نہیں کی۔ اول تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا پھر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ .... ممتاز نے یہ غلط بیانی کیوں کی؟ میں ابتدائی جھٹکے سے سنبھل گیا تھا اور کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ راج کنور یہاں کیوں آیا ہے اور وہ .... ممتاز کے توسط سے مجھے کیوں

تلاش کروا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "بڑے کنور کا کیا حال ہے؟ کیا وہ زندہ ہے؟"

اپنے بھائی کے بارے میں سن کر اس کا رنگ بدلا تھا۔ "ہاں وہ زندہ ہیں مگر ان کا مرض بڑھ رہا ہے۔"

"ظاہر ہے اب تم لوگوں کے پاس نہ سندھو ہے جو کسی کے خون سے اس مرض کی دوائی تیار کر کے دے اور نہ کوئی ایسا فرد جس کا خون مخصوص قسم کا ہو۔"

"سندھو کی جگہ دوسرا آدمی تلاش کر لیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ماہر ہے مگر کوئی ایسا بندہ اب تک نہیں ملا ہے جس کا خون کام آسکے۔"

"تم لوگوں کے پاس مجبور انسانوں کی کیا کمی ہے تم سیکڑوں لوگوں کو بھی سانپ سے ڈسوا کر ایسا آدمی تلاش کر سکتے ہو جو زہر سے بچ جائے اور اس کے خون میں وہی چیز آجائے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" میرے طنز کے جواب میں اس نے دبی زبان میں کہا۔ "ہم نے کچھ لوگوں پر تجربہ کیا مگر وہ بچ نہ سکے۔ اصل میں سندھو ایسے لوگوں کو مخصوص جڑی بوٹیاں دے کر بچاتا تھا، ان جڑی بوٹیوں کا کسی کو پتا نہیں ہے۔"

"ابھی تم کہہ رہے تھے کہ نیا آدمی سندھو سے زیادہ ماہر ہے۔"

"اس کا طریقہ علاج دوسرا ہے لیکن جب اس بارے میں پتا چلا تو اس نے دعویٰ کیا کہ وہ تمہارے خون سے کہیں زیادہ موثر دوا بنا سکتا ہے جو بڑے کنور کو چند ہفتوں میں بالکل ٹھیک کر سکتی ہے اور خون بھی زیادہ نہیں درکار ہوگا۔ ہر ہفتے صرف آدھا لیٹر خون چاہیے ہوگا۔"

میرا خدشہ درست نکلا تھا وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آیا تھا..... میں ممتاز کا قیدی تھا اگر وہ مجھے بے دست و پا کر کے اس کے حوالے کر دیتا تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ "یہ خون تمہیں میرے جسم سے چاہیے؟"

"ہاں مگر اس کے بدلے تمہیں بھی فائدہ ہوگا۔ تمہارے خلاف انڈیا میں جتنے کیس ہیں ان سب سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا اور دوسرے تم جو رقم مانگو گے وہ تمہیں دی جائے گی۔"

ایسے ہی وعدے مرشد نے بھی کئی بار مجھ سے کیے تھے لیکن ان پر عمل درآمد کی نوبت اس وقت آئی جب وہ میرے سامنے بالکل مجبور ہو گیا تھا۔ جب کہ کنوروں کو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی اور وہ مرشد سے کہیں زیادہ گھٹیا قسم کے سیاست دان تھے۔ گزشتہ رات جب..... ممتاز نے اچانک ہی مجھے معزز مہمان سے معزز قیدی کا درجہ دیا تھا تو میں دنگ رہ گیا تھا اور فوری طور پر میرے ذہن میں اس مشکل سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں آیا۔ جب کہ ... ممتاز نے پوری منصوبہ بندی سے مجھے جکڑ لیا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو بھی دھوکا دیا تھا۔ میں یوں بھی کنفیوز تھا کہ مجھے اس دشمن کا علم نہیں تھا جس نے..... ممتاز سے رابطہ کیا تھا۔ اب وہ دشمن سامنے تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ وہ مجھے یہاں سے لے جانے آیا تھا جب کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں کسی صورت اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "راج کنور اگر میں تمہارے ساتھ جانے سے انکار کردوں تو....."

"تو اس صورت میں جلد بھارتی حکومت کی طرف سے تمہاری حوالگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔ اگر تمہیں حوالے نہیں کیا گیا تو یہ معاملہ عالمی اداروں میں جائے گا۔ تمہیں کسی مستند دہشت گرد تنظیم کا رکن قرار دیا جائے گا تم سوچ سکتے ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔" راج کنور کا لہجہ مجھے ڈرانے والا تھا۔

"میرے خلاف بھارتی حکومت کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

"ثبوت ہیں۔" اس نے زور دے کر کہا۔ "فوج کے ورودھ (خلاف) ویوہار (استعمال) ہونے والے اور ہمارے سینا کے سپاہیوں کو مرتیو (موت) کے گھاٹ اتارنے والے کئی ہتھیاروں پر تمہاری انگلیوں کے نشانات ہیں۔ اسی طرح کم سے کم سو افراد موجود ہیں جنہوں نے تمہیں انڈیا میں اپرادھیک (مجرمانہ) کارروائیاں کرتے دیکھا ہے۔ دوسرے پرمان (ثبوت) بھی ہیں۔"

مجھے لگا اس بار راج کنور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے بھارت کی سرزمین پر بے شمار ہتھیار استعمال کیے تھے وہاں پر سے میری انگلیوں کے نشانات لینا عین ممکن تھا۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا مگر موازنے کے لیے ان کے پاس میری انگلیوں کے نشانات کہاں سے آئے۔ میں نے یہی سوال راج کنور سے کیا تو اس نے کہا۔ "یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے یہاں میری موجودگی سے تمہیں اندازہ ہو گیا کہ ہماری رسائی کہاں تک ہے۔"

راج کنور اپنی گفتگو میں ہندی کے وہ الفاظ استعمال کرتا جو جا بجا طور پر اس میں شامل کیے گئے تھے اور جسے شدھ ہندی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر الفاظ میرے لیے غیر مانوس تھے اور مجھے اندازے سے سمجھنا پڑ رہا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اس کی گفتگو کو آسان بنا کر پیش کر رہا ہوں۔ میں تشویش زدہ ہو رہا تھا مگر اپنے انداز سے میں نے ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بجائے میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ٹھیک ہے تم یہاں بہت اثر و رسوخ رکھتے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مجھے اتنی آسانی سے لے جا سکو گے۔"

"آسانی سے نہیں تو مشکل سے لے جاؤں گا۔" راج کنور نے غرا کر کہا۔ وہ اپنے اصل روپ میں آ رہا تھا۔ "ممتاز صاحب نے مجھے وچن دیا ہے کہ وہ میری سہایتا (مدد) کریں گے۔"

"تب تم ان ہی سے بات کرو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میرا دماغ کیوں کھا رہے ہو؟"

"تم سوئم (خود) چلو گے تو تمہیں بھی لابھ (فائدہ) ہوگا۔ انا تھا (ورنہ) تمہیں بندی (قیدی) بنا کر لے گئے تو تم کو کچھ نہیں ملے گا۔" اس نے دھمکی دی۔

میں خاموش رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا نہیں کہ میں اپنی خوشی سے بھی گیا تو مجھے کچھ نہیں ملے گا۔ سوائے اذیت اور موت کے۔ اسی لمحے..... ممتاز وہاں آگیا۔ حسبِ معمول وہ ترو تازہ اور سوبر لگ رہا تھا۔ اس نے گاؤن پہن رکھا تھا۔ وہ اپنی نشست پر آیا اور اس نے راج کنور کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے تمہاری بات ہو گئی ہے۔"

"کہاں جناب۔" اس نے شکایت کرنے والے انداز میں کہا۔ "یہ کچھ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"بکرا یا بھیڑ سے کہے کہ دیوار سے پیچھے آجاؤ میں تمہیں چھری نہیں کھونپوں گا تو کیا بھیڑ اس کی بات مان لے گی؟" میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا۔

"میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" راج کنور بولا۔ "بس چند مہینوں کی بات ہے۔"

"اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، عدالت میں ایک خاتون نے وکیل کے سوال پر اپنی عمر اٹھائیس سال اور چند مہینے بتائی۔ جب وکیل نے چند مہینوں کی وضاحت کرنے کو کہا تو پتا چلا یہ مہینے چوبیس نکلے تھے۔ تو راج کنور صاحب مجھے یقین ہے کہ آپ کے چند مہینے بھی اس سے کم نہیں ہوں گے۔"

ممتاز زیرِ لب مسکرایا تھا مگر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "تب اس مسئلے کا کیا حل نکل سکتا ہے؟"

"میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور اگر مجھے زبردستی اس کے ساتھ روانہ کیا گیا تو بڑے صاحب سمجھ سکتے ہیں آئندہ میرا اور میرے ساتھیوں کا ردعمل کیا ہوگا۔"

"میں تمہارا ہمدرد ہوں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ "مگر کنور فیملی سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔"

"تب آپ مجھے ان کے حوالے کر دیں۔"

ممتاز نے تپائی سے سگار کیس اٹھایا۔ سگار نکال کر سلگایا اور ایک گہرا کش لے کر دھواں چھوڑا اور نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔"

میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا کہ یہ کیوں ممکن نہیں ہے۔ یقیناً بیٹی باپ کے آڑے آئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق..... ممتاز حسین کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ نورالنساء عرف بنی اور مہرالنساء عرف ٹینا۔ کوئی بیٹا نہیں تھا مگر جہاں تک اس کا نام روشن کرنے کا تعلق تھا تو یہ دو بیٹیاں دس بیٹوں پر بھاری تھیں۔ ان کے کرتوت میں خود ملاحظہ کر چکا تھا۔ وہ ان کے آگے مجبور تھا۔ راج کنور یہ سن کر اچھل پڑا تھا اس نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ممتاز صاحب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں اتنا خطرہ مول لے کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ ایسے ہی واپس چلا جاؤں۔"

"دیکھو ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اگر دونوں طرف افہام و تفہیم کا جذبہ ہو۔"

"جو ہمارے سیاست دانوں میں بہت پایا جاتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا.... مگر ممتاز نے برا نہیں منایا اس کے بجائے اس نے سر ہلایا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ فطری اصول ہے جو طبقہ جتنا متحد ہوگا وہ دوسرے طبقوں پر اتنا ہی حاوی ہوگا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ وہ اقلیت میں ہے اور اکثریت پر حکمران ہے۔ دنیا میں دیکھو تو یہودی اس کی بہترین مثال ہیں۔"

"اور ہماری حکمران کلاس۔" میں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ "انہوں نے اپنے مفاد کے لیے ایکا کیا ہوا ہے اور عوام کو تقسیم کر رکھا ہے۔"

راج کنور بولا۔ "صرف پاکستان نہیں ایسا ہر جگہ ہوتا ہے۔ انڈیا میں بھی سیاست دان متحد ہیں لیکن جناب میں یہاں سیاست پر بحث کرنے نہیں آیا ہوں آپ مجھے بتائیں کہ اس شخص کو میرے حوالے کر رہے ہیں یا نہیں، اگر آپ کا

جواب انکار میں ہوتا ہے تو سوچ لیجیے گا بعد میں ہمارے پاس بھی انکار کا موقع آئے گا۔"

یقیناً... ممتاز اور کنوروں کے درمیان کوئی مالی مفاد کا چکر تھا اور راج کنور اسے اسی حوالے سے دھمکی دے رہا تھا..... مگر ممتاز نے بہ ظاہر کوئی اثر نہیں لیا۔ اس کے بجائے اس نے ایک گہرا کش اور لیا اور نرم لہجے میں بولا۔ "میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم دونوں مان لو؟"

"ممتاز صاحب میں اس شخص سے کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔" میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "اس سے بہتر ہے میں شیطان سے تعاون کرلوں، آپ جانتے ہیں یہ شخص ہزاروں معصوم افراد کا قاتل ہے جن میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے۔"

"اگر تمہارا اشارہ قبائلیوں کے قتلِ عام کی طرف ہے اس کی ذمے داری جتنی کنور خاندان اور بھارتی حکومت پر عائد ہوتی ہے اتنی ہی ان قبائلی زعما پر ہوتی ہے جنہوں نے ہیرے کی کان اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے اپنے لوگوں کو مروا دیا....." ممتاز نے سرد لہجے میں کہا۔ "انہیں پیشکش کی گئی تھی کہ وہ یہ جگہ چھوڑ دیں تو انہیں نہ صرف متبادل جگہ فراہم کی جائے گی بلکہ اس کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔"

"متبادل زمین۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "بڑے صاحب میں اس لفظ کے معنی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہزاروں سال سے طاقتور حکومتیں محکوموں کو اس طرح کے لارے دیتی رہی ہیں۔ امریکا کی تو پوری تاریخ ہی اس لفظ کے گرد گھومتی ہے جب مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے متبادل زمین کے دھوکے دیے گئے اور انڈیا میں متبادل زمین ہے کہاں؟"

ممتاز کے چہرے پر بیزاری دکھائی دینے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ میں فوراً اس کی تجویز مان لوں گا مگر میرا ردِعمل اس کی توقع کے خلاف تھا۔ راج کنور خاموش تھا ایسا لگ رہا تھا کہ مذکورہ تجویز پہلے سے اس کے علم میں تھی کیونکہ اس نے اس بارے میں ذرا بھی اشتیاق کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ دونوں مل کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں خاموش ہوا تو ممتاز نے جھنجلا کر کہا۔ "شہباز تم ایک بار میری تجویز سن تو لو۔"

"مجھے معلوم ہے آپ کیا تجویز پیش کریں گے۔"

میری اس بات پر وہ چونکا۔ "تمہیں کیسے معلوم؟"

"جناب عالی اللہ نے مجھے عقل دی ہے۔ آپ یہی تجویز کرتے نا کہ میں یہیں رہوں۔ آپ مجھے راج [illegible] حوالے نہیں کریں گے لیکن اسے ضرورت کے مطابق خون مہیا کیا جاتا رہے گا۔"

اس بار..... ممتاز کے ساتھ راج کنور بھی [illegible] تھا۔ انہوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کو جس طرح [illegible] اس سے ان کی ملی بھگت واضح ہوگئی..... ممتاز نے ناخواستہ سر ہلایا۔ "یہ درست ہے۔"

"میں راضی خوشی اپنے جسم سے صرف اضافی [illegible] دے سکتا ہوں۔" میں نے کہا تو راج کنور اچھل پڑا تھا۔

"بس جناب، میں اس سے زیادہ [illegible] برداشت نہیں کر سکتا۔"

"بے عزتی۔" میں نے طنز کیا۔ "جو لوگ اپنی [illegible] کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو جائیں وہ [illegible] کا مطلب سمجھتے ہیں۔"

راج کنور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے [illegible] کہا۔ "بکواس مت کرو، آشا قبائلیوں کے حملے میں [illegible] گئی تھی۔ انہوں نے اس کی لاش بھی جلا دی تھی۔"

"چلو یہ مسئلہ بھی حل ہوا اور تمہاری عزت [illegible] میں نے ہنس کر کہا۔ "لاش بھی تم نے شناخت کی ہوگی۔"

ممتاز نے سگار نئے سرے سے سلگا کر [illegible] دھواں آلود کرتے ہوئے کہا۔ "تم دونوں بیکار کی بحث میں الجھ گئے ہو۔ ماضی میں جو ہوا اسے بھول جاؤ، حال کے مسئلے پر بات کرو۔"

"ممتاز صاحب میں اسے لے کر جاؤں گا۔" راج کنور نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں کسی صورت اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور یہ بات بڑے صاحب بھی سمجھتے ہیں کہ میرے ساتھ زبردستی کرنے کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔"

"اسی لیے میں نے متبادل تجویز رکھی ہے۔"

"لیکن جناب، شہباز انکار کر رہا ہے۔" راج کنور نے کہا۔

"شہباز تم اپنے رویے سے میرے اور اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو۔" اس بار میاں ممتاز نے بد[illegible] ہوئے لہجے میں کہا۔

"بڑے صاحب، مشکلات نہ آپ کے لیے نئی ہیں اور نہ میرے لیے نئی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس لیے آپ یہ مت سوچیں کہ میں مشکلات [illegible]

سے آپ کی تجویز سے متفق ہو جاؤں گا۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے ......" ممتاز نے پھر لہجے میں شہد گھول کر کہا۔ وہ بلاشبہ ماہر سیاست دان تھا ورنہ اس کی جگہ اس حیثیت کا کوئی اور شخص ہوتا تو اب تک مشتعل ہو کر اپنے اصل روپ میں آچکا ہوتا۔ "راج کنور کا کہنا ہے کہ اسے ہفتے میں نصف لیٹر خون درکار ہے جب کہ اس سے پہلے تم کئی بار ایک لیٹر تک خون دے چکے ہو۔ یہاں بہترین ڈاکٹر تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ تمہیں بہترین غذا میں اور سپلی منٹ دیے جائیں گے، اگر کوئی کمی ہوگی تو وہ متبادل طریقے سے پوری کردی جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں ممتاز صاحب کہ نصف لیٹر خون دینے سے میری صحت پر خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اگر کسی کی جان بچنے کا سوال ہوتا تو میں اپنی پروا بھی نہ کرتا لیکن ان بھائیوں کے لیے میرے پاس کیا ہے وہ میں بتا چکا ہوں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

اس گفتگو کے ابتدائی حصے میں ہی میں سمجھ چکا تھا کہ...... ممتاز اور راج کنور اصل میں ایک پارٹی ہیں مگر ...... ممتاز بہ ظاہر اقوام متحدہ کا کردار ادا کر رہا تھا یعنی وہ کردار جو اقوام متحدہ ثالثی کے نام پر بڑی طاقتوں کے لیے ادا کرتی ہے۔ وہ سب پہلے سے طے کر کے آئے تھے اور اس میں یقیناً یہ بھی شامل تھا کہ میں تعاون سے بالکل انکار کردوں تو وہ پھر کیا کریں گے ...... ممتاز نہ سہی لیکن راج کنور مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا میں کسی صورت نہیں مانوں گا۔ بات اس طرف جا رہی تھی جب متبادل طریقہ سامنے آتا۔ دوسرے لفظوں میں بلی تھیلے سے باہر آجاتی ...... ممتاز نے گہری سانس لی۔ "شہباز مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری تجویز مسترد کردی۔"

"اس لیے آپ اب مجھے راج کنور کے حوالے کر دیں گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر تم راضی خوشی چلے جاتے تو ٹھیک تھا لیکن اس صورت میں جب کہ تم کنور خاندان کو اپنا دشمن قرار دے رہے ہو تمہیں ان کے حوالے کرنا مناسب نہیں ہوگا۔"

"یعنی مجھے یہیں رکھ کر میرا خون نچوڑا جائے گا۔"

"مجبوری ہے ......!" ممتاز نے پُر تفکر انداز میں کہا۔ "تم نے کوئی اور راستہ چھوڑا نہیں ہے۔"

"ممتاز صاحب تب بہتر ہے یہ کام آپ پوری احتیاط سے کریں۔ میں اس سلسلے میں آپ سے کسی تعاون نہیں کروں گا۔ بلکہ ہر ممکن مزاحمت کروں گا۔"

"مجھے بھی اسی بات کا خدشہ تھا ......" ممتاز نے سر ہلایا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور پھر کسی سے کہا۔ "کیا رپورٹ ہے؟" دوسری طرف سے سن کر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ "لو بات کرو۔"

میں نے موبائل کان سے لگایا تو دوسری طرف سے بیتو کی آواز آئی۔ "شوبی...... شوبی آپ کہاں ہے؟"

"بیتو" میرا دل دھڑ کا تھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"یہ لوگ ہم کو کل سے کہیں باہر لایا ہے۔ آنکھ پر پٹی باندھ کر...... ادھر ہم کو قید کیا ہے...... آپ ٹھیک ہونا۔"

"بیتو میں ممتاز ہاؤس میں ہی ہوں۔" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں کسی نے بیتو سے موبائل لے کر کال کاٹ دی۔ میں ہیلو ہیلو کرتا رہ گیا۔ میں نے غصے میں ...... ممتاز کا موبائل ...... دیوار پر دے مارا اور اس کے پرزے بکھر گئے تھے ...... مگر ممتاز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اس نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور بولا۔ "شہباز ملک اب تم سمجھ گئے ہوگے۔"

"جی سمجھ گیا ہوں۔" میں نے دانت پر دانت جما کر کہا۔ "مجھے امید ہے ابھی آپ نہیں سمجھیں ہیں لیکن جلد سمجھ جائیں گے۔"

ظاہر ہے اس دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ راج کنور بھی اٹھا تھا اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "اچھا جناب بہت شکریہ...... میں پھر چکر لگاؤں گا۔"

"لیکن سرحد کے راستے ......" ممتاز نے کہا۔ "آپ کا اس طرح آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

راج کنور نے یہاں نہ تو کچھ کھایا پیا تھا اور نہ ہی اس نے ...... ممتاز سے ہاتھ ملانے کی کوشش کی۔ وہ چھوت چھات کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس کے اس رویے کے باوجود بہ قول ...... ممتاز اس کے کنور خاندان سے مراسم تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ...... ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہ کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنے پر تل جاتا تو میں اس کے سامنے بے بس تھا۔ اگرچہ یہاں بھی حالات اچھے نظر نہیں آرہے تھے لیکن ایک تو میں اپنے ملک میں تھا دوسرے یہاں میں فرار کی کوشش کر سکتا تھا۔ راج کنور کے جانے کے بعد ...... ممتاز نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے شہباز، مگر میں بعض وجوہات کی بنا پر

مجبور ہوں، انکار نہیں کر سکتا تھا۔"

"آپ افسوس نہ کریں ممکن ہے اس کا موقع بھی بعد میں آئے۔"

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔ "تم خود کو کچھ سمجھتے ہو۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ انہیں کسی اور کا خون دے دوں گا۔ مگر ان کے پاس تمہارے خون کا نمونہ موجود ہے اس لیے وہ دھوکا نہیں کھائیں گے۔"

"آپ نے بہت دور تک کا سوچا ہوا تھا۔" میں نے طنز کیا۔ "دھوکا بھی آپ انہیں ہی دیتے ہیں جو خوشی خوشی دھوکا کھا لیں۔ جیسے اس بدنصیب ملک کی عوام جو آپ جیسے لیڈرز ہیں۔"

اس بار اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور اس نے اپنے آدمی کو طلب کر لیا۔ وہی دونوں اندر آئے ...... ممتاز نے ان سے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور پوری طرح چوکس رہنا۔" ان کو ہدایت دے کر اس نے میری طرف دیکھا۔ "شہباز تمہاری کسی غلط حرکت یا عدم تعاون کا خمیازہ بیتو بھگتے گی۔ میرا خیال ہے تم سمجھ گئے ہو؟"

وہ مجھے بیتو کی دھمکی دے رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کی اہمیت سمجھتا تھا۔ بیتو پر تشدد کیا جا سکتا تھا۔ اسے قتل کیا جا سکتا تھا یا اسے کنور خاندان کے حوالے کر دیا جاتا۔ وہ کنوروں کے دشمن قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے واپس اس کمرے میں پہنچ گیا جو میرا زندان تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مجھے راج کنور کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں وہ میرے لیے ماضی کا ایک حصہ بن چکا تھا لیکن اس نے اچانک سامنے آکر یاد دلا دیا کہ ماضی کبھی بھی وقت خود کو دہراتا ہے۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ کمرے میں آکر ...... دیکھا تو سات بجے تھے۔ ڈنر کے بجائے وہاں ناشتا میرا منتظر تھا۔ یہ قوت بخش قسم کا ناشتا تھا۔ اس میں ایک گلاس دودھ، ایک گلاس اورنج جوس، مکھن والے انڈے، شہد، پنیر اور براؤن بریڈ تھی۔

چائے یا کافی جیسی مضر صحت چیزوں کا دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے جب کنوروں کے محل میں مجھے خون دینا پڑ رہا تھا تب بھی مجھے چائے یا کافی نہیں دی جاتی تھی۔ ان سے مجھے مسئلہ ہوتا تھا۔ اب بھی میرے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ناشتا کروں لیکن اگر میں ناشتا نہ کرتا یا بھوک ہڑتال کر دیتا تب بھی یہ لوگ مجھے ضرور نچوڑتے۔ اس لیے اگر مجھے خود کو صحت مند اور جدوجہد کے قابل رکھنا تھا تو کھانا پینا لازمی تھا۔ میں نے پہلے تو خود کو معمول پر لانے کے لیے سانس کی چند مشقیں کیں۔ پھر کمرے میں ہی ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی۔ واش روم میں نہانے کی سہولت تھی لیکن فی الحال میں نے صرف منہ ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں لیٹ گیا۔

اب تک میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ میرے ساتھیوں پر میری اور بیتو کی گم شدگی کا کیا اثر ہوگا اور وہ مجھے تلاش کرنے کی کوشش کس طرح کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میرے ساتھی سب سے پہلے اس شاہد کو تلاش کریں گے۔ اگرچہ شاہد کو سفیر نے ہائر کیا تھا اور پھر ہم نے اسے کوٹھی نہیں بلایا تھا بلکہ خود فیض آباد کے ایک کیفے کے سامنے پہنچے تھے جہاں وہ ہمارا منتظر تھا۔ عبداللہ ہمیں چھوڑنے آیا تھا لیکن وہ بھی ہمیں دور اتار کر چلا گیا تھا۔ اس لیے اب شاہد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا سوائے سفیر کے، لیکن یہ کوئی مشکل کام نہیں' عبداللہ سفیر سے رابطہ کر کے شاہد کے بارے میں پوچھ سکتا تھا اور ایک بار اس کا نمبر مل جاتا تو اسے تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ شاہد نے بنٹی کو دیکھا تھا اور شاید میں نے اس کے سامنے بنٹی اور ...... ممتاز حسین کا نام بھی لیا تھا۔ کم سے کم بنٹی کا نام تو لیا تھا اور اگر شاہد کو یاد رہ گیا تھا تو اس سے میرے ساتھی سمجھ جاتے کہ میں کن کی تحویل میں ہوں۔

لیکن یہ ایک مفروضہ تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ مار کھا کر اور لہولہان ہونے کے بعد شاہد کو اس کا ہوش ہی نہ ہو کہ وہ بنٹی کا نام سنتا یا پھر اس کی پراڈو کا نمبر دیکھ لیتا۔ اس صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ بتا سکتا تھا کہ میں کسی جاننے والی حسین لڑکی کے ساتھ گیا تھا اور میں اسے دوست قرار دے رہا تھا۔ اس صورت میں مجھے اور بیتو کو تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ بہر حال امید پر دنیا قائم ہے۔ بہت سارے معاملات انسان قسمت پر چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تقدیر کے فیصلے کا انتظار کرتا ہے۔ سوچوں کا رخ بنٹی کی طرف مڑ گیا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اب اصل معاملے سے واقف ہو گئی تھی اور شاید اسی کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے ...... ممتاز مجھے راج کنور کے حوالے نہیں کر سکا۔ اپنی باتوں سے میں نے اسے جتنا مشتعل کیا تھا اس کے بعد وہ یقیناً ایسا کرنا چاہ رہا ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ میرے ساتھ جو ہونے والا تھا کیا اس میں بنٹی کی رضا شامل تھی؟

اگر بنجی کی رضا اس میں شامل تھی کہ مجھے قید میں رکھ کر میرا خون لیا جائے تو اس کی طرف سے کوئی امید بیکار تھی ویسے بھی وہ ایک حد سے زیادہ اپنے باپ کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی۔ میں اس کا محسن سہی لیکن وہ مجھے اپنے باپ اور اس کے مفادات پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔ بیتو کا ساتھ میرے لیے پھندا بن گیا اب میں کسی بھی کارروائی کے لیے آزاد نہیں تھا...... ممتاز نے چالاکی سے کام لیا اور اسے کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں میری کمزوری بن گیا تھا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور وہی دو گارڈز دکھائی دیے۔ لگتا تھا انہیں مستقل میرے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ان میں ایک گورا تھا اور ایک سانولا تھا۔ گورا باس لگتا تھا کیونکہ وہی مجھ سے بات کرتا تھا اور حکم دیتا تھا۔ سانولا چپ رہتا تھا اور حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ گورے نے مجھ سے کہا۔ "آپ کو بلایا گیا ہے جناب؟" اس کا لہجہ پھر بدل گیا تھا اور وہ اب عزت سے بات کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں جوتے پہن کر باہر آیا۔ البتہ راستے میں مجھے خیال آیا۔

"میرے ساتھی کے پاس ایک بیگ تھا اس میں میری چیزیں اور کپڑے تھے۔"

"آپ کی ہر چیز محفوظ ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے اپنے کپڑے چاہئیں۔"

"آپ کے کمرے میں پہنچا دیے جائیں گے۔"

میرا خیال تھا کہ مجھے عمارت میں ہی کہیں لے جایا جا رہا ہے لیکن وہ مجھے ایک عقبی دروازے سے باہر نکال لائے۔ اس طرف بھی دور تک پھیلا ہوا لان تھا۔ یہاں گھنے درخت بھی تھے اور پھولدار پودوں کے تختے بھی تھے۔ ہم پختہ روشوں سے گزرتے درختوں کے پیچھے پہنچے تو وہاں چار دیواری کے گوشے میں ایک سفید رنگ کی مختصر عمارت تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی دواؤں کی بو نے بتایا کہ یہ عمارت طبی مقاصد کے لیے مخصوص تھی۔ مجھے ایک کمرے میں لایا گیا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس پہلے سے موجود تھے۔ سانولا باہر رک گیا تھا لیکن گورا میرے ساتھ اندر تک آیا۔ گورے نے مجھ سے کہا۔ "آپ کے لیے بڑے صاحب کا حکم ہے کہ ڈاکٹر سے مکمل تعاون کریں۔"

میں نے دل ہی دل میں بڑے صاحب اور ان کے حکم کی ایسی کم تیسی کی اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا وہ سوکھے چہرے اور بڑی بڑی ابلی ہوئی سرخ آنکھوں والا کرپٹ نظر آنے والا شخص تھا۔ "تم ڈاکٹر ہو۔"

اس نے سر ہلایا اور اسٹریچر نما کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس پر آجائیں۔"

میں لیٹا تو اس نے پہلے معمول کا طبی معائنہ کیا۔ درجہ حرارت اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس کے بعد آنکھوں اور زبان کا معائنہ کیا۔ زبان دکھانے کے مطالبے پر میں نے چڑانے والے انداز میں زبان دکھائی جس پر نرس کی ہنسی نکل گئی اور جب ڈاکٹر نے اسے گھورا تو یہ ہنسی رک گئی تھی۔ وہ نو عمر اور گول مٹول سی لڑکی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور لائٹ براؤن بالوں کے ساتھ وہ دلکش لگ رہی تھی۔ جسامت بھاری تھی مگر یہ بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ چست یونیفارم میں اس کا جسم بھی چست لگ رہا تھا۔ وہ موٹی لڑکیوں کی طرح تھل تھل نہیں کر رہی تھی بلکہ ٹھوس جسامت کی مالک تھی۔ اپنا کام مکمل کر کے ڈاکٹر نے اسے حکم دیا۔ "بلڈ سیمپل لو۔"

"ایک منٹ۔" میں نے نرس کو سرنج گھونپنے کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "یہ سیمپل کس لیے لیا جا رہا ہے۔"

"بلڈ کا جنرل چیک اپ ہوگا کہ کوئی کمی تو نہیں ہے اور کسی بیماری کے جرثومے تو نہیں ہیں۔"

اس بار میں نے اعتراض نہیں کیا اور نرس نے ایک چھٹانک خون میری رگوں سے کشید کر لیا اور پھر سرنج بہت احتیاط سے کیپ لگا کر ایک پلاسٹک شاپر میں پیک کیا۔ ڈاکٹر نے مارکر سے اس پر کچھ لکھا اور ایک طرف موجود چھوٹے سے فریج میں رکھ دیا۔ اس کا کام ہو گیا تھا اس لیے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے واپس کمرے میں پہنچا دیا گیا اور میں وقت گزاری کے لیے ایکسرسائز کرنے لگا۔ وقفے وقفے سے کی جانے والی ورزش نے جب مجھے تھکا دیا اور کسی قدر پسینا بہہ نکلا تو میں نے واش روم کا رخ کیا، ور شاور لیا۔ میرے کپڑے آگئے تھے لیکن یہ صرف کپڑے تھے۔ ان کے بیگوں کا سارا سامان غائب تھا۔ بیتو کے کپڑے بھی نہیں تھے اور میرے بیگ کے ساتھ صرف میرے کپڑے تھے۔ اسلحے اور دوسری چیزوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال کپڑے مل گئے تھے یہی بڑی بات تھی۔ تب تک گارڈز کے علاوہ کسی کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد کھانے کے وقت بنجی کی خاص خادمہ بانو لے کر آئی تھی۔ گورا اس دوران میں اندر نہیں آیا یقیناً وہ مستعدی سے باہر موجود رہا تھا۔ بانو نے حسب معمول حیدرآبادی فراک اور چست پاجامہ پہن رکھا تھا جو اس کی متناسب جسامت پر سج رہا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "بے بی کہہ رہی ہیں آپ فکر نہ کریں آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا تھا کہ میرا خون ایک بے ایمان انسان کو صحت دینے میں کام آتا اور وہ صحت پا کر نہ جانے کتنے انسانوں کی بربادی کا باعث بن جاتا۔ یہاں بے بی میرا خون لیا جاتا۔ یہ بھی کم نقصان نہیں تھا۔ میں نے اس کی آہستہ سے کہا۔ "میں بنجی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں پیغام دے دوں گی۔" اس نے جواب دیا۔ "کھانا دینے میں ہی آؤں گی۔ آپ کو اور کوئی کام ہے تو مجھے بتا دیں۔"

مجھے چائے یا کافی کا خیال آیا مگر وہ ملتی نہیں۔ پھر مجھے کپڑوں کا خیال آیا۔ "کپڑے دھلوانے ہیں۔"

"دے دیں میں چند گھنٹوں میں دھو کر لا دیتی ہوں۔" وہ بولی۔ میں نے اسے اپنے اتارے کپڑے دے دیے۔ کھانے میں بھی سادہ اور قوت بخش غذائیں تھیں۔ جیسے بکرے کی یخنی، دلیے، مٹن اور مشروم سمیت بعض چیزوں کی مدد سے ایک ڈش تیار کی گئی تھی۔ یہ گاڑھے سوپ کی طرح تھی۔ پھر ایک کھیر نما میٹھی ڈش تھی جس میں کھجور کے ٹکڑے ڈالے گئے تھے۔ تمام چیزیں غیر روایتی لیکن مزے دار اور قوت بخش تو لازمی تھیں۔ انہیں دینے کا مقصد یہی تھا کہ میری صحت میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ بحال ہو جائے اور میرا جسم بہترین حالت میں آجائے۔ اس طرح ہر بار ہونے والی خون کی کمی کو آسانی سے پورا کیا جا سکے گا۔ خون دینے کا سلسلہ ایک حد سے اوپر جاتا تو لازمی مجھ پر اثر ہوتا۔ گوروں نے میرے ساتھ جو کیا تھا اس کے بعد میں مرتے مرتے بچا تھا۔ آخری بار جب قبائلیوں نے استعمال کیا تھا تو میرا دوگنا خون یعنی دو لیٹرز سے زیادہ نکال لیا گیا تھا۔ وہ تو قبائلیوں نے میری دیکھ بھال کی اور میں بھی سخت جان تھا اس لیے بچ گیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا ہر بار میری بچت ہو جاتی۔ میں نے دل میں دعا کی کہ میرے خون کی وہ تاثیر ختم ہو گئی ہو جس کی وجہ سے وہ ممتاز کے علاج کے لیے تریاق بن گیا تھا۔ وہ شخص بلکہ اس کا خاندان اس قابل تھا کہ گھل گھل کر مر جائے۔ مگر ابھی اللہ نے ان کی رسی دراز رکھی ہوئی تھی۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے تمام چیزوں سے پوری طرح انصاف کیا تھا۔ کھانے کے دوران مجھے بیتو کا خیال آیا۔ وہ بھی قید میں تھا اور اس کی سوائے اس کے کوئی اہمیت نہیں تھی کہ..... ممتاز نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے رکھنا اور اس کا خیال رکھنا ان لوگوں کے لیے ضروری نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے اسپتال لے جایا گیا یا کسی وجہ سے اس کمرے سے نکالنے کی بات کی تو میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک میری بیتو سے بات نہیں کرا دی جائے گی۔ کھانا بانو لے کر آئی تھی لیکن برتن ایک ملازم لڑکا لے گیا۔ وہ صاف ستھرا اور سجا سنورا ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں تمام ملازم شخصیت کے لحاظ سے اچھے اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے انداز میں رکھ رکھاؤ تھا۔ شاید ان کو باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی اور خاص ملازموں کی تعلیم کا بندوبست بھی کیا ہوگا۔ جیسے بانو اپنے انداز اور رکھ رکھاؤ سے کہیں سے خادمہ نہیں لگتی تھی۔ رات کے کھانے کے ساتھ بانو میرے دھلے ہوئے کپڑے اور ان کے ساتھ ایک بڑا شاپر لائی تھی۔ اس نے شاپر کرسی پر رکھا۔

"بے بی نے یہ آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

میں نے شاپر میں جھانکا۔ اس میں دو پینٹ اور شرٹ سوٹس تھے۔ ایک سلیپنگ سوٹ اور سوتی پاجامہ تھا یہ شاید ایکسرسائز کے لیے تھا۔ میں نے اپنے پیغام کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ "میں نے بے بی سے کہہ دیا تھا لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"ٹھیک ہے تم اس سے پھر کہنا اور میرے ساتھی بیتو کے بارے میں پتا ہے اگر نہیں تو مجھے اس کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ یا میری اس سے بات کراؤ۔"

بانو نے سر ہلایا اور کھانا لگا کر رخصت ہو گئی تھی۔

گورا مجھے اور بانو کو بات کرتے دیکھتا تھا لیکن اس نے اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی کوئی پابندی لگائی تھی۔ کھانے کے بعد میں کچھ دیر کمرے میں چہل قدمی کرتا رہا اور جب تھک گیا تو لیٹ کر سو گیا۔ اگلی صبح مجھے ناشتے سے پہلے بیدار کیا گیا۔ یہاں دروازے میں کنڈی تھی اور میں کنڈی لگا کر سویا تھا۔ کوئی دروازے پر مستقل دستک دے رہا تھا۔ میں نے کنڈی کھولی تو باہر گورا موجود تھا۔ "چلنا ہے۔" اس نے بلا تمہید کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "جب تک میرے ساتھی

بیتو سے میری بات نہیں کرائی جائے گی' میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

گورے نے چوکنا ہو کر شاٹ گن کا رخ میری طرف کر دیا اور غرایا۔ "تم انکار نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتا ہوں تم مجھے گولی مار سکتے ہو لیکن یہاں سے چلنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔" میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ غالباً وہ اس بارے میں ہدایت لے رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور گورے نے ایک موبائل میری طرف بڑھایا اور ساتھ ہی وارننگ دی۔

"اپنے ساتھی سے بات کر لو مگر کوئی غلط حرکت مت کرنا۔"

دوسری طرف بیتو موجود تھا اس نے میری آواز سنتے ہی بے تابی سے کہا۔ "شوبی یہ کیا ہے' یہ ہم کو آپ کے پاس کیوں نہیں لاتا۔"

"بس میری جان مجبوری ہے۔ تمہیں کنور یاد ہیں۔"

"ہم ان کو کیسے بھول سکتا ہے۔" اس نے نفرت سے کہا۔ "وہ ہمارا گھر اور لوگوں کا قاتل ہے۔"

"یہ منحوس یہاں بھی آ گیا۔" میں نے کہا اور بیتو کو کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ راج کنور کیوں آیا اور کیا چاہتا ہے۔ بیتو دم بخود رہ گیا تھا۔

"تو ہم کو اس لیے الگ کیا ہے۔"

"یہ تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کر رہے ہیں؟"

"نہیں شوبی سب ٹھیک ہے۔ اچھا کمرا ہے اور کھانا بھی ٹھیک ہے پر ہم کو آپ کا فکر ہے۔ یہ آپ کے ساتھ پھر وہی کر رہا ہے۔"

"اللہ مالک ہے یار، پہلے بھی ایسی صورت حال میں وہ مدد کرتا رہا ہے، آگے بھی وہی کرے گا۔ تم فکر مت کرو۔" میں نے تسلی دی اور موبائل گورے کو واپس کر دیا کیونکہ وہ اب کچھ بے چین ہو رہا تھا۔ بیتو کی خیریت معلوم کر کے مجھے تسلی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے اسی کلینک میں لے گئے جہاں ڈاکٹر اور گول مٹول سی نرس موجود تھی۔ اتنی صبح بلانے کا مقصد ناشتے سے پہلے کچھ سیمپل لینا تھا۔ یہ یورین، تھوک اور بلڈ سیمپل تھے۔ اس بار خون کم لیا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے مجھے ایک انجکشن لگانا چاہا تو میں نے پوچھا۔ "یہ کس لیے ہے؟"

"یہ ایک سی لیٹر ہے جسمانی پرفارمنس بہتر بناتا ہے۔"

"یعنی اسٹرائیڈز جیسی کوئی چیز ہے؟"

"نہیں۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔ "لیکن اسی جیسی [illegible] ہے۔"

میں اسٹرائیڈز کے نقصانات سے واقف ہوں [illegible] میرا تعلق کوہ پیماؤں سے بھی رہا ہے۔ وہ پہاڑوں میں [illegible] جسمانی کارکردگی بڑھانے کے لیے اپنے پاس [illegible] اور انجکشن رکھتے تھے جن میں اسٹرائیڈز ہوتے تھے۔ دوسرے کھیلوں میں ان کا استعمال عرصے سے جاری ہے اور اسپورٹس مین اور وومن کی ایک بڑی تعداد کارکردگی بڑھانے کے لیے ان کا بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ دہائیوں پہلے جب ان پر پابندی نہیں تھی تو کھلاڑی بے دریغ اور میڈل حاصل کرنے کے لیے انہیں استعمال کرتے تھے۔ اب ان پر پابندی لگ گئی ہے اس کے باوجود ہر سال بے شمار کھلاڑی انہیں استعمال کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں۔ انہیں جیت کا ایسا جنون ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

اسٹرائیڈز کی وضاحت کر دوں۔ یہ ایسی ادویات ہوتی ہیں جو انسانی جسم میں موجود توانائی کے چھپے ذخائر کام میں لے آتی ہیں۔ یہ ہماری ریزرو توانائی ہوتی ہے۔ جب ہم بیمار پڑتے ہیں، کسی حادثے کا شکار ہوتے ہیں، ہمارے اعصاب کو کوئی بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے تو یہ توانائی ہمیں اس حادثے یا صدمے یا بیماری سے لڑنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ توانائی طویل عرصے میں بنتی ہے اور اگر اسے خرچ کر دیا جائے تو انسان میں غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی معمولی بیماری کی وجہ سے دنیا سے گزر جاتا ہے۔ کئی شاندار صحت رکھنے والے کھلاڑی اسی وجہ سے اچانک نوجوانی میں دنیا سے رخصت ہوئے تو اسٹرائیڈز کے نقصانات سامنے آئے اور ان پر پابندی لگی۔

مگر اب بھی لوگ انہیں استعمال کرتے ہیں۔ [illegible] سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اب اسٹرائیڈز کا استعمال عام لوگوں نے بھی شروع کر دیا ہے اور وہ اسے بے خبری میں کر رہے ہیں۔ اس میں زیادہ ہاتھ ان نام نہاد ڈاکٹروں اور عطائیوں کا ہے جو معمولی بیماریوں میں بھی اسٹرائیڈز دے دیتے ہیں۔ فلو کا شکار کوئی شخص کسی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور وہ اسے اسٹرائیڈ کا انجکشن دے دیتا ہے۔ چند منٹ کے بعد آدمی کو لگتا ہے جیسے اسے کبھی فلو تھا ہی نہیں اور وہ خود کو کسی گھوڑے کی طرح فٹ اور طاقتور محسوس کرنے لگتا ہے۔ جنسی معاملات میں بھی ان کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے اور لوگوں کو پتا ہی نہیں چلتا کہ اس طرح وہ خود اپنی تباہی تیار کر رہے ہیں۔ ایک دن اچانک ہی بغیر کسی خاص وجہ کے وہ مر جاتے ہیں اور لوگ کہتے رہ جاتے ہیں کہ کیا دور آ گیا ہے اب انسان بیٹھے بٹھائے مر جاتا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ ایسا بے وجہ نہیں ہے۔ کوئی ان ڈاکٹروں کو نہیں پوچھتا ہے لیکن لوگوں کو تو اپنا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کسی ڈاکٹر سے جو دوا لے رہے ہیں وہ اصل میں ہے کیا؟ بدقسمتی سے اسٹرائیڈز بہت سستے مل جاتے ہیں۔ ان کی گولیاں اور انجکشن ہول سیل میں چند روپے میں دستیاب ہیں۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے انکار کیا۔

"یہ ضروری ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"ڈاکٹر مجھے بے وقوف مت بناؤ۔" میں نے اسے گھورا۔ "مجھے اچھی طرح معلوم ہے اس قسم کی دوائیں کیسے کام کرتی ہیں۔"

بادل ناخواستہ اس نے انجکشن واپس رکھ دیا اور بولا۔ "اس صورت میں تمہیں طاقتور غذائیں لینا پڑیں گی اور ان کے ساتھ باقاعدگی سے سپلی منٹس بھی لینا ہوں گے۔"

"ٹھیک ہیں۔"

اس نے مجھے گولیاں اور کیپسول دیے اور بتایا کہ کس طرح کھانے ہیں۔ ساتھ ہی مشورہ دیا۔ "پانی زیادہ سے زیادہ پیو۔ اس سے گردوں کا فنکشن بہتر ہوگا۔"

میں نے اس کی ہدایات ذہن نشین کر لیں۔ واپسی پر میں نے گورے سے کہا۔ "مجھے جم درکار ہے اگر یہاں جم نہیں ہے تو مجھے کھلی جگہ چاہیے جہاں میں ایکسرسائز کر سکوں۔"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" وہ بولا۔ "جم ہے مگر وہ صرف بڑے صاحب کی فیملی کے لیے ہے۔"

میں نے ایک بار پھر دل میں بڑے صاحب اور ان کی فیملی کی ایسی کم تیسی کی اور اس سے مطالبہ کیا۔ "میری بیتو سے بات کراؤ' دوسری صورت میں میں کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔"

[illegible] کا نام اس طرح لینے پر اس نے مجھے گھورا لیکن کچھ [illegible] دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ مگر میری وارننگ کا

خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ناشتے کے ساتھ بانو آگئی۔ اس نے ناشتا لگانے کے دوران حسبِ معمول دھیمی آواز میں کہا۔ "بے بی آپ سے نہیں مل سکتیں۔ بڑے صاحب کی طرف سے پابندی ہے۔"

"یہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری صورت میں، میں بھوک ہڑتال کردوں گا۔"

بانو نے اپنی فراک کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ بے بی نے آپ کے لیے بھیجا ہے اس سے آپ کسی وقت بھی ان سے رابطہ کرسکتے ہیں۔"

یہ دو طرفہ واکی ٹاکی سیٹ تھا جس کی فریکوئنسی طے شدہ ہوتی ہے اور اس سے کہیں اور رابطہ نہیں کیا جا سکتا۔ ... واکی ٹاکی ہلکا سا گرم ہو رہا تھا اور ہلکا سا نم بھی تھا۔ یہ گرمی اور نمی بانو کی مٹھی میں اسے لیتے ہوئے جھینپ گیا لیکن وہ بالکل نارمل رہی تھی۔ میں نے پہلے ناشتا کیا اور پھر واکی ٹاکی آن کرکے بنٹی کو پکارا۔ اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ شاید وہ کہیں مصروف تھی مگر میں مستقل مزاجی سے ہر دو تین منٹ بعد اسے پکارتا رہا تھا۔ بالآخر اس نے جواب دیا۔ "سوری میں باتھ لے رہی تھی۔"

"بنٹی تم جانتی ہو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں اور تم فکر مت کرو میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گی۔"

اگرچہ وہ بہت خلوص سے کہہ رہی تھی لیکن میں اس کی ضمانت پر بھروسا کرنے والا نہیں تھا لہٰذا تو میں ابھی مجبور تھا اس لیے میں نے اس کی بات تسلیم کرلی۔ "میں جانتا ہوں میرے لیے تم نے اپنے پاپا سے رعایت لی ہے اور مجھے راج کنور کے حوالے کیے جانے سے بچایا ہے۔"

"شکر ہے تم سمجھ گئے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "پاپا نے مجھے ضمانت دی ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

"تمہیں معلوم ہے یہ ہر ہفتے میرا خون چاہتے ہیں اور کوئی انسان ہر ہفتے خون نہیں دے سکتا... چاہے وہ جسمانی طور پر کتنا ہی فٹ کیوں نہ ہو۔"

"اسی لیے میں نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تمہاری ڈائٹ ترتیب دی ہے۔"

"اسے بھاڑ میں جھونکو۔ میں اپنا پروگرام خود بنا رہا ہوں اور مجھے میری مرضی کے مطابق کچھ سہولیات درکار ہوں گی؟"

"مثلاً؟"

"ایک تو مجھے جم چاہیے۔ دوسرے خوراک میری مرضی کے مطابق اور میرے بتائے وقت پر دی جائے۔ قصہ مختصر میں اپنا ٹائم ٹیبل خود بناؤں گا۔"

"جم یہاں موجود ہے۔ نیچے بیسمنٹ میں ہے تم جیسے کہو گے تمہیں ویسی سہولت مہیا کی جائے گی۔"

"یہ بات گارڈز کو بھی سمجھا دو۔"

"تمہاری خوراک کا معاملہ بانو کے ہاتھ میں ہے تم اس سے جو کہو گے وہ کرے گی۔"

"تم پر پابندی کیوں ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں، پاپا اس شرط پر میری بات مانے کہ میں تم سے نہیں ملوں گی۔"

"تم نے جو واکی ٹاکی بھیجا ہے اس کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے؟"

"خاصی دیر چلتی ہے جیسے ہی بیٹری کمزور ہوگی اس کے اوپر ایک سرخ لائٹ ہر پانچ سیکنڈ بعد جلے گی۔ بانو کو دینا وہ دوسری بیٹری لا دے گی۔"

"مجھے بیتو کی بھی خیریت معلوم ہونی چاہیے۔"

"روز تو نہیں لیکن میں حیات سے کہہ دوں گی وہ تمہاری اس سے بات کرا دیا کرے گا۔"

"حیات کون؟"

"جو گورا گارڈ ہے۔ وہ بہت ماہر آدمی ہے اور پاپا کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔"

"جبھی انہوں نے میرے سر پر مسلط کیا ہے۔" میں نے کہا اور واکی ٹاکی بند کردیا۔ دس منٹ بعد بانو اندر آئی، ایک نوٹ پیڈ لے کر آئی تھی۔ میں نے اسے لکھوایا کہ مجھے کس کس وقت کیا چاہیے ہوگا۔ لکھوا کر میں نے اس سے پوچھا۔ "اس میں آگے پیچھے بھی ہوسکتا ہے تو میں تمہیں بتاؤں گا۔"

"اب بے بی کا واکی ٹاکی میرے پاس ہوگا۔" اس نے کہا۔ "آپ اس پر مجھ سے کسی وقت بھی رابطہ کرسکتے ہیں۔"

میں نے اپنی ڈائٹ تین کے بجائے چار بار کردی تھی اور اس میں مختلف مائع جات کا اضافہ کرلیا تھا۔ صبح سات بجے سے رات دس بجے تک ہر پانچ گھنٹے کے بعد مجھے کھانا فراہم کیا جاتا۔ صبح میں کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کرتا، ناشتے کے دو گھنٹے بعد میں دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ اسی طرح شام سات بجے میں دوبارہ دو گھنٹے کے لیے جم جاتا۔ یہ پروگرام اسی دن سے شروع ہوگیا تھا اور نو بجے حیات نے دروازہ کھولا اور مجھ سے کہا۔ "آپ نے جم جانا ہے۔"

حیات اور اس کا ساتھی مجھے ممتاز ہاؤس کے تہ خانے میں واقع جم تک لائے۔ اس میں آنے جانے کے دو راستے تھے۔ مجھے ایک ایسے راستے سے لایا گیا تھا جو اصل میں سروس ڈور تھا اور جم کی صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص ملازمین یہیں سے آتے جاتے تھے۔ مالکان جس دروازے سے آتے جاتے تھے وہ اندر کے حصے میں واقع تھا۔ ظاہر ہے اسے بند کردیا گیا ہوگا۔ اس پر بھی حیات اور اس کا ساتھی احتیاطاً جم میں براجمان ہوگئے تھے۔ گویا وہ مجھے سوائے میرے کمرے کے کسی جگہ بھی اکیلے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ جب میں کلینک میں ہوتا تب بھی حیات خود میرے سر پر مسلط رہتا تھا۔ یہ چھوٹا سا جم تھا جہاں ایکسر سائز کی تمام سہولتیں مہیا تھیں حتیٰ کہ ایک طرف ایک چھوٹا سا سوئمنگ پول بھی بنا ہوا تھا۔ مجھے جو ایکسر سائز کرنا تھیں ان کا سامان یہاں موجود تھا۔ میں تمام باتیں ذہن سے جھٹک کر ایکسر سائز میں لگ گیا۔

شاید میرا رویہ عجیب لگے۔ میں ایک دوست نما دشمن کی قید میں تھا اور اس نے اس قید کو مضبوط کرنے کے لیے بیتو کو یرغمال بنالیا تھا کہ میں فرار کا سوچوں بھی نہیں۔ میرے ساتھیوں کو پتا نہیں تھا کہ میں کہاں تھا اور میری جان کے دشمن میرا خون نچوڑنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے میں بے فکری سے ڈائٹ پلان بنانا اور ایکسر سائز کرنا عجیب ہی لگے گا۔ مگر اس کی کچھ وجوہات تھیں۔ میں اس جدوجہد کے آغاز سے دیکھتا آیا کہ جب کوئی مشکل پیش آتی اور میں صبر و حوصلے کے ساتھ اس کا سامنا کرتا تو جلد یا بدیر مجھے موقع ملتا تھا اور میں آزاد ہو جاتا یا دشمن پر حاوی ہو جاتا۔ یہ چیز اب میری عادت بن چکی تھی کہ کسی بھی موقع پر پریشان نہیں ہوتا۔ دوسرے اگر میں یہ سب نہ بھی کرتا تب بھی یہ میرے جسم سے لازمی خون حاصل کرتے اور اس کا نقصان مجھے ہوتا۔ اس لیے مجھے اپنا خیال رکھنا تھا کہ ان ڈریکولاؤں سے مجھے کم سے کم نقصان ہو اور جب قدرت مجھے موقع دے تو میرا جسم اتنا توانا ضرور ہو کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود کو آزاد کرا سکوں۔ یہی سوچ کر میں یہ سب کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا ہمیشہ کی طرح مجھے موقع ضرور ملے گا اور نہ

بھی ملا تب بھی میں زندہ اور صحت مند تو رہوں گا۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے مجھے موقع مل رہا تھا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاتا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی ایکسر سائز کے بعد میں نے آدھے گھنٹے سوئمنگ کی اور جب میں کمرے میں واپس آیا تو مجھے خوفناک قسم کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے بانو کو کال کر کے کھانا لانے کو کہا اور خود نہانے چلا گیا۔ میرے پاس محدود کپڑے تھے اس لیے جب بانو آئی تو میں نے اس سے چند اسپورٹس شرٹس اور ایک گاؤن کا کہا۔ ”میں ابھی لاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ ”میرا خیال ہے آپ کو ایک الماری اور کپڑے ہینگ کرنے کی جگہ کی ضرورت ہے۔“

میں آرام کر رہا تھا تو بانو کچھ ملازمین کے ساتھ آگئی۔ انہوں نے ایک درمیانے سائز کی دو پٹ والی الماری اٹھا رکھی تھی۔ وہ انہوں نے کمرے میں ایک طرف رکھ دی۔ پھر انہوں نے واش روم میں کپڑے ٹانگنے والی ایک خوب صورت کھونٹی لگائی۔ جب ملازمین چلے گئے تو اس نے میرے کپڑے بیگ سے نکال کر سلیقے سے الماری میں لگائے۔ وہ مزید سوتی پاجامے، اسپورٹس شرٹس، بنیانیں، گاؤن اور چار عدد نئے تولیے لائی تھی۔ وہ میرا ہر ممکن خیال رکھ رہی تھی۔ صرف وہی نہیں کر رہی تھی جو میں اسے کہتا تھا۔ اپنے طور پر اسے جو بہتر لگتا وہ بھی کر رہی تھی۔ اپنا کام کر کے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ مطمئن ہیں ناسر، کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔“

”میں بور ہوتا ہوں...“ میں نے کہا۔

”میں ہوں ناسر۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ کہیں گے تو میں آپ کو کمپنی بھی دے سکتی ہوں۔“

اگرچہ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات نہیں تھی اس نے بہت سادہ اور عام سے انداز میں پیشکش کی تھی لیکن میں نے جلدی سے کہا۔ ”میری بوریت کسی پڑھنے والی چیز جیسے اخبار رسالے اور ٹی وی سے بھی دور ہو سکتی ہے۔“

”اس بارے میں مجھے بے بی سے پوچھنا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے معلوم کر لو۔“ میں نے دوبارہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے جو ڈائٹ پلان بنایا تھا اس میں صبح کا ناشتا بھاری اور بارہ بجے کسی قدر ہلکا کھانا ہوتا۔ شام پانچ بجے پھر بھاری کھانا اور رات سونے سے پہلے ہلکا کھانا تھا۔ دوپہر اور رات کے وقت میں آرام کرتا۔ صحت کے لیے جتنا ضروری کھانا پینا اور ورزش ہے اتنا ہی ضروری آرام اور نیند ہے۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی اس لیے آرام کر سکتا تھا۔ شام کے کھانے کے دو گھنٹے بعد میں نے حیات اینڈ کمپنی کے ساتھ دوبارہ جم کا رخ کیا۔ میں ورزش کر رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر وہاں... ممتاز آ گیا۔ اس کے آدمی الرٹ ہو گئے تھے لیکن میں توجہ دیے بغیر مشین پر رننگ کرتا رہا۔ اس نے دلچسپی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”لگتا ہے تم نے خود کو پوری طرح تیار کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نہیں بھی کروں گا تب بھی میرے جسم سے خون نکال جائے گا۔“

”اس سے تمہاری ری کوری تیز ہو جائے گی....“ ممتاز نے سر ہلایا۔ ”کیا مرشد سے تمہاری کوئی سیٹل منٹ ہو رہی ہے؟“

اس کا سوال غیر متوقع تھا لیکن میں گڑبڑایا۔ ”کیسی سیٹل منٹ؟“

”یہی کہ وہ تمہارے خلاف موجود مقدمات جو اصل میں اسی کے اشارے پر شروع ہوئے تھے۔ اب ختم کرا رہا ہے؟“

”اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو اس کا علم میرے وکیل کو ہو گا۔ میں نے قانونی معاملات اسی پر چھوڑ رکھے ہیں۔“

ممتاز کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ ”تم بتانا نہیں چاہتے ہو تو تمہاری مرضی لیکن اگر تم واقعی ایسا کچھ کر رہے ہو تو میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا بلکہ تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“

میں رننگ مشین سے اتر آیا اور ایک تولیے سے پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”بڑے صاحب آپ میری جتنی مدد کر رہے ہیں میرے لیے وہی کافی ہے۔“

وہ ایک لمحے کو کھسیایا پھر بولا۔ ”مرضی تمہاری۔“ واپس جانے کے لیے مڑا پھر رکا اور بولا۔ ”پرسوں خون لیا جائے گا۔“

ممتاز کہہ کر چلا گیا اور اس کے جانے کے بعد حیات نے غرا کر کہا۔ ”بڑے صاحب کے سامنے بھی زبان قابو میں رکھا کرو۔“

میں نے تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”بڑے صاحب کو میری زبان اور لہجے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو کیا اعتراض ہے؟“

”وہ مالک ہیں۔“

”تمہارے ہوں گے میرے نہیں ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے سوئمنگ پول کا رخ کیا۔ حیات کا چہرہ بگڑ گیا تھا لیکن مجھے ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہوتی جو ایک انسان کی غلامی میں حد سے آگے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس کمرے میں آیا تو غیر متوقع طور پر وہاں دیوار پر ایک خاصا بڑا سا ایل سی ڈی لگا ہوا تھا۔ اس میں ڈی، وی ڈی پلیئر بلٹ ان تھا اور ڈی وی ڈی بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ دراز پر آج کے اخبارات اور کچھ رسائل رکھے تھے۔ گویا میرے مطالبے کو مان لیا گیا تھا۔ بانو بھی وہاں تھی اس نے مجھے بتایا کہ ٹی وی ایک ہزار چینل والے سیٹلائیٹ سسٹم سے منسلک تھا۔ اس کی مدد سے میں دنیا کا کوئی بھی چینل دیکھ سکتا تھا۔ وہ ڈی وی ڈیز کا ایک بنڈل بھی لائی تھی۔ یہ سب موویز تھیں۔

”یہ آج کے اخبارات ہیں دو انگریزی کے ہیں اور تین اردو کے اور یہ کچھ رسائل ہیں۔“

رسائل میں اکثر فیشن میگ تھے ظاہر ہے یہاں اگر سنجیدہ نوعیت کے رسائل آتے تھے تو بنتی کے پاس نہیں تھے اس کے پاس یہی ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ کافی ہیں لیکن رسائل میرے کام کے نہیں ہیں انہیں لے جاؤ۔“

رات کا کھانا کھا کر میں نے کچھ دیر ٹی وی دیکھا اور اخبارات پر سرسری نظر ڈالی۔ اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں ہم حالات حاضرہ سے اتنے بے خبر ہو گئے تھے کہ ہمیں پتا نہیں چلا کہ کب الیکشن بھی ہو گئے۔ ہم خود سے غافل ہو گئے تھے۔ زندگی میں روٹین نام کی کوئی چیز نہیں تھی جب موقع ملا کھا لیا جب موقع ملا سو لیے۔ ورزش بھول چکے تھے۔ اس کا نتیجہ دو بار کی ایکسر سائز سے ہوا جب معمولی ورزشوں سے میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ میرا اسٹیمنا بہت کم ہو گیا تھا۔ رننگ مشین پر دس منٹ بعد میرا سانس پھولنے لگتا تھا۔ اس قید کو میں اسے قدرت کی طرف موقع سمجھا تھا اور اپنے آنے والے حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ رات میں دس بجے سے صبح چھ بجے تک سات گھنٹے کی نیند میرے لیے کافی تھی۔ سونے سے پہلے میں نے حیات سے کہا کہ وہ مجھے صبح چھ بجے اٹھا دے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں بانو سے کوئی الارم کلاک منگوا لوں۔ میں نے اسے کال کی تو وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے اس سے الارم کلاک کا کہا تو اس نے کہا۔ ”میں ابھی لاتی ہوں سر۔“

”نہیں اتنی جلدی کی ضرورت بھی نہیں ہے ابھی میں نے حیات سے کہہ دیا ہے وہ مجھے صبح اٹھا دے گا۔ تم کل لا دینا، ابھی آرام کرو۔“

”میں یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں ہوں، اپنی ذمے داریاں نبھانے کے لیے ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں کلاک لا رہی ہوں۔“

چند منٹ بعد وہ اندر آئی۔ اس نے ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل کلاک اٹھا رکھا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے دوسرے لباس میں دیکھا۔ اس نے سادہ سا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ شرٹ سلیولیس تھی اور کسی قدر کشادہ گلے سے اس کی سنہری جلد جھلک رہی تھی۔ شاید یہ اس کے آرام کا لباس تھا۔ اس نے مجھے کلاک کا استعمال سمجھایا۔ اس دوران میں وہ اتنی قریب آگئی کہ اس کے وجود سے اٹھتی بھینی سی مہک مجھے پریشان کرنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں سمجھ لوں گا۔ اب تم جا سکتی ہو۔“

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شاید یہاں کوئی ایسا نہیں ملتا ہو گا جو اس کے قریب آنے سے یوں گھبرائے۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں سوائے گڈ نائٹ کے اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے الارم سیٹ کیا اور سو گیا۔

آنے والے دو دن تک یہ معمول برقرار رہا تھا۔ ممتاز حسین نے بتایا کہ دو دن بعد خون لیا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اس کے بجائے اگلے دن صبح سویرے میرا خون لیا گیا۔ خون نکالنے کا سارا پروسیس ڈاکٹر نے خود کیا تھا۔ صرف کینولا کول مٹول نرس نے لگایا تھا۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط سے نصف لیٹر کی تھیلی بھری اور اس نے مجھے واضح دکھایا کہ تھیلی میں نصف لیٹر خون ہی گیا ہے۔ اس نے اپنا کام کرنے کے بعد مجھے طاقت کا ایک انجکشن دیا اور فوری طور پر جوس اور اس کے ساتھ منرل سالٹ دیا۔ ”ہمارے پاس پلازمہ ہے لیکن ابھی آپ کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اس کی ضرورت کب پڑے گی؟“

”شاید چوتھی بار خون لینے کے بعد۔“

”ڈاکٹر ایک شخص کتنا خون اور کتنے عرصے بعد دے کر صحت مند رہ سکتا ہے؟“

”ایک لیٹر خون دو مہینے بعد۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور میرے جسم سے مہینے میں دو لیٹرز سے زیادہ خون نکالا جائے گا۔“ میں نے فکرمندی سے کہا۔ ”کیا یہ

خطرناک نہیں ہے؟"

"آپ کی جان کو خطرہ نہیں ہے لیکن آپ کمزور ہو جائیں گے۔ البتہ ہم دواؤں اور خوراک سے اس کمزوری کو کم سے کم رکھنے کی کوشش کریں گے۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خطرے کو کم سے کم کر کے دکھا رہا ہو۔

اس پہلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے محسوس نہیں ہوا تھا اگر کمزوری ہوئی بھی تھی تو وہ طاقت کے انجکشن اور جوس سے پوری ہو گئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر نے احتیاطاً مجھے صبح کے سیشن میں ایکسر سائز سے منع کر دیا تھا۔ اس سے توانائی استعمال ہوتی جب کہ مجھے آنے والے چوبیس گھنٹے میں توانائی کی ضرورت تھی۔ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ اگلی بار خون نکالے جانے کے بعد مجھے آرام کی زیادہ ضرورت ہو گی۔ میں نے شام کو دو گھنٹے تک ایکسر سائز کی اور مجھے اپنی طاقت میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد ایک معمول بن گیا۔ چوبیس گھنٹے میں میرا ہر لمحہ کسی نہ کسی مصروفیت میں گزرتا تھا مجھے ٹی وی یا اخبارات دیکھنے کا موقع بھی کم ملتا تھا۔ رات کو بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جاتی اور پھر صبح الارم سے آنکھ کھلتی تھی۔ دو دن بعد بنٹی سے میری بات ہوتی تھی۔ وہ بدستور آرام سے تھا اور اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ بانو ہمہ وقت میرے لیے مخصوص تھی اور میں کسی بھی وقت اس سے کوئی کام کہہ سکتا تھا یا اسے طلب کر سکتا تھا۔ گویا بنٹی نے اپنی خادمہ مجھے ادھار دے دی تھی مگر خود وہ مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے باپ کی طرف سے پابندی تھی۔

خون دینے کے بعد چوتھے دن میں جم میں تھا۔ حسب معمول حیات میری نگرانی پر تھا اور اس کا ساتھی اوپر جم کے دروازے پر موجود تھا۔ اچانک ہی بانو وہاں آ گئی اور اس نے حیات سے کہا۔ "تم کچھ دیر کے لیے باہر جاؤ۔"

"مجھے یہاں سے جانے کا حکم نہیں ہے۔" حیات نے انکار کیا۔

"مجھے یہاں کچھ کام ہے۔" بانو نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "یہ بے بی کا حکم ہے۔"

حیات سوچ میں پڑ گیا۔ اگر چہ اسے ممتاز نے میری نگرانی کا حکم دیا ہوا تھا لیکن بنٹی بھی اس کی مالکن تھی اور وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "کیا بی بی سے میری بات ہو سکتی ہے؟"

بانو نے اپنے واکی ٹاکی سے بنٹی سے رابطہ کیا۔ "بے بی، حیات آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔"

بانو نے واکی ٹاکی حیات کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لے کر بات سنی اور پھر واکی ٹاکی واپس کر کے اپنی شرٹ کی سلوٹ ٹھیک کرتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ بانو اس کے ساتھ گئی اور وہ دروازہ اندر سے بند کر کے آ گئی۔ میں ویٹ مشین پر پیروں سے وزن اٹھانے والی ورزش کر رہا تھا۔ اب تک میں نے بانو سے پوچھا نہیں تھا کہ اسے کیا کام تھا جس کے لیے اس نے حیات کو باہر بھیج کر اندر سے دروازہ بھی بند کر لیا تھا مگر وہ میری طرف نہیں آئی اور جم میں آنے والے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئی جہاں سے مالکان آتے جاتے تھے۔ اس نے اندر سے دروازہ کھولا اور خود باہر چلی گئی اس کی جگہ بنٹی اندر آ گئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی تو یہ سارا چکر بنٹی مجھ سے ملاقات کے لیے چلا رہی تھی۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے بھی ورزش کا لباس پہن رکھا تھا اور یہ خالص ویسٹرن اسٹائل کا تھا۔ یعنی چست نیکر اور مختصری بنیان، بہ ظاہر وہ ایکسر سائز کرنے یہاں آئی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"اگر تمہارے پاپا کو پتا چل گیا کہ تم ان کے حکم کی خلاف ورزی کر رہی ہو اور وہ بھی کس حلیے میں تو ان کا کیا ردعمل ہوگا۔"

"کچھ نہیں۔" وہ ایکسر سائز سائیکل پر آتے ہوئے بولی۔ "ویسے وہ باہر ہیں ان کو پتا نہیں چلے گا۔"

"تقریباً تمام اولادوں کو یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ ان کی حرکتوں کا ان کے والدین کو پتا نہیں چلے گا۔"

"وہ دوسری اولادیں ہوتی ہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ویسے تم اس کے لیے فکر مت کرو اگر انہیں پتا بھی چل گیا تو میں سنبھال لوں گی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میں نے دیکھا ہے تم بڑے صاحب سے اپنی بات منوا لیتی ہو کیا ممّا میں بھی یہ کوالٹی ہے؟"

"نہیں اسے ان معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے ویسے بھی پاپا نے اسے اسنڈی کے لیے انگلینڈ بھیج دیا ہے۔"

"اسٹڈی کے لیے یا اسے کرمن جیسے لفنگوں سے دور کرنے کے لیے۔ ظاہر ہے اس کے اور بھی ایسے دوست ہوں گے۔"

"شاید۔" اس نے تسلیم کیا۔ "تمہیں جم کیسا لگا؟"

"بہترین، یہاں ہر سہولت موجود ہے۔"

"میں نے خاص طور سے ڈیزائن کرایا ہے۔" وہ فخر سے بولی۔ "جب میں تم سے ملی تو مجھے اس کے بعد سے ایکسر سائز کا شوق ہوا۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "مجھ سے ملنے کے بعد کیوں؟"

"میں نے سوچا کہ انسان کی زندگی میں کسی وقت بھی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اسے جسمانی طور پر فٹ ہونا چاہیے۔ جیسے کہ تم ہو۔ اسی لیے میں نے جم بنوایا اور میں نے سیلف ڈیفنس کی تربیت بھی حاصل کی ہے۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اچھا، لگ نہیں رہا تم تو پہلے سے زیادہ نازک اندام ہو گئی ہو۔"

"میرا استاد جاپانی ہے۔" وہ بولی۔ "اس نے مجھے اس طرح سے سیلف ڈیفنس کی تربیت دی ہے کہ میرے جسم پر اثر نہیں پڑا ہے۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو ایک دوستانہ مقابلہ کر کے دیکھ لو۔" وہ سائیکل سے اتر آئی ذرا سی دیر میں اس کے چہرے پر پسینا موتیوں کی طرح نمودار ہو گیا تھا۔ میں ویٹ مشین سے اٹھ گیا اور تولیا سے جسم صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے یقین ہے تم نے اچھی تربیت حاصل کی ہے۔"

"پلیز میں اسے آزمانا چاہ رہی ہوں۔"

مجھے بھی ہاتھ پاؤں کھولے خاصے دن ہو گئے تھے۔ میں نے سوچا اور تولیا اچھال کر اس کی طرف بڑھا۔ "کیا خیال ہے مقابلے کے ساتھ ساتھ کچھ گفتگو بھی کر لی جائے۔"

"کیسی گفتگو؟" اس نے میرے پاس آتے ہی ... جایا اور ایک پیر اور ایک ہاتھ آگے نکال کر مخصوص ... انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"یہی کہ نور فیملی تمہارے پاپا پر اس قدر حاوی کیسے ہے۔"

"ان سے پاپا کے پرانے تعلقات ہیں۔"

"میں ان تعلقات کی نوعیت سمجھنے سے قاصر ہوں ... کنور خاندان اعلیٰ ذات کا ہندو ہے اور وہ چھوت چھات کے قائل ہیں۔ راج کنور اتنا بڑا خطرہ مول لے کر ... اور اس نے یہاں سے ایک گلاس پانی پینا بھی گوارا نہیں کیا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا۔ کنور خاندان مسلمانوں سے شدید نفرت کرتا ہے اور یہ بات میں نے ان کی قید میں رہ کر بہت واضح محسوس کی۔ پھر وہ تمہارے پاپا کے دوست کیسے ہو گئے؟"

وہ میری بات میں الجھ کر اپنا اسٹانس بھول گئی اور میں نے اچانک زمین پر بیٹھتے ہوئے سوئپ کک لگائی۔ اس میں زور نہیں تھا ورنہ اسے بہت زیادہ چوٹ لگتی۔ پھر بھی وہ چیخ مار کر گری تھی۔ یہاں فرش پر موٹا ربر میٹرس تھا اس لیے اسے چوٹ نہیں لگی۔ میں نے کہا۔ "جب کسی سے مقابلے کے تیار ہو تو اس کی باتوں سے زیادہ اس مقابلے پر دھیان دیا کرو۔"

وہ اٹھتے ہوئے خفت سے مسکرائی۔ "تم نے سوال ہی ایسا کیا، میں الجھ کر رہ گئی۔ خیر اب نہیں الجھوں گی۔" اس نے دوبارہ اسٹانس بنایا اور بولی۔ "میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتی، لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ کوئی مالی مفاد کا معاملہ ہے۔ پاپا اور ان کے درمیان کوئی ڈیل ہے۔" اس نے کہتے ہوئے بجلی کی طرح لپک کر میرا اور مجھ پر گرنے کی کوشش کی یعنی سوئپ کک ماری مگر میں اچھل کر بچا گیا۔ وہ گھومی اور اپنے بدن کی قدرتی لچک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کک کو ریوائز کیا۔ مگر زمین پر قدم پڑتے ہی میں دوبارہ اچھلا تھا اور اس کا یہ وار بھی ناکام گیا۔ وہ پنجوں کے بل اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "تم بہت پھرتیلے ہو۔"

میں نے اس سے کہا نہیں کہ وہ سست تھی۔ شاید اس نے کچھ معمولی سا سیکھا تھا اور اسے کسی عام آدمی کے مقابلے میں اپنا دفاع کرنا آ گیا تھا۔ مگر وہ میرا یا کسی ماہر فن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس نے مجھ پر کئی حملے کیے مگر میں نے بہ آسانی انہیں ناکام بنا دیا۔ ساتھ ساتھ اس سے بات بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے باتوں سے زیادہ کچھ دوسری چیزوں میں الجھانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ آخر میں اس نے ہاتھ اٹھا دیے۔ "میں ہار گئی، تم سے نہیں جیت سکتی۔"

"چند مہینے میں تم نے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن ابھی تمہیں اس سے کہیں زیادہ سیکھنا ہوگا۔"

اس کا اسٹیمنا بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا اور میری نسبت کہیں زیادہ پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ جب کہ میرا سانس ابھی معمول پر تھا۔ ان چند دن کی ورزش نے میرا اسٹیمنا اور قوت کار کو خاصا بہتر بنایا تھا۔ اس نے رشک سے مجھے دیکھا۔ "تمہارا سانس ذرا نہیں پھولا۔"

"ہاں میرا اسٹیمنا بہتر ہوا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "ابھی ایک بار میرا خون لیا گیا ہے۔ جب مزید خون لیا

جائے گا تب میں اتنا بہتر نہیں رہوں گا۔"

"لیکن پاپا نے تو کہا تھا کہ تمہاری صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ بے چین ہوگئی۔

"شاید انہوں نے درست نہیں کہا ہے میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ کسی صحت مند آدمی کے لیے دو مہینے میں ایک بار ہی ایک لیٹر خون دینا مناسب ہے اس سے زیادہ خون دینا اس کی صحت پر اثر ڈالتا ہے جب کہ میرا ہر ہفتے نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ اگر اس سے میری جان کو خطرہ نہ بھی ہوا تب بھی میں کمزور پڑ جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے میں بیمار پڑ جاؤں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی تشویش بڑھ رہی ہے۔ یہ اچھی بات تھی وہ جتنا تشویش زدہ ہوتی میرے لیے اتنی ہی کوشش کرتی۔ "ایسا نہیں ہوگا اگر تم کمزور ہوئے تو خون لینے کا سلسلہ روک دیا جائے گا۔"

"کیا یہ تمہاری اپنے پاپا سے ڈیل ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں تم سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن موقع نہیں ملا، اس لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑا میں نے سوچا اس بہانے ایکسر سائز بھی کرلوں گی۔"

اگرچہ بنٹی کا رویہ کوئی بہت زیادہ متوجہ ہونے والا نہیں تھا پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ وہ میری توجہ چاہتی تھی۔ مختلف بہانوں سے قریب آنا اور خود کو نمایاں کرنا شاید اسی سلسلے کی کڑی تھی لیکن وہ میری فطرت اچھی طرح جان گئی تھی اس لیے کسی براہِ راست کارروائی سے گریز کر رہی تھی۔ میرے ساتھ ہمدردی کی آڑ میں یقیناً اس کی ذاتی دلچسپی تھی۔ ورنہ شاید اسے مجھ سے کوئی غرض بھی نہ ہوتی۔ کوٹھی میں جب میں نے اسے اور نینا کو کرم دین اور کرمین کی سازش سے بچایا تھا تبھی اس کا رویہ بہت لگاؤ والا ہو گیا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ میرے نزدیک نہ آنے پائے اور اسے اپنی توہین کا احساس بھی نہ ہو ورنہ وہ اپنے پاپا کی صف میں جا کھڑی ہوتی اور میرے لیے مشکل ہو جاتی۔ ایک گھنٹے کے دوران اس نے ایکسر سائز تو اتنی نہیں کی لیکن باتیں زیادہ کیں۔ جب میں اسے کنور خاندان اور اس کے پاپا کے موضوع کی طرف لانے کی کوشش کرتا وہ صفائی سے کنی کترا جاتی۔

جب میں نے سوئمنگ پول کا رخ کیا تو وہ واپس چلی گئی اور اس کی جگہ بانو اندر آئی۔ وہ حسبِ معمول حیدر آبادی فراک اور پاجامے میں تھی۔ ڈیوٹی کے وقت ایک طرح سے یہ اس کا یونیفارم تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر حیات کو اندر بلایا اور خود اسی دروازے سے باہر چلی گئی۔ اندر آکر حیات نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں کچھ عناد بھی تھا جیسے اسے بانو کا میرے ساتھ یہاں اکیلے رہنا پسند نہیں آیا تھا مگر میں نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ورزش کے بعد تیراکی سے جسم ایک تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے دوسرے اس سے جسم کے پھیل جانے والے مسلز تیزی سے اپنی پوزیشن میں آجاتے ہیں اور ان میں سختی پیدا نہیں ہوتی ہے جیسا کہ باڈی بلڈرز کے مسلز میں آجاتی ہے اور وہ پھرتی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر ایسی ورزشیں کر رہا تھا جو جسم کو بنانے کے بجائے اسٹیمنا اور قوت میں اضافہ کرتی ہیں ساتھ ہی جسمانی لچک اور ردِعمل کو بھی بڑھاتی ہیں۔

دو دن بعد بنٹی پھر اسی طرح آئی اور اس دن وہ ذرا معقول حلیے میں تھی یعنی اس نے ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔۔۔۔ ممتاز کے بارے میں اس نے انکشاف کیا کہ وہ لاہور میں مقیم تھا اور اس کی جلد ممتاز ہاؤس واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا اسی لیے بنٹی پھر جم چلی آئی تھی۔ اس دن بنٹی نے بھی سنجیدگی سے ورزش کی۔ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا مگر یہ گفتگو زیادہ تر حالاتِ حاضرہ اور دلچسپی کے دوسرے موضوعات پر تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے باپ اور کنور خاندان کے تعلقات کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتی ہے اس لیے میں نے دوبارہ یہ ذکر نہیں چھیڑا۔ البتہ اس نے بانو کا ذکر چھیڑ دیا۔ "کیا بات ہے تم اس سے اتنا گریز کیوں کرتے ہو؟"

"میں گریز کرتا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ بے چاری تو سارا دن میری خدمت میں لگی رہتی ہے۔ ہر تھوڑی دیر بعد میں اسے کسی نہ کسی کام کے لیے کہتا ہوں۔"

"میں وہ بات نہیں کر رہی ہوں۔" بنٹی نے منہ بنایا۔ "وہ خوب صورت لڑکی ہے۔"

"اگر تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کی خوب صورتی کی طرف توجہ نہیں دیتا ہوں تو تم جانتی ہو میں عورت کو صرف عورت سمجھنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔۔" بنٹی نے معنی خیز انداز اختیار کیا۔ کیونکہ میرا لہجہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "تم اکیلے ہو، ... تفریح نہیں ہے۔ ایک طرح سے قید میں ہو۔ میں تمہارے ... نہیں آسکتی ہوں اس لیے میں چاہتی ہوں بانو تم کو کمپنی دے، وہ پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ہے۔ تم اس سے بات کر سکتے ہو۔"

"تم سے بات ہو تو جاتی ہے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"ہاں لیکن اس طرح کئی دن بعد۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم نہیں جانتے اس ایک ملاقات کے لیے مجھے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔"

"میری ساکھ پر کیا گزرتی ہے اس بارے میں تم سوچتی بھی نہیں ہوگی۔"

وہ چونکی۔ "تمہاری ساکھ، کیا ہوا اسے؟"

"تم خود سوچو کہ بانو حیات کو یہاں سے رخصت کر کے اندر سے دروازہ بند کرلی ہے اور حیات کے خیال میں ایک ڈیڑھ گھنٹا میرے ساتھ رہتی ہے تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔"

"وہ حکم کا غلام ہے، اس کی جرأت کہ کچھ سوچ سکے۔" بنٹی کو غصہ آ گیا۔ "کیا اس نے تم سے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں۔۔۔۔"

"تب تمہیں اپنی ساکھ کی فکر کیوں لگ گئی ہے؟"

"کیونکہ میں سیلف ریسپکٹ کا قائل ہوں۔" میں نے بنا کر کہا۔ "میری عزت سب سے پہلے میری اپنی نظر میں ہے۔"

"ٹھیک ہے جب تم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہو تو یہ عزت تمہاری اپنی نظر میں بحال رہنی چاہیے۔" اس نے مجھے لاجواب کرنے کے انداز میں کہا۔ "حیات ایک معمولی سا ملازم ہے۔"

"کچھ دن پہلے تو تم اسے بڑے صاحب کا اہم ترین آدمی قرار دے رہی تھیں۔"

"ملازم کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو ملازم ہی ہوتا ہے۔" اس نے ایک آفاقی حقیقت بیان کی۔

اس دن جب میں حیات کے ساتھ واپس کمرے کی طرف جا رہا تھا تو اس کا موڈ پہلے سے زیادہ خراب تھا، اس نے بیتو سے میری بات بھی نہیں کرائی تھی جب میں نے توجہ دلائی تو وہ رکھائی سے بولا۔ "بیٹری چارج کر رہا ہے، ابھی نہیں کرا سکتا۔"

"تب ایک گھنٹے بعد کرا دو اور میں نے کون سا روز بات کرنی ہوتی ہے مجھے اپنے ساتھی کی خیریت معلوم کرنی ہوتی ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ جب اس نے ایک گھنٹے بعد بھی بیتو سے میری بات نہیں کرائی تو میں نے بانو کو کال کی، وہ میرے لیے کھانا لا رہی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ حیات کے دماغ میں کوئی کیڑا کلبلا رہا ہے اور وہ بیتو سے میری بات کرانے سے گریز کر رہا ہے تو اس نے کہا۔ "میں آرہی ہوں، ابھی حیات سے بات کرتی ہوں۔"

شاید بیتو بھی حیات کی تحویل میں تھا اور اس سے بات کرانے کی ذمے داری اس کی تھی۔ یعنی وہ نمبر کسی اور کے پاس نہیں تھا جس سے بیتو سے بات کی جاسکتی تھی اس لیے حیات کو بائی پاس کر کے اس سے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ دروازے کے باہر کوئی بول رہا ہے۔ میں نے دروازے سے کان لگائے تو دوسری طرف سے بانو کی آواز آئی۔ "تم نے شہباز صاحب کی ان کے ساتھی سے بات کیوں نہیں کرائی؟"

"یہ میرا کام ہے تمہیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔" حیات نے اکھڑ انداز میں کہا۔

"میرا بھی اس سے تعلق ہے۔ بے بی نے ان کی ذمے داری مجھے سونپی ہے۔ اگر ان کو کوئی مشکل ہوگی تو۔۔۔"

"بہت خیال ہے تمہیں اس کی مشکلوں کا۔" حیات کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔ "جم میں دروازہ اندر سے بند کر کے تم اس کی کون سی مشکل آسان کرتی ہو؟"

"ذلیل شخص۔" بانو نے کہا اور ایسی آواز آئی جیسے اس نے حیات کو تھپڑ مارا ہو۔ ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ پھر حیات کی سرد آواز آئی۔

"بانو میں یہ تھپڑ ہمیشہ یاد رکھوں گا اور ایک وقت آئے گا جب تمہیں اس کا حساب دینا ہوگا۔"

"اس سے پہلے میں تمہیں دوسرا تھپڑ لگاؤں میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" بانو برہمی سے بولی۔ "تم اس قابل بھی نہیں ہو کہ میں تم سے بات کروں۔ میں نے بے بی سے شکایت کردی تو تم ایک منٹ میں فارغ کردیے جاؤ گے۔"

"وہ تو بہت قابل آدمی ہے نا۔" حیات پھر زہریلے انداز میں بولا۔ اس پر بنٹی سے شکایت کرنے کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بانو اس کی بکواس پر توجہ دیے بغیر دروازے تک آئی تھی اس سے پہلے وہ دروازہ کھول کر اندر آتی میں واپس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اندر آئی تو اس کا گلابی چہرہ غصے

سے سرخ ہو رہا تھا اور وہ اپنا نچلا گداز لب دانتوں میں دبا رہی تھی۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔
”خیریت... یہ لال نیلی کیوں ہو رہی ہو۔“
اس نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ عام طور سے وہ اندر آنے کے بعد دروازہ بند نہیں کرتی تھی لیکن اس وقت اس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور چپ چاپ میز پر کھانا لگانے لگی۔ جب میں ہاتھ دھو کر آیا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کچھ نہیں، آدمی ملازمت میں مجبور ہو جاتا ہے لیکن میری مجبوری ان سے کہیں زیادہ ہے۔ کچھ لوگ ملازمت چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے۔“
”ایسی کیا بات ہو گئی؟“ میں نے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے تم بنٹی کے پاس ملازم ہو۔“
”نہیں .... میں بڑے صاحب کی پروردہ ہوں۔ بچپن سے اسی جگہ رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا اور پھر مجھے بے بی کو دے دیا۔ یہ ملازمت نہیں ہے۔“
وہ جذباتی طور پر منتشر تھی اس لیے یہ بات کہہ گئی پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے جلدی سے معذرت کی۔ ”سوری سر یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں نے بلاوجہ آپ کو بتا دیا۔“
”کوئی بات نہیں۔“ میں نے نرمی سے جواب دیا۔ ”اول تو میں نے خود پوچھا تھا اور دوسرے آدمی کسی کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“
”تھینک یو سر، آپ اچھے آدمی ہیں۔“ اس نے ممنونیت سے کہا۔
میں ہنسا۔ ”میرے اکثر جاننے والے بھی کہتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درست کہتے ہیں۔“
”نہیں سر، آپ سچ مچ اچھے آدمی ہیں۔“ اس بار وہ بے ساختہ بولی۔ ”آپ نے کبھی ان نظروں سے مجھے نہیں دیکھا جن سے یہاں کا ہر فرد دیکھتا ہے۔“
میں نے موضوع بدل دیا۔ ”میرے لیے کھانا کون بناتا ہے؟“
”میں خود بناتی ہوں۔“
میں نے حیرت سے کہا۔ ”اچھا میں تو سمجھتا تھا کہ شیف بناتا ہے۔“
”وہ عام کھانے بناتا ہے دراصل میں نے محسوس کیا کہ وہ آپ کے لیے مخصوص کھانے اس طرح نہیں بناتا جیسے اسے بنانے چاہئیں اس لیے اب میں خود بناتی ہوں۔“
”اسی وجہ سے مجھے چار پانچ دن سے کھانے کے ذائقے میں واضح فرق لگ رہا ہے۔“
اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا مزے کا نہیں ہے سر، میں نے تو اسی لیے شیف سے یہ تھا کہ...“
”بہت مزے کا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”شیف بھی برا نہیں بناتا تھا لیکن تمہارے بنائے کھانے کا ذائقہ الگ سے محسوس ہوتا ہے۔“
”تھینک یو سر۔“
”مجھے سر مت کہا کرو، مجھے اس لفظ سے الرجی ہے۔ سن کر ہی برا لگتا ہے۔ میرا نام شہباز ہے، اگر تم چاہو تو نام لے سکتی ہو یا چاہو تو شہباز صاحب کہہ سکتی ہو۔“
”شہباز صاحب ٹھیک رہے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”آپ کھانا کھائیے پھر مجھے کال کیجیے گا میں نے آپ کے لیے اسپیشل شیک بنایا ہے۔“
جاتے ہوئے اس کا موڈ اچھا ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ میرے لیے شیک لے آئی۔ یہ خاص کالے انگور، پیچ اور اناس سے بنایا ہوا شیک تھا اور واقعی لاجواب تھا۔ میں نے شیک کی دکانوں سے بے شمار قسم کے پھلوں کا اور کاک ٹیل شیک بھی پیا ہے لیکن اس کا ذائقہ واقعی سب سے منفرد تھا۔ میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ ”اب میں آپ کے لیے روز بناؤں گی۔“
”روز نہیں ایک دن چھوڑ کر ورنہ میں عادی ہو جاؤں گا اور پھر مجھے اتنا اچھا نہیں لگے گا۔“
”جیسے آپ کہیں، میں بدل بدل کر بھی شیک بنا سکتی ہوں۔“
”تب ٹھیک ہے تم روز شیک لے آنا۔“ میں نے اجازت دے دی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حیات نے دروازے پر دستک دی اور موبائل مجھے پکڑا دیا۔ مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔
”خیریت تمہارا منہ سوجا ہوا ہے کیا کسی نے ...“
اس نے خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر بولا۔ ”ابھی تک کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہیں ہوا جو میرے منہ پر تھپڑ مار سکے۔“
میں نے مزید شرارت آمیز سادگی سے کہا۔ ”اچھا تھپڑ مارا ہے، بڑے صاحب تو یہاں ہیں نہیں تو پھر کس نے یہ جرأت کی؟“
جواب میں اس نے دروازہ دھڑام سے بند کر کے مجھے شٹ اپ کال دی۔ میں نے بنٹی سے بات کی اور وہ نمبر ذہن نشین کر لیا جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ کال ختم کر کے میں نے جوابی کال اور پھر ایس ایم ایس کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار مجھے بیلنس ختم ہونے کی خوشخبری سنائی گئی۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے موبائل حیات کو واپس کر دیا۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ بیلنس کے ساتھ موبائل مجھے دے دیتا۔ اس وقت لون لینے کی سہولت بھی نہیں تھی ورنہ میں لون لے کر کال کرتا۔ بانو کے معاملے میں اس کا غصہ اپنی جگہ لیکن اس نے میرے معاملے میں اپنی مکاری برقرار رکھی تھی اور مجھے کوئی ہلکا سا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔
دو دن بعد میرا خون نکالا گیا تھا۔ اس بار بھی نصف لیٹر تھا لیکن خون دینے کے بعد میں نے ہلکی سی کمزوری محسوس کی تھی۔ اگرچہ یہ کمزوری چند منٹ کے لیے تھی جیسے ہی مجھے جوس ملا اور جوس پیا تو خود کو پہلے کی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس دن صبح کی ایکسرسائز نہیں کی تھی اور آرام کیا تھا لیکن جب شام کو جم گیا تو خلافِ معمول میں نے تھکاوٹ محسوس کی تھی۔ میں دو گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے میں واپس آ گیا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ صرف دوسری بار خون دینے سے میں تھکاوٹ اور کمزوری محسوس کر رہا تھا آیندہ نہ جانے میرا کیا حال ہونے والا تھا۔ میں قوت بخش زود ہضم غذائیں وافر مقدار میں لے رہا تھا۔ باقاعدگی سے ورزش نے میری صحت کو پہلے سے کہیں بہتر بنا دیا تھا۔ مجھے اتنی جلدی کمزوری کا شکار نہیں ہونا چاہیے تھا مگر اگلے دن تک میں نارمل ہو گیا اور میری یہ تشویش بھی مدھم پڑ گئی۔
ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی تھی کہ جب پہلی بار میرا خون نکالا گیا تھا تو مجھے حکیم قاؤس سے علاج کرائے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس وقت میرے جسم میں معجزاتی دواؤں کا اثر باقی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بہت زیادہ خون نکالنے کے باوجود کمزوری کا شکار نہیں ہوا تھا اور آخری مرتبہ غیر معمولی مقدار میں خون دینے کے باوجود بچ گیا تھا۔ مگر اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دواؤں کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے اس وجہ سے ... کم مقدار میں خون دینے کے باوجود میں کمزوری کا شکار ہو رہا ہوں۔ مگر ضروری نہیں تھا کہ یہی وجہ ہو۔ ان دواؤں کا ایک اثر اب تک برقرار تھا کہ میرے زخم چاہے وہ کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں غیر معمولی تیزی سے بھر جاتے تھے۔ پھر خون بھی صرف نصف لیٹر لیا جا رہا تھا جب کہ آدمی ایک لیٹر خون دے کر بھی بغیر کمزوری کے صحت مند رہ سکتا ہے۔
ممتاز واپس آ گیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے بانو نے دی۔ مگر وہ آرام کرنے آیا تھا کیونکہ جوڑ توڑ نے اسے توڑ دیا تھا اور دن رات اس میں لگے رہنے کے بعد وہ تھک گیا تھا اس لیے چند دن کے لیے ستانے کو ممتاز ہاؤس آیا تھا۔ بانو کا کہنا تھا کہ وہ چند دن بعد دوبارہ جائے گا۔ اگرچہ ممتاز کی موجودگی اور غیر موجودگی کا مجھ پر زیادہ اثر نہیں پڑتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بنٹی مجھ سے ملنے نہیں آ سکتی تھی مگر اس سے ملنا اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اتنا تو میں نے جان لیا تھا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ پھر بھی میں اس سے مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا اور پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے مصرع پر عمل پیرا تھا۔
بانو اب کھانا لانے کے ساتھ کبھی کبھی وہیں رک جاتی تھی اور جب تک میں کھانا کھاتا وہ گپ شپ کرتی تھی۔ ظاہر ہے وہ میرے ساتھ کھا نہیں سکتی حالانکہ میں نے کئی بار اسے دعوت دی مگر اس نے سوری کر لی۔ یہ حفظِ مراتب کے خلاف ہوتا۔ میں بھی زیادہ اصرار نہیں کرتا تھا۔ ورنہ شاید حفظِ مراتب کی اس خلاف ورزی پر اسے کچھ سہنا پڑتا۔ اس کی حیات سے جھڑپ پرانی بات ہو گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ دونوں نے معاملہ گول کر دیا تھا۔ بانو کے لیے اس میں بے عزتی تھی اور حیات کے لیے بے عزتی کا خطرہ اور بھی زیادہ تھا۔ شاید اس نے بعد میں موقع پا کر بانو سے معافی مانگ لی ہو گی۔ جب میں کمرے میں ہوتا تھا تو حیات یا اس کے ساتھی میں سے ایک ہی شخص باہر ہوتا تھا اور دوسرا اس دوران میں آرام کرتا تھا لیکن میرے کمرے سے باہر نکلنے کے وقت حیات لازمی موجود ہوتا تھا..... ممتاز کی طرف سے یہ اس کی لازمی ذمے داری تھی۔
تیسری بار خون نکالنے سے ایک دن پہلے جب میں جم میں مصروف تھا تو بانو اندر آئی اسے دیکھ میں سمجھ گیا کہ بنٹی آنے والی ہے اور یقیناً..... ممتاز دوبارہ روانہ ہو گیا تھا۔ بانو کو دیکھ کر حیات حسب معمول کچھ اور سمجھا تھا اور اسے گھورتا ہوا باہر گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بانو دانت پیستی واپس آئی۔ وہ دروازہ بند کرنے گئی تھی۔ حیات اور اس کے ساتھی کو بے خبر رکھنا لازمی تھا اس لیے بنٹی کی آمد سے

پہلے جم کا سروس ڈور اندر سے لازمی بند کیا جاتا تھا ورنہ اس بات کا خطرہ تھا کہ حیات کسی وقت بھی اندر آسکتا تھا۔ بانو دوسرے دروازے سے باہر نکلی اور اس کی جگہ بنٹی اندر آئی۔ آج وہ پھر مختصر سے لباس میں تھی۔ مجھے خیال آیا کہ یہ لباس وہ صرف میری موجودگی میں پہن کر آتی تھی یا پھر وہ اس جم میں اسی لباس میں ورزش کرتی تھی۔ ویسے یہ جتنا روشن خیال گھرانا تھا اس کے افراد سے ہر چیز کی توقع کی جاسکتی تھی۔

"بڑے صاحب چلے گئے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... تم سناؤ کیسا چل رہا ہے سب؟"

"دوسری بار خون دینے کے بعد مجھے ہلکی سی کمزوری محسوس ہوئی تھی حالانکہ جب میں کنوروں کی قید میں تھا اور انہوں نے میرے جسم سے فی ہفتہ ایک لیٹر خون نکال تھا تب بھی میں نے اتنی کمزوری محسوس نہیں کی تھی۔"

وہ فکر مند ہو گئی۔ "ایسا کیوں ہے؟ میں ڈاکٹر سے پوچھتی ہوں۔"

کنوروں کی بات آئی تو اس نے پہلی بار خود پوچھا۔ "تم ان کے ہاتھ کیسے لگے؟"

"یہ لمبی داستان ہے۔"

"تم مختصر کرکے سنادو۔" اس نے اصرار کیا تو میں ایکسر سائز کے ساتھ ساتھ اسے بتانے لگا کہ میں کنوروں کے ہاتھ کیسے لگا تھا۔ حسب معمول سوالات کی مدد سے داستان لمبی ہوتی چلی گئی۔ اوشا کا ذکر آیا تو وہ چونک گئی۔ "سپیرے کی بیٹی، کیسی تھی؟"

"سیاہ فام تھی لیکن خوب صورت تھی۔"

"تم سے متاثر ہوئی ہوگی؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"ایسا بھی نہیں ہے کہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی مجھ سے متاثر ہو جائے۔"

"لیکن متاثر ہونے والیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔"

اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ اوشا کس طرح میری دیوانی ہو گئی تھی کہ اپنے باپ سے بغاوت کر بیٹھی تھی اور اس سے اپنی کمال اتروالی تھی تو نہ جانے اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔ اس لیے اوشا کا ذکر ایک حد میں رکھتے ہوئے میں نے اسے کنور خاندان کے ہاتھ لگنے کا واقعہ سنایا پھر انہوں نے کیوں میرا خون نچوڑنے کی کوشش کی اور کس طرح میری جان بچی۔ جب میں نے قبائلیوں کے خلاف کنور خاندان کی سازش اور بھارتی حکومت کی بربریت کا بتایا تو وہ حیران ہوئی تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ "اتنے سفاک لوگ ہیں۔"

میں نے ملائمت سے کہا۔ "تمہیں ایک جاگیردار خاندان کی نورِ چشم ہو کر بھی نہیں معلوم کہ غریبوں کے ساتھ اس قسم کے لوگ کیسی سفاکی دکھاتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے ہم جاگیردار ہیں لیکن اپنے لوگوں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔"

"جیسے بانو کا رکھا ہوا ہے؟"

میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "تمہیں بانو نے بتایا ہے؟"

میں نے سر ہلایا اور پھر اسے حیات کے ساتھ بانو کی جھڑپ کے بارے میں بتایا۔ "وہ اس سے دل برداشتہ تھی اس لیے اس کے منہ سے نکل گیا۔"

بنٹی نے سر ہلایا۔ "میں جانتی ہوں وہ میری وفادار ہے مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"لیکن ہے تو تم لوگوں کی پروردہ۔"

"اس کا باپ پاپا کی زمین پر کام کرتا تھا اور ماں یہاں ملازم تھی۔ ایک بار یہ لوگ کسی رشتے دار کی شادی میں جارہے تھے کہ برات کی بس کو حادثہ پیش آگیا۔ دونوں ماں باپ مارے گئے بس یہی بچ گئی۔ پولیس بانو کو ہمارے پاس لے آئی تھی۔ اس کے اور رشتے دار بھی تھے لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو پاپا سے کہا کہ اسے رکھ لیں۔ پاپا مان گئے۔ اسے ایک ملازمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ بڑی ہوئی تو اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس نے لاہور کے ایک اچھے کالج سے گریجویٹ کیا۔ میں تو چاہتی تھی کہ وہ مزید پڑھے اور اپنا مقام بنائے۔ ہو سکے تو کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کرے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھ سے اور پاپا سے کہا کہ اسے کوئی ذمے داری دی جائے وہ ایسے ہی یہاں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ میری سکریٹری بن جائے۔"

"مگر اسٹینس سے وہ سکریٹری کی جگہ خادمہ لگتی ہے۔"

"میں اسے سکریٹری کا درجہ دیتی تھی مگر اس نے مجبور کیا کہ اسے ملازمہ کے لحاظ سے ٹریٹ کیا جائے۔"

مجھے حیرت ہوئی اگر بنٹی درست کہہ رہی تھی تو یہ لوگ بانو پر مہربان تھے اور اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی پروفیشنل ڈگری حاصل کر لیتی تو اپنی لائف خود بنا سکتی تھی۔ بے شک وہ ممتاز ہاؤس میں ملازمہ تھی اور بنٹی کی ملازمہ کی حیثیت سے وہ الگ ہی تھی لیکن تھی تو ملازمہ۔ چاہے اسے کوئی بھی تنخواہ دے دی جاتی یا یہاں وہ کتنے ہی سکون و آسائش سے رہتی۔ شاید اس میں ہمت کی کمی تھی اور وہ باہر نکل کر دنیا سے اپنا حصہ طلب کرتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ ممتاز ہاؤس بچپن سے اس کے لیے گوشۂ عافیت رہا تھا اور وہ یہاں سے نکلتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ بنٹی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "کیا بات ہے آج بانو میں بہت... دلچسپی لے رہے ہو؟"

"ایسے ہی۔" میں نے سوئمنگ پول کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کل تم خون لینے کے موقع پر میرے ساتھ وہاں رہو۔"

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے وعدہ کرنے سے گریز کیا۔ جب میں سوئمنگ کرنے جاتا تو وہ رخصت ہو جاتی تھی۔ اس روز بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے جاتے ہی بانو آئی اور سروس ڈور کی طرف گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد حیات اندر آیا۔ وہ کب آیا میں نے غور نہیں کیا تھا۔ سوئمنگ کرکے میں واپس کمرے میں آیا اور نہا دھو کر کھانے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر جب مقررہ وقت پر بانو نہیں آئی تو میں نے اسے واکی ٹاکی پر کال کی۔ مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا بس سائیں سائیں کرتی آواز آرہی تھی۔ غالباً کسی وجہ سے واکی ٹاکی کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انتظار کیا پھر دروازہ بجایا۔ باہر سے حیات نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"بانو ابھی تک کیوں نہیں آئی کھانا لے کر؟"

"بڑی بے چینی ہے تمہیں بانو کی۔" اس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

میں نے اسے گھورا۔ "میری بات کا جواب دو وہ اب تک کیوں نہیں آئی ہے؟"

وہ رکھائی سے بولا۔ "مجھے کیا معلوم، میں اس کا نگراں نہیں ہوں۔"

مجھے کھانے سے زیادہ بانو کی فکر ہو رہی تھی جب سے اس نے یہ ذمے داری سنبھالی تھی گھڑی کی سوئیوں کی سی پابندی سے کام کرتی تھی۔ اور آج بارہ بج کر بیس منٹ ہونے والے تھے اور وہ نہیں آئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور دروازہ کھلا۔ میں سمجھا کہ بانو ہو گی لیکن اس کی جگہ وہی نوجوان ملازم تھا جو پہلے دن نظر آیا تھا وہ کھانے کی ٹرالی لایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "بانو کیوں نہیں آئی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم جناب۔" وہ بولا۔ "میرا تعلق کچن سے ہے۔"

"بانو میرا کھانا بناتی ہے کیا وہ کچن میں آئی تھی؟"

"پتا نہیں جناب، مجھے شیف نے بلا کر یہ ٹرالی آپ کے لیے لے جانے کا حکم دیا میں لے آیا۔"

دوسرے لفظوں میں اسے بالکل علم نہیں تھا کہ کھانا بانو نے بنایا ہے یا نہیں اور وہ کہاں تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "کیا بے بی تک میرا پیغام لے جاسکتے ہو۔"

"بے بی تک صرف بانو پیغام لے جاسکتی ہے۔" اس نے معذرت کی اور رخصت ہو گیا۔ کھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ ایسی کیا بات ہو گئی کہ بانو نہیں آئی۔ اگرچہ یہ کوئی خاص بات بھی نہیں تھی۔ بانو کا نہ آنا اور آنا تقریباً برابر تھا۔ اگر بنٹی اس سے لے کر یہ ذمے داری کسی اور کے سپرد کر دیتی تب بھی مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ مگر اچانک بانو کا نہ آنا مجھے کھٹک رہا تھا۔ اس کا تعلق بنٹی سے تھا اور بنٹی اس گھر میں میری واحد ہمدرد تھی۔ اس کی کوششوں سے میں راج کنور کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہا تھا۔ اگر اس کی سوچ میں کوئی تبدیلی آتی تھی تو مجھ پر اس کا لازمی اثر پڑتا اس لیے میں بانو کے لیے فکر مند تھا۔ بہرحال یہ فکر مجھ پر زیادہ دیر سوار نہیں رہی تھی کیونکہ میں ہر قسم کے حالات کا بہت جلد عادی ہو جاتا ہوں۔ اس قید میں میرے لیے سب سے زیادہ تشویش ناک بات چیتو کی قید تھی۔ اس کی وجہ سے میں اپنے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ ورنہ اب تک آزاد ہونے کی کوشش کر چکا ہوتا۔ مگر اب میری ایسی کسی کوشش کا اثر چیتو پر پڑتا اور اسے خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ اس لیے میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔

اگلے روز میں خون دینے کے لیے صبح سویرے کلینک پہنچا۔ ڈاکٹر نے پھر نصف لیٹر خون نکالا اور جب میں نے خون دے کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک لمحے کو مجھے چکر آگیا تھا۔ اس لمحے میں سب بلیک آؤٹ ہو گیا۔ گول مٹول نرس پاس کھڑی تھی اس نے میری کیفیت بھانپ لی اور مجھے سہارا دیا ورنہ شاید میں گر جاتا۔ مگر دوسرے لمحے میں ہوش میں آگیا اور میں نے خود کو سنبھال لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ لیٹنے کو کہا اور مجھے اس بار طاقت کا انجکشن چھوٹی ڈرپ میں لگا دیا۔ اس

سے میری کیفیت خاصی بہتر ہوئی تھی پھر جوس پی کر میری طبیعت تقریباً بحال ہوگئی تھی۔ مگر اپنی لمحاتی کیفیت نے مجھے فکرمند کر دیا تھا۔ کیا میری صحت عام معیار سے بھی نیچے جا چکی تھی۔ واپسی کے بعد بھی میں اپنی کیفیت بھانپنے کی کوشش کرتا رہا۔

گزشتہ دن سوائے ناشتے کے باقی دن وہی لڑکا مجھے کھانا لا کر دیتا رہا تھا لیکن میں اسے ہر وقت طلب نہیں کر سکتا تھا اسی طرح میرا بنٹی سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے میں صبح جم نہیں گیا اور شام کو بھی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی لیکن صرف اس وجہ سے جم گیا کہ شاید اب بانو آئے اور حیات کو یہاں سے رخصت کر دے اور میری بنٹی سے ملاقات ہو۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور نہ ہی مجھ سے ورزش ہوئی تھی۔ واپسی پر میں نے کتوں کا شور سنا وہ زور سے بھونک رہے تھے اور آوازوں سے لگ رہا تھا کہ کتوں کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ اگر یہاں کتے نہ ہوتے تو مجھے تعجب ہوتا کیونکہ ہمارے ہاں جاگیردار کتوں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لڑکا آخری بار آیا تو میں نے کہا۔ ”سنو اگر تم بے بی تک رسائی نہیں رکھتے ہو تو کسی ایسے شخص کو تو جانتے ہو گے جو بے بی تک رسائی رکھتا ہے۔ اس سے کہو میں بے بی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”رستم صاحب سے کہہ دوں گا۔“ وہ بولا۔ ”وہ ممتاز ہاؤس کے منتظم ہیں۔“

”میری بہت سی چیزوں کا خیال بانو رکھ رہی تھی اب کون ان کو دیکھے گا۔“

”مجھے اس بارے میں نہیں معلوم ہے۔“ اس نے حسب معمول جواب دیا۔

”تو پھر کسے معلوم ہے؟“ میں نے جھنجلا کر کہا اور دروازہ کھول کر حیات کو پکارا۔ ”اِدھر آؤ تم؟“

”کیا ہے؟“ اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”جا کر اپنے بڑے صاحب کو بتا دو کہ اب میں خون نہیں دوں گا اور اگر وہ نہیں ہیں تو بے بی کو یہ بات کہہ دو۔“ میں نے کہہ کر دروازہ بند کر دیا۔ حیات کے تاثرات نہیں دیکھے تھے البتہ اپنے تاثرات غیظ و غضب والے رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ برآمد ہو گا۔ میں بنٹی سے رابطہ چاہتا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد حیات نے مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ اور اس کا ساتھی دونوں موجود تھے اور وہ مجھے بنٹی والے حصے میں لائے۔ وہ اپنی نشست گاہ میں موجود تھی اور اسے دیکھتے ہی لگا کہ وہ پریشان ہے۔ اس نے آنکھ سے حیات کو اشارہ کیا اور وہ خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں میں اور بنٹی تھے۔

”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟“

”بانو کیوں نہیں آ رہی؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے؟“

”کیا معلوم ہے؟“

”یہی کہ بانو کل صبح سے غائب ہے۔“

میں چونک گیا۔ ”غائب ہے.... کب سے اور کس طرح سے غائب ہے؟“

”وہ کل صبح جب جم سے نکلی تو اس کے بعد میرے پاس نہیں آئی۔ بارہ بجے میں نے اس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ تب مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے شیف سے پوچھا اس نے کہا کہ بانو کچن میں بھی نہیں آئی۔ میں نے اسے تمہارے کھانے کے بارے میں ہدایت دی اور پھر بانو کو پورے ممتاز ہاؤس میں دیکھا گیا لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ اس کے کمرے میں اس کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ حد یہ کہ اس کا پرس اور موبائل بھی موجود ہے۔ آج اسے کتوں کی مدد سے تلاش کیا گیا۔ پاپا کے ڈاگ ہاؤس میں بلڈ ہاؤنڈ ہیں جو کسی شخص کی بو میلوں دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ وہ بھی اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔“

”گھر میں کتوں کی مدد سے تلاش؟“

”ہاں تم نے دیکھا ہے ممتاز ہاؤس کتنا بڑا ہے اس میں کوئی بندہ گم ہو جائے تو اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ بیمار یا بے ہوش ہو کر نہ پڑی ہو اس لیے کتوں سے مدد لی۔“

مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ ”گیٹ کیپر کیا کہتے ہیں؟“

”ان کا کہنا ہے کہ بانو نہ تو پیدل اور نہ ہی کسی گاڑی میں باہر نکلی ہے۔“

”ممتاز ہاؤس سے باہر جانے کا اور بھی کوئی راستہ ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے ایک گیٹ اور تھا مگر سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے اسے بند کر دیا گیا۔“

”کوئی خفیہ راستہ ہے؟“

”لازمی بات ہے لیکن اسے صرف میں، پاپا اور چند ... استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اس سے کوئی اور نہیں گزر سکتا ہے۔“

”تب کیا بانو کسی بن کر یہاں سے نکلی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس پر مجھے یاد آیا یہاں ہیلی پیڈ بھی ہے۔“

”لیکن کل یہاں نہ تو کوئی ہیلی کاپٹر آیا اور نہ گیا۔“

”اگر وہ خود سے جاتی تو اس کا کوئی نہ کوئی نشان ملتا اور اس کا سامان بھی غائب ہوتا۔“

”تمہارا مطلب ہے اسے کسی نے غائب کیا ہے۔“ بنٹی چونک گئی۔

”سامنے کی بات ہے وہ کل جم سے نکلی اور اس کے بعد غائب ہو گئی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”گیٹ پر آنے جانے والوں کا مکمل ریکارڈ ہوگا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”وہ ریکارڈ بھی چیک ہوا ہے، کل سے اب تک کوئی دو درجن گاڑیاں اندر آئی اور گئی ہیں۔ ان میں سپلائی کی گاڑیاں بھی ہیں اور لانڈری کی گاڑی بھی اور ہماری گاڑیاں بھی ہیں۔“

میں چونکا۔ ”لانڈری کی گاڑی! کیا اس میں بانو کو بے ہوش کر کے نہیں لے جایا جا سکتا ہے؟“

”لے جایا جا سکتا ہے لیکن آخر کسی کو اس سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔“

”دشمنی ضروری نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم بھول رہی ہو وہ نوجوان اور دلکش لڑکی ہے اور شاید کنواری بھی ہے۔“

اس نے مجھے گھورا۔ ”شاید نہیں وہ یقیناً کنواری تھی۔“

”تب کسی کی نیت بھی اس پر خراب ہو سکتی ہے۔“

”تم ممتاز ہاؤس کے کسی فرد کو الزام دے رہے ہو۔“

”خاص ... ہے اسے یہاں سے یہیں کا کوئی بندہ لے جا سکتا ہے ورنہ کیا یہاں سب شریف اور پارسا لوگ ہیں۔“

بنٹی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا ... میں نے کل پاپا کو کال کر دی تھی۔ مگر ان کا کہنا ہے ابھی پولیس کے پاس جانے کے بجائے اسے خود تلاش کیا جائے۔ ہمارے آدمی آس پاس کے علاقے میں دیکھ رہے ہیں۔“

”فرض کرو اگر بانو کی گم شدگی میں اندر کا آدمی ملوث ہے تو تلاش کی اس مہم کو ناکام بنانا اس کے لیے نہایت آسان ہوگا۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے آج یا کل پاپا آ رہے ہیں وہی اس معاملے کو دیکھیں گے۔“

”تب تک اس بے چاری کے ساتھ نہ جانے کیا ہو جائے۔“ میں نے سرد آہ بھری اور ساتھ ہی اطمینان محسوس کیا کہ بنٹی اور دوسرے حالات میں میرے حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے شرمندگی ہوئی۔ اس لڑکی کا خیال کم تھا اور اپنا خیال مجھے زیادہ تھا۔ مگر یہ انسان کی فطرت ہے وہ کسی بھی معاملے میں پہلے اپنا مفاد دیکھتا ہے اور اس کے بعد کسی اور کی فکر کرتا ہے۔ بنٹی نے کہا۔

”میں نے تمہاری ذمے داری اکرم کو سونپ دی ہے۔“

اکرم وہی لڑکا تھا جو آج کل میرے لیے کھانا لاتا تھا۔ بنٹی کے حکم پر اب وہ ہمہ وقت کمرے کے باہر موجود رہتا اور میرے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ بنٹی نے پھر معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اب تم نہیں کہہ سکتے کہ تمہیں بانو کی فکر نہیں ہے۔“

”فکر ہے لیکن ان معنوں میں نہیں اور دوسرے آدمی خودغرض ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ شاید تم نے اسے ہٹا دیا ہے اور شاید تم مجھ سے فرنٹ ہو گئی ہو۔“

”سوری میں کلینک نہیں آ سکی تھی لیکن میں نے رپورٹ لی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہیں چکر آیا تھا۔“

”ہاں یہ میرے لیے تشویشناک بات ہے کیونکہ میں نے اتنا خون نہیں دیا ہے کہ مجھے کمزوری محسوس ہو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے میں نے اس سے دو گنا خون دے دیا ہے جتنا مجھے دینا چاہیے تھا۔“

”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تمہاری بلڈ ٹیسٹ رپورٹ بہترین آئی ہے۔ اسی طرح یورین اور دوسرا بلڈ ٹیسٹ بھی کلیئر ہے۔ یعنی جسمانی طور پر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”یہ ڈاکٹر تم لوگوں نے ہائر کیا ہے؟“

بنٹی چونکی۔ ”نہیں تو، یہ صرف اسی کام کے لیے آیا ہے۔“

اس بار میں چونکا۔ ”باہر...؟ کہاں سے؟“

”یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن پاپا کہہ رہے تھے اسے خاص طور سے اسی کام کے لیے بلایا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ بنٹی مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”اس میں کوئی خاص بات ہے جو تم پوچھ رہے ہو اور اب کچھ فکرمند بھی لگ رہے ہو؟“

میں نے جلدی سے خود کو نارمل کیا۔ ”نہیں ایسے ہی میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر سے کہہ کر ایک بار اپنے ٹیسٹ کراؤں۔“

”میرا مشورہ ہے اب خون دینے کے بعد تم پلازمہ لے لینا اس سے خون کی مقدار پوری ہو جائے گی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے کہوں گا۔“

بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنی صحت کے بارے میں بہت فکر مند ہوں اور میں بنی کو بھی یہی تاثر دینا چاہتا تھا یعنی میں ان سے پوری طرح تعاون کر رہا تھا۔ میں نے گفتگو کا رخ دوبارہ بانو کی طرف موڑ دیا۔ ”اگر اسے غائب کیا گیا ہے تو اسے لے جانے والے اسے زندہ چھوڑنے کا خطرہ تو کسی صورت مول نہیں لے سکتے۔“

بنی نے گہری سانس لی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ شاید اب اسے نہ دیکھ سکوں۔“

”مگر اس طرح سے ایک جیتا جاگتا بندہ غائب ہو جانا اس گھر کی سیکورٹی پر بہت بڑا سوالیہ نشان نہیں ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہاں فول پروف سیکورٹی ہے۔ پورے ممتاز ہاؤس کو دو سو سے زائد سیکورٹی کیمرے کور کرتے ہیں لیکن کسی کیمرے میں کوئی خلافِ معمول بات نہیں آئی ہے۔“

”اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کرنے والے سیکورٹی سے پوری طرح واقف تھے اور انہوں نے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بانو کی گم شدگی ریہرسل ہو۔“

بنی پھر چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”یہ کام کرنے والوں کا نشانہ کوئی اور ہو سکتا ہے لیکن اسے اٹھانے سے پہلے انہوں نے بانو پر ریہرسل کر لی۔“

بنی کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے ہم میں سے کسی کو اغوا کرنے کا پلان ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں کیا تم لوگوں کے دشمن نہیں ہیں۔ کرمن والے واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس کے خاندان والے تم لوگوں سے اس کی لاش کا مطالبہ بھی کر چکے ہیں۔ اگر وہ تم میں سے کسی کو قبضے میں کر لیں تو ممتاز صاحب پھر ان کا مطالبہ مسترد کر سکتے ہیں۔“

”نہیں... مگر یہ بہت مشکل کام نہیں ہے۔“

”تم اس نقطہ نظر سے سوچو کہ تمہارے پاپا ایک معروف آدمی ہیں اگر گھر سے باہر ایسی کوئی کارروائی ہوتی تو سب یقین کریں گے۔ لیکن اگر تم گھر سے غائب ہو جاؤ اور تمہارے پاپا شور کریں تو کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔ اسے ان کا اسٹنٹ قرار دیا جائے گا۔“

بنی قائل نظر آنے لگی حالانکہ یہ نہایت احمقانہ تھیوری تھی۔ گھر میں اس قسم کی کارروائی گھر کے افراد کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے اور پولیس جب چھترول کرے گی تو اصل مجرم کو اگلتے ہی بنے گی۔ اس قسم کے کام ہمیشہ گھر سے باہر ہوتے ہیں۔ اس میں آسانی ہوتی ہے اور پولیس کے ہاتھ آنے کا امکان بھی نہیں ہوتا ہے لیکن بنی کی سوچ محدود تھی اس لیے وہ فوراً فکر مند ہو گئی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ اس رخ پر سوچے اور اپنے باپ کو قائل کرے اس طرح سے وہ زیادہ تندہی سے بانو کو تلاش کر سکتے تھے۔ جب بانو کی تلاش کی جاتی تو لازمی بات تھی یہ ممتاز ہاؤس کے معمولات سے ہٹ کر ہوتی اور ممکن ہے اس دوران میں مجھے کوئی موقع ملتا۔ جب میں واپس کمرے میں آیا تو اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میری تین دن سے جیتو سے بات نہیں ہوئی تھی اور بنی نے روانگی سے پہلے حیات کو وارننگ دی تھی کہ اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہ دے۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا۔

”میری جیتو سے بات کرائی جائے۔“

باولِ ناخواستہ اس نے اسی موبائل پر جیتو سے میری بات کرائی۔ وہ ٹھیک تھا۔ مگر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا اس نے کہا۔ ”شوبی اب ہم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ ہم کو آپ کے پاس لائے ورنہ ہم اب شرافت سے نہیں رہے گا۔“

”ابھی تم کچھ نہیں کرو گے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھو ہمیں موقع ملے گا اس لیے جلد بازی نہیں کرو۔“

”شوبی آپ قید ہو کر سکون سے رہ سکتا ہے ہم نہیں۔“ اس نے فریاد کی۔ ”ہم کو اس کا عادت نہیں ہے۔“

”چھوڑو یار۔“ میں نے کہا۔ ”بلا وجہ ہنگامہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ الٹا یہ تمہارا کھانا پانی بند کر دیں گے۔“

”ہم کو یہ فکر ہے کہ جیسے جیسے یہ آپ کا خون نکالتا رہے گا ویسے ویسے آپ کمزور پڑ جائے گا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے تسلی دی۔ ”یہاں میرا پورا خیال رکھا جا رہا ہے اور ڈاکٹر میری دیکھ بھال کرتا ہے۔ میں کمزور ہوا تو یہ خون لینا بند کر دیں گے۔“

”شوبی ہم کو یقین نہیں ہے۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”دشمن کی بات کا کبھی اعتبار نہ کرو۔“

”میں کون سا ہنسی خوشی کر رہا ہوں مجبوری ہے۔“

”ہم بھی مجبور ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔

”بس تو بھی صبر کرو۔“

اس دن میں دونوں وقت ورزش نہیں کر سکا تھا کیونکہ کمزوری کا احساس باقی تھا بس کھانے کے بعد چہل قدمی کر لیتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ لیکن یہ گڑبڑ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ صرف ایک چیز سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس کا تعلق خون نکالنے سے تھا۔ یعنی گڑبڑ کلینک میں کی جا رہی تھی۔ دوسرے دن جا کر میری حالت اس قابل ہوئی کہ میں ذرا کر ایکسر سائز کر سکوں اور یہ بھی میں پورے اسٹیمنا سے نہیں کر سکا تھا۔ آخر میں میری سانس بے قابو ہونے لگی تھی اس لیے میں ورزش ادھوری چھوڑ کر سوئمنگ پر مجبور ہوا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میری چھٹی حس خبردار کرنے لگی تھی کہ میرے ساتھ کوئی چکر کیا جا رہا تھا۔ مگر یہ کیا جا رہا تھا یہ سمجھ سے باہر تھا۔ ڈاکٹر میرے سامنے بڑے کینولا سے نصف لیٹر کی تھیلی منسلک کرتا تھا اور جب یہ بھر جاتی تو مجھے دکھاتا تھا کہ اس نے میرا کتنا خون نکالا۔ بہ ظاہر اس میں کہیں گڑبڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے بنی کے انکشاف نے مشکوک کر دیا تھا کہ ڈاکٹر اسی کام کے لیے باہر سے آیا اور ممتاز ہاؤس کا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی باہر سے کسی ڈاکٹر کو بلانا مجھے کھٹک رہا تھا کیونکہ خون لینا کوئی اتنا بڑا کام نہیں تھا جس کے لیے خاص طور سے ڈاکٹر اور نرس باہر سے منگانے کی ضرورت پیش آتی۔

تیسرے دن میری حالت ٹھیک ہو گئی اور میں پوری توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ بانو کی جگہ اکرم آ گیا تھا اور وہ میرا خیال رکھتا تھا۔ میں نے بنی سے کہا تھا کہ وہ اکرم کو باہر جانے کی اجازت دے تاکہ اگر میں اسے کوئی فوری چیز منگانا چاہوں تو مجھے مشکل نہ ہو۔ دو دن گزر جانے کے باوجود بانو کا کہیں پتا نہیں تھا اور میاں ممتاز بھی نہیں آیا تھا۔ شاید کام کی زیادتی اسے واپس آنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ اس ہفتے کے دوران بنی سے میری ملاقات نہیں ہوئی اور نہ ہی بانو کا پتا چلا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے سہارا لڑکی کسی نامعلوم زبردستی کا شکار ہوئی تھی۔ بہ ظاہر ممتاز اور بنی اس کے سرپرست تھے لیکن اس کی پُراسرار گم شدگی پر ان کا رویہ واضح تھا..... ممتاز نے پولیس میں رپورٹ کرنے سے منع کر دیا تھا اور بنی بھی خاص فکر مند نہیں تھی۔ وہ ان کے لیے صرف ملازمہ تھی اور وہ نہیں رہے گی تو اس کی جگہ دوسری ملازمہ آ جائے گی۔ اگر اس کے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو یہ لوگ صرف افسوس کریں گے۔ اس سے زیادہ کی توقع نہیں جا سکتی تھی۔ غالباً اس سے زیادہ فکر انہیں اپنے سیکورٹی نظام کی ناکامی کی ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر رہے تھے۔

میرا خون جمعرات کی صبح لیا جاتا تھا۔ جمعرات آئی تو میں صبح کلینک جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حیات نے مجھ

بجے ہی دروازہ بجانا شروع کر دیا تھا لیکن میں آرام سے تیار ہو کر سات بجے نکلا۔ اس نے مجھے تاخیر کرنے پر گھورا تھا لیکن منہ سے کچھ کہا نہیں۔ وہ اپنے ساتھی سمیت مجھے کلینک کی عمارت میں لے کر آیا۔ جہاں حسب معمول ڈاکٹر اور گول مٹول نرس میرے منتظر تھے۔ اس دن میں نے پہلی بار اس کمرے کا بہ غور معائنہ کیا۔ یہاں صرف دو کرسیاں اور ایک وہ اسٹریچر نما بیڈ تھا جس پر میں لیٹ کر خون دیتا تھا۔ یہ زمین سے کوئی تین فٹ اونچا تھا۔ کیونکہ خون لیا ہوتا تھا اس لیے اسٹینڈ استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ خون کی تھیلی اسٹریچر کے ساتھ نیچے لٹکائی جاتی تھی۔ بیڈ کے نیچے خلا نہیں تھا بلکہ یہ چاروں طرف سے بند تھا۔ یہ بات مجھے ذرا اہٹ کر لگی تھی ورنہ عام طور سے اس قسم کے بیڈز کے نیچے خلا ہوتا ہے کیونکہ یہ اینگل آئرن سے بنے ہوتے ہیں۔ کرسیاں ڈاکٹر اور نرس کے لیے تھیں اور حیات کا کام کھڑے رہنا تھا اس لیے وہ مستعد کھڑا رہتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹرالی تھی جس پر دوائیاں، پانی اور منرل جوس کی بوتل رکھی تھی۔ یہ سب خون لینے کے بعد میرے لیے تھا۔

گول مٹول نرس نے مجھے بیڈ پر لیٹنے کو کہا اور پھر میرے بازو سے کینولا منسلک کرنے لگی۔ خون نکالنے کے لیے جو کینولا استعمال کیا جاتا ہے اس کی سوئی خاصی موٹی ہوتی ہے اور جب اسے نکال لیا جاتا تھا تب بھی کچھ دیر تک سوئی والی جگہ سے ہلکا سا خون رستا تھا جسے اینٹی سیپٹک روئی پر لگا کر دبانا پڑتا تھا تب کہیں جا کر خون رکتا تھا۔ نرس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس نے آ کر تھیلی کی نلکی کینولا سے منسلک کی۔ میں نے جھک کر دیکھا وہ تھیلی ہی لگا رہا تھا اس کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ تھیلی سے منسلک نلکی خاصی لمبی تھی یہ شاید ڈیڑھ گز تھی جب کہ اس سے نصف لمبی نلکی سے بھی کام چل سکتا تھا۔ تھیلی منسلک کر کے ڈاکٹر نے اسٹاپر کھولا تو خون نلکی سے ہوتا ہوا تھیلی میں جانے لگا تھا۔ میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ خون جانے کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ مگر اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر نے پھر اسٹاپر کو چھیڑا ہے۔ میں نے جھک کر دیکھنا چاہا لیکن گول مٹول نرس جو میرے بائیں طرف کھڑی تھی اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بار بار مت جھکیں اس سے بینوں پر دباؤ پڑ سکتا ہے۔“

میں سیدھا لیٹ گیا اور اپنی ساری حسیات کسی آہٹ یا معمولی سی حرکت پر مرکوز کر لی تھیں۔ ڈاکٹر واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ میں آنکھ بند کر کے ساکت لیٹا ہوا تھا۔ یہاں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ کتنی دیر تک خون لیا جائے تو تھیلی بھر جائے گی۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ خاصی دیر گزر گئی ہے اور یہ وقفہ تھیلی کو بھرنے کے لیے کافی تھا۔ اسی لمحے بیڈ کے ساتھ بہت معمولی سی حرکت کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے بیڈ سے منسلک کوئی چیز ہلی ہو۔ نلکی کو ہلنے سے روکنے سے بچانے کے لیے بیڈ کے ساتھ ایک کلپ سے فکس کر دیا تھا۔ پھر کیا چیز ہل رہی تھی۔ میں نے ان چیزوں پر پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ قدرتی طور پر میری توجہ اپنے بدن سے نکلتے خون پر مرکوز ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی پہلے نوٹ نہیں کیا تھا کہ گول مٹول نرس ہمیشہ میرے دائیں طرف بالکل ساتھ کھڑی ہوتی تھی۔ جیسے میری نگراں ہو اور مجھے حرکت کرنے سے روک رہی ہو۔ عام طور سے اس کے چہرے پر نرم تاثرات ہوتے تھے لیکن اس وقت اس کے چہرے پر سخت اور کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔ میں نے منہ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور اپنا بایاں پہلو کھجایا۔

”پلیز ہلیں مت۔“ نرس نے کرخت لہجے میں کہا۔

”مجھے خارش ہو رہی ہے۔“ میں نے بدستور بایاں پہلو کھجاتے ہوئے اچانک دائیں طرف کروٹ لی۔ ڈاکٹر ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور پیچھے سے نرس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اتنی دیر میں، میں دیکھ چکا تھا۔ بیڈ کے نچلے حصے میں جہاں تھیلی ہونی چاہیے تھی وہاں تھیلی نہیں تھی بلکہ نلکی ایک چھوٹے سے خلا میں جا رہی تھی۔ ظاہر ہے اس خلا میں کوئی تھا جس نے تھیلی کو نلکی سمیت اندر کر لیا تھا اور مقصد بھی واضح تھا۔ اندر کسی اور تھیلی میں میرا مزید خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دھوکا تھا کہ میرا صرف نصف لیٹر خون لیا جا رہا ہے۔ اس طریقے سے کہیں زیادہ مقدار میں خون لیا جا رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے کینولا کھینچ کر بازو سے الگ کر دیا۔ ڈاکٹر میری طرف آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو خون ضائع ہو جائے گا۔“

وہ میری زندگی ضائع کر رہے تھے۔ جتنا خون لیتا تھا شاید اس سے دو گنا یا تین گنا زیادہ خون لے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے دیکھ لیا تھا کہ میں نے ان کا دھوکا پکڑ لیا ہے۔ مگر اسے فکر تھی کہ نلکی کھینچنے سے تھیلی میں موجود خون ضائع ہو جائے۔ اس دوران میں، میں طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے گھوم کر عقب سے مجھے قابو کرنے کی کوشش کرتی گول مٹول نرس کے نرم وجود سے سر نکالا۔ ذرا آگے ڈاکٹر کی گردن پر لات ماری۔ ایڑی پوری قوت سے اور درست جگہ لگی تھی۔ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور ڈاکٹر حیات پر جا گرا۔ میں تڑپ کر اٹھنے لگا تھا۔ یہ موقع تھا میں حیات سے گن چھین سکتا تھا۔ ایک بار ہتھیار میرے ہاتھ میں آ جاتا تو میں پانسا پلٹ دیتا۔

مگر اس موقع پر گول مٹول نرس پیر تسمہ پا بن کر عقب سے چمٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میری بغلوں سے گزارتے ہوئے مجھے جکڑ لیا۔ یہ بڑی نرم گرم اور گداز بہت بھرپور جکڑ تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے اس قید سے آزاد ہونے کی اتنی جلدی بھی نہ ہوتی لیکن اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ خون نکلنے سے مجھے کسی قدر کمزوری کا احساس بھی ہو رہا تھا اور میں حیات کے سنبھلنے سے پہلے اس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ مگر جب خود کو نرس سے چھڑانے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ وہ صرف موٹی نہیں تھی بلکہ اس میں اچھی خاصی قوت بھی تھی اس کے باوجود وہ مجھے اتنی آسانی سے قابو نہیں کر سکتی تھی لیکن جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہی مجھے تیزی سے بڑھتی کمزوری کا احساس ہونے لگا اور میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں نے زور آزمائی کے بجائے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور نرس کو کہنیاں مارنے لگا مگر پہلی کوشش کی طرح یہ وار بھی کمزور تھا۔

نرس چیخی۔ ”جلدی کرو.... یہ نکل رہا ہے۔“

میں نے ڈاکٹر کی لاش کو ایک طرف دھکیل کر حیات کو اپنی سمت جھپٹتے دیکھا۔ ڈاکٹر یقیناً مر چکا تھا کیونکہ اس کی گردن غیر فطری انداز میں جھول رہی تھی اور اس کا جسم ہموار سے لگا تو سر گھوم کر پیچھے آ گیا۔ حیات نے شاٹ گن میری طرف کر رکھی تھی اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے شوٹ کرنے والا ہے۔ لیکن پاس آنے پر اس نے اس کی نال گھما کر میری بائیں کنپٹی پر رسید کی۔ میرا سر جو پہلے ہی چکرا رہا تھا اس ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے یک دم ہی اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ایسا لگا جیسے میں کسی تاریک دلدل میں اتر رہا ہوں۔ یہ احساس لمحاتی تھا اس کے بعد ہر احساس فنا ہو گیا۔ یہ دو چار ہاتھ لب بام رہ جانے والی بات تھی جب بہت کمزور اور صنف نازک سے تعلق رکھنے والی نرس نے میری جدوجہد کو ناکام بنا دیا اور میں آزاد ہوتے ہوتے دوبارہ قید ہو گیا تھا۔ اگر مجھے اس کی گرفت سے آزادی مل جاتی تو میں حیات کو بھی ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا اور اس سے شاٹ گن حاصل کر لیتا تو اس کے بعد دوسروں کو قابو کرنا زیادہ مشکل نہ رہتا۔ مگر ہر خواہش اور کوشش کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتی ہے۔

☆☆☆

مجھے ہوش آنے لگا تو پہلا احساس شدید تکلیف کا تھا۔ سر میں درد یوں حرکت کر رہا تھا جیسے واٹر بیلون کے غباروں میں پانی حرکت کرتا ہے۔ بہت تیز اور تند انداز میں۔ ایسے ہی درد کھوپڑی کی شاید بہت پتلی ہو جانے والی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کھوپڑی توڑ کر پانی کی طرح بہہ نکلے گا۔ میں نے اٹھنے یا آنکھیں کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ میں درد کے قابل برداشت ہونے کا انتظار کر رہا تھا ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے آنکھ کھولی یا اٹھا تو درد کی شدت مجھے دوبارہ بے ہوش کر دے گی۔ اس وقت مجھ سے سوچا بھی نہیں جا رہا تھا اس لیے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے اور میرے سر پر کیا قیامت گزری ہے؟ شاید اس وقت مجھے اپنی شخصیت بھی یاد نہیں تھی۔ میں سب بھولا ہوا تھا بس درد اور تکلیف کا احساس تھا۔ میں سانس بھی لیتا تو درد بپھر جاتا اس لیے سانس بھی بہت سنبھل کر اور آہستگی سے لے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ درد میں کمی آنے لگی۔

میں سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے سب سے پہلے یہ یاد آیا کہ میں کون ہوں اور پھر یاد آیا کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مجھے آغاز سے دھوکا دیا جا رہا تھا اور اس دھوکے میں ..... ممتاز بھی شامل تھا۔ نہایت چالاکی سے مجھے باور کرایا گیا کہ ہر ہفتے میرے جسم سے صرف نصف لیٹر خون لیا جائے گا۔ مگر اس طرح سے یقیناً نصف لیٹر سے زیادہ ہی خون لیا جا رہا تھا۔ نصف لیٹر تو بہ ظاہر لیا جاتا۔ بیڈ کے اندر خالی حصے میں کوئی پہلے سے موجود ہوتا تھا اور جب میں سیدھا لیٹ جاتا تو وہ چھوٹا سا خانہ کھول کر تھیلی کو نلکی سمیت اندر کھینچ لیتا اور نلکی کو الگ کر کے دوسری تھیلی سے لگا دیتا تھا۔ جب وہ بھر جاتی تو نلکی دوبارہ نصف لیٹر والی تھیلی سے لگا دیتا اور دوبارہ اس کی جگہ لگا کر خانہ بند کر دیتا۔ ڈاکٹر چالاکی سے اسٹاپر کو پورا کھول دیتا تھا اور مجھے علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میرا کتنا خون لیا جا رہا تھا۔ اسی وجہ سے میں دوسری بار ہی خون دے کر کمزوری محسوس کرنے لگا تھا اور تیسری بار تو میں واضح کمزور ہوا تھا۔ اس دن مجھے نہیں معلوم کہ میرا کتنا خون نکالا گیا تھا۔ سر کی چوٹ نے مجھے ویسے ہی کمزور کر دیا تھا اس لیے بھی میں اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ خون نکلنے سے ہوتے

والی کمزوری کتنی ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہر دفعہ میرا ڈیڑھ لیٹر خون نکالا گیا تھا۔ ورنہ پچھلی بار ایک لیٹر خون دینے سے اتنی کمزوری نہیں ہوئی تھی اس لیے لازمی اس سے زیادہ خون لیا جا رہا تھا۔

درد اب قابل برداشت حد میں آ گیا تھا۔ اس لیے میں نے پہلے آنکھیں کھولیں۔ میں ایک تاریک کمرے میں تھا۔ دیواروں کا رنگ کبھی سفید تھا مگر اب میلا ہو گیا تھا۔ چھت پر لکڑی کی بلیوں کے سہارے سیمنٹ شیٹ کی چھت تھی۔ میں ایک کھاٹ نما بستر پر پڑا تھا جس پر پتلا سا گدا تھا اور اس سے ناگوار سی بو اٹھ رہی تھی۔ میری طبیعت ایسی ہو رہی تھی کہ یہ ہلکی سی بو بھی چبھ رہی تھی۔ میں یقیناً ممتاز ہاؤس میں نہیں تھا وہاں اس جیسے کمرے کا تصور بھی محال تھا۔ کمرا بہت چھوٹا سا تھا۔ شاید دس بائی آٹھ کا تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں درد میں اضافے کا خطرہ مول لیے بغیر اٹھ سکتا ہوں تو میں اٹھ بیٹھا اور فوراً ہی لیٹ گیا تھا۔ سر چکرایا تھا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا تھا۔ یقیناً میرا اتنا خون نکال لیا گیا تھا کہ میں کمزوری کا شکار ہوا تھا اور اس کے بعد میری توانائی کیا بحال کی جاتی الٹا مجھے سر پر چوٹ برداشت کرنا پڑی تھی۔ میں نے سر چھوا تو کنپٹی سے کھال پھٹ گئی تھی۔ یہاں ہلکے بال تھے اس لیے چوٹ شدید آئی تھی اور خون بہہ کر جم گیا تھا۔

کچھ دیر میں ہمت کر کے اٹھ بیٹھا۔ اگر میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں لیٹا ہی رہتا۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے آرام کرنا عقل مندی نہیں تھی۔ کھڑا ہوا تو چکر آیا تھا مگر میں نے دیوار کا سہارا لے لیا۔ بستر لکڑی کا تخت تھا جس پر روئی کا پتلا سا گدا بچھا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک طرف چھوٹے سے روشن دان سے دن کی روشنی جھلک رہی تھی۔ روشن دان زمین سے سات فٹ سے زیادہ اوپر نہیں تھا اور تقریباً چھت سے لگ رہا تھا۔ فرش کچے سیمنٹ کا تھا۔ بظاہر یہ جگہ کسی دیہاتی ڈیرے جیسی تھی اور انداز بھی غریبانہ تھا۔ ابھی میری حالت بہتر نہیں ہوئی تھی اور سر کا درد رہ رہ کر اٹھ رہا تھا۔ چکروں میں کمی آئی تھی مگر یہ اب بھی ذہن پر حملہ کر رہے تھے۔ کسی ایڈونچر سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنی حالت بہتر کر لوں۔ اس لیے واپس تخت پر بیٹھ گیا اور سانس کی مشق کرنے لگا۔

اب سوال یہ تھا کہ حیات نے مجھ پر قابو پا لیا تھا تو وہ مجھے کہاں لے آیا تھا اور یہاں کس کی اجازت سے منتقل کیا گیا تھا۔ ممتاز ہاؤس میں قید خانوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جس کمرے میں، میں تھا وہ بھی اچھا خاصا قید خانہ تھا۔ تب مجھے ایسی کسی جگہ منتقل کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ کیا یہ... ممتاز کے حکم سے ہوا تھا؟ اگر وہ مجھے اپنی قید میں رکھنا چاہتا تھا تو کسی اور جگہ بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سانس کی مشقوں سے میری حالت خاصی بہتر ہوئی تھی اور اب میں بہتر طور پر سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہتر ہو رہی تھی مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اس کارروائی میں شاید.... ممتاز کا اتنا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے پس پشت حیات اور وہ ڈاکٹر تھا جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس میں ان کا کیا مفاد تھا تو اس کا جواب بہت سادہ تھا ان کا مفاد نوٹ تھے اور یہ نوٹ انہیں راج کنور سے ملے تھے اس لیے وہ معاہدے سے ہٹ کر میرا زیادہ سے زیادہ خون نکالنے پر راضی ہو گئے تھے اور یہ سارا کام... ممتاز اور مجھ سے چھپا کر کیا جا رہا تھا۔

ان کی بدقسمتی کہ میں نے گڑبڑ بھانپ لی اور پھر اسے دیکھ بھی لیا۔ ڈاکٹر کی وفات نے الگ مصیبت پیدا کر دی ہو گی۔ اس لیے حیات نے مناسب سمجھا کہ مجھے ممتاز ہاؤس سے کہیں اور منتقل کر دے اور یہ کام اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ... ممتاز کا معتمد ترین شخص تھا اور یقیناً ممتاز ہاؤس کے بہت سارے رازوں سے واقف تھا۔ ممکن ہے وہ خفیہ راستے سے بھی واقف ہو جس کے بارے میں بنٹی کا یقین سے کہنا تھا کہ صرف وہی تین اس کے بارے میں جانتے تھے لیکن پہلے بانو اور پھر میری گم شدگی سے واضح تھا کہ کوئی اور بھی اس راستے سے واقف تھا۔ بانو سے مجھے خیال آیا اور میں چونک گیا۔ کہیں بانو کی گم شدگی میں بھی حیات کا ہاتھ تو نہیں تھا۔ وہ جس طرح جم میں بانو کے میرے ساتھ اکیلے ہونے پر خار کھاتا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ شاید اس کی بانو پر نظر تھی اور جب یہ بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے اسے غائب کر دیا۔

حیات کسی طرح یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ میں اس کا پول کھول دوں.... وہ ممتاز کا کتنا ہی معتمد صحیح لیکن اگر وہ غدار نکل آتا تو اس کا انجام عبرت ناک ہی ہوتا۔ اب تک طور پر حیات نے ڈاکٹر کی موت میرے کھاتے میں ڈال کر مجھے مفرور ظاہر کیا ہو گا۔ نرس زندہ تھی لیکن وہ اس کام میں برابر کی شریک تھی اس لیے وہ کسی صورت حقیقت نہیں

بیٹھ گیا۔ کچھ دیر آرام کے بعد میری حالت اتنی بہتر ہو گئی تھی کہ میں روشن دان تک آیا اور دونوں ہاتھ اس کے کنارے پر جما کر خود کو اوپر کیا اور باہر جھانکا۔ اس طرف شاید چھوٹا صحن تھا کیونکہ سامنے ایک دیوار دکھائی دے رہی تھی اور نیچے کچی زمین تھی۔ کچرا سا پڑا تھا جیسے وہاں صفائی معمول نہ ہو اور دیوار بھی کچی مٹی کی تھی۔ اگر یہ کسی احاطے کی دیوار تھی تو یہ بہت معمولی سا ڈیرا تھا۔ شاید مجھے اس لیے یہاں رکھا گیا کہ کسی کا شک اس طرف نہ جائے۔ یہ تو طے تھا کہ اگر میرے فرار کی کہانی سنائی گئی تھی تب بھی... ممتاز کے آدمی مجھے شکاری کتوں کی طرح قرب و جوار کے علاقوں میں تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کی پہنچ سے دور ہی ہوں گا۔ یہ جگہ محفوظ ہو گی اس لیے ہی حیات نے مجھے یہاں رکھا تھا اسے یقین ہو گا کہ نہ تو کوئی مجھے یہاں تلاش کر سکے گا ورنہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں گا۔

میاں ممتاز کے شکاری کتوں کے ساتھ ہی مجھے بیتو کا خیال آیا اور میں جو کسی قدر سکون میں آ گیا تھا پھر سے مضطرب ہو گیا۔ اگر حیات نے میری گم شدگی کو فرار بتایا ہو گا تو اس وقت بیتو اس کی سزا بھگت رہا ہو گا..... ممتاز کے لیے بیتو مجھ پر صرف دباؤ ڈالنے کا ایک حربہ تھا اور اس کی کوئی اور اہمیت نہیں تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور راج کنور سے مفروضہ ڈیل خطرے میں پڑتی تو اس کا انتقام بیتو سے لیا جاتا۔ وہ یقیناً اس وقت مشکل سے گزر رہا ہو گا۔ ممکن ہے... ممتاز نے اسے فوری کوئی تکلیف نہ دی ہو لیکن اگر میں اسے نہ ملتا یا اسے حقیقت کا پتا نہ چلتا تو بیتو اس کے لیے بے مصرف ہو جاتا اور ایسے لوگ بے مصرف قابل اور انسانوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پتا نہیں وسیم اور عبداللہ کی تلاش کہاں تک پہنچی ہو گی یہ بات تو یقینی تھی کہ وہ پوری کوشش کر رہے ہوں گے۔ وسیم اب تک لازمی واپس آ چکا ہو گا میری گم شدگی کا سن کر اس کے لیے حویلی میں بیٹھے رہنا ممکن ہی نہیں تھا اس کا زخم بھی اب بھر گیا ہو گا اس لیے وہ پوری تندہی سے میری تلاش میں ہو گا۔ اگر وہ اب بھی پتا چلا لیں تو کم سے کم بیتو کو چھڑا سکتے تھے۔

میں واپس تخت پر آ کر بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ باہر کی دھوپ سے ایسا لگ رہا تھا کہ سورج مغرب کی طرف جھکنا شروع ہو گیا تھا یعنی دوپہر کے دو یا تین بج رہے تھے اور اس بند کمرے میں کسی قدر گرمی تھی۔ میرے جسم پر وہی لباس اور جوتے تھے جو میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے پہنے تھے۔ کمرے کے باہر اور آس پاس خاموشی تھی۔ میں نے اب تک جو حرکت کی تھی وہ بنا آہٹ کے کی تھی۔ ممکن ہے جیسے میں خاموش تھا اسی طرح کوئی باہر بھی خاموشی سے موجود ہو اور اگر میں کوئی آواز پیدا کروں تو وہ جان جائے کہ میں ہوش میں آ گیا تھا جب کہ میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ سر کا درد بہتر تھا لیکن اب مجھے پیاس لگنے لگی تھی اور ہر گزرتے لمحے اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا۔ خون نکلنے سے میرے جسم میں ویسے ہی پانی کی کمی ہوئی تھی۔ پھر گرم موسم اور سر کی چوٹ، یہ سب مل کر پیاس کو رفتہ رفتہ انتہا کی طرف لے جا رہے تھے۔ مگر میرے پاس سوائے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ پانی حاصل کرنے کے لیے مجھے دروازہ بجانا پڑتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ قید کرنے والوں کو میرے ہوش کی خبر ہو۔ اگر تین بج رہے تھے تو مجھے بے ہوش ہوئے پونے تو گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ مدت کافی سے زیادہ ہوتی ہے اور میری طویل بے ہوشی دیکھنے کے لیے کسی نہ کسی کو آنا تھا۔

مگر ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے یہاں ڈالنے والے جیسے ڈال کر بھول گئے تھے۔ یہاں شاید کوئی نہیں تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا کہ یہاں کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے میں ہتھیار کا کام لے سکوں لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ تخت کیکر اور پڑتل کی لکڑی کا بنا ہوا تھا اور یہ ساری لکڑی نہایت مضبوطی سے آپس میں جڑی ہوئی تھی میں خالی ہاتھ سے تخت سے لکڑی الگ نہیں کر سکتا تھا اگر میں کوشش کرتا تو اس سے بہت شور ہوتا۔ باقی کمرا خالی تھا۔ تخت کے نیچے تاریکی تھی لیکن میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر تسلی کر لی تھی کہ وہاں کچھ نہیں تھا سوائے مدتوں سے جمع ہونے والی گرد کے۔ یہاں شاید صفائی کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے کوٹھری گرد آلود ہو رہی تھی۔ بستر شاید اس لیے صاف تھا کہ استعمال ہوتا تھا ورنہ اس پر بھی مٹی جمی ہوتی۔ مگر گدے سے آتی بو بتا رہی تھی کہ اسے استعمال کرنے والا کوئی گندہ آدمی تھا ورنہ انسان اپنے ذاتی استعمال کی چیز تو صاف رکھ سکتا ہے۔ یہ کوٹھری اور اس کا محدود سامان بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی بہت ہی نچلے طبقے کا فرد رہتا ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں عارضی طور پر یہاں قید کیا گیا تھا۔ ورنہ یہ جگہ باقاعدہ قید خانہ نہیں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں نے دوبارہ روشن دان سے

جھک کر دیکھا تو صحن میں کسی درخت کا طویل ہوتا سایہ نظر آیا۔ اس سے لگ رہا تھا کہ سورج واضح طور پر مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ کچھ دیر میں سورج غروب ہو جاتا اور یہاں اندھیرا چھا جاتا جب کہ یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ کم سے کم اس کوٹھری میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف دیوار سے نکلی ہوئی کھونٹی تھی جس سے شاید لالٹین لٹکائی جاتی ہو گی۔ میں نے احتیاط سے دروازہ ہلانے کی کوشش کی لیکن یہ نہایت مضبوط لکڑی سے بنا دو پٹ کا دروازہ تھا جس میں کہیں خلا بھی نہیں تھا کہ باہر جھانکا جا سکتا۔ اگر اس میں کنڈی لگی تھی تو وہ خاصی بڑی اور مضبوط تھی جس نے دروازے کو مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ رات بہت تیزی سے آئی تھی۔ اندر تو تقریباً تاریکی تھی بس روشن دان سے کسی قدر روشنی چھلک رہی تھی جو ستاروں کی تھی۔ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں اور ابھی چاند نکلا بھی نہیں تھا اس لیے روشنی بہت کم تھی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ کیا مجھے اس جگہ بند کر کے وہ لوگ بھول گئے تھے۔ اتنی دیر میں مجھے نہ تو کسی انسان کی آواز آئی تھی اور نہ کسی جانور کی، بس کبھی کسی پرندے کی آواز آئی تھی۔ ہوا میں نباتات کی مہک تھی۔ مگر کوئی مخصوص خوشبو نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ جگہ کسی ویرانے میں تھی۔ ایک بار میں نے تخت پر کھڑے ہو کر چھت پر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی کس سے مس نہیں ہوئی۔ سیمنٹ کی شیٹ مضبوط تھی لیکن ساتھ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر خاصا بوجھ رکھا ہوا تھا اور اسے اٹھانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ تھک ہار کر میں لیٹ گیا اور اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے سانس کی مشق کرنے لگا۔ اس سے میرے سر درد میں بہت افاقہ ہوا تھا۔ مگر اس قید سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

اچانک ہی ایسا لگا کہ کہیں دور کوئی بول رہا ہے۔ پہلے میں اسے اپنا وہم سمجھا تھا لیکن جب آواز دوبارہ اور واضح آئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ یہ دو افراد تھے۔ ان میں سے ایک بلند آواز میں بول رہا تھا اور دوسرا دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ بلند بولنے والا اسے ڈانٹ رہا تھا کہ وہ نشہ کر کے سو رہا تھا اگر قیدی یعنی میں فرار ہو جاتا تو بابو ان دونوں کی کھال کھینچ لیتا۔ دھیمی آواز والا منمنا کر وضاحت کر رہا تھا۔ یعنی میں یہاں اکیلا نہیں تھا بلکہ ایک عدد نگران تھا اور وہ سو رہا تھا۔ آنے والا کوٹھری کے پاس آیا۔ مگر اس نے کوٹھری کھول کر اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی کہ میں کس حال میں تھا۔

دونوں پنجابی میں بات کر رہے تھے اور مجھے ان کے انداز میں کوئی بات کھٹک رہی تھی۔ آنے والے نے کسی بابو کا ذکر کیا تھا جو ان دونوں کی کھال کھینچ لیتا اگر یہ خاکسار کوشش کر کے یہاں سے شارٹ ہو جاتا۔ مگر میں نے موقع گنوا دیا کر کوشش ہی نہیں کی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یہاں حیات نے قید کیا لیکن یہاں کوئی بابو نکل آیا تھا، وہ حیات کا گرگا تھا۔ اتنا مجھے یقین تھا کہ میری یہاں موجودگی کے پیچھے حیات کا ہاتھ تھا۔ اب پیاس ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ پھر باہر دو افراد کی موجودگی بھی ثابت ہو گئی تھی اور ان کا اندر آنے کا کوئی ارادہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں آزاد ہونے کی ایک کوشش ہی کرتا۔ اس لیے اب میں نے دروازہ بجانے میں کوئی تکلف نہیں کیا اور ایسے بجایا جیسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہوں بلند آواز والا بوکھلا کر آیا۔ ”اوئے کی ہے آرام نال بہہ۔“

”مجھے پانی دو۔“

”کوئی پانی نئیں اے۔“

”تب میں اسی طرح دروازہ بجاتا رہوں گا۔“ میں نے کہا اور پھر دروازہ پیٹنے لگا۔ اگرچہ میرا اپنا دماغ خراب ہو رہا تھا مگر میں مستقل مزاجی سے بجاتا رہا۔ حتیٰ کہ بلند آواز نے چلا کر کہا۔ ”اوئے لاتا ہوں.... بند کر شور۔“

میں نے ہاتھ روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلے گا۔ مگر اس کے بجائے دروازے کے اوپری حصے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی۔ مشکل سے دس بائی سات انچ کی اس کھڑکی کو الگ سے پٹ میں ایک تختہ لگا کر بنا گیا تھا اور پتا نہیں اس کا کیا مقصد تھا بہرحال اس سے اس وقت ایک گلاس سامنے آیا۔ ”لے پانی ہن چپ کر کے بیٹھیں۔“

یہ بڑا سا اسٹیل کا گلاس تھا جیسا کہ عام طور سے گاؤں دیہات میں لسی یا دودھ پینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گلاس کے پیچھے ایک ہاتھ تھا لیکن بندہ کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے فوری پانی نہیں پیا حالانکہ پیاس ایسی تھی کہ میں پورا گلاس ایک بار میں پی جانا چاہتا تھا۔ مگر میں دل پر جبر کر کے چسکی لینے کے انداز میں تھوڑا تھوڑا پینے لگا۔ اگر میں ایک ساتھ پیتا تو عین ممکن تھا خالی پیٹ مجھے الٹی ہو جاتی۔ اس طرح میری پیاس میں کمی آئی اور سر کا درد بھی بہتر ہوا تھا۔ نصف گلاس بچا کر ایک طرف رکھ دیا۔ میں نہ جانے کیسے لوگوں کے قبضے میں تھا جو مجھے بعد میں پانی دیتے بھی یا نہیں۔ پانی پی کر میں نے ایک بار پھر دروازہ بجایا۔ پہلے تو

بولا نہیں ہوا مگر دوبارہ بجانے پر دھیمی آواز والے نے پوچھا۔ ”کی اے تینوں چین نئیں اے۔“

”مجھے یہاں کون لایا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے۔“

”چپ کر کے بیٹھ۔“ اس نے گھرک کر کہا۔ ”ہن بوا بوتھا کیتا۔“

مجھے اس کی زبان میں پھر کوئی بات عجیب لگی تھی۔ مگر اس وقت میں سمجھا نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے اب میں دوبارہ نہیں بولوں گا۔ لیکن اگر کھانے کو کچھ دے سکتے ہو تو دے دو۔“

اس نے جواب نہیں دیا مگر چند منٹ بعد دروازے کے اوپر والی کھڑکی کھلی اور ایک چنگیر اندر آئی۔ جیسے ہی میں نے چنگیر لی کھڑکی بند ہو گئی۔ روشن دان سے آتی ہلکی روشنی میں میری آنکھیں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں مگر پھر بھی چیزوں کو باریکی سے نہیں دیکھ سکتا تھا بس ہیولے سے دکھائی دے رہے تھے اس لیے مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ چنگیر میں کیا ہے؟ میں نے ٹٹول کر دیکھا تو روٹی کے ساتھ کچھ تھا۔ روٹی دیہی انداز کی تھی یعنی موٹی اور تندور کی لگی تھی اور کم سے کم چوبیس گھنٹے کی باسی تھی۔ بہرحال کھانے کے قابل تھی۔ پھر اچار کے ساتھ اس نے مزہ دیا تھا۔ جب میں نے کھانا شروع کیا تو مجھے پتا چلا کہ میں کس قدر بھوکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں منتقل ہو گئی تھیں۔ کھا کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور تخت پر دراز ہو گیا۔ حالات کے بارے میں سوچنا بے کار تھا جو ہونا سامنے آ جاتا۔ ایک بار میں نے کھڑکی والے حصے پر زور آزمائی کی لیکن وہ بھی دروازے جتنی مضبوط ثابت ہوئی تھی۔

نصف رات کو میری پیاس سے آنکھ کھلی تو اس نصف گلاس پانی نے مجھے سہارا دیا تھا۔ اگر میں آغاز میں اسے پی لیتا تو اس وقت مارے پیاس کے مجھے دوبارہ نیند نہیں آتی۔ نیند نے میری طبیعت کو تقریباً ٹھیک کر دیا تھا۔ جب میں صبح کے قریب اٹھا تو میرے سر کا درد ختم ہو چکا تھا اور اب کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بھوک پیاس کا احساس بھی ابھی قابو میں تھا۔ روشن دان سے باہر صبح کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ سورج نہیں نکلا تھا مگر نکلنے والا تھا۔ میرے سر کا زخم خشک ہو رہا تھا البتہ خون کے ٹکڑے جمے ہوئے تھے اور انہیں صاف کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ مجھے یہاں قید رکھنے والے یا تو نہایت بے حس اور انسانیت سے عاری لوگ تھے یا پھر وہ اتنی عجلت میں تھے کہ انہیں

قرون وسطیٰ میں سقوط بغداد (تیرہویں صدی عیسوی) میں اسلامی تہذیب و تمدن اپنے عروج پر تھا۔ خصوصاً علمی و سائنسی میدانوں میں دور دور تک مسلمانوں کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ دنیا و آخرت دونوں پر مسلمانوں کی نظر تھی اور ان دونوں کو بہتر بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ گارے اور گھاس کے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ ان کی گلیاں غلیظ اور جابجا گندے جوہڑوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سیاست، حکومت، تمدن اور تہذیب کا کوئی تصور سرے سے وہاں موجود نہ تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن تباہ ہو چکے تھے۔

اس وقت مسلمان اٹھے اور انہوں نے صرف ایک صدی میں ہندوستان سے فرانس اور چین سے افریقا تک کے علاقوں میں ایک ہی ثقافت وارد کر دی، جس کی ابتدا کلمہ طیبہ سے، اللہ اکبر کے سائے میں اور انجام السلام علیکم تھا۔ مسلمانوں نے جابجا مساجد بنائیں۔ جن کا طرزِ تعمیر دیگر معابد سے جدا مگر ہر مقام پر ایک جیسا تھا۔ انہوں نے علم و فن کے بڑے بڑے مراکز قائم کیے۔ یونانی، رومی، ہندی اور چینی علوم کو جمع کر کے مرتب کیا۔ نئے نئے نظریات پیش کیے اور نئی نئی دریافتیں کیں۔ جابجا کتب خانے اور درسگاہیں قائم کیں۔ شفا خانے بنوائے، سڑکیں نکالیں، نہریں کھودیں، باغات لگوائے، گلیوں کو پختہ کیا، رات کو روشنی کا انتظام کیا۔ پل اور تالاب بنائے اور دنیا کو ایسی حسین تعمیرات سے بھر دیا، جن کے امتیازی اوصاف چمک، روشنی، صفائی، کشادگی، نقاشی، مصوری، سنگ مرمر کا کام، محراب و منبر و مینار، تالاب اور فوارے تھے۔

مرسلہ: انور جدون، کوٹری

میرے زخم کو صاف کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ مجھے یہاں ایسے ہی ڈال کر چلے گئے تھے۔ مجھے سات آٹھ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا اور اس دوران میں مجھے ممتاز ہاؤس سے سیکڑوں میل دور لے جایا جا سکتا تھا۔

مجھے دوسری بات درست لگ رہی تھی کیونکہ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو لازمی بات ہے ان لوگوں کو میرے خون کی مزید ضرورت تھی اور وہ مجھے جسمانی طور پر کمزور کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ یقیناً کوئی ایسی مجبوری تھی کہ وہ مجھے یہاں بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر اسی کوٹھری میں محدود رکھنا تھا کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس سے باہر نکال کر مجھ پر قابو رکھتے۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ صرف یہی کوٹھری مجھے قید رکھ سکتی تھی۔ کیونکہ کھانا پانی بہت کم میرے پیٹ میں گیا تھا اس لیے ابھی تک اخراج کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا مگر میں نے اس کا شور کرنا مناسب سمجھا اس طرح شاید مجھے باہر جانے کا موقع ملتا۔ میں نے دروازہ بجایا تو اسی دھیمی آواز والے نے غنودگی کی کیفیت میں پوچھا۔ "ہن کی اے؟"

میں نے اسے دیہاتی زبان میں بتایا کہ مجھے کیا تکلیف تھی اور اس کے لیے مجھے یہاں سے باہر نکالنا ضروری تھا مگر اس نے انکار کر دیا۔ "اندر ہی کر لے۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" میں نے بھنا کر کہا۔ "یہاں کچھ کیا تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔"

"نہیں ہوگا۔" وہ بدستور پہلے کے سے انداز میں بولا۔ اس نے کوئی نشہ کر رکھا تھا۔ "میں نہیں کھول سکدا، باہر تالا پیا اے، چابی میرے کول نہیں اے۔"

"اچھا مجھے پانی اور کچھ کھانے کو تو دو۔"

اس نے کھڑکی کھولی۔ "گلاس دے، میں پانی لے آواں، پر ہن کھانے کو کج نہیں اے۔"

میں نے اسے گلاس تھمایا تو اس نے بھر کر پانی لا دیا۔ میں نے اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک طرف تھا۔ مجھے بس ایک جھلک دکھائی دی۔ وہ سیاہی مائل شخص تھا۔ چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس بار بھی میں نے بہت احتیاط سے پانی پیا۔ اس لیے نہیں کہ پانی ملنے کا امکان نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ اخراج کے مسئلے کو تا دیر ٹالا جا سکے۔ میں نے پتلون کی جیب ٹٹولی تو اتفاق سے اس میں رکھا ہوا رومال نکل آیا۔ میں نے اسے پانی سے بھگویا اور اپنی کن پٹی پر جما خون صاف کرنے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد اندر کا زخم تقریباً خشک ہو گیا تھا صرف اوپر خون جما ہوا تھا۔ وہ صاف ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب زخم بھی قابلِ توجہ نہیں رہا ہوگا۔ کوئی غور سے دیکھتا تو اسے محسوس ہوگا ویسے بھی وہ بالوں تلے تھا۔ اس موالی نے خوشخبری سنا دی تھی کہ اب کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں مزید کی توقع نہ رکھوں۔ بہرحال دو بڑی تندوری روٹیاں کھانے کے بعد اب میں شام تک رہ سکتا تھا۔

میں دوبارہ لیٹ گیا اور آرام کرنے لگا۔ جب ذہن پر سوچوں کی یلغار ہوتی تو سانس کی مشق کرتا اس سے ذہن پُرسکون ہو جاتا۔ روشن دان سے باہر روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ صبح دروازہ بجانے پر موالی کے آنے سے لگ رہا تھا کہ بلند آواز والا یہاں نہیں تھا۔ شاید وہ صرف دیکھنے آیا تھا اور رات کو ہی یہاں سے چلا گیا تھا۔ اب یہاں موالی چوکیدار کے طور پر موجود تھا۔ مجھے یہاں بند کرنے والوں کو یقین تھا کہ میں کسی صورت یہاں سے نہیں نکل سکوں گا سوائے اس کے کوئی میری باہر سے مدد کرے اور باہر سے مدد کے امکانات کو ختم کرنے کے لیے ہی مجھے یہاں رکھا گیا تھا۔ اب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ باہر میری تلاش جاری تھی اور شاید اس کھنڈر نما احاطے کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا ہوگا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر..... ممتاز کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوتے تو وہ مجھے لاہور جانے والی سمت میں تلاش کرتے کیونکہ آزاد ہوتے ہی میں شہر جانے کی کوشش کرتا۔ تاکہ اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر سکوں۔

میرا ذہن الجھنے لگا۔ اگر مجھے..... ممتاز سے بچانے کے لیے یہاں رکھا گیا تھا تو اب خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اگر یہ نہیں تھا تو پھر ان لوگوں کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ جب میں لیٹے لیٹے تھک گیا تو اٹھ کر کوٹھری میں چہل قدمی کی کوشش کی۔ اسے کوشش ہی کہا جا سکتا تھا یہاں چہل قدمی کی گنجائش نہیں تھی۔ میں دروازے کے پاس تھا تو مجھے لگا جیسے باہر کوئی دور سے کچھ کہہ رہا ہو۔ آواز باریک سی تھی مگر میں نے سنی تھی۔ میں نے دروازے سے کان لگا دیا۔ آواز بس ایک لمحے کو آئی تھی۔ اگر یہ سچ مچ کسی کی آواز تھی تو اسے دوبارہ آنا چاہیے تھا۔ مگر جب کئی منٹ گزرنے کے باوجود آواز نہیں آئی تو میں نے دروازے سے سر ہٹانا چاہا اور اسی لمحے مجھے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"خدا کے لیے مجھے پانی دو۔"

آواز بہت مدھم اور دور کی تھی لیکن الفاظ صاف سنائی دیے تھے۔ میں شناخت نہیں کر سکا کہ آواز بانو کی تھی یا نہیں کیونکہ اس میں ایک تھکن اور درد والی کیفیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ پھر وہ پوری قوت سے بول رہی تھی اور ایسے میں آواز کا بدل جانا لازمی تھا۔ بانو کا ذکر میں نے یوں کیا کہ یہ آواز سنتے ہی میرے ذہن میں بانو کا خیال آیا تھا۔ وہ بھی پُراسرار طرح غائب تھی۔ اس لیے یہاں اس کی موجودگی بھی ممکن تھی۔ مجھے پہلے بھی حیات پر شبہ تھا کہ بانو کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ تھا اور وہ جس طرح مجھے ممتاز ہاؤس سے نکال کر لے گیا تھا اس سے یہ شبہ تقریباً یقین کو پہنچ گیا تھا۔ اسی لیے عورت کی آواز سنتے ہی مجھے بانو کا خیال آیا۔ میں واپس آتے آتے رک گیا اور دوبارہ کان دروازے سے لگا دیا۔

عورت کی آواز سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ خاصی دور تھی۔ میرا نہیں خیال تھا کہ یہ احاطہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں کسی اور کو بھی رکھا جاتا ہو۔ یہ تاثر کوٹھری کا سائز اور روشن دان سے نظر آنے والے صحن سے آیا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ احاطہ خاصا بڑا ہوتا اور اس میں کہیں اور بھی تعمیرات ہوں۔ جہاں کسی اور کو رکھا جا سکتا تھا۔ عورت کی آواز پھر نہیں آئی مگر اس کے ایک جملے سے واضح تھا کہ وہ تقریباً میری جیسی صورت حال سے دوچار تھی اور شاید اس کا کھانا پانی بھی بند تھا۔ یہاں پانی تھا مگر موالی کو اٹھ کر دیتے ہوئے موت آتی تھی۔ کھانے کا اس نے منع کر دیا تھا اور اس کا کسی صورت پتا نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا اسے لاتے ہوئے بھی موت آ رہی تھی۔ میں نے بے شک شور مچا دیا تھا مگر اس عورت میں شاید اس کی جرأت نہیں تھی اور وہ صرف فریاد کر رہی تھی۔ جب دوبارہ اس کی آواز نہیں آئی تو میں بھی آ کر بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر ہو چکی تھی اور رات کا کھانا ہضم ہو چکا تھا۔ میرے معدے نے فریاد شروع کر دی تھی مگر یہ اب بلند نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے شور کرنا مناسب سمجھا۔ دروازہ بجانے پر موالی آیا اور خفگی سے بولا۔ "تینوں [illegible] اے۔"

"مجھے کچھ کھانے کو دو ورنہ میں اسی طرح شور کرتا رہوں گا۔" میں نے ممکنہ حد تک بلند آواز میں کہا۔

"ہن کج نہیں لبے۔"

"نہیں ہے تو منگواؤ، ورنہ میں دروازہ بجاتا رہوں گا۔"

"میں سر توڑ دیاں گا۔"

"اس کے لیے تمہیں اندر آنا پڑے گا اور ایک بار تم اندر آ گئے تو تمہارا صرف سر نہیں توڑوں گا میں گردن بھی توڑ دوں گا۔"

"او میرے پیو، میں وی بھوکا واں۔" اس نے عاجزی سے کہا۔

"تم یہاں اکیلے ہو؟"

وہ محتاط ہو گیا۔ "توں کیوں پچھ ریا اے؟"

"میں نے ابھی کسی عورت کی آواز سنی تھی وہ پانی مانگ رہی تھی۔"

"اس نوں وی پانی دے دیتا اے۔"

"تم یہاں چوکیدار ہو؟"

"آہو۔" وہ جان چھڑانے کے انداز میں بولا۔ "ہن مینوں تنگ نہ کریں۔"

"تم اس عورت کو جانتے ہو۔"

"نہیں جی اس نوں وی تیری طرح لائے سی۔"

"کون؟"

اس نے صاف انکار کیا۔ "اے میں نہیں دس سکدا۔"

"اچھا لڑکی نے نیلی فراک پہنی ہے جس پر پیلے پھول کاڑھے ہوئے ہیں؟"

وہ حیران ہوا۔ "تینوں کیویں پتا چلیا۔"

"وہ میری ساتھی ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے تم غریب آدمی لگ رہے ہو ہمیں یہاں لانے والے جرائم پیشہ ہیں۔ اگر کوئی مصیبت آئی تو تم مارے جاؤ گے اور یہ بچ جائیں گے۔"

"کیسی مصیبت؟" وہ فکرمند ہو گیا۔

"فرض کرو ہمیں چھڑانے کے لیے یہاں پولیس نے چھاپا مارا تو تم ہی پکڑے جاؤ گے۔"

"میں کیوں۔" وہ بدکا۔

"کیونکہ تم ان کے ساتھی ہو۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ جگہ کہاں ہے؟"

"تو نہیں جاندا؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا ویسے یہ ... ممتاز کا علاقہ ہے؟"

وہ حیران ہوا۔ "کون ... ممتاج؟"

"تم میاں ممتاز کو نہیں جانتے وہ بہت بڑا جاگیردار ہے۔"

"اچھے کوئی.... ممتاج نہیں اسے۔" اس نے صاف انکار کیا۔

اس کا مطلب تھا کہ مجھے کسی بہت دور دراز جگہ لایا گیا تھا۔ امکان یہی تھا کہ میں لاہور کی حدود سے باہر تھا۔ بھی سوالی کو.... ممتاز کا علم نہیں تھا ورنہ دیہات میں عام طور سے لوگوں کو چالیس کوس تک پائے جانے والے تمام مشہور افراد کی پوری ہسٹری مع خاندانی تاریخ کے زبانی یاد ہوتی تھی۔ جب کہ یہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اس خیال سے ایک سوال اور پیدا ہوا کہ اگر مجھے اتنی دور لے آیا گیا تھا کہ یہاں.... ممتاز کے آدمی نہیں پہنچ سکتے تھے تو پھر اس طرح رکھنے کا کیا جواز تھا؟ اگر حیات راج کنور کے لیے کام کر رہا تھا تو مجھے اس طرح رکھنے کا جواز نہیں تھا۔ اگر وہ.... ممتاز سے بچا رہا تھا تب بھی ضروری نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی تھی کہ حیات مجھے انتقاماً یہاں لے آیا تھا۔ وہ خود بانو کے چکر میں تھا اور اس کے خیال میں میرے بانو سے غلط قسم کے تعلقات تھے۔ اسی لیے بانو اسے جم سے نکال کر میرے ساتھ وہاں رہ جاتی تھی۔ مگر یہ بھی ایک مفروضہ تھا اور یہاں قید رہ کر میں صرف مفروضے قائم کر سکتا تھا حقیقت اپنے وقت پر میرے سامنے آتی۔

اب مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ آج تک میرے کسی دشمن نے مجھے اتنی بے نیازی سے قید نہیں کیا تھا کہ پلٹ کر پوچھنا ہی بھول جائے۔ ایسا لگ رہا تھا مجھے قرنطینہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس قید میں مجھے سوائے بھوک پیاس کے اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ مگر اب میں اس سے نکلنا چاہتا اور اس کے لیے باہر موجود کسی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ ان حالات میں ہونا وہی تھا جو میرے دشمن چاہتے یا جو انہوں نے میرے لیے سوچ رکھا تھا۔ دن ڈھلنے لگا۔ دوپہر کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکا۔ روشن دان کے دائیں طرف مغرب کی سمت تھی اور بائیں طرف مشرق کی سمت تھی۔ اگرچہ مجھے اس معلومات کا فائدہ نہیں تھا جب تک میں آزاد نہ ہو جاتا۔

آج بھی ابھی تک کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جس سے اس جگہ کے بارے میں کچھ اندازہ ہوتا۔ مجھے یاد تھا کہ کل جب بلند آواز والا آیا تھا تب بھی کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جسے مشینی انجن کی آواز سمجھا جاتا۔ وہ پیدل آیا تھا یا سائیکل تھا کسی خاموش سواری پر آیا تھا۔ اگر وہ کسی گھوڑے یا جانور پر آیا تھا تب بھی اس نے اسے یہاں سے دور چھوڑا تھا۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ اب سانس کی مشق کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ بہت کم محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی میں ایسے صبر آزما مواقع سے دوچار ہوا تھا۔ شاید خون نکالنے سے میں کمزور ہوا تھا اور جب انسان کا جسم کمزور ہوتا ہے تو اس کے اعصاب خود بہ خود کمزور ہو جاتے ہیں۔ ویسا انسان اسی وجہ سے زیادہ غصہ کرتا ہے۔ اوپر سے ان لوگوں کا رویہ بھی ایسا تھا۔ یہ مجھے کسی بوری کی طرح یہاں ڈال کر بھول گئے تھے۔ جب مجھے اپنی جھنجلاہٹ کا احساس ہوا تو میں اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اپنا ذہن موجودہ معاملے سے ہٹانے کے لیے اپنے ساتھیوں اور پیاروں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ یہ حربہ بہتر رہا۔ خاص طور سے جب سوچوں کا رخ سویرا کی طرف آیا۔ پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ وقت کس طرح گزر گیا تھا۔

باہر سے آتی آوازوں نے مجھے چونکایا۔ باہر تاریکی چھا رہی تھی اور کوٹھری کے اندر تاریکی چھا چکی تھی۔ بمشکل معمولی سا نظر آ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ اس بار بولنے والوں کی تعداد دو سے زیادہ تھی اور پھر ان میں حیات کی آواز سن کر میری رگوں میں خون تیز ہو گیا تھا۔ وہ سوالی اور بلند آواز والے سے بات کر رہا تھا۔ شاید وہ ان سے رپورٹ لے رہا تھا کیونکہ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سوالی دبی زبان میں اسے بتا رہا تھا کہ اس دوران میں میں نے کیا کیا۔ پھر حیات نے حکم دیا۔ "اسے نکال کر لاؤ۔"

چند لمحے بعد دروازے پر آہنی کھٹ پٹ ہوئی اور کنڈی کھل گئی۔ دروازہ کھلتے ہی جیسے روشنی کا سیلاب اندر آیا تھا کیونکہ سورج اسی سمت میں غروب ہونے والا تھا اور اس کی آخری کرنیں براہ راست کوٹھری میں گھس آئی تھیں۔ چند لمحے کے لیے میری آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ جب میں کسی قدر دیکھنے کے قابل ہوا تو میں نے دو افراد کو سامنے پایا جن کی داڑھیاں بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھیں اور سر پر انہوں نے مخصوص ساخت کی پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ میں چونک گیا کیونکہ وہ سکھ تھے۔ اب میں سمجھا کہ مجھے ان کی زبان کیوں عجیب لگ رہی تھی وہ سکھوں والی پنجابی بول رہے تھے جو ہماری پنجابی سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے۔ یہ فرق الفاظ سے زیادہ بولنے کے انداز کا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹی نال والا بڑا ہتھیار رکھا تھا۔ اعشاریہ اڑتیس کا بڑا

ہی چند مہلک ترین ہینڈ گنوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بلند آواز والا تھا اس نے مجھے حکم دیا۔ "باہر آؤ۔"

میں آنکھوں پر ہاتھ رکھتا ہوا باہر آیا۔ میری توقع کے خلاف یہاں بہت بڑا کچا احاطہ تھا اور میں جس کوٹھری میں قید تھا وہ اس احاطے میں بالکل الگ تھلگ تھی۔ اس کے تین طرف میں بلند قامت درخت تھے اور دور شمال طرف چند جھگیاں اور نظر آ رہی تھیں، درمیان میں درختوں تلے کئی چارپائیاں پڑی تھیں، اس کے علاوہ یہ احاطہ بالکل خالی تھا جو کم سے کم دو کنال رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی سمت احاطے میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا دروازہ تھا۔ چارپائیوں پر حیات کے ساتھ اس کا وہی ساتھی موجود تھا جو ممتاز ہاؤس میں میری نگرانی کرتا تھا۔ گویا وہ غداری میں حیات کے ساتھ شریک تھا۔ لازمی بات تھی حیات اکیلا نہیں تھا۔ تو اور مجھے وہاں سے بہ حفاظت اور کسی کی نظروں میں لائے بغیر نکالنے کے لیے اسے یقیناً کئی افراد کی مدد حاصل رہی ہوگی۔ ممکن تھا کہ اس سانولے رنگ کے شخص کے علاوہ بھی وہاں اس کے کئی ایک ساتھی ہوں۔ بلند آواز والے نے مجھے لے جا کر حیات کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں میرا جائزہ لیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کیا حال ہیں سورما...؟"

"اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں بھی رکھے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم لوگ اپنے اللہ کا ذکر بہت کرتے ہو۔" اس کے انداز میں طنز مزید بڑھ گیا تھا۔

میں چونکا۔ "کیوں تمہارا اللہ نہیں ہے؟"

اس نے میرا سوال نظر انداز کیا اور بولا۔ "تمہیں پتا ہے کہ تم کہاں ہو؟"

الفاظ سے زیادہ اس کے انداز نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا تھا اور میرے اندر ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ سکھوں کو دیکھ کر مجھے پہلے ہی خدشہ محسوس ہونے لگا تھا مگر اب یہ شبہ یقین کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے حیات مجھے مزید دبانے کی کوشش کرتا میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ہاں شاید میں انڈیا میں کہیں ہوں۔"

حیات نے حیرت سے دیکھا۔ "تمہیں پروا نہیں ہے کہ تم اب سرحد کے اس طرف ہو۔"

اگرچہ مجھے ننانوے فیصد یقین ہو گیا تھا لیکن حیات نے تصدیق کر کے اسے سو فیصد کر دیا کہ میں انڈیا میں ہی

رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب "تشکیل انسانیت" میں لکھتا ہے کہ عربوں کے ہاں اتنے نفیس سوتی، اونی اور ریشمی لباس تھے جنہوں نے نیم عریاں لوگوں کو لباس کا شوقین بنا دیا۔ پروفیسر براؤن "تاریخ ادبیات عربی" میں لکھتا ہے کہ سلاطین علما اور فضلا کی پیروی کیا کرتے تھے۔ دنیا کا سب سے پہلا باقاعدہ تعلیمی نظام "نظامیہ" کا تھا جسے نظام الملک نے مرتب کیا تھا۔ بغداد میں نظامیہ سلسلے کے تحت تیس کالج تھے۔ یہی حال اسپین کا تھا۔ ڈاکٹر ڈریپر، معرکہ مذہب و سائنس، میں لکھتے ہیں کہ جب یورپ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا تو قرطبہ اور غرناطہ کی درسگاہوں میں حصول علم کے بڑے بڑے فانوس جگمگا رہے تھے۔ کتب اکٹھی کرنے کا جنون مسلمانوں میں عام تھا۔ سلاطین اور امراء تو کیا عام مسلمان بھی کتابوں کا ذخیرہ کرنا ثقافت و تہذیب کا جزو سمجھتا تھا۔ "الفہرست" میں ابن ندیم لکھتا ہے کہ بغداد میں محمد بن حسین ابی بعرہ کا کتب خانہ لاجواب تھا۔ یاقوت حموی "معجم البلدان" میں رقمطراز ہے کہ سلطان بہاء الدولہ کے وزیر ابو نصر سابور کے کتب خانے سے بہتر کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ الفخری کے بقول آخری عباسی خلیفہ مستعصم کے وزیر موید الدین کی ذاتی لائبریری دس ہزار کتب پر مبنی تھی۔ تبریزی کے بقول خلفائے فاطمی کے ہاں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ اور ڈاکٹر ڈریپر کے بقول جب نوح بن منصور سامانی نے صاحب بن عباد کو وزارت کی دعوت دی تو اس نے چار سو اونٹ کتابیں اٹھانے کے لیے طلب کیے۔ "تمدن عرب" کا مصنف لیبان لکھتا ہے کہ جب منگولوں نے اہل بغداد کی کتابیں دریائے دجلہ میں پھینکیں تو وہاں ایک پل سا بن گیا جس پر لوگ پیدل چل سکتے تھے۔ اور دریا کا پانی سیاہی گھلنے سے کالا ہو گیا۔ ہمارے باہمت اسلاف کی تصانیف کی تعداد سو سے اوپر ہے۔ مثلاً امام غزالی دو سو، ابن عربی اڑھائی سو، ابن تیمیہ پانچ سو، جلال الدین سیوطی ساڑھے پانچ سو اور ابن طولون دمشقی ساڑھے سات سو کتابوں کے مصنف تھے۔ ہالینڈ کی ایک فرم ای جے برل نے کئی ہزار عربی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ڈریپر، رابرٹ بریفالٹ، لیبان، فلپ ہٹی، نکلسن، براؤن، ول ڈیوران، آرنلڈ، چارلس مور اور اسکاٹ وغیرہ ایسے کئی مستشرقین ہیں، جنہوں نے اس امر کے دستاویزی ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔

مرسلہ: ناصر حسین زیدی، ملتان

تھا۔ "اگر میرے پروا کرنے سے میں واپس اس طرف جا سکتا تو تم مجھ سے زیادہ پریشان کسی کو نہ پاتے۔"

"یہاں تمہارے خلاف بے شمار مقدمات ہیں۔" اس نے ڈرانے والے انداز میں کہا۔ "ہر کیس میں تم کو کم سے کم سزائے موت ہوگی۔"

"یہاں پاکستانیوں کو بغیر کسی جرم کے بھی سزائے موت ہو جاتی ہے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "اس لیے مجھے ڈرانا بیکار ہے۔ دو میں سے ایک ہی بات ہوگی یا تو میں یہاں سے بچ کر واپس چلا جاؤں گا یا نہیں بچ سکوں گا۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی ہے۔"

میں حیات اور اس کے ساتھیوں کے سامنے خود کو بے خوف ظاہر کر رہا تھا اور درحقیقت مجھے خوف نہیں تھا کیونکہ جو میں نے کہا تھا وہ الفاظ نہیں میرا ایمان تھا لیکن میں فکرمند ضرور ہو گیا تھا۔ جس جگہ اتفاقیہ آنے کے بعد میں کتنے جتن کر کے نکلا تھا ایک بار پھر ایک غدار کی وجہ سے وہیں آ پھنسا تھا۔ حیات نے صرف ... ممتاز سے غداری نہیں کی تھی اس نے اپنی زمین سے بھی غداری کی تھی۔ غداروں کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے لیکن فی الحال وہ مزے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ "تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا ہوں؟"

"ظاہر ہے تم راج کنور کے زرخرید ہو اور یہاں اسی کے لیے مجھے لائے ہو۔ وہاں بھی میرا خون لیا جا رہا تھا اور یہاں بھی تم میرا خون نکالو گے۔"

"اور اس کے بعد...؟" اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"اس کے بعد.... مجھے کسی بھارتی ایجنسی کے حوالے کر دیا جائے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تمہیں خوف نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں ہے، جب کہ میں جانتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں جنگل کے درندے بھی رحم دل ہوتے ہیں۔ مگر سوال وہی ہے خوف زدہ یا پریشان ہونے سے میری بچت ہو جائے گی؟"

حیات کے علاوہ اس کے دو ساتھی بھی مسلح تھے۔ انہوں نے اپنے ہتھیار ریڈی پوزیشن میں رکھے تھے۔ گویا وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔ صرف موالی خالی ہاتھ تھا اور اس کی شاید کوئی حیثیت نہیں تھی اگر میں اس پر قابو پا بھی لیتا تو اس کے مرنے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بے خوفی سے وہ دونوں سکھ متاثر ہوئے تھے خاص طور سے موالی جو اب مجھے قابل تحسین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ... نے کہا۔ "البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی ہے؟"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے مجھے یہاں کیوں رکھا گیا ہے اب تک تو مجھے کنور خاندان کے کسی زندان میں ہونا چاہیے تھا۔"

"جلد ایسا ہی ہوگا۔" حیات نے کہا۔ "اصل میں مجھے ممتاز ہاؤس کے معاملات نمٹا کر آنے میں کچھ وقت لگا ہے۔"

"وہاں کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "ویسے میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر کی موت اور میرے فرار کا الزام مجھ پر لگا کر تم صاف بچ گئے ہوگے۔"

وہ مسکرایا۔ "اتنی آسانی سے نہیں ..... ممتاز نے مجھے بھی رگڑ دیا تھا۔ مجھے ایک مصنوعی زخم بھی بنانا پڑا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح جان چھوٹ گئی۔" اس نے اپنی قمیص کی آستین الٹ کر زخم دکھایا جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ "تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے اس طرح غائب ہونے سے .... ممتاز کس طرح تلملا رہا تھا۔" اب اس کے لہجے میں .... ممتاز کے لیے کوئی احترام نہیں تھا جب کہ ایک وقت اس نے مجھے کہا تھا کہ میں .... ممتاز سے بے پروائی سے بات نہ کروں۔

"مگر تم یہاں ہو، اس طرح غائب ہونے سے بڑے صاحب کو شک نہیں ہوگا؟"

"ہوتا رہے اب مجھے واپس تو نہیں جانا ہے۔" اس نے شانے اچکائے۔

"میرے ساتھی کا کیا ہوا؟"

"وہ .... ممتاز کے پاس ہے اسے دوسری جگہ رکھا گیا تھا اور وہاں بندے میرے قابو میں نہیں تھے اس لیے اسے نہیں لا سکا ورنہ اسے بھی لے آتا۔"

"اسے کیوں؟"

"وہ بھی کنور جی کا مجرم ہے۔ باغی قبائل سے تعلق رکھتا ہے۔"

میں نے سکون محسوس کیا کہ وہ جیتو کو لانے میں ناکام رہا تھا ورنہ اسے یہاں سوائے موت کے اور کچھ نہ ملتا۔ راج کنور اسے فوری سزا دیتا البتہ مجھے وہ زندہ رکھنے پر مجبور ہوتا۔ اگرچہ ممتاز سے بھی امید نہیں تھی کہ وہ جیتو سے کوئی اچھا سلوک کرے گا یا اسے آزاد کر دے گا مگر یہاں

...ی ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بلاوجہ اس ... نہیں نکالا گیا تھا۔ شاید حیات مجھے لے جانے ... تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب وہ اٹھ کھڑا ہوا ... اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ "اس کے ہاتھ پشت پر ...

... تین گنوں کے سامنے مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ... میرا خیال تھا کہ وہ رسی سے ہاتھ باندھیں گے لیکن ... نے جدید ترین اسٹیل اور نائلون کی بنی ہوئی ... میرے ہاتھ میں ڈال دیں۔ پھر ایسی ہی بیڑیاں ... میں ڈالیں۔ ان کے درمیان ایک فٹ کی نائلون کی ... میں زیادہ قدم اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔ جب مجھے ... تو حیات نے موالی کو حکم دیا۔ "اسے بھی لے آ۔"

موالی سچ مچ موالی ہی لگتا تھا وہ دبلا پتلا لیکن لمبا اور ... سکھ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کئی مہینوں سے نہیں ... اس کے پاس سے بدبو آ رہی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر ... کہ اسی نے مجھے کھانا پانی دیا تھا۔ شکر ہے کھانے ... کوئی چیز نہیں تھی ورنہ وہ حرام ہوتی اور مجھے کیا ... کہ میں کہاں تھا اس لیے میں تو کھا لیتا۔ وہ کوٹھریوں کی طرف گیا تو مجھے عورت کا خیال آیا جس ... کی آواز آئی تھی۔ موالی نے لباس کی حد تک ... تھی کہ وہ بانو ہی تھی مگر پھر بھی ایک شبہ باقی تھا ... تصدیق ہونا باقی تھی۔ حیات نے شاید اسے لانے کا ... تھا۔ میری نظر کوٹھریوں کی طرف تھی۔ موالی نے ... کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ موالی نے اندر موجود ... سے پکڑ کر باہر نکالنا چاہا تو وہ خوف سے چلانے ... مجھے ... کتے .... ذلیل۔"

... میں واضح پہچانا۔ وہ بانو ہی تھی۔ موالی اسے ... باہر لایا اور حیات کے پاس لا کر ہلکا سا دھکا دیا۔ وہ ... گرنے لگی تھی کہ حیات نے اسے سنبھال لیا۔ مگر اس ... جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ وہ زہریلے لہجے میں ... ہاتھ نہ لگاؤ مجھے۔"

... نے برا نہیں مانا اور ہنس کر بولا۔ "اچھا نہیں ... تجھے ہر طرح سے ہاتھ لگاؤں گا اور تو مجھے نہیں ...

... حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ بھوکی تھی شاید ... کھانا پانی نہیں دیا جا رہا تھا۔ مسلسل خوف اور ... اس کے چہرے کی رونق ختم کر دی تھی اور ...

مسلمان وہ پہلے لوگ تھے، جنھوں نے سائنس پر کما حقہ، توجہ دی۔ بقول رابرٹ بریفالٹ سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے، پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں۔ جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور اسالیب کو رائج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے علمی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ مگر بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق مختصراً یہ کہ انھوں نے روشنی، نظر، کسوف، خسوف، بادوباراں، حیوانیات، نباتات، خواص اشیاء وغیرہ پر لاتعداد کتب لکھیں۔ گندھک اور شورے کا تیزاب بنایا۔ الکحل سے کام لیا۔ جرثقیل کے قوانین پہ روشنی ڈالی۔ مائعات معادن اور سیماب وغیرہ کا وزن معلوم کیا۔ تیز پہاڑوں اور سمندروں کے ذخائر پر بحث کی۔

طب میں اسلام نے ہزارہا علما پیدا کیے۔ جبریل بن بختیشوع یوحنا بن ماسویہ، الکندی رازی، ابن سینا، ابوالقاسم، ابن زہر، ابن خطیب اور ابن رشد جیسے سیکڑوں طبیبوں نے علم طب کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے کہ چیچک کا ٹیکا اور آپریشن کے کئی طریقے مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔

فلسفہ اور دیگر علوم مابعد الطبیعیات میں مسلمانوں نے بیش قیمت اضافے کیے۔ یورپ میں صدیوں تک الکندی، ابن رشد، جاحظ، ابن طفیل، امام غزالی اور ایسے کئی مسلمان مفکرین کا فلسفہ پڑھایا جاتا رہا۔ ریاضی میں عمر خیام، خوارزمی، ابو لوفا، ابن الہیثم اور موسیٰ بن شاکر جیسے علما کا کوئی جواب نہ تھا۔ الجبرا، مثلثات اور دیگر کئی علوم ریاضی مسلمانوں ہی نے ایجاد کیے۔ علم ہیئت میں مسلمانوں کی اہم ایجاد اصطرلاب تھی، جس سے ستاروں کا فاصلہ ناپا جاتا تھا۔ علم تاریخ پہلی بار مسلمانوں ہی نے صحیح اور سائنسی بنیادوں پر مدون کیا۔ واقدی، ابن سعد بلاذری، ابن اثیر، طبری، ابن خلکان، ابن حجر، ابن عساکر اور ابن خلدون جیسے سیکڑوں مورخین نے وہ کام کیے جو آج بھی سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علم لغت، ادب، شاعری، تصوف، موسیقی، حدیث، فقہ، علم الکلام اور ایسے سیکڑوں علوم میں مسلمان بڑی دسترس رکھتے تھے۔ قرون وسطیٰ کی ثقافت میں علم کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ لوگ تحصیل علم کو فرض اولین اور کسب معاش کو فرض دوم سمجھتے تھے۔ خصوصاً علم دین اور تصوف میں مسلمانوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ آج تک دیگر علوم کے ارباب بست وکشاد اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔

مرسلہ: یعقوب عثمانی، کراچی

کے گرد سیاہ حلقے آگئے تھے۔ لباس ملگجا مگر ٹھیک حالت میں تھا صرف کسی قدر میلا ہو گیا تھا۔ اسی طرح اس کے بال بھی کنگھی اور صفائی کے بغیر روکھے ہو رہے تھے ان کی ریشمی چمک غائب تھی۔ البتہ کسی نے اس سے دست درازی نہیں کی تھی ورنہ اس کا لباس ٹھیک حالت میں نہ ہوتا۔ یہ نفیس قسم کی ہلکی لان تھی جو آسانی سے پھٹ سکتی تھی۔ مجھے غائب ہوئے دو دن ہوئے تھے اور اسے غائب ہوئے دس دن ہوئے تھے۔ لڑکی ہونے کے ناتے اسے کہیں زیادہ خدشات تھے اس لیے اس کی ظاہری حالت کہیں زیادہ خراب تھی۔ اب تک اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا پھر اس کی نظر پڑی تو وہ چونک گئی۔ ”شہباز صاحب آپ ان کے ساتھ....“

”میں بھی قیدی ہوں۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

”شہباز صاحب۔“ حیات نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اب بھی اتنی عزت سے نام لے رہی ہو؟“

”کیونکہ یہ عزت کے قابل ہیں۔ تمہاری طرح گندی سوچ اور آنکھیں نہیں رکھتے ہیں۔“ بانو نے کہا تو حیات نے مشتعل ہو کر اسے تھپڑ مارا۔ تھپڑ میں زیادہ زور نہیں تھا ورنہ بانو پیچھے جا گرتی۔ البتہ اس کا سر گھوم گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ مگر اس نے آواز نہیں نکالی۔

”اب بھی اس کی حمایت کر رہی ہو۔ یہ کتنا عزت والا ہے مجھے معلوم ہے۔ جم میں تم دونوں دروازہ بند کر کے کیا کرتے تھے؟“

”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہاں بے بی آتی تھی۔“ بانو نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”لیکن تم سب کو اپنی طرح سمجھتے ہو۔“

میں نے اس کی حمایت کی۔ ”حیات تم ایک بلاوجہ کا شک لے کر ایک مظلوم لڑکی پر تشدد کر رہے ہو۔“

”بکومت۔“ وہ غرایا۔ ”تم دونوں اتنے شریف نہیں ہو جتنے بن رہے ہو۔“

انہوں نے بانو کے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ حیات اسے اچھی طرح جانتا تھا اور اسے اس سے فرار یا دوسری طرح کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے اسے ہتھکڑیاں پہنانے کی زحمت نہیں کی گئی۔ اتنی دیر میں سورج غروب ہو گیا تھا اور تاریکی چھانے لگی تھی۔ موالی نے پہلے ہی دو گیس لیمپ جلا لیے تھے اس لیے صحن کی حد تک فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنانے اور بانو کو باہر نکالنے سے لگ رہا تھا کہ اب ہم یہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ ایسا ہی ہوا۔ ایک منٹ بعد حیات نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”انہیں لے چلو۔ لیکن اس سے ہوشیار رہنا یہ بندھے ہاتھوں سے بھی کم خطرناک نہیں ہے۔“

”اب اتنا بڑھا چڑھا کر بھی نہ بیان کرو۔“ میں بولا۔ ”میں ایک عام سا انسان ہوں۔“

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“ حیات کے لہجے کی تلخی کم ہو گئی۔

سوائے موالی کے ہم سب باہر آئے تھے جہاں احاطے سے ذرا دور ایک بڑے سائز کی جیپ کھڑی تھی۔ دور یوں کہ احاطہ بلند زمین پر تھا اور جیپ ڈھلان چڑھ کر اتنی اوپر نہیں آسکتی تھی۔ یہی وجہ تھی یہاں سناٹا تھا کیونکہ ہم زمین سے کوئی سو فٹ کی بلندی پر تھے، ورنہ آس پاس کی ہموار زمین اور کھیتوں میں کام کرتے لوگوں اور مشینوں کا شور ہم تک نہیں آپاتا تھا۔ ہم ڈھلان سے اتر کر جیپ کی طرف جانے لگے۔ باقی سب آرام سے چل رہے تھے لیکن مجھے مشکل ہو رہی تھی کیونکہ میرے پاؤں ایک فٹ سے زیادہ دوری تک نہیں جا سکتے تھے۔ کہیں کہیں اس سے زیادہ قدم بڑھانے کی ضرورت پیش آتی تو مجبوری کی وجہ سے میں لڑکھڑا جاتا تھا لیکن اس موقع پر کسی نے میرے پاس آنے اور مجھے سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت محتاط تھے۔ ان کی بلا سے میں لڑھک کر نیچے پہنچتا۔ جیسے تیسے میں نیچے پہنچا۔ بانو کو بھی مشکل پیش آرہی تھی وہ بھی ناہموار راستوں پر چلنے کی عادی نہیں تھی۔

ہم نیچے پہنچے تو.... سب سے پہلے مجھے اور بانو کو جیپ کے عقبی حصے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ حصہ خالی فرش تھا جب کہ اور بر سیٹ بچھا ہوا تھا اور شکر ہے یہاں اسٹیل یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی ورنہ شاید ہمیں اس پر بیٹھنا پڑتا۔ اس کے باوجود اس میں سفر آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ناہموار راستوں پر سفر کرتے تو ہم لڑھکتے ہی رہتے۔ سکون سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ لوگ جیپ میں بیٹھ رہے تھے کہ اچانک بلند آواز والے نے کہا۔ ”بابو بی ایس ایف والے آرہے ہیں۔“

میں سن رہ گیا۔ بی ایس ایف سے مراد یقیناً بارڈر سیکورٹی فورس تھی۔ بی ایس ایف بھارتی فوج کا ایک حصہ تھی، کیا ان کی آمد میرے لیے تھی؟

بیت بازی

(محمد یاسین حیدر آباد کا جواب)

سماق دلبر ..... دبئی
رچ رہی ہے فضاؤں میں خوشبو
زلف ہے یا دھواں ہے صندل کا

رحیم خان ..... کوئٹہ
رو میں آئے تو وہ خود گرمئ بازار ہوئے
ہم جنہیں ہاتھ لگا کر ہی گنہگار ہوئے

اسماعیل رند .... ملتان
راس آئی تنہائی کی بسر تنہا
زندگی کی منزل کا طے ہو سفر تنہا

اسم علی کاظمی ..... کوئٹہ
رب ساحل کی آبرو کی قسم
کون بھنور ناخدا سے ڈرتے ہیں

محمد عقیل چشتی ..... حافظ آباد
رنگ سونے میں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

(محمد سعید قاسمی ڈلوال کا جواب)

نوشین ملک .... ملتان
اس زمانے کو ترس جائیں گے ہم
یہ تشنگی ہجر و وصال

نزہت پروین .... سکھر
آنکھ جب اٹھے بھر آئے، شعر اب کہا نہ جائے
کیسے بھول جائے بھولنے کی بات کو

اشرف سیال ..... جھنگ
اک طرفہ کیفیت نہ توجہ نہ بے رخی
میرے جنون دید کو یوں آزماتا تھا

لو زش خان ..... سرشٹہ
ان کو پانے کی سعی ان کی تمنا بے سود
سائے بھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

ملک نوروز علی ..... ساہیوال
اف یہ ظلمت کے اُمڈتے طوفاں
آتشِ دل کو جلائے رکھنا

افروز خان .... کوئٹہ
اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام

(مرزا ہادی بیگ حیدر آباد کا جواب)

فرید احسن ..... جہانیاں
اک سجدہ ضروری ہے تیری رضا کے لیے
زندگی ادھوری ہے تیری رضا کے بے

انجم فرید ..... ڈکاتہ
اس پیڑ کے نیچے کیا رکنا
جہاں سایہ کم ہو دھوپ بہت

میمونہ ممتاز ..... حیدر آباد
اک تیری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

فہیم الدین کھرل ..... شیخوپورہ
اس پیپل پر بات نہ کوئی پھل کا نام نشان رہا
اب بھی اس پیپل کے نیچے آتے ہیں ستانے لوگ

نواب علی .... لاہور
اس طرح تیرا انتظار کیا
تجھ کو ہر سانس میں شمار کیا

فلک مٹھو .... میانوالی
اے خدا وندگان زمیں و فلک
موت دو یا ہمیں زندگی بخش دو

(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

احمر سلیم ..... میانوالی
یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں یہ لوگوں نے پھیلائی ہے
تم انشا جی کا نام نہ لو کیا انشا جی سودائی ہے

مدا اسیر .... حاصل پور
یہ ہنستا ہوا چاند یہ پرنور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذروں کے سہارے

(ایم افضل کھرل ننکانہ کا جواب)

فصیح حسن خان ڈیرہ مراد جمالی

یہ دنیا ظالم دنیا ہے یہ بات بہت پھیلائے گی
تم سب کے سامنے چپ رہنا اور چپکے چپکے رو لینا

رضا نقوی.....بھکر

یہاں اہلِ محبت عمر بھر برباد رہتے ہیں
یہ دریا ہے اسے کچا گھڑا اچھا نہیں لگتا

دانش احمد.........قلات

یا اندھیرے خلاؤں میں دم گھونٹ دو
یا ہواؤں کو پھر تازگی بخش دو

نادر خان.........ڈی آئی خان

یہ خواب یہ خوشیوں بھرے جیتے ہوئے یہ خواب
یہ خواب میرے دل پہ اثر کیوں نہیں کرتے

زیب شکیب ....گوجرانوالہ

یہ شہر بہت جلد اجڑنے والا ہے
دکاندار و خریدار جھوٹ بولتے ہیں

اظہر اقبال.........لاہور

یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہے ہر اک شخص اکیلا

(شائستہ زریں شیخوپورہ کا جواب)

سعید احمد چاند.........کراچی

یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی تھی عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی بھی چارہ نہ تھا

نعمان فرحت قادری.........ساہیوال

یہ اور بات کہ تقدیر سو گئی قاتل
وگرنہ دیدہ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

(تسیم حیدر ناز مظفر گڑھ کا جواب)

غلام اکبر ساقی.........تورنگ میانوالی

رابطوں میں کمی ہے ترکِ تعلق نہ ہوگا بھروسا رکھ
ترے سوا ہے ہی کون میری ذات سے مخلص

(ناصر سعید فیصل آباد کا جواب)

مرزا ہادی بیگ ....حیدرآباد

وہ کون ہیں جنہیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

طحہ یاسین.........حیدرآباد

وہ دیکھ شام کے بستر پہ گر گیا سورج
بدن سے پھوٹ رہی ہے تکان کی خوشبو

افروز شکیل.........مظفر گڑھ

وہ دیوانہ ہوں میں جب سے بسایا میں نے زنداں
نہ صحرا میں اگے کانٹے نہ گلشن میں بہار آئی

نصیر الدین.........میرپور خاص

ابھی اس کی بلندی کو چھو نہیں سکتی
وہ زندگی جسے احساس زندگی ہو جائے

محمد امتیاز حسن.........سرگودھا

انساں سے محبت کی سزا کتنی بڑی تھی
نفرت کے طمانچے میرے رخسار تک آئے

ناصر.........حسن ابدال

اس کی ہنسی میں چھپے درد کو محسوس تو کر
وہ تو یونہی ہنس ہنس کے خود کو سزا دیتا ہے

وہاب اللہ سرہندی.........جہلم

آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے
روح ہے لاشہ جسم ہے مرگھٹ

(نگار سلطان لاہور کا جواب)

اشفاق حسین.........پشاور

یہ خود شناسی بھی آخر کہاں پہ لے آئی
کہ اپنے آپ سے لگنے لگا ہے ڈر مجھ کو

ناز افروز.........راولپنڈی

یہ مانا کہ تغافل نہ کرو گے دیکھو
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو، ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 93

ادارہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے، اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 جون 2013 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1947ء میں وہ بھارتی ریاست گجرات سے پاکستان آئے اسی دوران ان کی والدہ اپاہج ہو گئیں۔ وہ دواؤں کی خاطر ادھر بھاگتے رہے مگر اپنی والدہ کو بچا نہ سکے۔ ماں کی موت کے بعد انہوں نے عہد کیا کہ اب وہ کسی اور کو اس طرح مرنے نہیں دیں گے اور انہوں نے 1950ء میں گجراتی برادری کے لیے سماجی خدمت کا کام شروع کیا۔ چندہ جمع کر کے پہلے کلینک کھولی پھر ایک ایمبولینس فراہم کی۔ جذبہ خدمت کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے ایمبولینسوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ 2002ء میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے متاثرین کی امداد کے لیے ایک لاکھ ڈالرز بھیجے۔

علمی آزمائش 91 کا جواب

شبیر حسن جوش ملیح آبادی 1892ء میں یوپی کے شہر ملیح آباد میں پیدا ہوئے مگر پٹھان تھے۔ غصے کے تیز تھے مگر شاعری میں جواب نہ تھا۔ زندگی بھر غزل نہ کہی۔ الفاظ سے خوب کھیلتے تھے۔ پاکستان آئے تو گروہ بندی کا شکار ہو گئے تھے ایک رسالے نے ان کی فن لغت میں خاص نمبر نکالا۔ آپ بیتی ''یادوں کی برات'' لکھی تو وہ بھی متنازع ٹھہری۔ پاکستان میں ہی انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1- ارشد الیاس خان، دینہ جہلم　2- نادر صدیقی شیخ، چنیوٹ　3- فیروز زین محمود، کراچی

4- آفتاب خان، اسلام آباد　5- زریاب خان، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

میرپور خاص سے مرزا طاہر احمد دین بیگ، مجاہد علی الیس جسی، نعمان شیخ، احمد سعید قائم خانی۔ کراچی سے سید عزیز الدین، شیخ بکر، احمد کمال، زاہدہ بیگم، غزالہ اقبال رضوی، راحیلہ رفیق، وجاہت وکیل، عثمان خان، شاہد آفتاب، وکیل الرحمن، محمد عثمان خان، محمد علی شاہد، سعید احمد چاندہ، نصرت حیدر، بختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عروسہ انوار، عروج عالم، سید عزیز الدین، عنایت مسیح، علی احمد، رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، نعیم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نوازش علی شاہ، نغمہ اقبال رضوی، ناصر افروز، ممتاز الحسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ جمیل، منور علی، ملک سرفراز، گل، کاشف حیدر، جاوید علی، مظفر حسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، خالد خان، شمیم احمد، سمیہ عزیز، ذوالفقار احمد خان، وجاہت وکیل، عثمان خان، محمد علی شاہد۔ سرسٹہ سے عظمت علی رحمت علی۔ خانیوال سے افتخار شاہ۔ دینہ سے طاہر حسن۔ صادق آباد سے

...وان۔ رہم اقبال رضوی، محمد علی مشاہد، فرزانہ پروین، انصار حسین، نعیم احمد، سرور احسن صدیقی، عطیہ نورین، نیاز خلجی۔ لاہور سے عمران، مظفر علی خان، مسرت اسلم (جھنگ صدر)، نعمان حیدر، کاشف عزیز، فرحت بتول، ایم بی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر فاروق، کاوش نسیم، کاشان صدیقی، اسد ڈینو آرائیں، گل زیب، پروین ضیائی، نثار اختر، ارشاد علی، احمد علی اشرف، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان شرف، خالد فاروقی، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الدعلی، احمد بشیر بٹ، نعیم مرزا، صدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، نازش خان، ماہ جبیں، حمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نازش حسین، تابش اطہر۔ مظفر گڑھ سے محمد سجاد (شاہ جمال)، کہماں سے سلیم کا مریڈ۔ میانوالی سے غلام اکبر ساقی، حکیم سید محمد رضا، شاہ علوی (تورنگ) عبدالخالق (عیسیٰ خیل)۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، رضوان احمد ہاشمی، شیراز ملک، ڈاکٹر علم یاسین، ناصر جاہ، تسنیم فاروق آرگلی، صادق حسین، نرجس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، نوید بخاری، سید محمد تقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے عالیہ فاطمہ، حسن خان، نیلوفر شاہین، احمد خالد، ممتاز، برکت اللہ، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیق الرضی، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، انور یوسف زئی، سعید اختر، روا ممتاز، انور یوسف زئی، شہباز فیضی، محمد متین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد یحییٰ معین، نورین افشاں، محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، مزدان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جدل، فاضل خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، مدیحہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، عبدالعزیز (سمندری) شوکت علی چاند۔ جھنگ سے فرحت بیگ۔ گوجرانوالہ سے نسیم شاہ۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، مسرت لنڈی۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہانزیب۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، ورد رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، عقیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، شرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، مصطفیٰ اکمل ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات، ثمینہ کوثر لطیف۔ شجاع آباد سے حسن علی ریدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے مرزا ہادی بیگ، بابر خان، طہ یاسین۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ پاک پتن سے زاہد علی خان۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ حاصل پور سے نعمان درویش۔ جہلم سے ندیم امتیاز۔ بہاولپور سے حمیرا کوکب داسطی، قاضی عدنان احمد، آمنہ ملک۔ بہاؤ ننگر سے معظم علی، اقیوذ شیخ (چشتیاں)۔ اوکاڑہ سے سید احسن محمود، اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ باڑی چم مردال سے انور، ہری پور سے خورشید احمد۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبیں فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، ہشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ اٹک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، نثار جران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت، فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر زمان، سعید محی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، شیخ شاہ، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ سرسٹہ سے عظمت علی رحمت علی۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، یاز رخ بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ چکوال سے محمد جہانگیر۔ میانوالی سے نعمان نیازی (تلہ گنگ) احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان شیرانی۔ بھکر سے حسن چنگیزی، عماری شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیرا، زبیر شاہ، تقی بخش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوتانہ، ناصر بھگیو، نیاز عباس۔ مردان سے ابرار خان۔ کملیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، ستار علی، نعیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے روق اعظم، شہاب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سرور توفیق، نصیر حسین، ملک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ تربیلا ڈیم سے حسن بیگ، نعیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد فضل محمد، شیر افضل۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، جو، وحسین بھٹی، خالد جمال، ناصر انعم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، نیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل سیو، مشا وقار، منہال زیدی، ابشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی بنگش، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، نادر خان، اشرف حسن زئی، گل خان، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، ارکان اختر، شاہنواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری، بخش محمود، چکزئی، زرینہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ وزیر آباد سے ندیم اکبر۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے نصیر خان۔ ممالک غیر سے انور ممتاز (جدہ سعودیہ) نسیم نیازی، ٹورنٹو (کینیڈا)۔ اسلم فتح پوری (یو کے)۔ فہد مصطفیٰ (جرمنی)

محبینہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم !

آپ کے پاس ہر روز دس بیس آپ بیتیاں آتی رہتی ہوں گی لیکن میری آپ بیتی سب سے الگ ہے آپ خود بھی چونک جائیں گے۔

نگار عابد رحمٰن

لاہور

عابد رحمٰن سے میری شادی عام رسم و رواج سے ذرا ہٹ کر ہوئی تھی۔ ذرا ہٹ کر یوں کہ عابد رحمٰن پہلے بھی ایک بار شادی شدہ رہ چکے تھے۔ ان دنوں میں گریجویٹ کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی جاب کر رہی تھی۔ جاب کرنے کی دو وجوہات تھیں ایک تو میں فارغ تھی اور بور ہوتی تھی۔ کالج لائف بہت ہی بھرپور اور ہنگامہ خیز تھی۔ بے شمار دوستیں اور بے شمار تقریبات تھیں جو ان چار سالوں کا حصہ تھیں۔ کالج بہت اچھا تھا۔ معیارِ تعلیم کے ساتھ وہاں ہونے والی دوسری سرگرمیوں کا معیار بھی اچھا تھا۔ ہم ڈراموں اور پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ ہماری ٹیچرز ہماری حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ تقریباً ہر دوسرے تیسرے مہینے کالج کی طرف سے کہیں نہ کہیں پکنک کا پروگرام بنتا تھا۔ کالج میں میلے لگتے تھے۔ چار سال کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا اور پھر فائنل آ گیا۔

امتحان دے کر جب چند دن گھر میں بیٹھنا پڑا تو میں بوکھلا گئی تھی۔ گھر خالی نہیں تھا، مجھ سے بڑی دو بہنیں بیاہی جا چکی تھیں لیکن دو چھوٹی ابھی باقی تھیں، پھر دو بڑے بھائی تھے اور دونوں شادی شدہ تھے۔ ابا جان اور امی تھیں۔ اس کے باوجود گھر جیسے کاٹنے کو دوڑتا تھا اور خاص طور سے صبح کے وقت جب بہنیں، ابا جان اور بھائی دفتر اور کالج جا چکے ہوتے تھے۔ ابا جان ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ تنخواہ بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن اتنی تھی کہ عزت سے گزر بسر ہو جاتی۔ ہماری تعلیم و تربیت کے ساتھ وہ ہماری جائز خواہشات بھی پوری کرتے تھے۔ گھر ہمارا اپنا تھا۔ بھائیوں کی شادی سے پہلے مکان کی اوپری منزل بنا کر انہیں وہاں منتقل کر دیا تھا۔ یوں انہیں شروع سے الگ کر کے وہ بنیاد ہی ختم کر دی گئی تھی جو عام طور سے ہمارے ہاں شادی کے بعد جھگڑوں کا باعث بنتی ہے۔

بہن بھائیوں کی شادی سے ابا جان پر خاصا مالی بوجھ پڑا تھا۔ قرض چڑھ گیا تھا پھر امی میرے اور چھوٹی بہنوں کے لیے بھی کچھ نہ کچھ جمع کرتی رہتی تھیں۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اب ابا جان پر مزید بوجھ ڈالنے کے بجائے میں ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کروں۔ اتفاق سے میری ایک کلاس فرینڈ جو پاس ہی رہتی تھی اس نے بھی امتحانات کے بعد اسکول میں ٹیچر کی جاب کر لی تھی اور وہی مجھے وہاں لے گئی۔ امی مخالفت کر رہی تھیں لیکن ابا جان نے اجازت دے دی۔ چار گھنٹے کی جاب تھی اور ایک ہزار روپے تنخواہ تھی۔ یہ آج سے کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت بھی ہزار روپے کوئی بڑی رقم نہیں تھی لیکن اس وقت یہ اتنی چھوٹی رقم بھی نہیں تھی۔ پانچ سو روپے اپنے لیے رکھ کر میں پانچ سو امی کو دے دیا کرتی تھی۔ اس جاب نے میری بوریت بھی دور کر دی تھی۔ میں چھوٹی کلاسوں کو پڑھاتی تھی اور مجھے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے اور ان کے ساتھ کھیلنے میں بہت مزہ آتا تھا۔

ایک بجے سے پہلے میں گھر آ جاتی تھی جب کہ کالج سے دو بجے واپسی ہوتی تھی۔ صبح کا ناشتا اور دوپہر کی ہانڈی امی بناتی تھیں جب کہ روٹی یا چاول میں آ کر بناتی تھی پھر رات کا کھانا ہم تینوں بہنیں مل کر تیار کرتیں اور گھر کے دوسرے کام نمٹاتی تھیں۔ چھٹی والے دن پورے گھر کی صفائی کرتیں اور ہفتے بھر کے کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ اسی دن ملنے جلنے والے بھی آتے تھے اس لیے مہمان نوازی بھی کرنا پڑتی تھی۔ وقت ایک بار پھر مصروفیت میں گزرنے لگا۔ میں تو آگے پرائیویٹ ماسٹرز بھی کرنا چاہتی تھی لیکن امی نے صاف منع کر دیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے نگار، اب تمہاری شادی کرنی ہے، ورنہ ہمارے پاس کوئی فالتو رقم نہیں ہے۔“

”امی اتنا خرچ نہیں ہوتا ہے پرائیویٹ پڑھنے میں۔“

”تا بی بی دو سال تک تمہیں بیٹھے بٹھائے رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ جیسے ہی کوئی اچھا رشتہ آیا بس الوداع۔“

میں اپنا خیال منہ پر لے کر رہ گئی۔ ویسے بس یک خیال ہی آیا تھا ورنہ ماسٹر کرنے کا کوئی بہت شوق بھی نہیں تھا۔ امی کے برعکس ابا جان میری شادی میں کچھ تاخیر چاہتے تھے تاکہ سابق قرض اتر سکے۔ دوبارہ قرض لے سکیں۔ انہوں نے امی سے کہا۔ ”ابھی ایک سال تک مزید کوئی شادی نہیں ہو سکتی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے، پہل

کون سے رشتے

لائن لگا ہوا

مزید

ابھی

امی

نے جل کر کہا۔ ”آتے آتے بھی سال تو لگ ہی جائے گا۔“

میں نے سنا تو خوش ہو گئی۔ میں بھی سال دو سال سے پہلے اس گھر سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ خوش قسمتی سے بھابیاں بہت اچھی ملی تھیں اور ہم نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا تھا کہ وہ بھی ہم سے اتنی ہی خوش تھیں۔ اول تو انہیں شادی کے فوراً بعد اپنا گھر مل گیا تھا اور وہ اپنے گھر میں خود مختار تھیں۔ ہم ان کے کسی معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے۔ دونوں بھائی اچھی جاب کر رہے تھے اور وہ خود سے امی کو ہر مہینے ایک مخصوص رقم دیتے تھے۔ امی اس رقم سے جہیز ڈال کر ہم بہنوں کے لیے تیاری کر رہی تھیں۔ اس طرح بھابیاں مواقعوں پر کام اور ذمے داریاں اٹھانے میں آگے رہتی تھیں۔ اتفاق سے دونوں بھابیوں کے ہاں بچے ساتھ ہوئے تھے تب ہم نے ان کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی تھی۔ ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا کہ جو ہوتا ہے اسی گھر میں ہو اور بھابیوں کے گھر والوں کو بالکل کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ جب دونوں طرف سے ایسے خلوص اور محبت کا

معاملہ ہو تو پھر گھر خود بہ خود جنت کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

مجھے جاب کرتے ہوئے سال ہونے کو آیا تھا۔ میری کلاس میں ایک بچہ رامس پڑھتا تھا۔ وہ صرف پانچ سال کا تھا اور بہت پیارا اور معصوم سا بچہ تھا لیکن وہ کچھ ڈرا سہا رہتا تھا اور کوئی اس سے ذرا زور سے بات کر لے تو وہ ڈر کر رونے لگتا تھا۔ مجھے اس سے خاص انسیت ہو گئی تھی، اس لیے میں اس کا خیال رکھتی تھی اور جو بچے اسے تنگ کرتے تھے ان سے رامس کو بچاتی تھی۔ جب اس نے میری انسیت محسوس کی تو خود بھی میرے ساتھ رہنے لگا۔ کلاس میں وہ سب سے آگے میرے سامنے بیٹھتا تھا۔ جب ہاف ٹائم ہوتا تو دوسرے بچوں کی طرح باہر جانے کے بجائے میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ میں باہر بھی بچوں کو دیکھتی تھی۔ جب دوسرے بچے جھولوں، کھلونوں اور کھانے پینے میں مگن ہوتے تو وہ میرے ساتھ ہوتا۔ میں اسے لنچ کراتی جو وہ اپنے چھوٹے سے لنچ بکس میں لاتا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا۔

"آپ کی امی کیا کرتی ہیں؟"

"وہ ابو سے لڑتی ہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

مجھے حیرت ہوئی۔ "ابو سے لڑتی ہیں لیکن کیوں؟"

"پتا نہیں.... وہ بس ابو سے لڑتی ہیں اور مجھے ڈانٹتی ہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کرتی ہیں۔"

مجھے خیال آیا کہ رامس کہیں اسی وجہ سے تو ڈرا سہا نہیں رہتا ہے۔ "آپ کے ابو بھی آپ کو ڈانٹتے ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے زور و شور سے سر ہلایا۔ "ابو تو بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں جو کہتا ہوں مجھے لا کر دیتے ہیں لیکن امی مجھ سے پیار نہیں کرتی ہیں۔"

"آپ کے ابو کیا کرتے ہیں۔"

"وہ کام کرتے ہیں۔" رامس نے کہا لیکن وہ واضح نہیں کر سکا کہ اس کے ابو کیا کرتے ہیں۔ شاید وہ کہیں جاب کرتے تھے یا کوئی بزنس کرتے تھے۔ یہ اسکول اسٹینڈرڈ کا تھا اور یہاں فیس خاصی زیادہ تھی اس لیے یہ تو طے تھا کہ رامس کے والد کماتے پتے آدمی تھے۔ رامس شروع میں پڑھنے میں اتنا تیز نہیں تھا لیکن میری توجہ کی وجہ سے وہ جلد دلچسپی سے پڑھنے لگا تھا۔ تھرڈ ٹرم میں اس نے کلاس میں دوسری پوزیشن لی تھی۔ رزلٹ کی تقریب میں اس کے والد آئے تھے اور تب میں نے عابد رحمٰن کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تقریباً تیس بتیس برس کے سرخ و سفید اور باوقار نظر آنے والے شخص تھے۔ رامس ان کے ساتھ بیٹھا ہو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ جب رزلٹ کی تقریب ختم ہو گئی تو وہ خاص طور سے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتا ہوا عابد رحمٰن کے پاس لے گیا۔

"ابو یہ میری مس نگار ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کیسی ہیں آپ۔" عابد رحمٰن مسکرائے۔ "رامس آپ کا ذکر کرتے نہیں تھکتا ہے۔"

نہ جانے کیوں میں شرما گئی حالانکہ اس سے پہلے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ "یہ خود بہت پیارا بچہ ہے۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں آپ نے رامس پر خصوصی توجہ دی۔ یہ توجہ چاہتا ہے جو بد قسمتی سے اسے نہ مل سکی۔"

"اس کی ماما کی طرف سے؟" میں غیر ارادی طور پر بولی۔

انہوں نے سر ہلایا۔ "اس کا مطلب ہے آپ نے اندازہ لگا لیا ہے۔ رامس ہماری ایک ہی اولاد ہے لیکن رخسانہ اس پر بھی توجہ نہیں دیتی ہے۔"

"وہ آپ سے بھی لڑتی ہیں۔" میرے منہ سے نکلا اور میں نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہنے لگی کہ آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں وہ باتیں کر رہی تھی جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

"ہاں وہ کسی حساب میں خوش نہ ہونے والی عورتوں میں سے ہے۔" خلافِ توقع عابد رحمٰن نے میری احمقانہ بات کا جواب بھی دیا تھا۔ ان کا لہجہ اور انداز تھکا ہوا سا تھا۔ "آج دیکھو، رامس نے پہلی کلاس پاس کی ہے اور اس کی ماں نے اتنی زحمت نہیں کی کہ اپنی نیند قربان کر کے یہاں آ جائے۔"

مجھے رامس اور عابد پر ترس آنے لگا جو ایک ناقدر عورت کے ہاتھوں اور دل شکستہ رہے تھے۔ واقعی آج کے دن سب بچوں کے ماں باپ آئے ہوئے تھے اور صرف رامس تھا جس کا باپ آیا تھا۔ جب تصویر کھنچوانے کا وقت آیا تو رامس پھر میرے پاس آیا۔ اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ "مس آپ میرے ساتھ تصویر بنوا لیں، میری ماما تو آئی نہیں ہیں۔"

میں ہچکچائی مجھے عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ یہ تو فیملی فوٹو سیشن تھا مگر مجھ سے اس معصوم بچے کا دل نہیں توڑا گیا تھا۔ اس لیے میں وہاں آ گئی جہاں تصویریں لی جا رہی تھیں۔ عابد رحمٰن نے مجھ سے معذرت کی۔ "سوری میں نے رامس کو منع کیا لیکن یہ نہیں مانا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس سے برہم مسکرا کر

کہتے ہوئے کہا۔ رامس اپنی شیلڈ اور رزلٹ اٹھائے ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور ہم نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ مجھے شرم بھی آ رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں اچھا بھی لگ رہا تھا۔ تصویر اتر گئی تو میں پیچھے آئی۔ تب میری ساتھی ٹیچر معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایک دو نے تو جملے بھی چست کیے لیکن میں نے انجان بن کر نظرانداز کر دیا۔ جانے سے پہلے عابد رحمٰن نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں رامس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ وہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی بن ماں کے بچوں کی طرح پل رہا تھا۔ وہ دکھی ہوتا تھا لیکن اپنا دکھ چھپاتا تھا۔ کتنی بار ایسا ہوا کہ وہ اسکول آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے ہوتے تھے۔ میں کوشش کر کے اسے ہنساتی اور اس کا دل بہلاتی تب کہیں جا کر اس کی آنکھوں سے آنسو غائب ہوتے تھے۔ رامس چھٹی نہیں کرتا تھا کم سے کم میں نے اسے چھٹی کرتے نہیں دیکھا تھا۔

لیکن نئے سیشن کے آغاز میں ہی وہ لگاتار دو دن اسکول نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی لیو آئی۔ تیسرے دن میں نے اسکول کے ریکارڈ سے اس کے گھر کا نمبر نکالا وہاں کسی خاتون نے کال ریسیو کی۔ "میں رامس کی کلاس ٹیچر بات کر رہی ہوں وہ دو دن سے اسکول نہیں آیا ہے۔"

خاتون نے جواب دیا۔ "اسے بخار ہو گیا تھا وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

"اسپتال میں۔" میں بے چین ہو گئی۔ "اس کی طبیعت اتنی خراب ہے، کون سے اسپتال میں ہے؟"

اس نے سپاٹ سے انداز میں اسپتال کا نام بتایا اور فون رکھ دیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ رامس کی ماں تھی۔ چھٹی کے بعد میں پہلے گھر گئی اور پھر امی کو بتا کر اسپتال کے لیے روانہ ہوئی جو گلشن اقبال میں ہمارے گھر سے کچھ دور تھا۔ میں آسانی سے رکشے میں وہاں پہنچ گئی۔ ریسپشن پر مجھے رامس کا کمرا معلوم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے اسپتال کے سامنے فلاور اسٹال سے ایک چھوٹا سا بکے لے لیا تھا۔ یہ پرائیوٹ روم تھا اور اندر عابد رحمٰن کو موجود پا کر میں جھجکی جو کہانیوں کی ایک کتاب ہاتھ میں تھامے رامس کو کہانی سنا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر رامس کا چہرہ تو چمک اٹھا تھا لیکن ساتھ ہی عابد کے چہرے پر جو تاثر آئے تھے مجھے یقین ہے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "آپ" انہوں نے کہا۔

"مس آئی ہیں۔" رامس مارے جوش کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے جلدی سے آگے آ کر اسے دوبارہ لٹایا۔

"اٹھیں مت ... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اسے لٹا کر عابد رحمٰن سے سلام دعا کی اور بکے رامس کے سرہانے رکھ دیا۔

"تھینک یو مس، آپ کو کس نے بتایا مس کہ میری طبیعت خراب ہے۔"

"میں نے آپ کے گھر کال کی تھی۔" میں نے اسے پیار کیا چند دن میں وہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ "وہاں سے آپ کی ماما نے بتایا کہ آپ اسپتال میں ہیں۔"

میری بات پر رامس اور عابد رحمٰن دونوں کا انداز عجیب سا ہو گیا تھا۔ میں نے اتنی شدت سے اس بات کو محسوس کیا کہ موضوع بدل دیا۔ "آپ کو کیا ہوا؟"

"بخار ہوا تھا اور پھر کسی طرح اتر ہی نہیں رہا تھا اس لیے میں اسپتال لے آیا۔" عابد رحمٰن نے بتایا۔ "اللہ کا شکر ہے اب بہت بہتر ہے لیکن کمزوری ہے۔"

"یعنی رامس ابھی کچھ دن اور اسکول نہیں آئے گا؟" میں نے رامس کی طرف دیکھا تو عابد رحمٰن نے سر ہلایا۔

"ڈاکٹر نے تین دن کا بیڈ ریسٹ کہا ہے۔"

"اس طرح تو رامس کا بہت نقصان ہوگا۔ ابھی کلاس کا آغاز ہوا ہے اور یہ پیچھے رہ جائے گا۔ میری خواہش ہے اس بار یہ کلاس میں فرسٹ آئے۔"

"مس میں گھر میں ابو سے پڑھ لوں گا۔"

"نہیں! ابھی آپ آرام کریں جب آپ اسکول آئیں گے تو میں خود آپ کو پڑھاؤں گی۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔" عابد رحمٰن نے کہا۔ "میں اس وجہ سے بھی پریشان تھا۔"

میں کچھ دیر وہاں بیٹھی اور پھر جانے کے لیے اٹھی تو عابد رحمٰن نے پیشکش کی۔ "میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں! میں چلی جاؤں گی میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ باہر آرام سے رکشا مل جائے گا۔"

"چلیں میں آپ کو نیچے چھوڑ آتا ہوں۔" عابد رحمٰن نے اصرار کیا تو میں مان گئی۔ ہم کمرے سے باہر آئے تو انہوں نے کہا۔ "آپ نے رخسانہ سے بات کی تھی۔"

"انہوں نے نام نہیں بتایا تھا۔"

"وہ گھر میں ہے۔ وہ ایک بار بھی رامس کو دیکھنے نہیں آئی۔"

میں حیران رہ گئی۔ "وہ کس قسم کی ماں ہیں.... ہمیں تو اتنے بڑے ہوکر کھانسی آجائے تو میری امی اتنی پریشان ہو جاتی ہیں کہ رات کو بھی ہمیں بار بار دیکھنے آتی ہیں۔"

"ساری دنیا کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں لیکن رخسانہ بالکل مختلف عورت ہے، اسے اپنے شوہر اور بچے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"وجہ!" عابد رحمٰن نے گہری سانس لی۔ "اصل بات یہ ہے کہ اسے میں ہی پسند نہیں ہوں۔"

"آپ پسند نہیں ہیں۔" میں دم بہ خود رہ گئی اور پھر میرے منہ سے نکل گیا۔ "کوئی آپ کو بھی ناپسند کرسکتا ہے۔"

"ہاں رخسانہ مجھے پسند نہیں کرتی ہے کیونکہ وہ بہت حسین و جمیل اور دولت مند خاندان سے ہے۔"

میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی عورت میں اتنا غرور و تکبر ہوگا کہ وہ اپنے شوہر اور بچے کو بھی پسند نہ کرتی ہو۔ عابد رحمٰن میں کوئی کمی نہیں تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں ایسے مردوں کی خواہش کرتی ہیں کہ وہ ان کے شوہر بنیں اور پھر رامس جیسا بچہ جس پر ہر ماں فخر کرسکتی تھی۔ پتا نہیں یہ رخسانہ کیسی ماں تھی۔ پھر جس دن رامس اسپتال سے گھر گیا اسی دن رخسانہ عابد سے جھگڑا کرکے اپنے ماں باپ کے گھر چلی گئی۔ یہ بات مجھے رامس نے بتائی۔ اس دن وہ ماں کے لیے دکھی نہیں بلکہ غصے میں تھا۔ اس نے کہا۔ "مس مجھے اپنی ماما بالکل پسند نہیں ہیں وہ میرے ابو کو بہت تنگ کرتی ہیں۔"

یہ بات چند دن بعد مجھے عابد رحمٰن سے پتا چلی کہ رخسانہ صرف گھر چھوڑ کر نہیں گئی ہے بلکہ اس کے وکیل نے خلع کا نوٹس بھی بھیج دیا ہے۔ میں اس دن کپڑے لینے نزدیک ہی مارکیٹ گئی تھی وہاں اتفاق سے عابد رحمٰن مل گئے اور گفتگو میں یہ بات نکل آئی۔ میں رامس کے حوالے سے فکر مند ہوگئی۔ "تب آپ کیا کریں گے اور اگر آپ دونوں الگ ہوگئے تو رامس پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔"

"رامس پر جتنا برا اثر پڑنا تھا پڑ گیا۔ ماں کی موجودگی میں اسے کون سا سکھ ملا ہے جو اس کے جانے سے وہ دکھی ہوگا۔" عابد رحمٰن نے تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے بچے کی فکر ہے، میں بزنس مین ہوں بزنس دیکھوں یا گھر۔ ایک ملازمہ ہے لیکن وہ ماں کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتی۔"

اس دن پہلی بار مجھے خیال آیا کہ اگر عابد رحمٰن میرے شوہر اور رامس میرا بیٹا ہوتا تو میں اپنی زندگی کو جنت سے کم نہ سمجھتی۔ لیکن ایسا تھا نہیں۔ یہ نعمت رخسانہ کو ملی تھی اور وہ اس کی قدر نہیں کر رہی تھی۔ میں نے صدق دل سے دعا کی کہ وہ واپس آجائے اور رامس کو اس کی ماں واپس مل جائے مگر بعض دعائیں قبول ہونے کے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ ایک مہینے بعد عابد رحمٰن اور رخسانہ میں قانونی علیحدگی ہوگئی۔ رخسانہ کو خلع مل گیا تھا اور اس کے بدلے وہ بچے حق مہر، حق نان نفقے کے ساتھ رامس سے بھی دست بردار ہوگئی۔ اس کا پتا مجھے یوں چلا کہ ایک دن بچوں کو لینے والی وین نہیں آئی تھی۔ اسکول انتظامیہ نے بچوں کو روک لیا اور ان کے ماں باپ کو اطلاع دینے لگے لیکن عابد رحمٰن کے گھر بیل جا رہی تھی اور وہاں کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ یہ کشش کا تھا میں نے پیار دیکھا اور پرنسپل سے کہا۔

"رامس کو میں اس کے گھر چھوڑ دیتی ہوں۔"

ہم روانہ ہوئے اور کچھ دور گئے ہوں گے کہ راستے میں عابد رحمٰن مل گئے۔ "تھینکس گاڈ.... جب رامس مقررہ وقت پر نہیں آیا تو میں اسے لینے جا رہا تھا۔"

"اسکول کی وین نہیں آئی تھی اور آپ کے گھر پر کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔"

"گھر کا فون خراب ہے، میں نے کمپلین کرائی ہے اور میں نے موبائل فون لیا ہے، اس کا نمبر آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ اسے اسکول کے ریکارڈ میں شامل کر لیں۔" اس زمانے میں موبائل فون دولت مندوں کے پاس ہوتا تھا۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"آئیں میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔"

"میں چلی جاؤں گی۔"

"پلیز... میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے اس طرح کہا کہ میں مجبور ہوگئی۔

"ٹھیک ہے لیکن آپ مجھے میرے گھر کے پاس پارک پر اتار دیجیے گا۔"

عابد رحمٰن نے گاڑی اور بات آگے بڑھا دی۔ "میری اور رخسانہ کی علیحدگی ہوگئی ہے۔"

مجھے جھٹکا لگا۔ "علیحدگی ہوگئی ہے اور رامس..."

"یہ میرے پاس رہے گا۔ میں نے اسی شرط پر اسے خلع دیا ہے۔"

"اب رامس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"اسی لیے تو میں پریشان ہوں۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "ابھی تو ایک ملازمہ ہے لیکن میں رامس کو کسی ملازمہ پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو پھر آپ نے اس کا کیا حل سوچا ہے؟"

"مجھے دوسری شادی کرنی ہوگی۔" انہوں نے گاڑی روکتے ہوئے کہا تو میں چونک گئی۔ پارک آگیا تھا۔ مجھے عابد رحمٰن کی دوسری شادی کا ارادہ سن کر جھٹکا سا لگا تھا۔ "نگار میں اسی معاملے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، پلیز کیا آپ کہیں مجھ سے مل سکتی ہیں بس کچھ دیر کے لیے؟"

اس کا لہجہ ملتجی ہوگیا۔ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"عابد صاحب میرے گھر والے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں کسی سے بھی آج تک ان سے چھپ کر نہیں ملی۔"

"پلیز... میرا مقصد برا نہیں ہے۔ بس چند منٹ چاہئیں۔"

یہ سچ ہے کہ مجھے باہر ملنے کی بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی لیکن میں ان کی التجا ٹھکرانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں کل رامس کے ہاتھ آپ کو ملاقات کا نوٹس بھیج دوں گی اور آپ آکر اسکول میں مجھ سے مل لیجیے گا۔"

"اسکول میں؟"

"ہاں وہاں ایک پیرنٹس روم بھی ہے، اگر کسی مسئلے پر بچے کے والدین کو بلایا جاتا ہے تو متعلقہ ٹیچر ان سے وہیں ملتی ہے اور کوئی نہیں ہوتا ہے۔ آپ وہاں آرام سے بات کر سکتے ہیں۔"

عابد رحمٰن مطمئن تو نہیں تھے لیکن انہیں ماننا پڑا۔ اگلے دن میں نے رامس کے ہاتھ ملاقات کا نوٹس بھجوایا۔ اسکول میں ٹیچرز کو آزادی تھی کہ وہ کسی بچے کے والدین کو بلا کر ان سے بات کرسکتی تھیں۔ پرنسپل یا ایڈمنسٹریشن کا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس سے اگلے دن عابد رحمٰن آگئے اور میں انہیں پیرنٹس روم میں لے آئی۔ "جی فرمایئے۔"

"نگار میں کچھ کہنے سے پہلے اپنے بارے میں آپ کا خیال جاننا چاہوں گا؟"

"کیسا خیال؟"

"یہی کہ میں کیسا شخص ہوں؟"

"آپ اچھے آدمی ہیں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"اگر میں دوسری شادی کرنا چاہوں تو کسی بھی اچھے گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مجھے مل سکتا ہے؟"

"اس بارے میں تو لڑکی یا اس کے گھر والے ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔"

"فرض کریں وہ لڑکی آپ ہوں۔"

میں اتنی گڑبڑائی کہ خاصی دیر میرے منہ سے آواز ہی نہیں نکلی تھی۔ پھر میں نے بہ مشکل کہا۔ "یہ تو میرے گھر والے ہی بتا سکتے ہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے میرے بارے میں؟"

"بتایا تو ہے آپ اچھے آدمی ہیں۔"

"یعنی میں آپ کے گھر رشتہ بھیجوں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟"

"نہیں۔" اس بار میں نے خاصی مشکل سے کہا تھا، مجھے بہت شرم آرہی تھی۔

"نگار میں آپ سے یہی بات کہنے آیا تھا۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو بے اختیار خیال آیا کہ کاش رخسانہ کے بجائے آپ میری زندگی میں آئی ہوتیں۔ پھر رامس آپ سے مانوس ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے آپ کی رضامندی لے لوں۔"

میں نے خود کو سنبھال لیا اور صاف گوئی سے بولی۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میرے رشتے کا معاملہ میں نے اپنے ماں باپ پر چھوڑ رکھا ہے وہ جو چاہیں گے وہی میری مرضی ہوگی۔"

"لیکن وہ آپ سے پوچھیں تو آپ اتنا تو کہہ سکتی ہیں کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ہاں بہ شرط کہ میرے ماں باپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو۔"

گھر آکر میں نے امی کو عابد رحمٰن کے بارے میں بتا دیا۔ امی نے خاموشی سے سنا اور مجھے گلے لگا کر بولیں۔ "تم نے ٹھیک کیا میری بچی... اب یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ "امی مجھے معلوم ہے آپ لوگ میرے لیے بہتر کریں گے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ عابد رحمٰن نے کس طرح میرے ابو سے رابطہ کیا اور پہلے ان سے بات کی۔ ابو ہچکچائے تھے لیکن انہوں نے انکار نہیں کیا اور معاملہ امی اور بھائیوں کے سامنے رکھ دیا۔ عابد رحمٰن ایک پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد اور چچا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اکثر یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہے تھے۔ عابد رحمٰن کی ایک پھوپی ٹورنٹو یونیورسٹی میں انڈو پاک ہسٹری پڑھاتی تھیں۔ خود

عابد رحمٰن ایم بی اے تھے اور اپنی فرم چلا رہے تھے۔ وہ امپورٹ، ایکسپورٹ کا بزنس کرتے تھے۔ گلشن اقبال میں اپنا بنگلہ تھا جو چار سو گز پر بنا ہوا تھا۔ نئے ماڈل کی کار تھی۔ مالی لحاظ سے وہ ہم سے کہیں بہتر تھے۔

بدقسمتی سے شادی رخسانہ سے ہوئی جو ارب پتی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، وہ اس کا دماغ ہمیشہ آسمان پر رہتا تھا۔ اس کی عابد رحمٰن سے کبھی نہیں بنی تھی۔ انہوں نے ابا جان کو یہ سارے حالات بتا دیے تھے۔ مسئلے صرف دو تھے ایک عابد رحمٰن عمر میں مجھ سے کوئی دس سال بڑے تھے دوسرے وہ ایک بچے کے باپ تھے بلکہ اصل مسئلہ یہی تھا کیونکہ خود میری امی ابا جان سے گیارہ سال چھوٹی تھیں۔ امی، ابا جان اور بھائیوں کے ساتھ بہنوں کی بھی کئی میٹنگز ہوئیں۔ اس میں تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کیا گیا۔ عابد رحمٰن کے ماں باپ .... حیات تھے اور کئی بہن بھائی بھی تھے۔ مگر وہ الگ رہتے تھے۔ ماں باپ ان کے بڑے بھائی صادق رحمٰن کے ساتھ رہتے تھے۔ عابد رحمٰن نے کہا تھا اگر میرے گھر والے مان گئے تو پھر ان کے ماں باپ رشتہ لے کر آئیں گے۔ ایک رات امی نے مجھے الگ بلایا۔

"نگار ہم نے عابد رحمٰن کے رشتے پر غور کیا ہے اور ہمیں سوائے پہلی شادی اور ایک بچے کے اس میں کوئی نقص نظر نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو خاندان اور خود عابد رحمٰن کی شخصیت اور اسٹیٹس کے لحاظ سے یہ بہت اچھا رشتہ ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی رضامندی کے ساتھ یہ فیصلہ تم پر چھوڑ دیا ہے۔"

یہ سن کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا لیکن میں نے کہا۔ "امی جب آپ سب راضی ہیں تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے نگار، اگر عابد رحمٰن پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ نہ ہوتا تو ہم صرف اپنا فیصلہ سناتے لیکن اب پوچھنا ضروری ہے۔ تم آرام سے سوچ لو، ہمیں تمہاری خوشیاں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔"

میں نے دو دن بعد ہاں کر دی۔ میں نے محسوس کیا کہ امی اور سب اس فیصلے سے خوش تھے۔ ان سب کو عابد رحمٰن پسند آئے تھے اور کیوں نہ آتے ان میں ناپسند کرنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ جہاں تک رامس کا تعلق تھا تو وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے سنبھالنا اور خود سے راضی کرنا میرے لیے مسئلہ نہ ہوتا اور ایسا ہی ہوا۔ جب عابد کے ماں باپ رشتہ لے کر آئے تو رامس ان کے ساتھ تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں ان کے گھر آنے والی ہوں اور وہ ابھی سے بہت خوش تھا۔ عابد رحمٰن کے گھر والے بھی بہت سلجھے ہوئے اور اچھی نیت کے لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہاں رشتہ لائے ہیں ان کے بیٹے کی شادی پہلی بار ہو رہی ہو اور وہ اپنے بیٹے کے ارمان پورے کریں گے۔ سچ مچ میری اور عابد رحمٰن کی شادی اتنے اچھے طریقے سے اور اتنی دھوم دھام سے ہوئی کہ پہلی بار شادی کرنے والے کی بھی کیا ہوتی ہوگی۔ مجھے میں اکاون سوٹ جو سب اعلیٰ درجے کے تھے اور دو ڈائمنڈ سیٹ اور دو گولڈ سیٹ تھے۔ ہر چیز لاجواب تھی۔ میک اپ کا سامان باہر سے منگوایا تھا۔ ہر سوٹ کے ساتھ میچنگ کی سینڈل اور پرس تھا۔ ولیمہ شیرٹن میں ہوا تھا۔

پہلی ہی رات عابد نے کچھ ایسے والہانہ جذبات کا اظہار کیا کہ میں جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اس سے پہلے میں نے خود کو کبھی خاص نہیں سمجھا تھا لیکن عابد نے مجھے مغرور کر دیا تھا۔ رامس تو تھا ہی میرا دیوانہ وہ بھی کم نہیں نکلے تھے۔ اگلے دن میں امی کے گھر آئی تو رامس میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے اکیلے جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا اور میں اسے ساتھ لے آئی۔ میری کھلی رنگت گھر والوں کو بتانے کے لیے کافی تھی کہ میں کتنی خوش ہوں۔ امی اور بہنوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ عابد دل کے اتنے اچھے تھے کہ انہوں نے جلد میرے گھر والوں کا دل جیت لیا اور ایسے ہو گئے جیسے داماد نہیں بلکہ بیٹے ہوں۔ خاص طور سے ابا جان سے ان کی بہت بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اتفاق سے ابا جان کا دفتر عابد کے دفتر کے پاس تھا۔ اکثر شام کو ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ پھر وہ ہر دوسرے تیسرے دن مجھے ملانے کے لیے گھر لاتے تھے۔

شادی کے بعد میں نے جاب چھوڑ دی اور گھر سنبھال لیا۔ البتہ رامس کو میں پڑھاتی تھی۔ وہ ذہین بچہ تھا لیکن گھر کی پریشانیوں نے اس کا ذہن منتشر کر دیا تھا اب اسے اچھا ماحول ملا تو اس کے جوہر سامنے آئے اور اس نے دوسری کلاس میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ ان دنوں طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن رامس کی تعلیم پر پوری توجہ دیتی تھی۔ شادی کے چار مہینے بعد تک جب کوئی آثار نظر نہیں آئے تو عابد میرے کہنے سے پہلے مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئے اس نے معائنہ کر کے بتایا کہ مجھ میں کچھ کمزوری تھی۔ کمزوری دور کرنے کے لیے اس نے طاقت کی دوائیں دیں اور ان کا رزلٹ ہوا تھا۔ شادی کے چھ مہینے بعد میں امید سے ہوئی۔ عابد بہت خوش تھے انہیں بچوں کی خواہش تھی۔ رخسانہ نے رامس کو بڑی مشکل سے جنم دیا تھا۔ وہ تو بچہ پیدا کرنے کو بھی تیار نہیں تھی لیکن رامس کا علم دیر سے ہوا تھا اور وہ مجبور ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ بلکہ عابد کی لاعلمی میں آپریشن بھی کروا لیا تھا۔ رامس سے محبت کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے بچوں کی بھی خواہش تھی۔ لیکن جب شامیر پیدا ہوا تو ہم دونوں سے زیادہ رامس خوش تھا۔ اب تک وہ اکیلا تھا اور اب اسے ایک بھائی مل گیا تھا۔ اسکول سے آتے ہی وہ شامیر کے ساتھ لگ جاتا تھا۔

شامیر کے تین سال بعد رومی پیدا ہوا۔ اس کے تین سال بعد ہی ایلا دنیا میں آئی تو جیسے ہماری دنیا مکمل ہو گئی۔ شادی کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی عابد میرے اسی طرح دیوانے تھے۔ میری ایک ایک معمولی سی خواہش کا بھی یوں خیال کرتے تھے کہ میں خود پر ناز کرنے لگتی تھی۔ میرے اپنے تین بچے تھے لیکن میں سب سے زیادہ اہمیت رامس کو دیتی تھی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ کہیں اسے خیال نہ آئے کہ وہ میری اولاد نہیں ہے اور دوسرے مجھے اس سے سچ مچ بہت زیادہ محبت تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب سائیکل چلاتے ہوئے گرنے سے رامس کے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا تھا اور اس کی حالت دیکھ کر میری اپنی حالت خراب ہو گئی تھی۔ وہ آپریشن کی وجہ سے دو دن اسپتال میں رہا اور میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ حالانکہ وہ کہتا رہا کہ میں گھر جاؤں وہاں بچے اکیلے تھے لیکن میرا دل نہیں چاہا کہ اسے اسپتال میں اکیلا چھوڑ کر جاؤں۔ جب تک اس کے ہاتھ پر پلاسٹر رہا میں اس کا ہر کام خود کرتی رہی۔

ایلا کے بعد میں نے عابد سے کہا۔ "بس اب میں مزید کوئی اولاد نہیں چاہتی۔"

"یہ تو اللہ کی دین ہے۔" وہ شرارت سے کہتے۔

"ہاں مگر اب میں ان چاروں پر اپنی توجہ رکھنا چاہتی ہوں۔ رامس بڑا ہو رہا ہے اسے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔"

"تم پوری توجہ تو دیتی ہو۔"

"ہاں لیکن آپ نہیں جانتے وہ اس عمر میں ہے جہاں بچے سوچنا شروع کرتے ہیں۔ ان کے پاس عقل تو ہوتی ہے لیکن تجربہ نہیں ہوتا۔ ایسے میں ان کو گمراہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ رامس اپنی ماں کے پاس اور ننھیال جاتا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہاں اس سے کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں لیکن میں اپنے طور پر ہوشیار رہنا چاہتی ہوں۔ میری ہوشیاری یہی ہے کہ میں رامس پر پوری توجہ دوں۔ اسے کسی قسم کی کمی محسوس نہ ہونے دوں۔"

عابد حیران ہوئے تھے۔ "یہ بات میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی۔"

"کیونکہ آپ باپ ہیں اور وہ آپ کے بارے میں جو کہیں گے رامس اسے تسلیم نہیں کرے گا لیکن میرے بارے میں اسے بہکایا جا سکتا ہے۔"

عابد نے سوچا اور تسلیم کر لیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو، واقعی اس معاملے میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ورنہ ہمارے گھر میں مسئلہ ہوگا۔"

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میں اس کے بعد امید سے ہوئی بھی نہیں تھی۔ حالانکہ بعض اوقات ہم احتیاط کو نظر انداز بھی کر جاتے تھے۔ بلکہ میرے ذہن میں تھا کہ مزید اولاد کی خواہش نہ ہونے کے باوجود اگر میں امید سے ہوئی تو میں کفرانِ نعمت نہیں کروں گی۔ ایلا کی پیدائش کے وقت شامیر اسکول جاتا تھا اور رومی ایک سال بعد جانے لگا۔ یوں مجھے دوپہر تک صرف ایک بچے کے ساتھ گھر دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ میں اس دوران میں سارے اہم کام نمٹا لیتی تھی کیونکہ جب یہ تینوں اسکول سے آتے تو میرا سارا وقت ہی ان کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا تھا۔ جب میں بیاہ کر آئی تو اتنے بڑے گھر کی حالت اچھی نہیں تھی۔ کیونکہ رخسانہ کو عابد کی طرح گھر سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سامنے بڑا سا لان اجڑا پڑا تھا کیونکہ اس کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں فرنیچر اچھا خاصا تھا لیکن بے ترتیب اور بعض جگہ بے جوڑ تھا۔

میں نے سب سے پہلے گھر کی سیٹنگ اور فرنیچر بدلا۔ مجھے جہیز میں مکمل بیڈ روم سیٹ ملا تھا لیکن باقی فرنیچر اور چیزیں مجھے عابد نے لے کر دیں۔ میں نے سب سے پہلے رامس کے بیڈ روم کا فرنیچر بدلا۔ اس کی عمر کے لحاظ سے شوخ رنگ اور جدید فرنیچر لیا۔ قالین اور پردے بدلے۔ اس کے بعد ڈرائنگ روم کی باری آئی۔ پھر ڈائننگ روم اور آخر میں دوسرے بیڈ روم جو اضافی تھے وہاں تبدیلیاں

لائی۔ ہر کمرے میں نیا پینٹ بھی کیا گیا تھا۔ ایک سال کے اندر گھر کی صورت ہی بدل گئی تھی اس دوران میں لان کے لیے ایک تجربے کار مالی کو جز وقتی رکھا گیا۔ لان اتنا بڑا نہیں تھا کہ کل وقتی مالی کی ضرورت پڑتی۔ وہ روز دو گھنٹے کام کر جاتا تھا اور اس نے چند مہینے کے اندر لان کو خوب صورت پودوں سے بھر دیا۔ میں نے اپنی پسند کے پودوں کے ساتھ درخت بھی لگوائے تھے۔ چار دیواری کے ساتھ چاروں طرف سرو لگوائے تھے۔ ڈرائیو وے میں دونوں طرف پام کے سیدھے تنوں والے درخت تھے۔ بنگلے کے دائیں بائیں...... دیواروں پر پھولدار بیلیں چڑھی تھیں۔ جن لوگوں نے ایک سال بعد اس گھر کو دیکھا وہ حیران ہوئے تھے۔ لوگ ہمارے گھر کی خوب صورتی اور سجاوٹ کی مثال دینے لگے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بنگلے کی خوب صورتی اور آرائش میں اضافہ ہوا تھا۔ میں ہر تین سال بعد فرنیچر بدل دیتی تھی اسی طرح پردے اور قالین کے ساتھ سیٹنگ کا انداز بھی بدل جاتا۔ عابد کو یہ سب اچھا لگتا تھا۔ دراصل میں یہ سب کرتی بھی ان کے لیے ہی تھی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند اسی لیے میں وہ سب کرنے لگی تھی جو انہیں پسند تھا چاہے اس کے لیے مجھے خود پر کتنا ہی بوجھ کیوں نہ ڈالنا پڑے۔ بچوں کے ساتھ گھر کی یہ ذمے داریاں پورا کرنا آسان نہیں تھا۔ مگر عابد کو خوش کرنے کی خاطر میں نے یہ سب بھی کیا اور اپنی خوشی سے کیا کیونکہ انہوں نے مجھے وہ محبت اور مان دیا جو ہر عورت چاہتی ہے۔ خود کو سرتاپا میرے سپرد کر دیا۔ میری خوشی کو اپنی خوشی بنالیا اور میری ناخوشی ان کی ناخوشی بن گئی۔

عابد حسن نے سات سال ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارے جس نے انہیں کچھ نہیں دیا تھا۔ میں ان گزرے لمحات کی تلافی بھی کرنا چاہتی تھی۔ رامس میں عابد کی جان تھی۔ مجھے شروع میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں رامس سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کرتے۔ اس لیے بھی میں نے رامس کو اپنے بچوں سے زیادہ خود سے قریب کر لیا تھا۔ اس نے بھی جواب میں مجھے ماں جیسا مقام اور محبت دی تھی۔ میری ہر بات اس کے لیے پتھر پر لکیر ہوتی تھی اور میرے چہرے کی ذرا سی کبیدگی اسے بے قرار کر دیا کرتی تھی۔ یہ کیفیت اس وقت بھی رہی جب وہ سولہ سال کا ہو کر کالج جانے لگا تھا۔ کالج سے آتے ہی اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ماما کا نعرہ لگاتا اور اس کے بعد جب تک میں [illegible] مل جاتی وہ پورے گھر میں مجھے تلاش کرتا تھا۔ کھانا [illegible] کھاتا جب میں اسے میز پر لگا کر دیتی تھی حالانکہ ملازمہ [illegible]

میرا گھر میری جنت تھی۔ یہاں سکون تھا اور محبت تھی۔ کوئی کسی سے کینہ نہیں رکھتا تھا۔ شاید روبی [illegible] سے بڑھ کر ایلا رامس کی دیوانی تھی۔ جب تک وہ [illegible] ہوتا ایلا اسی کے پاس رہتی تھی۔ جب وہ چلنے کے قابل ہوئی تو خود رامس کو ڈھونڈ لیا کرتی تھی۔ شام کو رامس کہیں جاتا تو ایلا کی بے قراری دیکھنے والی ہوتی تھی۔ جب رامس آتا تو وہ چمٹ جاتی اور رات سونے تک اس کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔ میں بہ مشکل اسے بہلا کر لاتی تھی ورنہ وہ رامس کو پڑھنے بھی نہیں دیتی تھی۔ وہ پری میڈیکل میں تھا اور ایم بی بی ایس میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ رامس کو ایک بہت اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا لیکن ایم بی بی ایس میں داخلے کے لیے اسے بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ صبح کالج اور شام کو ٹیوشن کے لیے جاتا تھا۔ پھر رات کو بھی دیر تک پڑھتا تھا۔ اس لیے میری کوشش ہوتی تھی کہ اسے اپنی اسٹڈی کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت ملے۔ رامس نے فرسٹ ایئر میں نوے فیصد مارکس لیے تھے اور اگر وہ سیکنڈ ایئر میں بھی یہ تناسب برقرار رکھتا تو اس کا ایم بی بی ایس میں داخلہ یقینی ہو جاتا۔

☆☆☆

بعض اوقات جب انسان سوچتا ہے کہ وہ خوش نصیبی کی انتہا پر ہے اور اب اسے اس سے زیادہ اور کیا ملنا ہے۔ تب قدرت اسے جھٹکا دیتی ہے اور تب اسے پتا چلتا ہے کہ اسے اور کیا حاصل تھا جو اب اس کے پاس نہیں ہے۔ میں اللہ کا بہت شکر ادا کرتی تھی کہ اس نے مجھے اتنا اچھا شوہر اتنے اچھے بچے اور اتنا خوب صورت اور مثالی گھر دیا ہے۔ سب جاننے والے ہم پر رشک کرتے تھے۔ ہمیں مثالی جوڑا قرار دیتے تھے۔ اب کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ عابد کی یہ دوسری شادی تھی۔ لوگ میرے گھر کے سکون اور ماحول کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آجاتا کہ کسی عورت کو اس سے زیادہ کیا ملے گا جو مجھے ملا ہوا ہے۔ شوہر، بچے اور پُرآسائش زندگی۔ مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ یہ سب ایک جھٹکے کی مار ہے۔ جب تک آدمی میں جان ہے تب تک انسان اس کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اور وہ انسانوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے لیکن جیسے ہی اس سے یہ زندگی چھنتی ہے سب اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

ہماری شادی کو بارہ سال ہونے والے تھے۔ عابد نے پروگرام بنایا کہ سالگرہ کا کیک ہم گھر میں کاٹیں گے اور اس کے بعد ہم دونوں ڈنر کے لیے باہر جائیں گے۔ بچوں کے ساتھ کیک کاٹ کر ہم ڈنر کے لیے باہر نکلے تھے۔ عابد نے سی ویو کے ایک اوپن ایئر ریستوران کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے علم ہوتا کہ وہاں میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ منتظر ہے تو شاید میں وہاں قدم بھی نہ رکھتی۔ مگر آدمی کو آنے والے وقت کا پہلے سے علم ہو جائے تو پھر دنیا میں کوئی حادثہ ہی نہ ہو۔ ڈنر کے دوران میں واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ واش روم بہت صاف ستھرا اور چکنی ٹائلوں والا تھا اور یہی چکنی ٹائلیں میرے لیے مصیبت کی وجہ بنیں۔ میں واش بیسن میں ہاتھ دھو کر پیچھے ہٹ رہی تھی کہ نہ جانے کیا ہوا میرا توازن بگڑا اور میں پشت کے بل نیچے گری۔ میرا سر بہت قوت سے فرش سے ٹکرایا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں اور میں آس پاس کی آوازیں سن رہی تھی لیکن جب میں نے حرکت کرنا چاہی تو مجھے پتا چلا کہ میرا جسم میرے قابو میں نہیں ہے۔ میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میری یادداشت پوری طرح بحال تھی اور مجھے فوراً یاد آگیا تھا کہ میں عابد کے ساتھ ڈنر پر گئی تھی اور وہاں واش روم میں پاؤں پھسل جانے سے گر پڑی تھی۔ میرا سر بہت زور سے فرش پر لگا تھا۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ لیکن اب میں ہوش میں تھی اور اس کے باوجود حرکت نہیں کر پا رہی تھی تو کیا اس چوٹ کی وجہ سے میرا جسم مفلوج ہو گیا تھا؟ یہ سوچ آتے ہی میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نہیں نہیں، میں نے گھبرا کر سوچا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید چھت تھی اور یہاں دواؤں کی مخصوص بو تھی مگر میرے آس پاس کوئی نہیں تھا۔

پھر دروازہ کھلا اور مجھے عابد کی آواز آئی اور میں تڑپ گئی۔ مگر یہ تڑپ اندر ہی رہی تھی، اوپر سے میں اپنی پلکیں بھی نہیں جھپکا پا رہی تھی۔ اگر ذرا دیر پلک نہ جھپکے تو آنکھوں میں خارش سی ہونے لگتی ہے لیکن اس وقت مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حد یہ کہ سر جہاں فرش سے لگا تھا وہاں بھی تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔ عابد کسی سے بات کرتے میری طرف آ رہے تھے۔ "ڈاکٹر... آپ لوگوں نے اب تک کیا کیا ہے؟ ...نگار کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ یہ رات سے اسی طرح ہے۔"

گویا صبح ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "دیکھیں ان کے وائٹل سائن خطرے کی حد سے باہر ہیں۔"

"تب یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی ہے۔ بلکہ یہ ہوش میں ہے دیکھیں اس کی آنکھیں کھلی ہیں لیکن یہ نہ تو بات کر رہی ہے اور نہ کوئی حرکت کر رہی ہے۔" عابد کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت جذباتی ہو رہے ہیں اور بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رکھا ہے۔ شاید وہ پہلے میرے پاس تھے اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن اس وقت میں بے ہوش تھی۔ اب مجھے ہوش آگیا تھا۔ مگر یہ کیسا ہوش تھا کہ میں نہ حرکت کر سکتی تھی اور نہ بول سکتی تھی۔ عابد کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا۔ پھر ڈاکٹر نظر... آیا اس نے میری آنکھوں میں روشنی ڈال کر دیکھا اور بولا۔

"یہ پتلی ریٹیکل دے رہی ہے مگر یہ کس حد تک ہوش میں ہیں اس کا فیصلہ سی ٹی اسکین اور چند دوسرے ٹیسٹوں کے بعد ہی چلے گا۔"

"یہ ٹیسٹ کب ہوں گے۔" عابد بہت بے چین تھے۔

"اب سے چند گھنٹے کے اندر۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "یہ تو طے ہے کہ سر کے اندر بلیڈنگ نہیں ہوئی ہے۔ مگر چوٹ سے دماغ متاثر ہوا ہے اور بعض اوقات ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔"

"اس کا کوئی تو علاج ہوگا۔"

"کیوں نہیں لیکن پہلے ہم وجہ کا تعین کر لیں۔"

کچھ دیر بعد مجھے اسٹریچر پر منتقل کر کے دوسری جگہ لے جایا گیا جہاں مجھے سی ٹی اسکین کی مشین میں ڈال دیا گیا۔ اسی طرح دو تین گھنٹے تک مشینوں سے میرا معائنہ ہوتا رہا اور میں ہوش میں تھی۔ میں سب سن اور دیکھ رہی تھی اور میرا دماغ درست انداز میں سوچ رہا تھا صرف مجھے اپنے جسم پر قابو نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ سی ٹی اسکین مشین میں ڈالتے ہوئے میرے کان اور میری آنکھیں بند کر دی تھیں اس سے میری گھبراہٹ بڑھ گئی تھی لیکن شکر ہے جب باہر نکالا تو نرس نے دوبارہ میرے کان اور میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کے باوجود میری گھبراہٹ کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک اچھی بھلی چلتی پھرتی اور جوان عورت اچانک یوں معذور ہو جائے تو اس کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہی کیفیت اس وقت میری تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں لمحے میں ٹھیک ہو جاؤں اور اٹھ بیٹھوں۔ میں بار بار کوشش کر رہی تھی کہ خود کو حرکت دوں یا اپنی پلکیں جھپکاؤں یا پھر

آنکھیں گھمانے کی کوشش کروں مگر مجھے ذرا بھی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر مجھے اپنے بچوں کا خیال آیا میں پھر تڑپ گئی تھی۔ باقی تو بڑے تھے لیکن میری ایلا تو چھوٹی سی تھی۔ آنے والے جنوری میں وہ چار سال کی ہو جاتی۔ وہ میرے بغیر نہیں رہتی تھی گھر میں میں ایک منٹ کے لیے اس کی نظروں سے دور ہو جاؤں تو وہ مجھے تلاش کرتی آ جاتی تھی۔ اگر گھر میں رامس نہیں ہوتا یا وہ مصروف ہوتا تو ایلا ازی میرے پاس ہی ہوتی تھی۔ پتا نہیں اسے کون سنبھال رہا ہوگا۔ رومی، شامیر اور رامس کا کیا حال ہوگا۔ بڑے ہونے پر ان کا یہ حال تھا کہ میرے بغیر ایک دن نہیں رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے میں مہینوں بعد بھائیوں کے گھر ایک دن کے لیے رکنے جاتی تھی۔ انہوں نے میرے بغیر رات کیسے گزاری ہوگی۔

میرے ٹیسٹوں کے دوران عابد میرے ساتھ ساتھ تھے۔ انہوں نے وہی رات والا سوٹ پہن رکھا تھا اور ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے شاید ایک لمحے کو بھی آرام نہیں کیا تھا۔ مستقل اسپتال میں تھے۔ کئی گھنٹے بعد مجھے دوبارہ اسی کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ بڑا اور صاف ستھرا اے سی روم تھا۔ میرے سرہانے تازہ پھولوں کا گل دستہ رکھا تھا جس سے اٹھنے والی خوشبو میں واضح محسوس کر سکتی تھی۔ جب سب کمرے سے چلے گئے تو عابد میرا ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔

"پلیز..... گل تم میری بات سن رہی ہو نا..... پلیز جواب دو..... یوں خاموش نہ رہو..... تم جانتی ہو میں تمہاری ذرا سی خاموشی برداشت نہیں کر سکتا..... بولو نا۔" وہ کہتے کہتے رو دیے تھے۔ میں اپنی حالت کیا بیان کروں میرے بس میں ہوتا تو میں موت کی قیمت پر بھی ان کو ایک بار جواب دیتی۔ مگر میرے بس میں کچھ نہیں تھا۔ میں ویسے ہی ساکت لیٹی رہی۔ کچھ دیر بعد بچے بھی آ گئے۔ وہ میرے آس پاس جمع تھے۔ وہ مجھے پکار رہے تھے، مجھے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر رو رہے تھے۔ خاص طور سے ایلا کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ اتنا بلک بلک کر رو رہی تھی کہ مجھے لگا میرا دل پھٹ جائے گا۔ میں تو اس کی سسکی بھی برداشت نہیں کرتی تھی اور اب وہ میرے سامنے رو رہی تھی۔ اندر سے میں کسی طوفان سے دوچار تھی اور اوپر سے کسی ساکت سمندر کی طرح تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ میرے ٹیسٹ جاری تھے۔ روز کئی ڈاکٹرز مجھے دیکھنے آتے تھے۔ نت نئے علاج تجویز ہوتے تھے لیکن میری بے حسی ختم نہیں ہو سکی تھی۔ [illegible] ڈاکٹروں نے ہار مان لی۔ انہوں نے عابد سے کہا۔ "[illegible] جان کو خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہ از خود سانس لے رہی ہیں [illegible] کا دل بھی خود دھڑک رہا ہے۔ جسم کے دوسرے سسٹم بھی [illegible] کر رہے ہیں۔ اس لیے آپ انہیں گھر میں ہی رکھ سکتے ہیں [illegible] ہمارے بس میں جو تھا وہ ہم کر چکے ہیں۔"

"تب یہ کیسے جاگے گی؟"

"یہ خود جاگیں گی ممکن ہے یہ اب بھی [illegible] ہوں اور ہماری باتیں سن رہی ہوں لیکن جواب دینے سے قاصر ہوں۔ بہتر ہے آپ انہیں گھر لے جائیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے کوئی مستقل نرس رکھ لیں۔"

عابد مجھے اس حالت میں گھر لے جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ڈاکٹروں نے مجھے مزید اسپتال میں رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً عابد مجھے گھر لے آئے۔ ہمارے بیڈ روم کے ساتھ والا کمرا جو عابد نے اسٹڈی بنا رکھا تھا میرے لیے خالی کر دیا گیا۔ یہاں میرے لیے خاص مریضوں والا بیڈ لایا گیا۔ اس میں پہیے لگے تھے اور حسب ضرورت اس کا کوئی بھی حصہ اوپر نیچے کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اس حادثے کے بعد ایک بار بھی آکسیجن نہیں لگائی گئی تھی اس کے باوجود عابد نے آکسیجن ٹینک، ہارٹ بیٹ اور بلڈ پریشر پر نظر رکھنے والی مشین منگوائی تھی۔ مجھے ڈرپ کی مدد سے خوراک دی جا رہی تھی اور ایک کینولا مستقل میرے بائیں ہاتھ سے منسلک تھا۔ اسپتال میں صبح شام دو مرتبہ میری فزیو تھراپی ہوتی تھی کہ میرا جسم اپنی معمول کی حالت پر رہے۔ میرے جسم کی صفائی کی جاتی تھی۔

پہلی رات عابد میرے ساتھ رہے تھے۔ لیکن اگلی صبح ایک نرس آ گئی۔ وہ بڑی دلکش اور جوان عورت تھی۔ نرس کا سادہ لباس بھی اس پر جچ رہا تھا۔ اس نے عابد کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ میں نیم دراز پوزیشن میں تھی اور پورا کمرا میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ وہ میرے پاس آ کر ذرا جھکی۔ "مسز عابد..... میں سحر ہوں آپ کی نرس..... میں بارہ گھنٹے آپ کے ساتھ رہوں گی۔"

ظاہر ہے میں اسے کیا جواب دیتی لیکن نہ جانے کیوں اس پہلی نظر میں وہ مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کمرے میں عابد کے ساتھ آئی تھی۔ مجھ سے بات کر کے اس نے پلٹ کر عابد کی طرف دیکھا۔ "عابد صاحب آپ بے فکر رہیں، میں آپ کی مسز کو سنبھال لوں گی۔ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"مجھے امید ہے آپ اپنے فرائض بہترین انداز میں سرانجام دیں گی۔"

ظاہر ہے عابد کو اپنا بزنس بھی دیکھنا تھا۔ وہ سارا دن میرے ساتھ لگے نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے میری دیکھ بھال کے لیے یہ نرس ہائر کی تھی۔ اس کا نام سحر تھا لیکن وہ دیکھنے میں بھی ساحرہ لگ رہی تھی۔ بہت خوب صورت براؤن ریشمی بال، اس سے لائٹ براؤن فسوں خیز آنکھیں، بہت دلکش ناک نقشہ، گلابی رنگت جو اس کے ہاتھ اور چہرے سے بھی جھلک رہی تھی۔ متوسط قامت اور نرس کے لباس میں چھپا دلکش ترین بدن۔ مجھے حیرت ہوئی تھی اس خوب صورتی کے ساتھ تو وہ ماڈل بن سکتی تھی، اسے نرس بننے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر میں بول سکتی تو اسی لمحے سحر کو بطور نرس مسترد کر دیتی لیکن میں تو مردہ بدست زندہ تھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ عابد اسے چھوڑ کر چلے گئے تو اس نے کھڑکی سے پردے سرکائے جہاں سے لان کا دلکش منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بیڈ کا زاویہ بدلا اور میرا تکیہ درست کرتے ہوئے بولی۔ "مسز عابد۔ آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے، بالکل آپ کی طرح۔ آپ یقیناً ایک خوش قسمت عورت ہیں۔"

میں نے دل میں سوچا کہ میں ایک خوش قسمت عورت تھی۔ میری قسمت مجھ سے روٹھ گئی ہے ورنہ میں اس طرح بے بس و لاچار کیوں بستر پر پڑی ہوتی۔ سحر سارا دن میرے ساتھ رہی تھی۔ وہ میرا مکمل خیال رکھ رہی تھی۔ حد یہ کہ وہ مجھے صاف ستھرا بھی رکھتی تھی۔ اگرچہ مجھے یہ بہت ناگوار گزرتا تھا کہ وہ مجھے صاف کرے لیکن میں مجبور تھی، کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس دن مجھے خیال آیا کہ قدرت نے جو مجھے ہوش دیا ہے اس سے تو بہتر تھا کہ میں سچ مچ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی تو اس اذیت سے تو نہ گزرنا پڑتا۔ سحر صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک میرے ساتھ ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ایک بہت مہنگے اور بڑے اسپتال میں نرس تھی۔ عابد نے وہاں کی انتظامیہ سے اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور اس کے لیے وہ اسپتال کو ہر مہینے پچاس ہزار روپے دیتے۔ اس فیس میں فزیو تھراپی بھی شامل تھی۔ رات کو میں اکیلی ہوتی تھی یا جب تک عابد کو نیند نہیں آتی وہ میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

بچے صبح اسکول جاتے تھے۔ دوپہر میں واپس آ کر ان کو کچھ دیر کے لیے میرے کمرے میں آنے کی اجازت تھی۔ پھر وہ کھانا کھانے اور دوسرے کاموں کے لیے چلے جاتے تھے۔ میں نے ان کاموں کے لیے جو ملازمہ رکھی تھی اب اس نے بچوں کی دیکھ بھال بھی شروع کر دی تھی۔ ایلا اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر جب مجھے گھر منتقل کیا گیا اور سحر میری دیکھ بھال کے لیے آئی تو ایلا اس سے مانوس ہو گئی اور اب وہ دن میں کئی بار میرے کمرے میں آ جاتی لیکن وہ میرے لیے نہیں آتی تھی بلکہ سحر کے پاس آتی تھی۔ وہ اس کے بال بناتی تھی اور بعض اوقات اسے کپڑے بھی تبدیل کرا دیتی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرتی اور اسے کہانیاں سناتی تھی لیکن یہ سب وہ فارغ وقت میں کرتی تھی جب وہ میرا کام کرتی تو ایلا کو باہر بھیج دیا کرتی تھی۔

صبح آنے کے بعد سے وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ اپنے لیے اس نے ایک آرام دہ کرسی منگوائی تھی۔ فارغ وقت میں وہ اس پر بیٹھتی تھی۔ کرسی پر بھی وہ الرٹ پوزیشن میں بیٹھتی تھی۔ اس نے آتے ہی میرے متعلق ایک چارٹ بنا لیا تھا کہ کب کیا کرنا تھا۔ جیسے بستر پر میری پوزیشن بدلنی تھی۔ وہ تقریباً ہر گھنٹے بعد میری پوزیشن بدلتی تھی۔ کبھی سرہانہ اٹھا دیتی اور کبھی مجھے لٹا دیتی تھی۔ دن میں دو بار وہ مجھے ایک ایک گھنٹے کے لیے الٹا لٹا دیتی تھی تاکہ میرا جسم ہر پوزیشن کا عادی رہے۔ کبھی کھڑکی سے پردے ہٹا دیتی تھی اور کبھی پھیلا دیتی۔ مجھے دن بھر میں دو ڈرپ کی بوتلیں دی جاتی تھیں جن میں طاقت بخش ادویات کے ساتھ وہ تمام ضروری منرلز اور وٹامنز بھی دیے جاتے تھے جو ایک انسان کو درکار ہوتے ہیں۔ ہر تیسرے دن وہ سر سے پاؤں تک گیلے اسفنج اور لیکوئیڈ سوپ سے میری صفائی کرتی تھی۔ میرا سر خاص پوزیشن میں رکھ کر بال دھوتی، انہیں شیمپو اور کنڈیشنر کرتی تھی۔ شام کے وقت جب عابد آنے والے ہوتے تو وہ میرا ہلکا پھلکا میک اپ کرتی اور عابد کے آنے پر کمرے سے چلی جاتی تھی۔ عابد کچھ دیر میرے ساتھ رہتے۔ مجھ سے باتیں کرتے تھے اور پھر فریش ہونے چلے جاتے تھے۔ اس کے بعد وہ کھانا کھا کر میرے پاس آتے تھے اور رات دیر تک میرے ساتھ رہتے تھے۔

سحر بے شک پروفیشنل سہی لیکن وہ میری ہر ممکن خدمت کرتی تھی اس کے باوجود پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھی، روز اول سے اس کے لیے میرے دل

میں جو ناپسندیدگی آئی تھی وہ برقرار تھی۔ ایک دن عابد کو دفتر سے دیر ہو گئی تھی اور اتفاق سے سحر کو لینے والی گاڑی بھی نہیں آئی تھی۔ اسپتال کی گاڑی روزانہ اسے چھوڑنے اور لینے آتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے گھر میں صرف ایک ماں تھی اور وہ بھی نابینا تھی۔ اپنے سارے کاموں کے لیے سحر کی محتاج تھی۔ وہ دیر سے جاتی تو ماں پریشان ہو جاتی۔ عابد آئے اور سحر کو دیکھ کر چونک گئے۔ ”ارے تم گئی نہیں ابھی تک نہیں ہو؟“

”گاڑی نہیں آئی ہے، خراب ہو گئی ہے اور کوئی دوسری گاڑی بھی نہیں ہے۔ پلیز آپ مجھے اسٹاپ تک چھوڑ دیں۔“

”میں تم کو گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔“ عابد نے کہا۔

”تھینک یو سر۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”ویلکم۔“ عابد نے کہا اور بریف کیس رکھتے چلے گئے۔ میں اندر سے سلگ اٹھی تھی۔ سحر کے لہجے میں ایک خاص شوخی اور کھنک تھی اور میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ایک عورت کے لہجے میں یہ شوخی اور کھنک کب پیدا ہوتی ہے۔ عابد اسے لے کر چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جلد آ جائیں گے لیکن وہ پورے دو گھنٹے بعد آئے تھے۔ انہوں نے آتے مجھ سے معذرت کی۔ ”سوری گی.... سحر نے چائے پر روک لیا تھا۔“

میں نے سوچا کہ چائے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی ہے۔ تب عابد اتنی دیر سحر کے گھر کیا کرتے رہے۔ عابد تھکے ہوئے تھے اس لیے کچھ دیر بعد سونے کے لیے چلے گئے۔ اب تک یہ تھا کہ عابد سحر سے صرف میرے بارے میں بات کرتے تھے لیکن اس دن کے بعد سے وہ اس کے بارے میں اور اس کی ماں کے بارے میں بھی بات کرنے لگے۔ اگر شام کو جلدی آ جاتے تو اپنی چائے میرے کمرے میں منگوا لیتے اور سحر کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے چائے پیتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ سحر عابد کے ساتھ خوش ہوتی تھی۔ ان سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں شوخی اور کھنک آ جاتی تھی۔ وہ انہیں اپنے بارے میں بتاتی تھی۔ اس نے گریجویشن تک تعلیم حاصل کی پھر نرسنگ کا کورس کیا اور اپنی تعلیم اور شخصیت کی وجہ سے اسے بڑے اسپتال میں جاب مل گئی۔ یہاں اسے اچھی تنخواہ کے ساتھ سہولتیں اور عزت بھی ملتی تھی۔ ایک دن ایسی ہی ایک نشست کے دوران عابد نے اس سے پوچھ لیا۔

”تم تعلیم یافتہ اور پرکشش شخصیت کی مالک ہو، اچھی جاب بھی کر رہی ہو تو شادی کیوں نہیں کی؟“

”اس کی دو وجوہات ہیں عابد صاحب۔“ [illegible] سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اول میری ماں کا میرے سوا کوئی نہیں ہے اور میں شادی کے بعد بھی انہیں ساتھ رکھوں گی۔ دوسرے مجھے آج کل کے نوجوان اچھے نہیں لگتے ہیں۔ ان میں مردوں والی کوئی بات ہی محسوس نہیں ہوتی۔ ابھی تک بچے بنے ہوئے ہیں، ذمے داری اور [illegible] انہیں پروا نہیں ہے۔ کم سے کم مجھے ابھی تک ایسا [illegible] ایسا نہیں ملا۔“

”تب تمہیں کس قسم کے مرد اچھے لگتے ہیں۔“

”مجھے پختہ عمر کے مرد اچھے لگتے ہیں۔ ان میں مردانگی بھی ہوتی ہے، عقل بھی اور ذمے داری بھی۔“ سحر نے کہا تو مجھے لگا جیسے اس نے خاص طور سے عابد کو سامنے رکھ کر یہ بات کی تھی۔ عابد بے شک تقریباً چوالیس کے ہو چکے تھے لیکن سوائے کنپٹی سے جھلکتے سفید بالوں کے کسی چیز سے ان کی عمر کا پتا نہیں چلتا تھا۔ بے داغ چہرہ، فٹ جسم دیکھ کر کوئی انہیں زیادہ سے زیادہ پینتیس کا کہہ سکتا تھا۔

”ہو سکتا ہے تمہیں تمہاری پسند کا آدمی مل جائے۔“ عابد نے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ میری طرف آئی اور تکیے پر میرا سر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

”مسز عابد آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو عابد صاحب جیسا شریکِ حیات ملا ہے۔“ اس کے لہجے میں [illegible] رشک سے زیادہ حسد محسوس ہوا تھا۔ وہ اور عابد ہر دوسرے تیسرے دن اسی طرح ایک ساتھ چائے پیتے تھے۔ ان کی آدھ پون گھنٹا نشست ہوتی تھی۔ شروع میں تو میں بھی ان کا موضوع گفتگو ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں گفتگو سے خارج ہوتی چلی گئی۔ ایک دن عابد جلدی آئے تو سحر نے ان سے کہا۔ ”عابد صاحب مجھے نزدیکی مارکیٹ سے کچھ لینا ہے کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟“

مجھے غصہ آیا تھا۔ اسے کیا حق تھا کہ عابد سے اس طرح چلنے کو کہے۔ میرا خیال تھا کہ عابد انکار کر دیں گے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں.... میں بس چینج کر کے آتا ہوں۔“

اس دن عابد نے پہلی بار نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ ہی مجھ سے مخاطب ہو کر کوئی جملہ کہا اور کمرے سے چلے

گئے۔ میں عابد کے اس سلوک پر آزردہ ہو گئی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ ابھی عابد آئیں گے تو وہ میرے پاس آئیں گے مگر وہ تیار ہو کر آئے اور سحر کو باہر سے ہی آواز دے کر بلا لیا اور دونوں چلے گئے۔ میں نے دور ہوتی آوازوں میں سحر کی کھنک دار ہنسی سنی تھی اور میرا دل سلگ اٹھا تھا۔ مجھے عابد سے امید نہیں تھی کہ وہ بھی مجھے یوں نظر انداز کریں گے۔ انہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ وہ اپنی بیوی کے سامنے ایک غیر عورت کو شاپنگ پر لے کر جا رہے تھے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے ہوش میں کہاں سمجھتے ہیں؟ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ یوں سحر کو شاپنگ پر لے جاتے۔ اس روز بھی انہوں نے واپسی میں خاصی دیر لگائی اور جب سحر واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کئی شاپرز تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس نے کپڑوں اور جوتوں کی دل کھول کر شاپنگ کی تھی۔ شاپرز ساری مہنگی دکانوں کے تھے جہاں نارمل سوٹ اور جوتی بھی ہزاروں میں آتی تھی۔ اس نے اندر آ کر پھولے سانس کے ساتھ کہا۔ ”عابد صاحب سو گئی تھینکس۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے آپ بھی تو میرے لیے اتنا کر رہی ہیں۔“

”کاش میں آپ کے لیے اس سے زیادہ کر سکتی۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ ”آپ اچھے نہیں بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”تم بھی اچھی لڑکی ہو۔“ عابد نے اس کی جوابی تعریف کی اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ اس بار بھی انہوں نے میرے قریب آنے اور میرا احوال معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ان کے اس رویے سے میرے اندر آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور میرا سینہ جل رہا تھا۔ عابد اور سحر میرے سامنے ہی ایک نئے کھیل کا آغاز کر چکے تھے اور اس کا انجام مجھے معلوم تھا۔ کبھی میں بھی اس دور سے گزری تھی جب رخسانہ عابد کی بیوی تھی لیکن میں نے عابد کو اس سے نہیں چھینا تھا بلکہ اس نے خود علیحدگی اختیار کی تھی۔ مگر سحر یہ جانتے ہوئے بھی کہ عابد مجھ سے محبت کرتے تھے ان پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عابد مرد تھے اور مرد کبھی عورت کی چالوں کو نہیں سمجھ پاتا ہے۔ اسے عورت کے معاملے میں ایسا ذہن ملا ہے جو ہمیشہ عورت کا قصور کرتا ہے کبھی اسے غلط یا چالباز نہیں سمجھتا۔

اس کے دو دن بعد سحر آئی تو بہت تیار ہو کر آئی تھی۔ اس نے نرس کے یونیفارم کے بجائے خوب صورت نیلے رنگ کا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔ میک

رفعت حسن

بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور

وہ اس وقت امریکا میں اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لیے بھرپور انداز میں کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے فلسفے اور تصنیف پر مقالہ تحریر کر کے انگلستان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ 1976ء سے یونیورسٹی آف لوئیز ویل (کینٹکی) سے بطور پروفیسر مذہبی علوم وابستہ ہیں۔ امریکا کی کئی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ اسلامی اقدار سے متعلق کورس کی ایک کتاب بھی لکھی۔

مرسلہ: شجاعت حسن، اونٹاریو

اپ کر رکھا تھا اور چوڑیوں کے ساتھ ایک فیشنل جیولری بھی پہن رکھی تھی، سادہ پمپی شوز کے بجائے اس نے ایڑی والی سینڈل پہن رکھی تھی۔ وہ معمول سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آج اتنا تیار ہو کر کیوں آئی تھی۔ عام طور سے وہ مجھ سے باتیں کرتی تھی لیکن جب سے وہ عابد کی طرف زیادہ متوجہ ہوئی تھی مجھ سے باتیں کرنا بند کر دی تھیں اور صرف ڈیوٹی ادا کرتی تھی۔ پہلے وہ روز صبح لان سے پھول لا کر میرے سرہانے رکھتی تھی، یہ معمول بھی بند کر دیا تھا۔

لیکن سحر سے زیادہ مجھے عابد کے رویے پر تکلیف ہو رہی تھی بلکہ مجھے اصل تکلیف ہی ان سے ہوئی تھی۔ دو تین دن سے وہ مجھ سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اگر کبھی پاس آئے بھی تو نہایت روکھے اور بھگتانے والے انداز میں دو تین باتیں کیں اور چلے گئے۔ بچوں کو پہلے ہی میرے پاس کم آنے دیا جاتا تھا۔ اب وہ دن میں بس ایک دو بار ہی میرے کمرے میں آتے تھے۔ سوائے راس کے، وہ کالج سے آتے ہی سیدھا میرے پاس آتا۔ سلام کرتا مجھے ماتھے پر پیار کرتا کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر اپنی پڑھائی اور کالج کی باتیں کرتا اور پھر کھانے کے لیے چلا جاتا۔ اسی طرح وہ شام کو اور رات کو

بھی باقاعدگی سے آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سحر کو پسند نہیں کرتا ہے۔ وہ جب آتا اور سحر ہوتی تو اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ اور ناگواری آجاتی تھی۔ جب سحر نہیں ہوتی تو اس کا موڈ خوشگوار ہو جاتا۔ ایک رات کو وہ آیا تو روہانسا لگ رہا تھا۔ سحر جا چکی تھی اور عابد ابھی میرے پاس نہیں آئے تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''ماما پلیز اٹھ جائیں.... ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے.... یہ عورت کیوں ہر وقت پاپا کے پیچھے لگی رہتی ہے..... ماوہ مجھے زہر لگتی ہے.... لیکن اس نے پاپا کو اپنی مٹھی میں کر لیا ہے۔ اب پاپا اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔''

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ اب عابد اسے چھوڑنے جاتے ہیں۔ تب ہی وہ کئی دن سے دیر سے آتے تھے اور کچھ دیر بیٹھ کر سونے چلے جاتے تھے۔ ان کے انداز میں بیزاری صاف محسوس ہوتی تھی کہ وہ دل پر جبر کر کے ڈیوٹی بھگتانے آتے ہیں۔ راس رو رہا تھا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے ہمیشہ اسے سگی اولاد سے بڑھ کر سمجھا تھا اور اب وہ میرے سامنے رو رہا تھا تو میرا دل کیوں نہ تڑپتا؟ مگر میں اتنی بے بس تھی کہ اسے تسلی بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی تھی۔ راس سترہ سال کا ہونے والا تھا اور اب وہ جوان لڑکا تھا اسے معلوم تھا کہ سحر کس چکر میں تھی اور اس کے باپ کے گرد اپنا گھیرا کس طرح تنگ کر رہی تھی۔ راس نے کچھ دیر بعد آنسو پونچھے اور غصے سے بولا۔ ''ماما آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں ورنہ میں اس عورت کو قتل کر دوں گا۔''

میں دہل کر رہ گئی۔ راس کا غصہ بہت تیز تھا۔ اسے غصہ کم آتا تھا لیکن جب آتا تو وہ بے قابو ہو جاتا تھا اور بڑی مشکل سے اس کا غصہ اترتا تھا۔ اس نے تصدیق کر دی تھی کہ سحر اور عابد کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ اس دن سحر کو تیار دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ عابد شام کو جلدی آگئے اور سیدھے میرے کمرے میں آئے۔ اس لیے نہیں کہ یہاں میں تھی بلکہ اس لیے کہ یہاں سحر تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہ چمک آئی جو کبھی مجھے دیکھ کر آتی تھی۔ ''آج تو تم بہت تیار ہو کر آئی ہو۔''

''ہاں۔'' سحر نے ایک ادا سے کہا۔ ''آج میری برتھ ڈے ہے اس لیے میں نے سوچا ذرا تیار ہو جاؤں۔ آپ کو اچھا لگا۔''

''بہت اچھا لگا۔'' عابد نے کہا اور پھر انہوں نے سر کے اشارے سے سحر کو باہر آنے کو کہا۔ ان کا خیال تھا کہ میں یہ اشارہ نہیں دیکھ سکی تھی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد بے نیازی سے انداز میں باہر گئی اور جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ عابد نے باہر بلا کر نہ جانے اسے کیا کہا تھا۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار رہا تب۔ وہ کام کے دوران فارغ بیٹھی ہوئی گنگناتی رہی تھی۔ مغرب سے قریب اس نے اپنا میک اپ تازہ کیا اور میرے بازو میں لگی ہوئی ڈرپ کی بوتل نکال دی جو ختم ہو گئی تھی۔ آج اس نے مجھے دوپہر میں دوسری بوتل دے دی تھی۔ گویا اسے جانے کی جلدی تھی۔ اپنا کام مکمل کرتے ہی وہ جانے کی تیاری کرنے لگی۔ چھ بجے یعنی مقررہ وقت سے دو گھنٹے پہلے وہ جا رہی تھی اور تب میں نے عابد کی ہلکی سی آواز سنی۔ ''نگار کو تو پتا نہیں ہے۔''

سحر ہنسی۔ ''ان بے چاری کو کیا پتا... اب چلیں دیر ہو رہی ہے کیک بھی جا کر آنا ہے۔''

عابد اس کی برتھ ڈے منانے اسے کہیں لے جا رہے تھے۔ شاید عابد نے یہی بات کہنے کے لیے اسے اشارے سے باہر بلایا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کھل گئی تھی اور اس نے جلدی جلدی اپنے کام نمٹائے تھے۔ ان کے جانے کے بعد راس بپھرا ہوا کمرے میں آیا۔ ''ماما اب میں برداشت نہیں کر سکتا... پاپا اسے باہر لے جانے لگے ہیں۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں... میں یہاں رہا تو اس عورت کو یا خود کو مار دوں گا۔''

میں راس کو روکنا چاہتی تھی کہ وہ یوں نہ جائے۔ اس کا گھر تھا مگر وہ بہت غصے میں تھا۔ وہ روتا ہوا جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ شامیر اور روبی بہت کم سن تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ روتے ہوئے آئے۔ ''ماما بھائی جا رہے ہیں۔ انہیں روک لیں۔''

ملازمہ آ کر ان دونوں کو لے گئی۔ وہ بھی اس صورت حال پر دکھی نظر آ رہی تھی۔ عابد اپنے اصل روپ میں آگئے تھے۔ انہیں مجھ سے بس اتنی محبت تھی جب تک میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ ان کا گھر اور انہیں دیکھ رہی تھی اب میں بستر پر ایک بے جان لاش کی طرح پڑی تھی تو انہیں میری ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے دوسری عورت تلاش کر لی تھی۔ ٹھیک ہے اس میں سحر کا قصور بھی تھا وہ کیوں ایک شادی شدہ مرد کی طرف جھکی تھی لیکن اصل قصور عابد کا تھا۔ وہ شادی شدہ تھے اور ابھی ان کی بیوی زندہ تھی۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے ایک غیر عورت کے ساتھ گھوم پھر رہے تھے۔ میں ان کے

لیے بوجھ بن گئی تھی اور اب انہیں ایک زندہ بیوی کی ضرورت تھی۔ میں مارے دکھ کے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ کیا ہماری محبت اتنی ہی کمزور تھی کہ حالات کا ایک تھپیڑا نہ سہہ سکی؟ کیا عابد کے نزدیک میں صرف ایک خوب صورت عورت تھی۔ اب میں ان کے قابل نہیں رہی تھی تو انہوں نے مجھے نظر انداز کر دیا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ چیخیں مار کر روؤں۔ جاہل عورتوں کی طرح بین کروں کہ میرا سب لٹ گیا اور میں برباد ہو گئی۔ مگر میں پلک تک نہیں جھپکا سکتی تھی۔ چیخیں کیسے مارتی اور بین کیسے کرتی؟ میرے تو آنسو بھی خشک تھے اگر آنسو ہی نکل جاتے تو میرے اندر جو آگ لگی تھی شاید اس میں کچھ کمی آتی۔

عابد اس رات بہت دیر سے آئے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اور فوراً ہی ان کے چلانے کی آواز آئی، وہ ملازمہ سے پوچھ رہے تھے کہ راس کس کی اجازت سے گھر سے گیا تھا۔ ملازمہ سہمی ہوئی آواز میں بتا رہی تھی۔ عابد میرے کمرے میں آئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''سنا تم نے برخوردار اب اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ باپ کی ان کی اجازت سے کوئی کام کرنا چاہیے۔'' عابد کا لہجہ بہت تلخ تھا۔

''کیونکہ آپ وہ کر رہے ہیں جو ایک جوان ہوتے بیٹے کے باپ کو زیب نہیں دیتا ہے۔'' میں نے دل میں کہا۔

''اس کا خیال ہے میں تمہارے ساتھ کوئی ناانصافی کر رہا ہوں۔ کیا میں نے تمہارا خیال نہیں رکھا... تمہارے علاج میں کوئی کمی چھوڑی۔ اب یہ میرا قصور تو نہیں ہے کہ تم ٹھیک نہ ہو سکیں... کیا مجھے سب چھوڑ کر تمہارے پاس بیٹھ جانا چاہیے.... بولو نگار... میری زندگی بس یہاں آ کر ختم ہو جانی چاہیے... نہیں، زندگی اور اس کی خوشیوں پر میرا بھی حق ہے۔'' عابد بولے اور کمرے سے چلے گئے۔

میں اندر سے لرز رہی تھی بالآخر عابد کھل کر سامنے آگئے تھے۔ انہوں نے ڈھکے چھپے انداز میں کہہ دیا تھا کہ انہیں ایک مردہ عورت کی نہیں ایک زندہ عورت کی ضرورت ہے جو زندگی کی مسافتوں میں ان کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اٹھ کر کھڑی ہو جاؤں اور عابد سے کہوں کہ میں ابھی مری نہیں ہوں۔ میرے جیتے جی آپ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔

مگر یہ سارا تلاطم اندر ہی اندر رہا تھا اوپر سے میں ساکت تھی۔ رفتہ رفتہ میرا لرزا رک گیا۔ اب میں بے آواز رو رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ عابد ایسا کیوں کر رہے تھے جہاں تک میں نے انہیں جانا تھا یہ ان کی فطرت نہیں تھی۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہے تھے۔ عابد رات کو ہی راس کو لینے رخسانہ کے گھر چلے گئے تھے لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے عابد کے سامنے آنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ عابد واپس آئے تو انہوں نے میرے کمرے میں آ کر مجھے یہ سب بتایا پھر بہت زہریلے لہجے میں بولے۔ ''وہ برخوردار سمجھتے ہیں کہ میرے باپ بن کر میری زندگی کے فیصلے کریں گے لیکن میں تمہیں اور اسے بتا دوں گا کہ میں اپنے فیصلے خود کرتا ہوں چاہے کوئی اس سے متفق ہو یا نہ ہو اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں سحر سے شادی کرنے جا رہا ہوں اور یہ شادی بہت جلد ہوگی۔''

یہ کہہ کر عابد دندناتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور درمیان کا دروازہ بہت زور سے بند کیا تھا۔ میں اوپر سے تو ساکت تھی ہی عابد کی بات سن کر میں اندر سے بھی ساکت ہو گئی، مجھے لگا جیسے اب میں سچ مچ مردہ ہو گئی ہوں۔ ایک ایسا مردہ جسے دفن نہ کیا گیا ہو۔ شاید میں مر گئی تھی لیکن ڈاکٹر مجھے زندہ سمجھ رہے تھے۔ کاش انہوں نے مردہ ہی سمجھا ہوتا اور عابد نے محبت کے ساتھ مجھے دفنا دیا ہوتا تو آج رات مجھے یہ عذاب نہ بھگتنا پڑتا۔ اس ساری رات میں پل پل جیتی اور پل پل مرتی رہی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں صبح نہیں دیکھ سکوں گی اس لیے جب صبح کی روشنی پھیلی تو مجھے تعجب ہوا تھا کہ میں زندہ تھی۔ بچے اٹھ گئے تھے اور اسکول جانے کے لیے تیار ہو کر میرے پاس آئے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ایلا ابھی سو رہی تھی اور عابد کے کمرے میں خاموشی تھی۔

آٹھ بجے سحر کمرے میں داخل ہوئی تو میرا دل چاہا کہ میں زبان سے اسے کچھ کہہ نہیں سکتی تو کم سے کم اپنی آنکھیں ہی بند کر لوں۔ مگر میں چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر سکی تھی۔ مجھے اس کی صورت سے نفرت ہو رہی تھی۔ اس نے آ کر مشینی انداز میں اپنی ڈیوٹی شروع کی۔ اس کے تاثرات سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ مجبوراً یہ کام کر رہی ہے اگر اس کے بس میں ہوتا تو انکار کر دیتی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ شاید اسے بھی میری نگاہوں میں اپنے لیے نفرت نظر آ رہی تھی۔ اپنا کام کر کے وہ کرسی پر بیٹھ گئی اس کے چہرے پر کشیدگی صاف جھلک رہی تھی۔ شاید عابد نے اسے تازہ ترین حالات سے خبردار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد عابد کمرے میں آئے وہ سحر سے

بھی زیادہ مضطرب لگ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"نگار میں نہیں جانتا کہ تم ہوش میں ہو یا نہیں اور میری باتیں سن رہی ہو یا نہیں .. اس کے باوجود میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اور سحر آج کچھ دیر بعد نکاح کر رہے ہیں۔ اس نکاح کے بعد سحر اپنے گھر میں رہے گی اور کچھ عرصے بعد میں اسے دوسرا مکان لے دوں گا۔ یہ بنگلا تمہارا اور بچوں کا رہے گا۔ سحر کا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس کا صرف مجھ سے تعلق ہوگا۔"

عابد کہہ کر چلے گئے انہوں نے سحر سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ سحر نے کوئی بات کی تھی۔ انہیں بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی وہ دونوں ہی سب کچھ طے کر چکے تھے۔ رات سے اب تک مجھے لگ رہا تھا جیسے میں سچ مچ مر چکی ہوں۔ لیکن عابد کی اس بات نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے سامنے اور میرے ہی گھر میں مجھ پر سوتن لانے کا اعلان کر رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی آتش فشاں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا ہے۔ یہ آتش فشاں ہر اس عورت کے اندر ابھر آتا ہے جس کا شوہر اس کے ہوتے ہوئے اس پر سوکن لانا چاہتا ہو اور وہ اس آتش فشاں کے لاوے میں سب کچھ جلا دینا چاہتی ہے۔ چاہے وہ اس کا گھر کیوں نہ ہو۔ مگر دوسری عورتوں کے مقابلے میں میں بے بس تھی۔ بستر پر پڑی تھی اور اپنی مرضی سے جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔

سحر سامنے بیٹھی مجھ سے آنکھیں چرا رہی تھی۔ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ پہلے ہی میرے لیے پریشان تھے۔ امی ابو تو گزر چکے تھے لیکن میرے بہن بھائی تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ عابد کیا کرنے جا رہے تھے ورنہ وہ انہیں روکنے کی کوشش ضرور کرتے۔ مگر جو شخص اپنے بیٹے کے کہنے پر باز نہیں آیا تھا اور اسے پروا نہیں تھی کہ جس بیٹے کی خاطر اس نے دوسری شادی کی تھی اب وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے، وہ میرے بہن بھائیوں کو کیوں خاطر میں لاتا؟ اس کی آنکھوں پر تو سحر کے حسن کی پٹی بندھ گئی تھی۔ میں نے دل و جان کی نفرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ وہ عابد کو مجھ سے چھین لینا چاہتی تھی۔ میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ "میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"

لیکن میں انہیں روک بھی نہیں سکتی تھی۔ راس گھر میں نہیں تھا۔ ملازمہ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ میرے گھر والے بلکہ عابد کے گھر والے بھی شاید اس فیصلے سے [illegible] تھے۔ انہیں کون روکتا؟ حالات عابد اور سحر کے [illegible] طرح سازگار تھے۔ اب کچھ دیر کی بات تھی ان کا نکاح ہو جاتا اور اس کے بعد کوئی چاہتا بھی تو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ [illegible] کے باوجود میرے اندر گونجنے والی سرگوشی مسلسل بھ رہی تھی۔ "میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"

سحر اب مضطرب تھی کیونکہ وقت قریب آ رہا تھا اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ وہ [illegible] کہ اس نے معمول کے کام بھی نہیں کیے ورنہ میری [illegible] پوزیشن چینج کی۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے ہاتھ لگائے۔ مجھے اس خیال سے ہی نفرت ہو رہی تھی۔ شکر ہے اس نے ڈرپ لگانے کے بعد دوبارہ مجھے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ فزیو تھراپی کرانے والی دس بجے آتی تھی۔ نو بجے عابد آئے اور انہوں نے سحر کو کمرے سے باہر بلایا۔ وہ بظاہر سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن مجھے صاف سنائی دے رہا تھا۔ "تم تیار رہنا کچھ دیر میں مولانا صاحب آ جائیں گے پھر کاغذی کارروائی مکمل کر کے تمہیں بلائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سحر نے جواب دیا۔ "لیکن عابد مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عابد نے اسے تسلی دی اور چلے گئے۔ سحر واپس آ کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان تھی اور اپنی انگلیاں [illegible] رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کا گلا مروڑ دوں۔ میرے اندر لگی آگ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ جائے گا۔ میں ریزہ ریزہ ہو جاؤں گی۔ یہ آگ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی لیکن مجھے ضرور مار ڈالے گی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری آنکھوں پر دباؤ آ رہا ہے۔ کوئی چیز آنکھوں سے باہر آنے کے لیے بے تاب تھی پھر نمی کا ایک قطرہ گوشے سے نکلا اور میرے رخسار پر بہنے لگا۔ چوٹ لگنے کے بعد یہ پہلی حرکت تھی جو میرے ارادے سے ہوئی تھی۔ سحر نہیں دیکھ رہی تھی اور اب میرے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ملازمہ نے دروازہ کھول کر سحر سے کہا۔

"بی بی آپ کو صاحب جی بلا رہے ہیں۔"

سحر تیزی سے کھڑی ہوئی اور اس بار بھی اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ورنہ اسے پتا چل جاتا کہ میری آنکھیں اشکبار ہیں۔ شاید میرے بس میں یہی سوچ تھی جو میں اپنی ہونے والی بربادی پر بہا سکتی تھی۔ سحر باہر نکل گئی۔ مولانا آ چکے تھے اور یقیناً عابد اور سحر کے نکاح کی کارروائی ہونے والی تھی۔ سحر کو ایجاب و قبول کے لیے بلایا گیا تھا۔ میرا غصہ پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ آنسوؤں نے پانی کا نہیں پیٹرول کا کام کیا تھا۔ میرا ذہن پھر اسی جملے کی تکرار کرنے لگا۔

"میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"

میری چشم تصور مجھے دکھا رہی تھی کہ نشست گاہ میں عابد اور سحر قاضی اور گواہوں کے ساتھ موجود ہیں۔ نکاح پڑھایا جا رہا ہے۔ عابد اور سحر نکاح نامے پر دستخط کر رہے ہیں اور پھر قاضی ایجاب و قبول کے لیے کہہ رہا ہے۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر ایک دھماکا ہوا ہو اور میں بے ساختہ اٹھ بیٹھی۔ آواز اب جیسے طوفان کا شور بن گئی تھی۔ میں نے زور سے کہا۔ "میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔"

مارے جوش و جذبات کے مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میرا مفلوج جسم حرکت کرنے لگا ہے۔ میں نے ڈرپ اور اس کے ساتھ کینولا بھی اتار پھینکا اور بستر سے اتر گئی۔ ایک لمحے کو لڑکھڑائی۔ ممکن ہے میں عام حالات میں اس طرح ٹھیک ہوتی تو شاید اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں پاتی کیونکہ ڈیڑھ مہینے سے میرا جسم ساکت رہا تھا۔ مسلز بے جان تھے اور جسم فوری حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن میرے اندر لگی آگ نے مجھے آتش فشاں بنا دیا تھا اور میں پھٹ پڑنے کے لیے بے تاب تھی۔ ایک بار لڑکھڑانے کے بعد میرے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جم گئے اور میں قدم قدم کر کے دروازے کی طرف بڑھی۔ دیوار کا سہارا لے کر میں کمرے سے باہر آئی اور دیوار کے سہارے ہی نشست گاہ کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہی تھی میرا جوش و غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر جب نشست گاہ کے پاس پہنچی تو خلاف توقع مجھے وہاں خاموشی ملی تھی۔ اگر وہاں پانچ چھ افراد تھے تو اتنی خاموشی کیوں تھی؟ اس سے پہلے میں نشست گاہ میں داخل ہوتی عابد کی آواز آئی۔

"اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔"

"پلیز عابد صاحب۔" سحر نے کہا۔ "آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔"

"تم نہیں جانتیں ... نگی میرے لیے کیا ہے۔ وہ میرے لیے یہ جذبات رکھتی ہے۔ وہ مر جائے گی۔"

"اس کے برعکس مجھے یقین ہے انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

گویا عابد کو اب بھی میرا خیال تھا اور سحر اپنی سوچ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ خوش ہونے کے باوجود میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ صرف ان دونوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ نکاح کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اور باقی لوگ جا چکے تھے۔ عابد نے پھر کہا۔ "نہیں بس بہت ہو گیا.... میں نگی کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے وہ سب سمجھ اور سن رہی ہے۔ وہ پہلے ہی معذوری کی اذیت برداشت کر رہی ہے۔"

"عابد صاحب، یہ ان کی بہتری کے لیے ہے۔" سحر نے پھر کہا تو میں نے اس کے لہجے پر غور کیا۔ شادی کے بعد بیوی شوہر کو صاحب نہیں کہتی ہے اور نہ ہی اس لہجے میں بات کرتی ہے وہ تو میرے سامنے عابد سے اتنے شوخ انداز میں بات کرتی تھی اور یہاں اس کا لہجہ نارمل تھا۔ جیسے وہ اپنے سے بڑے رتبے کے شخص سے بات کر رہی ہو۔ عابد بولے۔

"دیکھو یہ ڈراما دس دن سے جاری ہے۔ اگر نگی پر اس کا اثر ہونا ہوتا تو ہو چکا ہوتا۔"

"آپ بھول رہے ہیں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کوئی بڑا شاک ہی ان کو دوبارہ سے متحرک کر سکتا ہے۔ ان کے لیے اس سے بڑا شاک کیا ہوگا کہ آپ ان کے سامنے دوسری شادی کر رہے ہیں۔"

"یعنی میں انتظار کروں۔"

"میرا مشورہ یہی ہے۔ آپ نے خود پر اتنا جبر کیا ہے، میں نے دل پر پتھر رکھ کر اداکاری کی ہے تو اس کا کوئی نتیجہ تو نکلنے دیں جلد بازی نہ کریں کیونکہ صبر کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔"

بات اچانک ہی پلٹ گئی تھی۔ تو کیا عابد اور سحر ڈراما کر رہے تھے تاکہ مجھے شاک دے کر ٹھیک کیا جا سکے۔ میرا رک جانے والا دل پھر سے دھڑکنے لگا اور مجھے ٹھیک ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ وہ سب ڈراما تھا۔ عابد نے سحر سے شادی نہیں کی تھی۔ وہ بدستور میرے تھے۔ اس خوشی نے میرا جوش اور غصہ ختم کر دیا اور جب یہ ختم ہوئے تو میری کمزوری حاوی آ گئی اور میں گرنے لگی تو نشست گاہ کے دروازے پر حائل پردہ تھام لیا۔ پردہ ہلا تو عابد نے دیکھ لیا۔ وہ زور سے بولے۔ "نگی" اور جھپٹ کر آگے آئے انہوں نے مجھے سنبھال لیا۔ "نگی تم خود آئی ہو یہاں؟"

ان کی بانہوں میں آ کر مجھے یوں لگا جیسے میں پھر سے جی اٹھی ہوں۔ عابد نے مجھے احتیاط سے صوفے پر لٹا دیا اور سحر سے کہا۔ ”ڈاکٹر کو کال کرو۔“

سحر ڈاکٹر کو کال کرنے لگی۔ عابد کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرے آنسو تو رک ہی نہیں رہے تھے۔ سحر نشست گاہ سے نکل گئی تھی۔ عابد مجھ سے سوری کر رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ”سوری تو مجھے کرنا چاہیے جو میں نے آپ کی محبت پر شک کیا۔“

”نہیں تم نے بہت تکلیف سہی.... یقین کرو میں تمہارے پاس نہیں آتا تھا کہ تم سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔“

سحر اندر آ گئی۔ ”میں نے ڈاکٹر کو کال کر دی ہے اور پلیز انہیں بستر پر لے چلیں۔“ وہ پروفیشنل بن گئی تھی۔ ”ابھی ان کی کنڈیشن ٹھیک نہیں ہے۔“

عابد مجھے اٹھا کر میرے کمرے میں لے آئے اور بیڈ پر لٹا دیا۔ سحر مجھ سے کہہ کر جسم کے مختلف حصوں کو حرکت دلوانے لگی۔ اس دوران میں ڈاکٹر آ گیا تھا۔ اس نے میرا معائنہ کیا۔ میں سحر سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں کیا سوچا تھا اور وہ کیا نکلی تھی۔ کسی لڑکی کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ کوئی اپنی ذات کے ساتھ اس قسم کا ڈراما برداشت نہیں کرتی ہے۔ ڈاکٹر مطمئن ہو کر عابد کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا تو میں نے سحر کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”مجھے تم سے بھی سوری کرنی ہے۔“

”ارے نہیں۔“ وہ زبردستی ہنسی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”نہیں تم نے میرے لیے بہت کیا ہے۔ کوئی عورت اپنے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی جو تم نے میرے لیے کیا ہے۔“

”میں نے کسی کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔“ اس نے آہستگی سے کہا اور دوسری طرف مڑ گئی لیکن میں نے دیکھ لیا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے آنسو صاف کیے اور جب عابد آئے تو اس نے کہا۔ ”عابد صاحب اب میری ضرورت نہیں رہی ہے۔“

”اللہ کا شکر ہے کہ ٹھیک ہو گئی ہے۔“ عابد بہت خوش تھے۔ ”میں اور نگی تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے۔“

”آپ انہیں فوری اسپتال لے جائیں۔“ سحر نے کہا اور اپنا پرس اٹھا کر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

”رکو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

سحر نے میری طرف دیکھا اور عجیب انداز میں ہنسی۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے اب آپ کی مسز ٹھیک ہو گئی ہیں۔“

”نہیں تم ہمارے ساتھ جاؤ گی۔“ میں نے کہا تو وہ رک گئی۔ عابد مجھے اسپتال لے گئے اور مجھے وہاں چھوڑ کر سحر کو چھوڑنے چلے گئے۔ ڈاکٹرز نے میرا معائنہ کیا اور مجھے مکمل طور پر صحت یاب قرار دیا۔ وہ حیران تھے کہ ایسا کون سا شاک تھا جس نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا کیونکہ اس قسم کے مریض بہت سست روی سے ٹھیک ہوتے ہیں۔ راستے میں عابد نے مجھے بتا دیا تھا کہ راس اصل میں کانگی کا ... اور وہ بھی اس ڈرامے میں شامل تھا۔ میں بچوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ عابد فون کر کے سب کو میرے بارے میں بتا رہے تھے۔ مختلف ٹیسٹ اور تھراپیوں سے گزار کر ڈاکٹرز نے مجھے شام کو گھر جانے کی اجازت دی تھی۔ عابد سحر کو چھوڑ کر آئے تو انہوں نے اس کے بارے میں بات نہیں کی تھی جب کہ میں ان سے سحر کے بارے میں بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔

میں گھر پہنچی تو بچوں کے ساتھ میرے بہن بھائی اور دوسرے رشتے دار بھی وہاں موجود تھے۔ راس مجھ سے لپٹ گیا اور کان میں کہا۔ ”سوری ماما۔“

میں نے اسے پیار کیا۔ ”تمہیں تو میں بعد میں بتاؤں گی۔“

لوگوں سے نمٹتے ہوئے رات ہو گئی تھی۔ بچے مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ عابد نے بہ مشکل انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر سونے کے لیے بھیجا تھا۔ جیسے ہی عابد مجھے اکیلے میں ملے میں نے ان سے سحر کے بارے میں بات کی۔

”عابد وہ تیار کیسے ہوئی؟“

”میں نہیں جانتا... ڈاکٹر نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کوئی شاک تمہیں ٹھیک کر سکتا ہے لیکن یہ خیال سحر کے ذہن میں آیا اور اسی نے مجھے قائل کیا۔ وہ بہت ذہین ہے اس نے سارا ڈراما اس طرح ترتیب دیا کہ تمہیں بالکل حقیقت لگے۔ پھر وہی مجھے مجبور کرتی رہی ورنہ میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا تمہارے لیے یہ سب کتنا اذیت ناک ہوگا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”لیکن اسی اذیت نے مجھے ہوش میں لے آئی۔ اس کے لیے میں سحر کی شکر گزار ہوں۔“

عورت ایک پہیلی

مکرمی جناب!
سلام مسنون!
کسی نے سچ کہا ہے کہ ”عورت ایک پہیلی ہے“ اس بات کو خود میں نے بھی پور پور محسوس کیا، کہا جاتا ہے کہ عورت کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ میں نے بھی دو عورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پہلی عورت وہ جسے میں نے اپنا سمجھا مگر اس نے میرا سہارا لے کر اپنی زندگی سنواری، دوسری عورت وہ جو مجھے اپنی جاگیر سمجھ رہی ہے۔ امید ہے میری آپ بیتی آپ کو پسند آئے گی۔

عمران
(لاہور)

نازیہ مجھ سے جنون کی حد تک محبت کرتی تھی۔ میرے قریب کسی عورت کا گزر بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کسی تقریبات میں جہاں مکس گیدرنگ ہوتی وہ مستقل میرے ساتھ چپکی رہتی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ اسے یہ گوارا بھی نہیں تھا کہ میں کسی جان پہچان کی عورت سے بات کروں۔ میرے دفتر میں کوئی عورت کام نہیں کرتی تھی کیونکہ نازیہ سے شادی کے بعد مجھے اس کی فرمائش پر تمام فیمیل اسٹاف کو فارغ کرنا پڑا تھا۔ اس

طرح میرا جن خواتین سے ملنا جلنا تھا اور صرف دوست کے زمرے میں آتی تھیں ان سے بھی قطع تعلق کرنا پڑا۔ نازیہ نے شادی کی پہلی رات وارننگ دے دی تھی کہ وہ سب برداشت کرسکتی ہے لیکن میرے آس پاس دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ ہماری محبت کی شادی تھی۔ لیکن محبت میں پہل نازیہ نے کی تھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ پہلی ملاقات میں وہ سب کچھ میرے نام کر چکی تھی۔

نازیہ کا تعلق فیصل آباد کے ایک بہت بڑے کاروباری خاندان سے ہے۔ وہ اب بھی نہیں بلکہ کھرب پتی ہیں۔ کاروباری تو ہم بھی ہیں۔ میرے والد نے تیس سال پہلے ایک ٹیکسٹائل یونٹ لگایا تھا جسے محنت کر کے آج ٹیکسٹائل مل میں بدل دیا ہے۔ کیونکہ میں ایک ہی بیٹا ہوں اس لیے بزنس میرا ہے۔ مگر ہم نازیہ کے خاندان جتنے دولت مند نہیں ہیں۔ اگر نازیہ اپنے والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکاتی تو اس کی شادی کسی ہم پلہ خاندان میں کی جاتی۔ اس کے والدین اور گھر والے اس رشتے پر راضی نہیں تھے لیکن نازیہ کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے تھے۔ یوں ہماری شادی ہوئی۔ نازیہ خوب صورتی میں بلاشبہ لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی مرد اس جیسی عورت پا کر ناخوش ہو ہی نہیں سکتا.... پھر وہ فطرت اور عادات کی بھی اچھی ہے اس لیے شادی کے دو سال گزرنے کے بعد بھی ہمارے درمیان کبھی کوئی سنجیدہ لڑائی یا تنازعہ نہیں ہوا تھا۔

شادی کے بعد وہ یوں ہمارے گھر میں رچ بس گئی جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتی آئی ہو۔ اس نے یہاں کے رواج اپنا لیے اور بھول گئی کہ اس کا تعلق کہاں سے تھا۔ اپنے میکے میں وہ مل کر پانی بھی نہیں پیتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی ذمے داریاں اتنے اچھے انداز سے نبھائیں کہ ہر طرف اس کی واہ واہ ہونے لگی۔ وہ بیوی میری ہے لیکن مجھ سے زیادہ امی ابو اس پر فریفتہ ہیں۔ ان کی زبان پر نازیہ کا نام ہی رہتا ہے۔ گھر میں کئی ملازم ہیں لیکن میرے سارے کام وہ خود کرتی ہے۔ میں منع کروں تب بھی وہ نہیں مانتی ہے۔

ایک بار اس نے کہا۔ ”عمران آپ نہیں جانتے کہ آپ کے کام کر کے مجھے کتنی خوشی ملتی ہے اور یہ کون سے بہت بڑے کام ہیں۔ سب بیویاں اپنے شوہروں کے کام کرتی ہیں۔“

”مجھے بھی اچھا لگتا ہے لیکن میں تمہیں یوں کام کرتے نہیں دیکھ سکتا۔“

”تو آنکھیں بند کرلیا کریں۔“ وہ ہنس کر کہتی۔

البتہ یہی نازیہ جب باہر کہیں جاتی تو اس کی آنکھیں پوری طرح کھل جاتی تھیں اور وہ مجھ پر یوں نظر رکھتی جیسے میں اس کا پالتو جانور ہوں اور موقع ملتے ہی رسی تڑوا کر فرار ہو جاؤں گا۔ شاپنگ پر وہ میرے ساتھ ساتھ ہوتی۔ میرے قریب سے کوئی دوسری عورت گزرنے لگتی تو وہ جان بوجھ کر اس کے اور میرے درمیان آجاتی، چاہے اسے کتنی ہی زحمت کیوں نہ کرنی پڑے۔ شاپنگ سینٹرز میں کہیں اگر سیلز گرل ہوتی تو نازیہ خود اس سے بات کرتی چاہے مجھے کیوں نہ لینی ہوتی۔ یہی رویہ اس کا تقریبات اور پارٹیوں میں ہوتا تھا۔ دفتر کا حال میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ وہاں ابو کے زمانے سے ایک خاتون کام کرتی تھیں جنہیں میں عزت سے آنٹی کہتا تھا لیکن نازیہ کی وجہ سے مجھے ان کو بھی نوکری سے جواب دینا پڑا۔ جس کا مجھے بہت افسوس تھا۔ البتہ میں نے یہ کیا تھا کہ ان خاتون کو جاننے والوں کے پاس جاب دلا دی تھی۔

خاندان کی خواتین، جیسے کزنز اور کزنز کی بیویاں، نازیہ بادلِ ناخواستہ برداشت کرتی تھی۔ بلکہ ان سے میرے ملنے بولنے پر نظر رکھتی تھی۔ اگر میں کسی سے ذرا بے تکلف ہو کر بات کرلوں تو اس کا منہ پھول جاتا تھا۔ وہ کہتی کچھ نہیں تھی لیکن اپنے رویے سے ظاہر کر دیتی کہ اسے میری یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔ حالانکہ میں ان خواتین کو صرف رشتے دار کی حیثیت دیتا ہوں۔ وہ میری بہنیں، بھابیاں ہیں۔ نازیہ بھی یہ بات سمجھتی ہے۔ اسے میرے کردار پر شک نہیں ہے۔ یہ اسی کا کہنا ہے۔ ”میں جانتی ہوں آپ کردار کے اچھے آدمی ہیں۔ جس دن مجھے آپ کے کردار پر شک ہوا اس دن میں آپ کی زندگی میں نہیں رہوں گی۔“

یہ رویہ تو جیتی جاگتی خواتین کے لیے تھا۔ اگر میں کوئی میگزین یا اخبار دیکھتا تو نازیہ کو فکر لگ جاتی کہ میں کہیں اس میں موجود عورتوں کی تصویر تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے اگر میں اس کے ساتھ ہوتا تو کوئی خوب صورت عورت اسکرین پر آتی تو وہ جلدی سے چینل بدل دیتی تھی۔ میں صرف اسپورٹس یا اینیمل پلانٹ اور ڈسکوری جیسے چینل سکون سے دیکھ سکتا تھا۔ حد یہ کہ خبروں کے چینلز پر بھی نازیہ کو اعتراض تھا اس کا کہنا تھا کہ آج کل ٹی وی چینلز نے ناظرین کی دلچسپی حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی خواتین کا سٹر رکھ لی ہیں جو ڈریسنگ بھی ایسی کرتی ہیں جن سے مردوں کی توجہ حاصل کی جاسکے۔ شروع میں مجھے اس کے رویے سے الجھن ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ میں عادی ہوتا گیا کیونکہ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی اور نہ میں بیوی کے علاوہ کسی عورت یا لڑکی میں دلچسپی لیتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے ہنسی آجاتی تھی۔

مجھ میں دل چسپی لینے والیوں کی کمی نہیں تھی۔ کیونکہ جیسے نازیہ لاکھوں میں ایک، اسی طرح میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں الگ سے نظر آتا ہوں۔ کسی قدر دراز قد، کسرتی جسم، سرخ و سفید رنگت اور اچھے نقوش کی وجہ سے صنف نازک شروع سے مجھ میں دل چسپی لیتی آئی ہے۔ جن دنوں میں کالج میں تھا تو میرے حلقہ احباب میں کئی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن ان سے تعلق ایک حد میں تھا اور یہ پرانی بات ہے۔ اب میں اس کا سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے کسی عورت یا لڑکی میں ذرا سی دل چسپی لی تو نازیہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔ وہ تو اتنی جنونی ہے کہ اس بات پر کسی کی جان لے سکتی ہے اور اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ یہ بات وہ خواتین بھی جانتی ہیں جو مجھ میں دل چسپی لیتی ہیں اس لیے وہ نازیہ کے سامنے مجھے نظرانداز کرتی ہیں اور جب نازیہ میرے ساتھ نہیں ہوتی ہے تو میری توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ بات نازیہ کو پتا نہیں ہے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے تو وہ اسی بات پر اپنا کتنا خون جلالے۔

یہ تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں اور نازیہ فیصل آباد کے ایک بڑے صنعت کار کی کوٹھی میں ہونے والی پارٹی میں شریک تھے۔ یہ ویسی ہی پارٹی تھی جیسی کہ بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ روشنیاں، رنگ و خوشبو کے ساتھ کھانے اور پینے کے ساتھ پینے پلانے کا انتظام بھی تھا۔ میں کیونکہ اس عادت سے دور ہوں اس لیے فی الحال اپنے حلقہ احباب سے بھی دور تھا۔ وہ سب پینے والے کمرے میں جمع تھے اور مجھے شراب کی بُو سے الرجک ہے۔ اس لیے میں ہال میں تھا۔ اتفاق سے نازیہ کچھ دور اپنی جاننے والیوں میں اس طرح گھر گئی تھی کہ چاہنے کے باوجود میرے پاس نہیں آسکی تھی۔ میں اس کی بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔ ایسے لمحے کم ہی آتے تھے جب وہ کسی تقریب میں مجھ سے دور ہو۔ میں اورنج جوس سے شغل کرتے ہوئے محفل کا رنگ دیکھ رہا تھا کہ اچانک گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ وہی تھی۔ میں اسے تقریباً پانچ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اس کے ایک ایک نقش سے واقف تھا۔ اس کے وجود کا کوئی گوشہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پھر وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ بوٹا سا قد، شانوں پر لہراتے لائٹ براؤن ریشمی بال، سحر انگیز آنکھیں جن میں سچ مچ جادو سا لہراتا تھا۔ کھینچ لینے والے لب و رخسار اور چھونے سے میلا ہو جانے والا رنگ و روپ، اور قیامتیں چھپائے وجود جس کی حشر سامانیوں سے میں خوب واقف تھا۔ اس نے دھانی رنگ کی ساڑی باندھ رکھی تھی جس کے تلے کسا ہوا سرخ بلاؤز تھا۔ بلاؤز کی آخری حد کمر سے خاصی اوپر ختم ہو گئی تھی اور اس سے نیچے کا سنہری رنگ یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مسز شیخ سے گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ سچ مچ آج بھی ویسی ہی تھی۔

”کسے دیکھا جا رہا ہے اتنے غور سے؟“ اچانک ہی پاس سے نازیہ کی آواز ابھری تو گلاس دوسری بار میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

”کک... کوئی نہیں۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔

لیکن نازیہ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ میری جیسے جان پر بن گئی۔ پھر نازیہ مسکرائی۔ ”ہاں ہے تو اس قابل کہ کوئی مرد نظر بھر کر دیکھ لے۔“

اسے مسکراتے دیکھ کر میری جان میں جان آئی تھی۔ ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی وہ کہے گی۔ میں جانتی ہوں آپ اسے کیوں غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں یوں جھینپا جیسے سچ مچ اس کے حسن سے متاثر ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ نازیہ کو کچھ دیر بعد ایک طرف سے آواز آئی اور وہ نظروں ہی نظروں میں مجھے خبردار کرتی اس طرف بڑھ گئی۔ میں ایک طرف موجود مردوں کے ایک گروپ کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں کوئی میرا قریبی شناسا نہیں تھا لیکن ان میں سرفراز شاہ تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ شہر کی کوئی ایسی حسین خاتون نہیں تھی جس کے بارے سرفراز نہ جانتا ہو۔ وہ خود بھی دل پھینک قسم کا شخص تھا۔ اس کی ایک لیدر پروسیسنگ فیکٹری تھی۔ اس سے علیک سلیک کے بعد میں نے سرسری سے انداز میں خواتین کا ذکر چھیڑ دیا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ زور و شور سے مختلف خواتین کے بارے میں بتانے لگا۔ میں اس کی باتوں میں پوری...

دلچسپی لے رہا تھا اور سرسری اشاروں سے وہاں موجود خواتین کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یار یہ دھانی ساڑی والی کون ہے؟ اسے پہلی بار دیکھا ہے کسی تقریب میں۔“

سرفراز معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ”عمران صاحب، آپ بھی عورتوں کو دیکھتے ہیں۔“

”کیونکہ یہ خود کو دکھاتی ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ”آپ مسز ظہیر کو نہیں جانتے؟“

مجھے جھٹکا لگا۔ ”ظہیر اینڈ کو والے؟“

”ہاں وہی، یہ ان کی مسز ہے۔ بہت طرح دار اور آزاد خیال عورت ہے لیکن پیٹھ پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتی ہے، اپنی مرضی سے بندہ چنتی ہے۔“

مجھے سرفراز کی بات کا پورا یقین ہو گیا۔ ”لیکن ظہیر صاحب تو خاصے عمر رسیدہ ہیں۔ کم سے کم بھی ساٹھ کے ہوں گے جب کہ یہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔“

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میرا اندازہ ہو جب کہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی عمر پینتیس سے زیادہ نہیں مگر دیکھنے میں وہ ستائیس اٹھائیس برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی اور اتنی عمر بھی اس کے کسی قدر بھاری بدن کی وجہ سے لگتی تھی۔ ورنہ چہرے سے وہ پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

سرفراز نے بائیں آنکھ دبائی۔ ”وہ بھی شوقین ہیں۔ اس سے اس وقت شادی کی تھی جب یہ کالج گرل تھی شاید انیس برس کی بھی نہیں ہوگی۔ اب تو اس کا بڑا بیٹا اولیول میں ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی بھی جوان ہو رہی ہے۔“

میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اس لیے میں سرفراز سے جان چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ مسز ظہیر الدین نکلے گی۔ مگر ساتھ ہی اس انکشاف سے کئی سوالات سامنے آئے تھے۔ سرفراز کا کہنا تھا کہ وہ گزشتہ سولہ سال سے مسز ظہیر الدین چلی آ رہی تھی۔ ظہیر اینڈ کو ... کا شمار ملک کی چند بڑی الیکٹرانکس اور الیکٹرک کی چیزیں تیار کرنے والی فرم میں ہوتا تھا۔ اس کے برانڈ نہ صرف ملک بلکہ ملک سے باہر بھی مقبول تھے۔ وہ بلاشبہ کروڑ پتی تھا اور وہ اس شخص کی بیوی تھی۔ میں کچھ دیر پہلے پارٹی سے لطف اندوز ہو رہا تھا مگر اب میرا موڈ بدل گیا تھا۔ میں نے جانے کا سوچا لیکن پھر خیال آیا کہ نازیہ پوچھے گی اور وہ آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی اس لیے میں نے فوراً ... نہیں کہا لیکن ایک گھنٹے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”... سر میں درد ہو رہا ہے کیا خیال ہے گھر چلیں؟“

”اتنی جلدی۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”اب تو ... شروع ہوئی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو کچھ دیر اور رک جاتے ہیں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ نہیں رکے گی اور ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد ... نے کہا۔

”نہیں، چلتے ہیں آپ کی طبیعت کا سن کر ... میرا بھی نہیں لگ رہا ہے۔“

ہم واپس آئے تو امی ابو سو چکے تھے۔ جب سے ابو نے بزنس میرے سپرد کیا تھا وہ آرام کے عادی ہو گئے تھے اور اب رات کو بھی دس بجے تک سو جاتے تھے جب کہ ... عرصے پہلے جب وہ بزنس دیکھ رہے تھے تو اکثر دس بجے تک دفتر سے آتے تھے۔ امی صبح نماز فجر کے لیے اٹھتی تھیں اس لیے وہ شروع سے جلد سونے کی عادی تھیں۔ ہم ... کمرے میں آئے۔ میں نے کوٹ ایک طرف ڈالا اور ٹائی کی گرہ کھولنے لگا۔ نازیہ ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی میک اپ صاف کر رہی تھی۔ اس نے اچانک کہا۔ ”وہ دھانی ساڑی والی عورت کون تھی جسے آپ غور سے دیکھ رہے تھے؟“

میں چونکا پھر ہلکے انداز میں مسکرایا۔ ”کتنا ... اب تک تمہارے سر پر سوار ہے بس ایک دو بار ... دیکھا تھا اور مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ ... جانے مجھے کیوں لگا جیسے آپ اسے اچھی طرح جانتے ہوں۔“

”وہم ہے تمہارا۔“ میں کہتے ہوئے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ درحقیقت میں نازیہ سے چہرہ چھپا رہا تھا ورنہ وہ شاید تاثرات سے بھانپ جاتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں شاور لے کر آیا تو خاصی حد تک پرسکون تھا۔ لائٹ بجھا کر لیٹا تو نازیہ نے میرے بازو پر سر رکھ دیا۔ ”آپ کو برا لگا؟“

”کیا؟“

”یہی کہ میں نے اس عورت کے بارے میں پوچھا؟“

میں ہنسا۔ ”نہیں، میں تمہاری عادت جانتا ہوں اس لیے برا ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے کس طرح محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ کسی دوسری عورت کا ذرا سا تعلق بھی برداشت نہیں کر سکتی، چاہے یہ تعلق کبھی ماضی میں ہی رہا ہو۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”ماضی کا تعلق بھی ... برداشت نہیں ہے۔“

”ہاں اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو مجھے مت بتایئے گا۔ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوگا۔ یہ میرا غرور ہے کہ آپ صرف میرے ہیں۔ میرا یہ غرور کبھی مت توڑیئے گا۔“ نازیہ نے کہا اور سو گئی۔

وہ اپنی بات کہہ کر پرسکون ہو گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا اور بے چین تھا۔ نازیہ نے واضح کر دیا تھا کہ اگر میرا کبھی ماضی میں کوئی تعلق کسی سے رہا تھا تو اسے ماضی کا حصہ ہی رہنا چاہیے تھا، حال میں اور اس کے سامنے نہیں آنا چاہیے ورنہ ہماری ازدواجی زندگی کا یہیں خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے نازیہ کی فطرت کا اندازہ تھا، وہ ایسا ہی کرتی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی جستجو کو خود تک رکھوں گا اور اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جاؤں گا۔ بے شک اسے دیکھ کر مجھے شدید دھچکا لگا تھا اور یہ معاملہ بھی ایسا تھا کہ میں اسے بہت مشکل سے نظر انداز کر سکتا تھا لیکن نازیہ کی خاطر میں یہ بھی کرنے کو تیار تھا۔ وہ میری بیوی اور میری محبت تھی۔ میں کسی صورت اس سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اپنے طور پر میں نے یہ معاملہ ختم کر دیا لیکن میں بھول گیا کہ ماضی اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔

☆☆☆

میں دفتر میں بعض ضروری فائلیں دیکھ رہا تھا۔ جنرل منیجر ان پر بعض احکامات چاہتا تھا۔ موبائل فون کی بیل بجی۔ میں نے دیکھا ایک اجنبی نمبر تھا اس لیے میں نے موبائل سائلنٹ کر کے دوبارہ فائلوں کی طرف توجہ دی۔ بیل بج کر خاموش ہو گئی۔ پون گھنٹے بعد کام مکمل ہوا تو میں نے کافی کا کہا اور آرام کرنے لگا۔ پھر موبائل کا خیال آیا۔ میں نے نمبر دیکھا اور کال بیک کی۔ چند لمحے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز نے جواب دیا۔

میرا دل دھڑکا تھا اور میں نے کسی قدر اضطراب سے کہا۔ ”... نمبر سے مجھے کال کی گئی تھی میں مصروف تھا۔“

”مجھے معلوم ہے تم مصروف ہو گے۔“ وہ ہنسی تو میں نے پہچان لیا۔ اس ہنسی کو میں خوب پہچانتا تھا۔ ”اس لیے میں نے دوبارہ کال نہیں کی، مجھے معلوم تھا کہ تم فارغ ہو کر کال بیک کرو گے۔“

”تم نے کیسے جانا کہ میں کال بیک کروں گا۔“

”کیونکہ میں تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”بہت قریب سے جانتی ہوں۔“

”تم ... نے کیوں کال کی ہے؟“ میں نے ہچکچا کر پوچھا۔

”میں نے تمہیں پارٹی میں دیکھا تھا۔ تم نے بھی مجھے دیکھا اور میرا خیال تھا کہ تم رابطہ کرو گے۔ لیکن تم نے رابطہ نہیں کیا۔“

”اس سے تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نے ماضی کے اس باب کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔“

”باب بند ہو جاتے ہیں لیکن کھل بھی جاتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ترغیب دے رہا تھا۔

”دیکھو سارہ یا تمہارا جو بھی نام ہے۔ میں نے غلط کہا تھا میں نے اس باب کو بند نہیں کیا بلکہ اسے سرے سے اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ کر نکال دیا ہے۔“

”رئیلی؟“ اس کا لہجہ چیلنج دیتا ہوا تھا۔ ”کیا تم سچ مچ وہ سب بھول سکتے ہو؟“

جواب میں میں نے کال کاٹ دی۔ میں اس کی بات کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ میرا جھوٹ پکڑ لے گی اور میں شرمندہ ہو جاؤں گا، اس سے بہتر میں نے یہی سمجھا کہ کال ہی بند کر دوں۔ میں نے موبائل رکھ کر سر تھام لیا۔ اس کا چیلنج میرے اندر گونج رہا تھا ”کیا تم سچ مچ وہ سب بھول سکتے ہو؟“

میں نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ سب جو پانچ سال پہلے ہوا تھا اور جو میرے ماضی کا ایک حصہ تھا۔

☆☆☆

ابو نے مجھے دفتر میں بلایا تھا۔ ان دنوں میں ایم بی اے فائنل کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا اور دفتر میں بیٹھ رہا تھا۔ ”جی ابو آپ نے بلایا ہے؟“

ابو نے کہا۔ ”ہاں برخوردار میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں۔“

"جی کہیے؟"

"دیکھو آفس اور بزنس مینجمنٹ تو تم دفتر میں رہ کر سیکھ لو گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مل مینجمنٹ پر بھی عبور حاصل کرو۔ اس کے بغیر ہم یہ بزنس آگے نہیں بڑھا سکتے ہیں، اگر تمہارے ساتھ کوئی اور ہوتا تو کام بٹ جا سکتا تھا لیکن اب سب تمہیں اکیلے دیکھنا ہے اس لیے تمہیں ہر شعبے کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا ہونا چاہیے۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ میں مل میں بیٹھوں؟"

ابو نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہماری مل اتنی بڑی اور اتنی جدید نہیں ہے، یہاں تمہیں سیکھنے کا زیادہ موقع نہیں ملے گا۔ اس لیے میں تمہیں کراچی بھیج رہا ہوں۔ احمد صاحب کو جانتے ہو، میرے اچھے دوست ہیں اور ان کی پورے ملک میں کتنی ہی ملیں ہیں۔ ان کی ایک مل حال ہی میں لگی ہے میں چاہتا ہوں تم وہاں کام کر کے تجربہ حاصل کرو تاکہ مستقبل میں اسی پیٹرن پر اپنے بزنس کو ترقی دے سکو۔"

"میں تیار ہوں، مجھے کب جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس تم تیاری کر کے جلد از جلد چلے جاؤ۔ میری احمد صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ تم جاتے ہی ٹریننگ پر لگ جاؤ گے۔ میرا خیال ہے تم چھ مہینے میں بہت کچھ سیکھ لو گے۔"

میں کراچی جانے کے خیال سے خوش تھا کیونکہ اکلوتا ہونے کی وجہ سے مجھے مشکل سے ہی کہیں جانے کی اجازت ملتی تھی۔ ابو مجھے پڑھنے کے لیے امریکا یا یورپ بھیج سکتے تھے لیکن امی کی وجہ سے میں نے تعلیم یہیں حاصل کی تھی۔ اپنے ملک میں بھی میں لاہور اور اسلام آباد سے دور نہیں گیا تھا حتیٰ کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں مجھے کلاس فیلوز کے ساتھ ٹورز پر جانے کی اجازت بھی نہیں ملتی تھی کیونکہ اکثر ٹور نادرن ایریاز کے ہوتے تھے اور امی کے خیال میں یہ سارے علاقے بہت خطرناک تھے۔ انہوں نے تو کراچی کا سن کر بھی شور مچایا تھا لیکن ابو نے ان کی مخالفت کے باوجود اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ انہوں نے امی سے کہا۔ "یہ اس کے لیے ضروری ہے۔ کل کو اسے اکیلے پورا بزنس دیکھنا ہے اور بزنس یہ گھر بیٹھ کر نہیں سیکھ سکتا۔"

یوں میں کراچی روانہ ہو گیا۔ یہاں احمد صاحب کی نئی لگنے والی مل سائٹ میں تھی۔ رہنے کے لیے مجھے پرانی سبزی منڈی کے پاس ایک چھوٹی سی کوٹھی مل گئی۔ کوٹھی بھی احمد صاحب کی تھی۔ بڑا پُرسکون اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔

کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ شاید دس مرلے پر تھی، [illegible] صرف نیچے کی منزل تعمیر ہوئی تھی جس میں دو بیڈ روم [illegible] ساتھ لاؤنج اور ایک بڑا سا ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے [illegible] لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہ اجاڑ پڑا تھا۔ [illegible] کوٹھی اندر سے بہترین حالت میں اور پوری طرح آراستہ تھی۔ ہر کمرے میں اے سی تھا۔ کچن کے ساتھ ڈائننگ [illegible] بھی تھا لیکن یہ میرے لیے بیکار تھا کیونکہ میں تینوں وقت کھانا باہر کھاتا تھا۔ ناشتا اور لنچ میں مل میں رہتا تھا وہاں کینٹین میں بہترین کھانا ملتا تھا اور رات کو میں کسی ریستوران یا ہوٹل چلا جاتا، کبھی موڈ ہوتا تو گھر [illegible] کسی ایسی چیز سے گزارا کرتا جو بہ آسانی دستیاب [illegible]

ایک مہینے میں مل اور دفتر میں کام کرنے والے اپنے جیسے چھڑے نوجوانوں سے دوستی ہوئی اور شام کو [illegible] کے بعد ہم مل کر کہیں نکل جاتے تھے۔ گھومتے پھرتے، گپ شپ کرتے اور جب تھک جاتے تو اپنے گھروں کا رخ کرتے تھے۔ آمد و رفت کے لیے مجھے ایک مناسب [illegible] ملی ہوئی تھی۔ تنخواہ کچھ نہیں تھی لیکن یہاں قیام اور [illegible] اخراجات احمد صاحب نے اپنے ذمے لیے تھے اس میں کار بھی شامل تھی۔ میں اکتوبر میں کراچی آیا تھا جب [illegible] کا موسم گزر گیا تھا لیکن میں نے سنا تھا کہ کراچی میں [illegible] جیسی گرمی نہیں پڑتی ہے البتہ سردی بھی ویسی نہیں ہوتی [illegible] سال کے بیشتر حصے موسم بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ [illegible] سال سرما کے آغاز میں ہی بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ [illegible] دوسرے تیسرے دن بارش ہو جاتی اور موسم ٹھنڈا ہو جاتا۔ سردی اب بھی زیادہ نہیں تھی لیکن انجوائے کرنے کے قابل تھی۔ اس روز سب نے مل کر [illegible] جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ڈنر بھی وہیں کرتے۔ وہاں سے آتے آتے رات کے بارہ بج گئے تھے پھر بارش بھی شروع ہو گئی، اس سے [illegible] دیر ہوئی تھی۔ کراچی میں بارش اتنی نہیں ہوتی لیکن [illegible] بارش سے ہر طرف پانی کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے [illegible] سے مشکل ڈرائیورز کو پیش آتی ہے۔ انہیں بہت احتیاط سے گاڑی چلانی پڑتی ہے ورنہ جا بجا کھلے مین ہول اور گڑھے ان کا استقبال کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

میں گھر پہنچا اور ابھی سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا [illegible] کوٹھی کا گیٹ کھولتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ [illegible] وجہ سامنے پورچ میں پڑی تھی۔ میں جاتے ہوئے پورچ کی لائٹ جلا جاتا تھا تاکہ واپسی میں اندھیرا نہ ملے۔ اسی روشنی

[illegible] عورت صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گٹھڑی سے بنی پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے گیٹ بند کیا اور اس کی طرف [illegible] میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ دل میں خیالات [illegible] کہ کسی نے اس عورت کو مار کر یہاں ڈال دیا ہے [illegible] گھٹنوں کا میں [illegible] وہ بارش میں بھیگی ہوئی تھی اور اس کے جسم پر باریک کپڑے کا سوٹ تھا جو بھیگ کر نہ ہونے کے [illegible] تھا۔ اس کے تمام جسمانی خدوخال اس میں نمایاں تھے۔ مگر اس وقت اس طرف دھیان کہاں تھا۔ میں ڈرتے ڈرتے اسے سیدھا کیا۔ وہ بے سدھ رہی [illegible] کسی لاش کی طرح۔ پھر میں نے مزید ڈرتے ڈرتے [illegible] کی نبض ٹٹولی اور یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ اس کی نبض چل رہی تھی۔ اگرچہ بھیگ کر سردی میں پڑے رہنے سے [illegible] کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ زندہ تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ بڑی خطرناک جگہ پڑی تھی۔ آس پاس کوٹھیاں تھیں اور کئی منزلہ تھیں خوش قسمتی سے سردی کی وجہ سے تمام کھڑکیاں بند نظر آ رہی تھیں لیکن کسی [illegible] شیشے سے جھانکنے پر کوئی پابندی نہیں تھی اور کوئی دیکھ لیتا تو [illegible] بے ہوش عورت کے ساتھ میں بھی نظر آ جاتا۔ میں نے [illegible] میں برآمدے کی روشنی بند کی اور پھر دروازہ کھولا۔ [illegible] عورت کے پاس آ کر میں کچھ دیر ہچکچاتا رہا مگر اسے [illegible] تو لے جانا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اسے اٹھایا۔ اندر [illegible] میں نے سوچا اور اسے دوسرے بیڈ روم میں لے گیا۔ [illegible] یہاں مکمل فرنیچر تھا لیکن یہاں کمبل نہیں تھا وہ میں اپنے بیڈ روم سے لے آیا۔ عورت مکمل طور پر بے ہوش تھی کیونکہ اٹھا کر یہاں لانے کے دوران اس نے قطعی کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ پھر میں گاڑی اندر لایا اور گیٹ لاک کیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ [illegible] کو طبی مدد کی ضرورت تھی۔ میں اسے عورت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جسم سے وہ عورت ہی لگ رہی تھی۔ البتہ چہرہ کسی لڑکی جیسا تھا۔ میں سخت کنفیوز تھا۔ پہلے میں نے ڈاکٹر بلانے کا سوچا لیکن پھر یہ خیال مسترد کر دیا۔ اول تو یہاں کوئی ڈاکٹر میرا جاننے والا نہیں تھا اور اگر میں تلاش کر کے کسی ڈاکٹر کو لے آتا تو وہ دس سوال کرتا اور معاملہ بالآخر پولیس تک جاتا اور یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ پھر مجھے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے کا آئیڈیا سوجھا اور فوراً ہی عقل بھی آ گئی کہ وہ پہلے ہی بھیگی ہوئی تھی اور اس سردی میں ٹھنڈے پانی سے کون ہوش میں آتا اسے اصل میں گرمائش کی ضرورت تھی۔ اس کے کپڑے بدلنا بھی ممکن نہیں تھا اگر میں کسی طرح اس کا لباس اتار بھی دیتا تو اسے پہنانے کے لیے یہاں کوئی لباس نہیں تھا سوائے میرے کپڑوں کے اور میں اتنا پُرخطر کام کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ ہوش میں آ جاتی تو نہ جانے کیا سمجھتی اور اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ تولیے سے اس کا لباس ممکنہ حد تک خشک کر کے اے سی کا ہیٹر آن کر دیا۔ پھر اس کے لیے دودھ گرم کر کے لے آیا۔ یہاں چائے وغیرہ بنانے کے لیے ڈبا بند دودھ موجود تھا۔ اس کے لب کھول کر چمچ سے دودھ ٹپکانا شروع کیا تو اس کا خاطر خواہ ردعمل ہوا۔ اس کی گلابی رنگت تیزی سے بحال ہو گئی اور وہ جیسے ہوش میں آنے لگی۔ میں پیچھے ہٹ کر انتظار کرنے لگا۔

وہ بہت حسین تھی۔ رنگت بحال ہوئی اور بال خشک ہوئے تو اس کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ اس کے پیروں میں چپل یا جوتا تھا اور نہ دوپٹا تھا۔ سوئیٹر یا کوئی گرم چیز بھی نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موسم میں وہ اتنے ہلکے سے لباس میں باہر کیسے نکل آئی تھی؟ اس پر کیا مصیبت آئی تھی؟ یہ سب وہی بتا سکتی تھی۔ چند منٹ بعد اس نے کراہنا شروع کر دیا تھا اور مزید چند منٹ بعد آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے تک وہ چھت کو گھورتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چیخ اٹھی تھی۔ اس نے جلدی سے گر جانے والا کمبل سینے تک کھینچ لیا اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"آرام سے.... آرام سے.... یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"میں یہاں کیسے آئی؟" اس نے سہمی آواز میں کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی شخصیت کی طرح اس کی آواز بھی دلکش تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی شخصیت کا ہر جز دلکش ہوتا ہے۔ ان سے ملنے والا کوئی مرد ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔

"آپ میرے گھر کے پورچ میں بے ہوش پڑی تھیں۔ میں آپ کو اندر لے آیا۔"

"وہ.... میرے.... پیچھے ہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ "وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں، اگر کوئی آیا تو میں اسے دیکھ لوں گا۔ آپ یہ گرم دودھ پی لیں

اس سے آپ کی حالت اور بہتر ہو جائے گی۔" میں نے دلیر بن کر کہا لیکن اندر سے میں فکرمند ہو گیا تھا کہ کچھ خطرناک لوگ اس کے پیچھے تھے۔ میں ایک سیدھا سادہ شریف کاروباری گھرانے سے تعلق رکھنے والا نوجوان تھا، امی ابو نے ویسے ہی سختی سے تاکید کر کے بھیجا تھا کہ کسی معاملے میں نہیں پڑنا۔ کراچی خطرناک شہر ہے۔ وہاں اپنے کام سے کام رکھنا۔ مگر اب میں اس کی مدد کر ہی چکا تھا۔ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ دودھ پی کر اس کی حالت سدھر گئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ نہا دھو کر صاف ستھری ہو کر میرا سلیپنگ سوٹ پہنے کمبل میں گھسی کافی پی رہی تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے بارے میں صرف ایک بات بتائی تھی کہ اس کا نام سارہ تھا۔ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن دشمنوں نے اس کے شوہر کو قتل کر دیا اور اب اس کے پیچھے پڑے تھے۔

اس نے کھل کر تو نہیں بتایا تھا لیکن اشاروں کنایوں میں کہا تھا کہ اس نے پسند کی شادی کی تھی اور اس وجہ سے اس کے شوہر کے خاندان والے ان کے دشمن بن گئے تھے۔ اس نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ جمائیاں لینے لگی تو میں کمرے سے نکل آیا اسے نیند آ رہی تھی۔ صبح اتفاق سے چھٹی کا دن تھا۔ اس لیے میں الارم لگائے بغیر سو گیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں اس کے بارے میں شک نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس پر اتنی آسانی سے اعتماد نہ کرتا۔ میں بے خبر سو رہا تھا کہ اس نے مجھے بیدار کیا۔ وہ اتنے پاس اور اتنی بے تکلف سی تھی کہ میں جھجک گیا۔ اس کی شرٹ کے اوپری بٹن نہ جانے کھل گئے تھے یا اس نے جان بوجھ کر کھولے تھے۔ میں چند لمحے کے لیے سحر زدہ سا رہ گیا۔ پھر جھینپ کر چونکا۔
"خیریت...!"
اس نے منہ بسورا۔ "دس بج گئے ہیں اور میں بھوک سے مرنے والی ہوں یہاں کچن میں سوائے چائے کافی کے کچھ نہیں ہے۔"
"سوری مجھے خیال نہیں رہا۔" میں جلدی سے اٹھ گیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر کوٹھی کے پاس ایک بیکری تک گیا۔ بارش رک گئی تھی اور زنالے کی سرد ہوا چل رہی تھی۔ بوکھلاہٹ میں مجھے کوئی گرم چیز لینے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس لیے سردی میں ٹھٹھرتا واپس آیا۔ اسے انڈوں، مارجرین، ڈبل روٹی، مارملیڈ اور حلوہ پوری کا شاپر پکڑا کر میں خود واش روم چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ میز پر ناشتا سجا چکی تھی اور فارغ بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ "آپ نے شروع نہیں کیا؟"
"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔ "ورنہ دل تو چاہ رہا تھا کہ سب کھا جاؤں۔"
ناشتے کے بعد مجھے خیال آیا۔ "آپ کے ..."
"آپ جناب کا تکلف نہیں۔" اس نے ٹوکا۔ "میں عمر میں تم سے بڑی نہیں ہوں۔"
"اوکے.... میں کہہ رہا تھا کہ تمہارے پاس لباس نہیں ہے۔"
"میں نے اپنا سوٹ بھی دھو کر ڈال دیا تھا، [illegible] جائے گا۔"
"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"
وہ اب تک ہنس بول رہی تھی میرے اس سوال پر اچانک مرجھا گئی پھر اس نے گہری سانس لی۔ "ارادہ کیا ہے تمہارا شکریہ ادا کر کے یہاں سے نکلوں گی اور پھر جہاں قسمت لے جائے۔"
"کیا مطلب کیا تمہارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟"
"ٹھکانا ہوتا تو اس موسم میں رات کو در بدر رہی ہوتی۔ جہاں رہتی تھی وہ جگہ اب دشمنوں کی نظر میں ہے وہاں گئی تو ان کے ہاتھ لگوں گی اور وہ مجھے فوراً [illegible] کر دیں گے۔"
یعنی اس کے پاس کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "اس صورت میں تم یہیں رہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
وہ مسکرا اٹھی اور اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ میں حیران تھا وہ کیسی پل پل میں روپ بدلنے والی عورت تھی۔ "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"
"میں دل سے کہہ رہا ہوں یہ احسان نہیں ہے۔"
"پھر بھی مجھ پر تو احسان ہے ورنہ مجھے تو لگ رہا ہے اس پناہ گاہ کے باہر میری جان کے دشمن گھوم رہے ہیں۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "یہاں تم عارضی رہ رہے ہو؟"
"تمہیں کیسے پتا چلا؟"
"یہاں کچن میں کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح تمہارا سامان بھی کم ہے۔ کوٹھی کی دیکھ بھال بھی نہیں ہوتی ہے۔"
"ہاں میں یہاں عارضی مقیم ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر اسے اپنے بارے میں بتایا۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ پھر کرید کرید کر پوچھتی رہی اور میں سادگی سے اسے اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب اسے پتا چلا کہ میرا تعلق فیصل آباد سے ہے تو وہ کچھ فکرمند سی ہوئی تھی جیسے پتا نہ [illegible] لی تھا۔ میں نے اسے پولیس سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس اسے تحفظ نہیں دے سکتی تھی۔ دوپہر میں کھانا لینے کے لیے نکلا تو مجھے خیال آیا اور میں نے اس کے لیے ایک ایسا عبایا لیا جس میں چہرے کا نقاب بھی شامل تھا۔ میں واپس آیا تو وہ گھر کی صفائی کر چکی تھی اور خود گم صم سی اپنی [illegible] تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنسی۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"
"تم ہر حال میں اچھی لگتی ہو۔" میں نے کہا اور عبایا اس کے سامنے رکھا۔ "یہ دیکھو تمہارے لیے لایا ہوں۔"
"اچھا ہے۔" وہ بے دلی سے بولی۔ "لیکن میں اس کا کیا کروں گی میں ویسے بھی پردہ نہیں کرتی ہوں۔"
"یہ تمہیں چھپانے کے لیے ہے۔ تم نہا لو پھر ہم کھانے کے بعد باہر چلیں گے اور تم اپنے لیے کپڑے لینا۔ ظاہر ہے اس ایک لباس یا میرے سلیپنگ سوٹ میں تو گزارہ نہیں ہوگا۔"
اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے میں تم پر بار ڈال رہی ہوں۔"
"ہاں بار ہے لیکن بعض بار ایسے ہوتے ہیں جو آدمی اپنی خوشی سے اٹھانا چاہتا ہے۔ اس لیے تم فکر مت کرو۔"
نہا دھو کر اس نے اپنا ہی لباس پہنا تو اس کا روپ کھل اٹھا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ شرمائی اور پھر بولی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"
"پتا نہیں کیا دیکھ رہا ہوں، تم تو پل پل میں روپ بدل رہی ہو۔"
"میرے پاس دوپٹا نہیں ہے۔"
میں نے اسے اپنی ایک ہلکی گرم چادر پیش کی جسے اس نے بیک وقت دوپٹے اور شال کی طرح لے لیا۔ کھانے کے بعد ہم باہر جانے کے لیے تیار ہوئے تو میں نے اس کے برف کی طرح سفید اور گلابی پیروں کی طرف دیکھا۔ "تمہارے پاس چپل بھی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں راستے میں سے لیں گے۔"
طارق روڈ یہاں سے دور نہیں تھا اور چھٹی والے دن بھی شاپنگ سینٹرز کھلے رہتے تھے۔ میں نے پہلے ایک جوتوں کی دکان سے اس کے لیے خوب صورت سینڈل لیا۔ وہ اسے پورا آیا تھا۔ ایک بوتیک سے اس کے لیے کئی لباس لیے۔ وہ منع کر رہی تھی لیکن میں سنی ان سنی کر کے اپنی مرضی سے کپڑے لیتا رہا۔ ڈیزائن اور رنگ بھی میں نے اپنی پسند سے لیے تھے۔ صرف چودہ گھنٹے پہلے میں اسے جانتا بھی نہیں تھا اور اب میں اس کے لیے لباس لے رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے کئی چیزیں اور بھی لی تھیں۔ وہ منع کرتی رہی تھی۔ جب ہم واپس گاڑی میں آئے تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔ "عمران تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟"
"اگر تم سمجھ رہی ہو کہ میں یہ کسی غرض سے کر رہا ہوں تو یہ غلط ہوگا، میں ذہنی طور پر تیار ہوں کہ ابھی تم کہو گی کہ میں جا رہی ہوں اور پھر ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ بس یہ میری خوشی ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں کوئی ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اسے ساری عمر یاد رہتا ہے اور اچھی یاد بن جاتا ہے، تمہارا یہ ساتھ میرے لیے ایسا ہی واقعہ ہے۔"
"ہمارا ساتھ عارضی ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔
"یہ کھلی حقیقت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں جس ٹریننگ کے لیے آیا تھا وہ وقت سے پہلے ختم ہونے والی ہے اور زیادہ سے زیادہ ایک مہینے بعد میں یہاں سے واپس چلا جاؤں گا اور ظاہر ہے میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"
"میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"
"میں ایمان داری سے کہوں گا کہ آج تک میں جتنی عورتوں اور لڑکیوں سے ملا ہوں ان میں سے کوئی بھی تمہارے جیسی حسین اور دلکش نہیں ہوگی۔"
وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے موضوع بدل دیا اور اپنے کپڑوں کے بارے میں بات کرنے لگی۔ "ان کی فٹنگ ٹھیک نہیں ہے لیکن میں ٹھیک کر لوں گی۔"
"وہ کیسے؟"
"کوٹھی میں ایک سوئنگ مشین بھی ہے پرانی ہے مگر چلتی ہے، چلا کر دیکھ چکی ہوں اور مجھے سلائی آتی ہے۔ لیکن میرے پاس گھر میں پہننے والا سلیپر نہیں ہے۔"
ہم نے راستے میں ایک جگہ رک کر اس کے لیے سلیپر لے لیے۔ ہم گھر آئے تو وہ بہت خوش تھی۔ اس نے کہا۔ "آج میں تمہیں خود کھانا بنا کر کھلاؤں گی۔"
"تمہیں بنانا آتا ہے۔"
"تم کوئی چیز کہو۔" اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔
"مجھے بریانی اچھی لگتی ہے۔"

"اب میں تمہیں ایسی بریانی کھلاؤں گی کہ تم نے آج تک نہیں کھائی ہو بس مجھے چیزیں لادو۔"

میں نے اسے چیزیں لادیں اور وہ کچن میں گھس گئی۔ اس کی تیار کی ہوئی بریانی واقعی لاجواب تھی۔ میں نے آج تک ایسی بریانی نہیں کھائی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس عورت کے پاس ظاہری حسن کے ساتھ اور کتنے حسین پہلو ایسے تھے جو چھپے ہوئے ہیں۔ اسے یہاں آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور وہ ایسی لگ رہی تھی جیسے برسوں سے یہاں رہتی آئی ہو۔ اگلے روز میرا کام پر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجبوراً جانا پڑا۔ چھٹی والے دن دوست فون کرتے رہے کہ کہیں چلتے ہیں مگر میں طبیعت کا بہانہ کر کے انہیں ٹالتا رہا۔ دفتر میں ان سب نے میرا پیچھا لیا کہ طبیعت تو ٹھیک لگ رہی ہے کوئی اور چکر ہے۔ بہ مشکل میں نے ان سے پیچھا چھڑایا ورنہ وہ آج کے لیے پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے بہانہ کیا کہ آج مجھے ایک رشتے دار کے گھر جانا ہے جو کب سے بلا رہے تھے۔ یوں میری جان چھوٹی۔ چھٹی ہوتے ہی میں گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور سارے راستے یہ اندیشہ مجھے پریشان کرتا رہا کہ میں گھر پہنچوں گا تو سارہ وہاں نہیں ہو گی، وہ جا چکی ہو گی۔ میں نے خود گیٹ کا تالا کھولا۔ میں معمول کے مطابق تالا لگا کر گیا تھا اور سارہ کو منع کیا تھا کہ وہ باہر نہ نکلے آس پاس والے جانتے تھے کہ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ اس نے ہنس کر کہا۔

"میں نظر آ گئی تو تمہاری ریپوٹیشن خراب ہو جائے گی؟"

"بھاڑ میں گئی ریپوٹیشن یہاں رہنے والے کون سے میرے محلے دار ہیں جن کی فکر کروں۔ مسئلہ یہ ہے کہ کوئی پولیس کو کال نہ کر دے۔"

"ٹھیک ہے میں احتیاط کروں گی۔"

گاڑی کھڑی کر کے میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر آیا اور اسے لاؤنج میں ٹی وی میں مگن پا کر سکون کا طویل سانس لیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھی جیسے میرا انتظار کرتی رہی تھی۔ پھر خود کو دکھایا اس نے نیا لباس پہنا تھا۔ اسے اپنے ناپ کے مطابق کر لیا تھا۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔" میں نے کہا۔ "تم لباس سے نہیں سجتی ہو لباس تم سے سج جاتا ہے۔"

"تھینک یو۔" وہ خوش ہو کر بولی۔ "تمہارے لیے چائے لاؤں۔"

"میری عادتیں مت بگاڑو کہ تمہارے بعد مشکل ہو۔"

میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ سب کچھ ہونے کے باوجود اس نے اب تک اپنے بارے میں کچھ خاص نہیں بتایا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے کم کم گریجویٹ ہے اور اس کا تعلق شاید ... سے تھا کیونکہ بولنے کے دوران کبھی کبھی اس کے لہجے میں ... جھلک آجاتی تھی۔ اب تک اس نے اردو میں بات کی تھی البتہ انگلش بھی روانی سے بولتی تھی۔ اپنے رکھ رکھاؤ اور انداز سے وہ اوپری طبقے کی لگتی تھی اور میں نے اس میں ... محسوس کیا تھا۔ وہ میرے گھر میں تھی لیکن میں ... خود کو اتنا پُراعتماد محسوس نہیں کرتا تھا جتنا وہ کرتی تھی۔ میں ... کے لیے سب کر رہا تھا اور وہ بہت وقار آمیز شکریے کے ساتھ اسے قبول کر رہی تھی۔ اس رات بھی اس نے کھانا بنایا تھا۔ میں کئی طرح کی ڈشز کا سامان ساتھ لے آیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے لاؤنج میں کچھ دیر باتیں کیں اور پھر سونے کے لیے اٹھ گئے۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ میں دفتر سے آتا تو وہ میرا استقبال کرتی۔ میرے کپڑے استری شدہ رکھے ہوتے تھے۔ جب میں باتھ کے بعد چینج کر کے آتا تو وہ چائے لاتی اور پھر رات کا کھانا۔ صبح ناشتے کے وقت وہ سو رہی ہوتی تھی۔ میں حسبِ معمول ناشتا دفتر کی کینٹین میں کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس معمول میں تبدیلی ہو اور میرے دوست چوکنا ہو جائیں ویسے وہ حیران اب بھی تھے کہ کہاں میں رات گئے تک ان کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا اور کہاں اب میں چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا تھا۔ میں نے ... کیا کہ کراچی کے حالات کی وجہ سے امی ابو نے شام کے بعد باہر نکلنے سے منع کیا ہے اور وہ اطمینان کے لیے لینڈ لائن نمبر پر کال کر کے معلوم کرتے ہیں کہ میں گھر میں ہوں یا نہیں۔ اس پر دوستوں نے مذاق تو اڑایا تھا لیکن ساتھ ہی انہوں نے مجھے مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ مجھے یہ خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی کسی دن گھر پر نہ آ پہنچے۔ ظاہر ہے میں انہیں اس سے منع نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ عین موقع پر اطلاع دیتے تو میں کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔ ورنہ پہلے سے پروگرام ... لیتے تو مجھے انکار کرنا مشکل ہو جاتا۔

میں سارہ کی گھر میں موجودگی کا عادی ہوتا جا رہا تھا اور میرے ذہن سے یہ خیال محو ہونے لگا تھا کہ وہ میرے لیے ایک اجنبی عورت ہے اور کسی دن اسے یہاں سے جانا ہو گا۔ اگر وہ نہیں گئی تو مجھے تو جانا ہی تھا اور میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال آتا تھا مگر وہ بھی اتنے سکون سے رہ رہی تھی جیسے اسے ساری عمر یہیں رہنا تھا۔ جب میں نہیں ہوتا تو وہ گھر کی صفائی کرتی، اپنی پسند کی چیزیں بناتی اور ٹی وی دیکھتی تھی۔ جب میں آتا تو سونے تک اس کا وقت میرے ساتھ گزرتا تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ میں اس سے مستقبل کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر اس خیال سے رک گیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس سے بیزار آ گیا ہوں اور اب جان چھڑانا چاہتا ہوں۔ ایک رات ہم باہر گئے۔ میں اسے ایک ریستوران لے گیا۔ باہر اس نے عبایا پہنا ہوا تھا لیکن ریستوران میں جا کر اس نے عبایا اتار دیا۔ "یہاں تمہیں خوف نہیں ہے؟"

"نہیں، میرے شوہر کے رشتے دار جس قسم کے لوگ ہیں وہ یہاں نہیں آسکتے۔" اس نے جواب دیا اور مینو دیکھنے لگی۔ آج اس نے ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اتنی دلکش لگ رہی تھی کہ ریستوران میں موجود تمام ہی مرد اس کی طرف متوجہ تھے۔ یہ بلیک ساڑی میں نے ہی اس کے لیے لی تھی لیکن اس کا بلاؤز اس نے خود سیا تھا اور یہ اتنا چست اور چھوٹا تھا کہ اس کا شہابی رنگ کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے غصہ آنے لگا۔ میں لوگوں کو نہیں روک سکتا تھا اس لیے اس سے کہا۔ "یہاں ٹھیک نہیں ہے میرا خیال ہے ہمیں کسی الگ جگہ بیٹھنا چاہیے۔"

"کیوں یہاں کیا خرابی ہے؟"

"خرابی یہ ہے کہ یہاں موجود لوگ تمہیں دیکھے جا رہے ہیں اور مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"کیوں؟" وہ شوخی سے ہنسی۔ "میں تمہاری بیوی تو نہیں ہوں۔"

"لیکن لوگ تو یہی سمجھ رہے ہیں۔" میں نے خفگی سے کہا اور منتظم کو اشارہ کیا، وہ آیا تو میں نے اس سے جگہ تبدیل کرنے کو کہا۔ "ہمیں مزید پرائیویسی چاہیے۔"

وہ سمجھ گیا اور ہمیں ایک کونے کی میز کی طرف لے گیا۔ مزید پرائیویسی کے لیے اس کے دو طرف اسکرین لگا دی۔ یوں ہم باقی ہال سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ "تمہیں اچھا نہیں لگا کہ لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔"

"ہاں۔" میں نے اقرار کیا۔ "میں اس معاملے میں قدامت پسند ہوں۔ بے شک تم سے میرا کوئی رشتہ نہیں

ہے لیکن اس وقت تم میرے ساتھ ہو اور مجھے اچھا نہیں لگا کہ لوگ تمہیں اس طرح دیکھیں۔“

وہ چپ ہو گئی۔ ہم نے کھانا خاموشی سے کھایا اور کھانے کے فوراً بعد اس نے کہا۔ ”گھر چلو میری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ بھی گرم تھا۔ گھر سے چلتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ کوئی گرم چیز پہن لے باہر بہت سردی ہے مگر اس نے صرف عبایا لیا تھا۔ ہم واپس گھر آئے تب تک اس کا بخار بڑھ گیا تھا۔ میں نے اسے دوا دی۔ ”اب تم سو جاؤ.... کچھ دیر میں بخار اتر جائے گا۔“

وہ ڈولتے قدموں سے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ میں اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس روز واقعی سردی تھی۔ میں لباس بدل کر بستر میں گھسا تو مجھے فوراً نیند آ گئی۔ پھر رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے سارہ کو بستر کے قریب کھڑے پایا۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور وہ جس حال میں تھی اسے دیکھ کر میں بوکھلا گیا تھا۔ ”سارہ ...... یہ تم....“

وہ آگے بڑھی اور میں اسے اور خود کو کسی طرح نہ روک سکا تھا۔ کچھ دیر میں وہ سب ہو گیا جس سے میں شروع سے ڈرتا آیا تھا۔ وہ کسی طوفان کی طرح آئی تھی اور میں اس کے ریلے میں بہہ گیا۔ دوسری بار میری آنکھ اس کی سسکیوں سے کھلی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ اگرچہ اس کا قصور بھی تھا وہ رات کو اس حال میں میرے کمرے میں آئی تھی کہ کسی زاہد خشک کے لیے بھی خود پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ میں نوجوان تھا اور پھر وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی۔ اس کے باوجود میں خود کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ ہمت کر کے میں نے اسے چپ کرانا چاہا مگر وہ روتی رہی۔ تنگ آ کر میں نے کہا۔ ”پلیز سارہ چپ کر جاؤ۔ تم چاہو تو مجھے سزا بھی دے سکتی ہو۔“

اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں اور ناک رونے سے سرخ اور متورم ہو رہی تھیں۔ اس نے کہا۔ ”مجھ سے شادی کر لو ابھی اور اسی وقت۔ میں گناہ کا یہ داغ لے کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر تم شادی نہیں کر سکتے تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

”نہیں تم خودکشی نہیں کرو گی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میں آج ہی تم سے شادی کروں گا۔“

پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ صبح ہوتے ہی میں نے دفتر فون کر کے چھٹی لی اور کسی نکاح خواں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی مشکل سے ایک نکاح خواں ملا جو بغیر سوالات کے میرا اور سارہ کا نکاح پڑھانے پر راضی ہو گیا تھا۔ وہ ساتھ دو گواہ بھی ساتھ لے آیا۔ اسے اپنی فیس سے غرض تھی جو معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ وہ لے کر اس نے میرا اور سارہ کا نکاح پڑھا دیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ دو دن کے اندر نکاح رجسٹرڈ کرا کے نکاح نامہ میرے حوالے کر دے گا۔ مجھے ان چیزوں کا اتنا علم نہیں تھا لیکن سارہ سب جانتی تھی اس نے کہا۔ ”جب تک نکاح نامہ رجسٹرڈ نہیں ہو گا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔“

یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور جب نکاح ہو گیا تو مجھے امی اور ابو کا خیال آیا کہ میں ان سے کیا کہوں گا اور کیا میں ان کو بتا سکتا تھا کہ یہ نکاح کیسے اور کیوں ہوا؟ یہ سوال سامنے آیا تو میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ امی ابو نے جس طرح میری تربیت کی تھی اور مجھ سے جو توقعات رکھتے تھے اگر انہیں میری لغزش کا پتا چل جاتا تو وہ کبھی مجھے معاف نہ کرتے۔ میں اتنا فکر مند ہوا کہ یہ بھی بھول گیا کہ سارہ اب میری بیوی تھی اور مجھے اس پر پورا حق حاصل ہو گیا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے یاد دلائی جب رات کو وہ خود میرے کمرے میں آ گئی اور شکوہ کیا۔ ”میرا خیال ہے اب تمہیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”ایسا نہیں ہے میں تو یہ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں کہ امی ابو سے کیا کہوں گا۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ وہ اعتماد سے بولی۔ ”یہ مجھ پر چھوڑ دو میں اس طرح معاملہ ہینڈل کروں گی کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی۔“

اس نے مجھے اس طرح اپنی طرف متوجہ کیا کہ میں سچ مچ ساری فکریں اور پریشانیاں بھول گیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ وہ بہت ذہین اور تجربے کار عورت تھی اور اسے معلوم تھا کہ مجھ جیسے ناتجربے کار نوجوان کو کس طرح قابو کیا جاتا ہے۔ اس کی قربت میں میں فکریں کیا سب ہی کچھ بھول گیا تھا۔ اگلے روز میں نے صبح کال کر کے دفتر سے مزید دو دن کی چھٹی طلب کی جو ظاہر ہے مجھے مل گئی کیونکہ میں وہاں ملازم تو نہیں تھا جو میرے نہ جانے سے کام رک جاتا۔ بس مجھے ڈر یہ تھا کہ یہ خبر ابو تک نہ پہنچ جائے کیونکہ

باقاعدگی سے احمد صاحب کو کال کر کے میری پروگریس لیتے تھے۔ یہ دو دن میں نے سارہ کے ساتھ کس طرح گزارے مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ممکن ہے اگر اس سے باقاعدہ شادی ہوتی تو میں اتنا پاگل نہ ہوتا۔ پھر اس نے بھی میری پوری حوصلہ افزائی کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے زیادہ سے زیادہ موقع دینا چاہ رہی ہو۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے جو کیا تھا اس سے تو مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

تین دن وہ میرے ساتھ رہی۔ دوسرے دن نکاح خواں نے حسب وعدہ مجھے نکاح نامہ لا دیا تھا۔ اس کی دونوں کاپیاں اس نے مجھے دی تھیں۔ یہ نکاح رجسٹرار کے پاس رجسٹر ہو چکا تھا۔ تیسری صبح بیدار ہونے پر ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ سارہ تک سک سے تیار ہو کر بیٹھی تھی جیسے کہیں جانے والی ہو۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”بس اب اٹھ جاؤ میں دو گھنٹے سے تمہارے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔“

”تو اٹھا لیا ہوتا۔“ میں نے انگڑائی لی۔

”تم رات کو دیر سے سوئے تھے اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اب اٹھ جاؤ مجھے بہت اہم کام لینا ہے تم سے۔“

”ایسا کیا اہم کام ہے، کہیں جانا ہے کیا؟“

”صرف مجھے۔“ اس نے تصحیح کی۔ ”تمہیں اس طلاق نامے پر سائن کرنے ہیں۔“

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ”کیا.... کیا کہا تم نے؟“

”یہ پیپرز رکھے ہیں طلاق کے ان پر سائن کر دو اور اپنی زبان سے بھی مجھے تین بار طلاق دے دو۔“ اس نے میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔

اس بار مجھے سننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے شک سے اسے دیکھا۔ ”تم مذاق کر رہی ہو؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ بولی۔ اس کے تاثرات بالکل بدلے ہوئے تھے۔ بے شک اس وقت بھی وہ غضب کی حسین لگ رہی تھی کیونکہ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا مگر اس کے تاثرات کسی پتھر کی طرح سخت تھے۔ ایسا لگ رہا تھا اس کا چہرہ سنگ مرمر سے تراشا ہوا ہو۔ خوب صورتی کے باوجود پتھریلا پن لیے ہوئے تھی۔ اس کے تاثرات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”وہی جو تم نے سنا ہے۔“ وہ بولی اور ایک بار پھر میز پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ طلاق نامہ ہے اس پر سائن کر دو۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ میں بری طرح چونکا کیونکہ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا لیکن صورت سے مہلک نظر آنے والا پستول تھا۔

”میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ بے ستور سکون سے بولی۔ ”تمہارے پاس تین منٹ ہیں اس پر سائن کر دو۔“

رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ بالکل بھی مذاق نہیں کر رہی تھی اور پوری طرح سنجیدہ تھی۔ اس نے پستول نکال لیا تھا، اس سے زیادہ سنجیدہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ اس وقت بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس مہربان اور محبت کرنے والی سارہ سے بالکل مختلف جو کل رات تک مجھ پر تن من سے نثار ہو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”دو منٹ رہ گئے ہیں۔“

”سارہ تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے۔ اگر ہے بھی تو یہ طلاق مانگنے کا کون سا طریقہ ہے؟“

”میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتی۔ میرا مطالبہ طلاق ہے اور وہ مجھے بہر صورت چاہیے۔“

”اگر میں یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دوں۔“

”ایک منٹ رہ گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ایک منٹ بعد میں تمہیں شوٹ کر دوں گی اور پھر مجھے طلاق کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔“

میں نے پھر بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ”تم مجھے شوٹ کر دو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے کہا اور اچانک گولی چلا دی۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے گولی مجھے لگی ہو۔ گولی چلنے کا دھماکا اتنا نہیں تھا لیکن بند کمرے میں یہ بہت زیادہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے خود کو ٹٹولا اور صحیح سلامت پا کر خدا کا شکر ادا کیا پھر میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہارا دماغ درست ہے۔“

”ہاں... لیکن اب تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میں سنجیدہ ہوں۔ جو سوراخ پیچھے دیوار میں ہوا ہے وہ تمہارے سینے میں بھی ہو سکتا تھا۔“

میں نے مڑ کر دیکھا واقعی دیوار میں سوراخ تھا۔ میں کانپ اٹھا تھا۔ گولی میرے بالکل پاس سے گزری تھی۔ نہ جانے اس نے سچ مچ گولی چلائی تھی یا مجھے ڈرا رہی تھی۔ ”سارہ ایسا کیوں کر رہی ہو؟“

”اگر میں وضاحت کر سکتی تو پہلے ہی کر چکی ہوتی۔ لیکن مجھے افسوس ہے میں کوئی وضاحت نہیں کر سکتی۔“

”کوئی اور راستہ نہیں....“

”دوسرا راستہ میں تمہیں بتا چکی ہوں اور یہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ بہتر ہے مجھے طلاق دو اور زندہ رہو۔“

”سارہ پلیز....“

اس نے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف کر دیا۔ ”عمران میں اب تین تک گنوں گی۔ تم مرنا ہی چاہتے ہو تو تمہاری مرضی.... ایک.... دو....“

اس کے تین کہنے سے پہلے میں نے فائل اٹھا لی۔ یہ باقاعدہ اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ اس میں گواہوں والی جگہ خالی تھی۔ اس کے مطابق میں اپنے ہوش و حواس میں سارہ احمد ولد شریف احمد کو طلاق دے رہا ہوں۔ اس کا اور میرا این آئی سی نمبر اور اس کی کاپی بھی تھی۔ میں نے اس پر سائن کیے اور فائل اس کی طرف پھینک دی۔ ”تم نے کسی مقصد کے تحت مجھ سے شادی کی تھی؟“

”ظاہر ہے۔“ وہ فائل اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”مگر اطمینان رکھو اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ہماری ملاقات ہوگی۔ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزارا کیونکہ تم سچ مچ بہت اچھے انسان ہو۔ کاش میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی۔“ اس کے لہجے میں حسرت آ گئی تھی۔

”ہمیشہ رہنے والی یہ حرکت نہیں کرتی ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”صحیح بات یہ ہے کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے تمہیں اچھی بیوی ملے گی۔ اب ذرا اپنے منہ سے بھی تین بار طلاق کہہ دو۔“

میں طلاق کے پیپرز پر سائن کر چکا تھا۔ اس لیے زبان سے کہہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اسے تین بار طلاق دے دی۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ فائل اپنے بڑے سے بیگ میں رکھی۔ ”میں یہاں سے کچھ نہیں لے کر جا رہی ہوں سوائے تن کے ان کپڑوں کے.... ہاں نکاح نامے کے لیے زحمت مت کرنا اس کی دونوں کاپیاں میرے پاس ہیں۔“

وہ کمرے سے نکل گئی۔ ایک منٹ بعد میں باہر نکلا تو گیٹ کے سامنے ایک سفید کار کی جھلک دکھائی دی۔ میں گیٹ سے نکلا تو ایک وائٹ کیب گلی سے مڑ رہی تھی۔ یعنی اس نے ٹیکسی بھی پہلے سے منگوائی ہوئی تھی۔ میں واپس آیا اور اپنی چیزوں کی تلاشی لی۔ ہر چیز اپنی جگہ تھی کچھ نہیں غائب تھا۔ سوائے سارہ کی چیزوں کے۔ نکاح کے موقع پر میرے پاس اس کا شناختی کارڈ آ گیا تھا لیکن میں نے غور نہیں کیا تھا اور نہ اس کا پتا وغیرہ دیکھنے کی زحمت کی تھی۔ میرا دماغ اڑا ہوا ہو رہا تھا۔ ہاں اس کے کپڑے وہاں موجود تھے جن میں اس کے وجود کی خوشبو بسی تھی۔ وہ خوشبو جو کل رات تک میری تھی اور چند منٹ میں میری نہیں رہی تھی۔ وہ جس طرح میری زندگی میں اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک نکل گئی۔ بغیر کوئی نام، پتا اور نشان چھوڑے۔

کئی دن میں پاگلوں کی طرح سوچتا رہا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ وہ مجھ سے کچھ لے کر نہیں گئی تھی بلکہ اس نے مجھے اپنا آپ دیا تھا۔ پھر اچانک ہی سب واپس لے لیا اور چھوڑ کر چلی گئی اگر اس کا کوئی مقصد تھا تو اس نے مجھے ہی کیوں استعمال کیا تھا؟ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا اور اسی وجہ سے میرا دماغ زیادہ خراب ہو رہا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ مجھے صبر آنے لگا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس واقعے کا کسی کو علم نہیں ہوا۔ چند دن بعد میں نے دفتر جانا شروع کیا اور پھر میرا دل نہیں لگا تو میں نے ابو سے کہا کہ میں واپس آ رہا ہوں میں نے جو سیکھنا تھا سیکھ لیا تھا۔ امی ابو بھی اب میری جدائی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے مجھے واپسی کی اجازت مل گئی۔

واپس آنے کے بعد میں ابو کے ساتھ بزنس میں لگ گیا۔ کچھ عرصے سارہ کی یاد ستاتی رہی لیکن پھر یہ یاد دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی گئی اور بس ایک بھولی بسری چیز بن کر رہ گئی۔ تین سال بعد جب میں بزنس کو پوری طرح سمجھ چکا تھا تو امی ابو نے میری شادی کر دی۔ نازیہ میری پسند تھی۔ نازیہ کے ماں باپ شروع میں اس رشتے پر آمادہ نہیں تھے لیکن بعد میں وہ بھی راضی ہو گئے تھے۔ نازیہ میری زندگی میں آئی تو میں سب بھول گیا تھا۔ لیکن سارہ کے اچانک سامنے آنے سے ماضی کی بھولی یاد دوبارہ تازہ ہو گئی تھی۔ مگر اب اس یاد میں ایک خوف شامل ہو گیا تھا کہ کہیں یہ بات نازیہ تک نہ پہنچ جائے۔ میں نے کال بند کر دی تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سارہ مجھ سے دوبارہ رابطہ نہ کرتی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس سے بات کرنا پڑے گی۔ ورنہ کہیں اس کی طرف سے رابطے کی کوئی کوشش میرے گلے نہ پڑ جائے۔ میں نے شام کو دفتر سے اٹھنے سے پہلے سارہ کے نمبر پر کال کی۔ ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں آخری بار۔“

''پہلے کیوں کال کاٹ دی تھی؟''
''اس وقت میں ٹینشن میں تھا۔''
''تو اب کیوں ملنا چاہتے ہو؟''
''معاملہ کلیئر کرنے کے لیے تاکہ مستقبل میں ہم دونوں کی زندگی میں کوئی مشکل نہ آئے۔''
''ٹھیک ہے کہاں ملو گے؟''

کسی ریسٹوران یا ہوٹل میں ملنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ یہ میرا شہر تھا اور یہاں ہر جگہ میرے جاننے والے تھے۔ کوئی دیکھ لیتا تو میرے لیے مسئلہ بن سکتا تھا۔ میں نے لاہور جانے والی ایکسپریس وے پر واقع ایک ریسٹوران کا نام لیا۔ وہ دور دراز جگہ تھی اور وہاں پرائیویسی بھی تھی۔ وہ راضی ہو گئی۔ ''میں چھ بجے تمہارا انتظار کروں گا۔''

وہ ٹھیک وقت پر آئی اور میں اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا کیونکہ اس نے عبایا پہن رکھا تھا اور چہرے پر نقاب تھا۔ میں نے ایک بوتھ لیا تھا وہاں صرف ہم ہوتے۔ ہم بوتھ میں آئے تو اس نے عبایا اور نقاب اتار دیا۔ اس نے جدید تراش کا چست لباس پہن رکھا تھا جو اس کے بدن کے تمام پیچ و خم نمایاں کر رہا تھا۔ میں نے پانچ سال بعد اسے قریب سے دیکھا تھا اور مجھے لگا کہ ان پانچ سالوں کا اگر اس پر کوئی اثر ہوا تھا تو وہ مثبت ہی ہوا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ دلکش اور حسین ہو گئی تھی۔ وہ شرمائی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں جھینپ گیا۔ ''سوری میں بھول گیا تھا کہ اب میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے۔''
''وہ تو اب بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
''پلیز..... جو پانچ سال پہلے ہوا تھا مجھے اس پر آج بھی شرمندگی ہے۔ ہاں تمہارے ساتھ جو وقت گزرا وہ اچھا تھا۔ مگر میرے لیے وہ بھی دفن شدہ ماضی کا ایک حصہ ہے۔''
میرے کھردرے لہجے پر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''تب مجھے کیوں بلایا ہے؟''
''دو باتوں کے لیے۔ ایک وہ سب کیا تھا جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا؟ دوسرے اب ہم دونوں اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں اور ہمیں آباد ہی رہنا چاہیے۔''
اس نے گہری سانس لی۔ ''میں بھی یہی سوچ کر تم سے ملنے آئی ہوں۔''
''تو یہ طے ہے کہ ہم آخری بار مل رہے ہیں اور آئندہ جب بھی ہمارا سامنا ہوگا اتفاق سے اور اجنبی کی حیثیت سے ہوگا؟''

''ڈن۔'' اس نے اپنا گلابی ہاتھ میری طرف بڑھایا جو میں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ تھام لیا۔
''وہ سب کیا تھا؟''
اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''میرا خیال تھا تم سمجھ گئے ہو گے؟''
''ہاں بعد میں ایک خیال آیا تھا لیکن تصدیق تم کرو گی۔''
اس نے گہری سانس لی۔ ''ایک جھگڑے میں ضمیر نے مجھے طلاق دے دی تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن میں اپنے بچے کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی تھی اور ضمیر سے بچے لے بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میرے پاس ایک ہی صورت تھی۔ میں کسی سے شادی کروں، پھر اس سے طلاق لوں اور دوبارہ ضمیر سے نکاح کر لوں۔''
''لیکن میں ہی کیوں؟''
''میں نے اتفاق سے تمہیں دیکھا تھا۔ میں کراچی چلی آئی تھی۔ کیونکہ میں سب سے چھپ کر یہ کام کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تمہارا گھر دیکھا اور پھر مظلوم بن کر وہاں پہنچ گئی۔ اب یہ اتفاق ہے کہ تم بھی فیصل آباد کے رہنے والے نکلے۔ اس سے آگے تم جانتے ہو۔''
''گویا تم سب طے کر کے وہاں آئی تھیں۔''
''ہاں لیکن سب ویسا نہیں ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم فوراً مجھ پر فریفتہ ہو جاؤ گے اور میں شادی کی شرط رکھوں گی لیکن جب تم ٹس سے مس نہیں ہوئے تو مجھے وہ سب کرنا پڑا۔''
''تمہارے لیے شاید نہ ہو لیکن میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ اسی بوجھ تلے دب کر میں تم سے شادی پر راضی ہوا تھا۔''
وہ ہنسی۔ ''میں نے سنا ہے تم اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہو؟''
''میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''وہ بھی مجھ سے جنون کی حد تک محبت کرتی ہے۔''
اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ ''تم واقعی خوش قسمت ہو کہ محبت کرتے بھی ہو اور تمہاری بیوی تم سے محبت کرتی ہے۔ میاں بیوی کی زندگی میں محبت نہ ہو تو یہ رشتہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی اور عبایا پہننے لگی۔ میں نے اسے روکا نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی میری زندگی سے نکل چکی تھی۔

وہی ہوتا ہے

محترم مدیر اعلیٰ
آداب عرض،
لوگ اپنے مفاد کی خاطر کس طرح دوسروں کی زندگی سے کھیلتے ہیں اس کا ثبوت خود میری زندگی ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے صرف وقت گزاری کے لیے نہ پڑھا جائے یہ انسانوں کی بند آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اگر خداوند تعالیٰ میرا ساتھ نہ دیتا تو میری زندگی جہنم بن گئی ہوتی۔

ارجمند
(سرگودھا)

جب وہ لوگ میرے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئے تو ہم حیران رہ گئے تھے۔
کہاں تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ کسی تقریب میں ملاقات ہوتی تو سلام کا جواب بھی گردن کے اشارے سے دیا کرتے۔ پھر دو چار باتیں کر کے ادھر اُدھر ہو جاتے۔
ریاض نام تھا خاندان کے سربراہ کا۔ اور ان کی بیگم تھیں شہزادی۔ میری سگی پھوپی۔ اور ریاض میرے سگے

پھوپا تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا کمال۔

نہ جانے یہ پیسا کیا ہوتا ہے۔ یہ رشتوں کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے آگے ساری مروت ساری مہربانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔

ہم غریب لوگ تھے (کم از کم ان لوگوں کے مقابلے میں تو بہت غریب ہی تھے) جبکہ ریاض صاحب بہت بڑے کاروباری تھے۔

بہت بڑی فرم تھی ان کی۔ شاندار کوٹھی، گاڑیاں، بینک بیلنس، سب کچھ تھا ان کے پاس۔ اس لیے پہلے تو ان لوگوں نے آنا جانا کم کیا پھر آہستہ آہستہ ہمارے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے۔

بس کبھی کبھی کسی تقریب میں ملاقات ہو جاتی۔ اس سے زیادہ اور کوئی رسم وراہ نہیں تھی۔ ہاں عید بقر عید کے دن بھی رسماً ہمارے یہاں آجایا کرتے۔

ان کا بیٹا کمال بھی ایک اکڑی ہوئی گردن والا نوجوان تھا۔ اس نے تو شاید ہمارے یہاں کبھی قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔

مجھ سے ملاقات ہوتی تو سرسری انداز سے خیریت وغیرہ معلوم کر کے اِدھر اُدھر ہو جاتا یا اپنے موبائل پر کسی سے بات کرنے لگتا۔

اس لیے جب پھوپی اور پھوپا ہمارے یہاں کمال کا رشتہ لے کر آئے تو ہم سب ہی حیران رہ گئے تھے۔

"بھائی صاحب، لاٹھی مارنے سے پانی جدا نہیں ہوتا۔" پھوپی نے کہا۔ "آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم آپ کو بھول گئے ہیں یا آپ لوگوں کو چھوڑ دیا ہے۔ بس کم بخت فرصت ہی نہیں ملتی۔ دن رات کی مصروفیات میں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریاض پاکستان میں کہاں ہوتے ہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔"

"ہاں شہزادی۔" ابا نے ایک گہری سانس لی۔ "ہم سب جانتے ہیں۔"

"انور بھائی، اب ہم اپنے پچھلے رویے کی تلافی کرنے آئے ہیں۔" پھوپا ریاض نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ ہمیں مایوس ہو کر نہیں جانا پڑے گا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" ابا حیرت زدہ سے تھے۔ "کس بات کی تلافی۔ کیسی مایوسی۔"

"ہم ارجمند کے لیے کمال کا رشتہ لے کر آئے ہیں۔" پھوپی نے اچانک یہ بات کہہ دی۔

ہم سب کچھ دیر کے لیے سناٹے میں رہ گئے تھے۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم نے کیا سن لیا ہے۔ کمال سے میرا رشتہ (اتفاق سے اس گفتگو کے دوران میں بھی وہیں بیٹھی تھی)

"بھابی۔" پھوپی نے میری امی کی طرف دیکھا۔ "ہمیں ارجمند تو شروع ہی سے پسند تھی۔"

"لیکن آپ لوگوں کی طرف سے تو کبھی اظہار بھی نہیں ہوا۔"

"کیا ضرورت تھی رسمی اظہار کی۔ ہم نے سوچ رکھا تھا جب وقت آئے گا تو ایک ساتھ ہی سوالی بن کر آجائیں گے۔"

"ریاض میاں، اپنے صاحب زادے سے تو معلوم کر لیا ہوتا۔" ابو نے پھوپا سے کہا۔

"معلوم کر کے آئے ہیں انور بھائی، بلکہ یہ اسی کی خواہش ہے۔"

اس انکشاف نے دوسروں پر جو بھی اثر ڈالا ہو، لیکن میں تو ان لوگوں کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔

اگر میرے ساتھ کسی اور کے نام کا سلسلہ ہوتا تو شاید میں پریشان بھی ہو جاتی۔ لیکن میرے ساتھ تو ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اتنا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ کسی کے لیے سوچتی، کسی کی طرف توجہ دیتی۔ براہ راست شادی کے لیے رشتہ ہی آگیا تھا اور وہ بھی کمال کے لیے۔

خدا جانے یہ کیا سلسلہ تھا۔

"بھائی صاحب کیا سوچنے لگے؟" پھوپا نے ابو کی طرف دیکھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کیا جواب دوں۔"

"کمال آپ کے سامنے کا بچہ ہے۔ اولاد ہے آپ کی۔ اس کے لیے کیا سوچنا۔ پھر اپنا خون ہے۔"

"دیکھیں، یہ معاملہ چونکہ دو زندگیوں کا ہے۔ چلیں ایک طرف تو معلوم ہو گیا کہ کمال میاں اس رشتے کے لیے تیار ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ارجمند کیا کہتی ہے۔ ہم اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتے۔"

اب میں بول پڑی۔ "چونکہ یہ معاملہ میری زندگی کا ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ ایک بار کمال سے ملاقات کر لوں۔ تاکہ پتا چل جائے کہ انہوں نے میرا انتخاب کیوں کیا ہے۔"

"ہاں ہاں بیٹی کیوں نہیں۔" پھوپی بول پڑیں۔ "تم دونوں جب چاہے ایک دوسرے سے مل سکتے ہو۔ بلکہ کمال خود یہاں آجائے گا۔"

میں پھر کچھ نہیں کہہ سکی۔ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئی۔

طے یہ پایا تھا کہ کمال دوسری شام کو ہمارے گھر آئے گا اور میں اس سے براہِ راست بات کر سکوں گی۔ ویسے بھی وہ ہمارے لیے اجنبی تو نہیں تھا۔

پورا گھر اس رشتے پر حیران بھی تھا اور خوش بھی تھا۔ خاص طور پر ابو کو اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی بہن نے انہیں بھلایا نہیں تھا۔

دوسری شام جب کمال آیا تو مجھے اس سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع دے دیا گیا۔

"جی کمال صاحب۔" میں نے براہِ راست بات کی۔ "یہ آپ کو اچانک ہم غریبوں کا خیال کیسے آگیا۔ اور وہ بھی اس قدر کہ اپنا رشتہ تک بھیج دیا۔"

"ارجمند میری تو شروع سے یہی خواہش تھی۔" کمال نے کہا۔ "اور تم ہمارے لیے اجنبی تو نہیں ہو۔"

"اگر شروع سے خواہش تھی تو اس کا پتا کیوں نہیں چلا؟"

"یہ سب چھوڑو، تم یہ بتاؤ تم اس رشتے پر خوش ہو یا نہیں؟"

"یہ تو بہت ڈائریکٹ سوال کیا ہے آپ نے۔"

"اس لیے جواب بھی ڈائریکٹ ہی چاہتا ہوں۔"

"چلیں، اگر آپ کہہ ہی رہے ہیں تو مان لیتی ہوں۔"

کمال ہنس پڑا تھا۔

قصہ مختصر دو مہینوں کے اندر ہی میری شادی کمال سے ہوئی۔ اور میں اپنے عام سے گھر سے اٹھ کر پھوپی کے شاندار گھر میں آگئی۔

یہاں دنیا بھر کی آسانیاں اور نعمتیں حاصل تھیں۔ گھر والوں کا رویّہ بھی بہت مناسب تھا۔ کم از کم انہوں نے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

کمال کا رویّہ بھی بہت اچھا تھا۔

سب کچھ ٹھیک تھا۔ ابو اور امی بھی اس بات پر خوش تھے کہ ارجمند کی قسمت بدل گئی ہے۔ زندگی نے اس کے دامن میں ڈھیر ساری خوشیاں بھر دی ہیں۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے کہ ایک دن اچانک ایک ایسی خبر سننے کو مل گئی جس نے مجھے بدحواس کر کے رکھ دیا۔

اس دن میری ایک دوست انجم مجھ سے ملنے آئی تھی۔ کالج میں ہم ساتھ ہی ہوا کرتے تھے۔ میری شادی کے وقت وہ ملک سے باہر گئی ہوئی تھی۔ اس لیے شادی میں اس کی شرکت نہیں ہو سکی تھی۔

واپس آتے ہی اس نے میرے گھر پر فون کیا اور وہاں سے میرا نیا نمبر لے کر مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں نے اس کو اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے اور کمال کے لیے بہت سے تحفے وغیرہ لے کر آگئی۔ اس وقت کمال گھر پر نہیں تھے۔

ہم دونوں بہت دنوں کے بعد ملے تھے۔

میں اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ "انجم، شادی میں تیری کمی بہت محسوس ہوئی۔" میں نے کہا۔

"چل، اب تو آگئی ہوں نا۔" وہ مسکرا دی۔ "اپنے میاں صاحب کی تصویریں تو دکھاؤ۔"

میں نے شادی اور ولیمہ کے البم اس کے سامنے کر دیے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کمال کی تصویر دیکھتے ہی وہ چونک گئی۔ "یہ، یہ تمہارا شوہر ہے۔"

"ہاں، یہی تو ہیں کمال۔ پہلے میرے پھوپی زاد تھے اور اب میرے شوہر ہیں۔ لیکن بات کیا ہے؟"

"ارجمند، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" انجم پریشان ہو گئی تھی۔

"بتاؤ تو سہی، کیا معاملہ ہے؟"

وہ کچھ بتانے سے گریز کرتی رہی۔ میرے بہت اصرار پر اس نے کہا۔ "ارجمند، تجھے اس سے شادی نہیں کرنی تھی۔"

"آخر کیوں؟"

"بہت عجیب صورتِ حال ہے۔ تم نے کسی وقار حسین کا نام سنا ہے۔"

"نہیں تو۔" میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "کون ہے یہ وقار حسین؟"

"ایک بہت بڑا صنعت کار۔" اس نے بتایا۔ "اس کی ٹیکسٹائل مل بہت مشہور ہے۔"

"چلو، مان لیا تو پھر۔ مجھ سے اس کا کیا تعلق۔"

"تم سے نہیں، تمہارے شوہر کمال سے اس کی بیٹی

سارہ کا تعلق ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور میں سارہ کو جانتی ہوں۔ دوست ہے میری.... کمال اور سارہ کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اس کے بعد میں ملک سے باہر چلی گئی.... اب جب واپس آئی تو کمال تمہارا شوہر بن چکا ہے، کچھ میں نہیں آیا۔''

''یہ تو ایک عام سی بات ہے یار۔'' میں نے بے پروائی ظاہر کی۔ ''مردوں کا کیا ہے' وہ تو دس لڑکیوں سے دوستیاں کر لیتے ہیں۔''

''نہیں یار' یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھ یار' تو ایسا کر، میرے ساتھ چل۔''

''کہاں؟''

''سارہ کے گھر۔'' اس نے بتایا۔ ''واپس آ کر میں نے ابھی اس سے ملاقات بھی نہیں کی ہے۔ تو اس پر ظاہر مت کرنا کہ کمال سے تیری شادی ہو چکی ہے۔ بس خاموش رہ کر ہم دونوں کی باتیں سنتی رہنا۔''

''کیا بے وقوفی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔''

''تو یقین کر، میں اس وقت بہت الجھ گئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''چونکہ مجھے یہ کہانی معلوم ہے۔ اس لیے میں اتنا پریشان ہو رہی ہوں۔ میں جو بھی بتاؤں گی، شاید تو اس پر یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ سارہ کے پاس چل۔''

''کیا کمال نے سارہ سے شادی کر رکھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ یہ بات کچھ اور ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے ساتھ چلے گی تو سب جان جائے گی۔''

''کیا وہ مجھے پہچان نہیں جائے گی۔ کیا کمال نے اس کو میری تصویریں نہیں دکھائی ہوں گی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' وہ سوچنے لگی تھی۔ ''اچھا۔ تو پھر ایک اور ترکیب ذہن میں آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں سارہ کو اپنے گھر بلاتی ہوں۔ تو بھی آ جانا۔ میں تجھے ایسی جگہ چھپا دوں گی، جہاں سے تو ہماری باتیں سن سکے گی۔ اس کے بعد سب کچھ تجھ پر واضح ہو جائے گا۔''

''تو نے تو ایسا سماں باندھ دیا ہے جیسے یہ کوئی پراسرار معاملہ ہو۔''

''ہاں یار' ایسا ہی سمجھ لے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''بس تیار رہنا۔ میرا فون سنتے ہی آ جانا میرے گھر۔ لیکن خدا کے لیے اس کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا۔ ورنہ سارا کام خراب ہو جائے گا۔''

☆☆☆

سارہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

اس کا انداز، اس کا لہجہ، اس کا لباس، یہ سب ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ایک دولت مند گھرانے کی دولت مند لڑکی ہے۔

انجم نے اپنے ڈرائنگ روم ہی میں مجھے ایک ایسی جگہ چھپا دیا تھا جہاں سے میں دونوں کے درمیان ہونے والی باتیں سن سکتی تھی۔

سارہ اور انجم کے درمیان کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر انجم نے سارہ سے پوچھا۔ ''ہاں یار اب بتا' تیرے کمال کا کیا حال ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ اس نے تو آدھا کام کر دکھایا ہے۔'' سارہ نے بتایا۔

''کیا مطلب؟''

''ارے بھائی' اس نے شادی کر لی ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''کس سے شادی ہو گئی اس کی۔''

''اپنی ماموں زاد سے شادی کر لی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''جلدی میں وہی اس کے ہاتھ لگی تھی۔''

اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی۔ اور میرا یہ حال تھا جیسے کسی نے میرے بدن سے خون نچوڑ لیا ہو۔ یہ میں کیا سن رہی تھی۔ کیا مطلب تھا کہ میں جلدی میں ہاتھ لگی تھی۔

کس بات کی جلدی۔ میرے خدا! یہ کیا معاملہ تھا؟

''میری جان' میرے ڈیڈ اور کمال کے ابو دونوں صاحب دونوں ہی شیخ صاحب کے مرید ہیں۔ اور شیخ صاحب پر دونوں خاندانوں کا بہت اعتماد ہے۔ تم تو جانتی ہو کہ میری اور کمال کی شادی کی بات طے ہو چکی تھی کہ شیخ صاحب نے استخارہ نکال کر بتایا کہ کمال کی پہلی بیوی کچھ دنوں کے بعد مر جائے گی۔''

میرے خدا! میں نے یہ کیا سن لیا تھا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اتنے خود غرض، اتنے بے رحم لوگ۔

''جانتی ہو اس کے بعد ہم دونوں کے خاندانوں کے لیے یہ پرابلم کھڑی ہو گئی کہ اب کیا ہو۔ شیخ صاحب پر دونوں کو اعتماد تھا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ فوری طور پر کمال کی شادی کسی اور لڑکی سے کر دی جائے۔ تاکہ جو بلا نازل ہونی ہو وہ اسی پر ہو جائے۔''

''اس کے بعد تمہارے لیے میدان صاف ہو جائے گا۔'' انجم نے کہا۔

''ہاں یار' اس کے بعد تو کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔''

''یار، تم لوگ اتنے پڑھے لکھے اور روشن خیال ہو کر بھی ان باتوں پر یقین رکھتے ہو کیا یہ انتہائی درجے کی خود غرضی اور بے رحمی نہیں ہے۔''

''ہاں یار ہے تو۔'' سارہ نے کہا۔ ''لیکن جنگ اور محبت میں سب جائز ہوتا ہے۔''

''فرض کرو، اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کیا کرو گی؟'' انجم نے پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے شیخ صاحب کی ابھی تک کوئی بات غلط نہیں ہوئی۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کمال کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لے گا۔ وہ کسی بھی حال میں مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔''

پھر وہ دونوں ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ مجھے جو کچھ معلوم نہیں تھا وہ معلوم ہو چکا تھا۔ انسانی خود غرضی اور بے رحمی کی اعلیٰ ترین مثال میرے سامنے آ گئی تھی۔

اب اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ پھوپی اور پھوپا اچانک اتنے مہربان کیوں ہو گئے تھے۔ کمال نے مجھ جیسی غریب لڑکی سے کیوں شادی کی تھی۔ میں تو قربانی کا بکرا تھی۔ مجھے تو قربان ہونے کے لیے رکھا گیا تھا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ شیخ صاحب کے کہنے کے مطابق میری زندگی صرف چند دنوں کی ہے۔

سارہ کے جانے کے بعد جب انجم نے مجھے آواز دے کر پردے سے باہر آنے کے لیے کہا تو میں صرف سکتے میں تھی۔ میری آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

''سن لیا تو نے۔'' انجم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں کچھ نہیں بول سکی۔ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس وقت میرے ذہن میں سوائے سناٹوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

ان لوگوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی جب میں نے کمال سے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔

ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ آخر کیوں' کیوں طلاق چاہتی ہو؟ کیا کمی ہے اس گھر میں؟ کیوں اپنی زندگی خراب کرنے پر تلی ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا کہ میں ایسا کیوں چاہتی ہوں۔

بس میری یہی ضد تھی کہ مجھے اس گھر میں نہیں رہنا۔ خیال یہ بھی تھا کہ اگر میں نے ابو اور امی کو یہ سب کچھ بتادیا تو رشتوں پر سے ان کا اعتبار ہمیشہ کے لیے اٹھ جائے گا۔ پھر کون کسی پر بھروسا کرے گا۔

اسی لیے میں نے کچھ نہیں بتایا۔ صرف ضد کرتی رہی کہ مجھے ان کے ساتھ نہیں رہنا۔ میری دوست انجم کو جب اس بات کا پتا چلا وہ بھی میرے پاس آگئی۔

"ارجمند کیا تو واقعی شیخ صاحب کی پیشن گوئی سے گھبرا کر طلاق کا مطالبہ کررہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ مجھے ایسی باتوں پر کوئی یقین نہیں ہے۔"

"تو پھر۔"

"بات صرف یہ ہے کہ میں ایسے خودغرض اور بے رحم لوگوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔" میں نے کہا۔ "فرض کرو اگر مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بیمار نہیں پڑی۔ مجھے موت نہیں آئی تو کیا کمال سارہ کو حاصل کرنے کے لیے کسی اور انداز سے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"ہاں یہ تو ہوگا۔" انجم نے کہا۔

"تو پھر بہتر یہی ہے نا کہ میں ایسے لوگوں سے دور ہوجاؤں۔"

بہرحال اس کے بعد خاصا جھگڑا ہوتا رہا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ ہوا کہ کمال نے مجھے طلاق دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کی وجہ بھی انجم سے پتا چلی تھی۔

"اس نے اس لیے تمہیں طلاق دے دی ہے کہ تم اس کی زندگی سے دور ہورہی ہو۔" اس نے بتایا۔ "پہلی بیوی چاہے مرجائے یا طلاق لے کر الگ ہوجائے۔ بات ایک ہی ہے۔"

میں نے گھر والوں کو اس کے بعد بھی کچھ نہیں بتایا۔

سارا الزام میں نے اپنے سر پر لے لیا۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ ضرور میری ہی غلطی ہوگی۔ ورنہ کمال ایسا نہیں تھا۔ پھوپی ایسی نہیں تھیں۔ پھوپا ایسے نہیں تھے۔

اب میں کیا بتاتی کہ وہ کیسے تھے؟ اور میرے لیے انہوں نے کیا سوچا ہوا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اس گھر میں میرے نکل جانے کے بعد خوشیاں منائی جارہی ہوں گی۔ کیونکہ ایک طرح سے میری قربانی تو ہو ہی چکی تھی۔

اور ایک دن وہی ہوا۔ جس کے لیے یہ پورا ناٹک رچایا گیا تھا۔ کمال اور سارہ کی شادی ہوگئی۔

کیونکہ ہونا بھی تو یہی تھا۔ یہ سارا کھیل ان دونوں کی شادی ہی کے لیے تو کھیلا گیا تھا۔ شیخ صاحب بھی بہت خوش ہورہے ہوں گے کہ ان کی بات پوری ہورہی ہے۔

اس شادی میں ہماری طرف سے کوئی نہیں گیا تھا۔ اور نہ ہی انہوں نے ہمیں مدعو کرنے کی زحمت کی تھی۔ ہمارا ایک طرح سے تو ان سے رشتہ ہی ختم ہوچکا تھا۔

پھر یہ پتا چلا کہ کمال اور سارہ ہنی مون کے لیے یورپ چلے گئے ہیں۔

اس وقت فطری طور پر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بند ہوکر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ انسان کی خودغرضی اور بے رحمی پر افسوس ہورہا تھا۔

پھر ان دونوں کی شادی کے ایک مہینے کے بعد امی نے ایک خبر سنادی۔ "ارجمند' کمال نے جس لڑکی سے شادی کی تھی نا، کل رات اس کا انتقال ہوگیا۔"

"کیا!" میں یہ خبر سن کر سناٹے میں رہ گئی تھی۔ "انتقال ہوگیا؟ وہ کیسے؟"

"اچانک ہی رات کو اس کے دل میں درد اٹھا اور وہ ہاسپٹل جاتے جاتے مرگئی۔"

یا خدا! میں تو اس خبر کو سن کر لرز اٹھی تھی۔ تیری ہر بات میں مصلحت ہوتی ہے۔ تو کس طرح ارادوں کو ناکام یا کامیاب بناتا ہے۔ کیا ہوئی شیخ صاحب کی پیشن گوئی۔ کہاں گئی سارہ کے ماں باپ کی سازش۔

کہاں گئے کمال کے ارادے۔ پھوپی اور پھوپا کے گھناؤنے منصوبے سب خاک میں مل کر رہ گئے۔ خدا نے کمال کی اس پہلی بیوی کو سلامت رکھا جس کو قربانی کا جانور بنایا گیا تھا۔ اور اس کو موت دے دی جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

واقعی اس کے فیصلے الگ ہی ہوتے ہیں۔ انسان اپنی مکارانہ سازشیں کرتا رہتا ہے اور تقدیر اس کے ارادوں پر ہنستی رہتی ہے۔

سنا ہے کہ اس کے بعد کمال اپنا ذہنی توازن تقریباً کھوچکا ہے، جبکہ خدا نے ایک بہت اچھے انسان سے میری شادی کروادی ہے۔ اور میں ایک خوش وخرم زندگی گزار رہی ہوں۔

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم!

آپ یقین کریں یا نہ کریں یہ سب کچھ میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس تحریر کا ہر لفظ سچ پر مبنی ہے۔ لیکن آج تک میں اپنے دل کو مطمئن نہیں کرسکا ہوں کہ وہ آخر کیا تھا؟ خواب یا ذہنی اختراع مگر یہ سچ ہے اسی لیے میں اسے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

منظر امام
(کراچی)

وہ ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ تین یا چار برس کا (بظاہر) یہ اور بات ہے کہ اس کی عمر ہزاروں برس کی ہو۔

اس کے دو خوبصورت پر تھے۔ اس کی آنکھوں پر ایک سنہری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ اس کی پشت پر ایک ترکش بھی تھا۔ جس میں بہت سے تیر بھرے ہوئے تھے۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ میں اپنے فلیٹ کی کشادہ بالکونی میں بیٹھا ہوا چاند کو دیکھے جارہا تھا۔ یہ میرا بہت پرانا

مشغلہ ہے۔ چاند مجھے ہمیشہ سے اپنی طرف کھینچتا چلا آیا ہے۔

تو وہ ایک چاندنی رات تھی۔ جب میں نے کسی چیز کو فضا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ چاندنی میں وہ چیز چاندی کی طرح جگمگا رہی تھی۔ نہ جانے کیا چیز تھی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چاند سے نکل کر سیدھا زمین کی طرف آرہی ہو۔

میں اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ قریب آرہا تھا۔ قریب، بہت قریب، پھر وہ براہِ راست اسی بالکونی میں اتر آیا جہاں میں بیٹھا تھا۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ مجھے اس سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس پر پیار آرہا تھا۔ میں اسے بہت دلچسپی سے دیکھے جا رہا تھا۔

وہ میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بہت خوبصورت اور روشن تھیں۔

"تم نے پہچانا مجھے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ یاد آرہا ہے۔ تم بہت جانے پہچانے لگ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں کیوپڈ ہوں۔" اس نے بتایا۔

اور ایک دم سے یاد آگیا کہ یہ مشہور و معروف یونانی دیوتا کیوپڈ ہے۔ عشق اور محبت کا بانی۔ میں نے جس کے مجسمے دیکھے تھے۔ جس کی ہزاروں تصویریں دیکھی تھیں۔ جو اپنا تیر چلا کر دو انجان دلوں کو ایک دوسرے کی محبت میں باندھ دیا کرتا ہے۔

"ہاں یاد آگیا تم کون ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم تو افسانوی اور خیالی کردار ہوا کرتے تھے۔"

"نہیں، میں افسانوی کردار نہیں ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ پھر دریافت کیا۔ "اگر میں بیٹھ جاؤں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"نہیں، بیٹھ جاؤ۔ میں تو خود کہنے والا تھا۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ واقعی بہت مہذب تھا اور خوبصورت اتنا کہ اس کے چہرے سے نگاہ نہیں ہٹتی تھی۔

"پہلے یہ بتاؤ، تمہارے لیے چائے یا شربت لاؤں۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"کیوپڈ یہ بتاؤ تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم کہانیاں لکھا کرتے ہو۔ بہت سوچنے اور محسوس کرنے والا احساس دل رکھتے ہو۔" اس نے کہا۔ "اسی لیے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔ تم ان کرداروں کی کہانیاں لکھو جن کو میں محبت میں مبتلا کر دوں گا۔"

"لیکن میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ میں نے محبت کی بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ "نہیں۔ یہ تجربہ۔"

"وہ تم نے اپنے حساب سے لکھی ہوں گی۔ اب میرے بتائے ہوئے کرداروں پر لکھو۔" اس نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے، میرے لیے بھی یہ ایک نیا اور دلچسپ تجربہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں کل صبح ہی سے اپنا کام شروع کر رہا ہوں۔"

☆☆☆

پھول وتی نے کن انکھیوں سے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا دی اور صفائی کرنے میں مشغول ہو گئی۔ وہ ایک بھنگن تھی۔

بہت خوبصورت۔ بہت نازک جسم تھا اس کا۔ بیل کی طرح لہراتی ہوئی۔ نہ جانے کتنے اسے دیکھ کر آہیں بھرا کرتے لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کا مقصد کیا ہے۔

اس کے لیے تو پوری دنیا میں صرف ایک ہی تھا۔ گوپال... جو اس کی برادری ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ خاکروبوں کا ہیڈ تھا۔ میونسپل والوں نے بہت سے خاکروبوں کو اس کے انڈر میں کر دیا تھا۔

وہ صبح سویرے ہر ایک کی ڈیوٹی مختلف مقامات پر لگایا کرتا۔ پھول وتی کو وہ اس علاقے میں رکھتا تھا جہاں وہ خود ہوا کرتا۔ کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔

آج کچھ عجب بات ہوئی تھی۔ ایک نوجوان اپنی شاندار گاڑی سے اتر کر پھول وتی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ پھول وتی کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس کی نگاہیں پھول وتی کو اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ عجب بات تھی کہ پھول وتی کو اس پر غصہ نہیں آرہا تھا۔ اس کے برعکس اسے حیا سی محسوس ہو رہی تھی۔

اسے اس نوجوان کی نگاہیں... دوسروں کی نگاہوں

سے الگ دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے وہ پھول وتی سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کام کرنے والی دوسری بھنگنیں کچھ فاصلے پر جھاڑو دے رہی تھیں۔ کسی کی توجہ پھول وتی اور اس نوجوان کی طرف نہیں تھی۔

اچانک وہ نوجوان پھول وتی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ پھول وتی سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے بابو جی۔" پھول وتی نے شرماتے ہوئے پوچھا۔ "کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"ہاں۔" اس نوجوان نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہارا نام ہے؟"

"پھول وتی۔"

"تم واقعی پھول ہی کی طرح ہو۔" نوجوان نے کہا۔ "تازہ اور خوبصورت۔ سنو، میرا نام امجد ہے۔ میرا بہت بڑا کاروبار ہے۔"

"تو پھر۔" پھول وتی نے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہنا ہے تمہیں۔"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ نہ جانے کیوں یہ دل چاہا کہ تم سے بات کروں۔ اسی لیے تمہارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔"

"بابو اب تم جاؤ۔" پھول وتی نے کہا۔ "تم ایک بابو ہو۔ میں ایک بھنگن ہوں۔ تمہارا ہم سے اس طرح باتیں کرنا اچھا نہیں ہے۔ دیکھنے والے کیا سوچیں گے۔"

"ہاں پھول وتی، میں شاید پاگل ہی ہو گیا ہوں۔ ویسے تم مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کیسا وعدہ۔"

"یہی کہ تم مجھ سے باتیں کیا کرو گی۔ میں جب بھی تمہارے پاس آؤں، تم کچھ دیر کے لیے اپنے کام بھول کر میری طرف توجہ دو گی۔"

پھول وتی کا دل چاہا کہ وہ اس نوجوان سے کہہ دے کہ تم جب بھی آؤ گے میں تمہیں اپنے دل میں بٹھا لوں گی۔

لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ اسی دوران گوپال ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ گوپال کو دیکھ کر وہ نوجوان... اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا بات ہے پھول وتی۔" گوپال نے پھول وتی سے پوچھا۔ "یہ آدمی تم سے کیا باتیں کر رہا تھا؟"

"یہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میں اس کے یہاں کام کروں گی۔" پھول وتی نے بہانہ بنایا۔ "اس کی کوٹھی یہاں سے قریب ہی ہے۔"

"یہ حرامزادے اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" گوپال نے برا سا منہ بنایا۔ "چکنی چپڑی باتیں کر کے تم جیسوں کو پھانس لیتے ہیں۔ آئندہ تم سے بات کرے تو گالیاں دے کر بھگا دینا۔"

پھول وتی اس سے کیا کہتی کہ وہ نوجوان اس کے لیے کتنا اہم ہو گیا ہے۔ وہ کس طرح ذرا سی دیر میں آنکھوں کے راستے اس کے دل کے کسی کونے میں جا کر بیٹھ چکا ہے۔

امجد اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔

اس کی نگاہیں ابھی تک پھول وتی کا طواف کر رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اسے ہوا کیا ہے۔ وہ ایک اسمارٹ نوجوان تھا۔ بزنس مین تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی تھی۔ لیکن جو کیفیت پھول وتی کو دیکھ کر ہوئی تھی ایسی پہلے تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس کی دوست لڑکیاں اس کے لیے تفریح کا ذریعہ تھیں۔ ان کے ساتھ اچھی گپ شپ ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس بھنگن کے ساتھ تو معاملات ہی کچھ اور ہونے لگے تھے۔

وہ اس کے وجود کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

کیوپڈ نے جب مجھے ان دونوں کی یہ کہانی سنائی تو میں بھڑک اٹھا۔ "یہ کیا کیا تم نے؟ خوامخواہ ان دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"محبت میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن یہ کیسی محبت ہونے لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم ذرا ان دونوں کے Status کو تو دیکھو۔ آسمان زمین کا فرق ہے۔"

"محبت تو اسی کا نام ہے۔ پوری دنیا ہزاروں برسوں سے یہ جانتی ہے کہ محبت اندھی ہوا کرتی ہے۔"

"لیکن اب اتنی بھی تو اندھی نہیں ہوتی۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم ان دونوں کی داستانِ محبت کو پروان چڑھنے دو پھر دیکھنا کیا کیا ہوتا ہے۔"

"ایسا نہ ہو کہ تمہارے چکر میں دونوں ہی پاگل ہو جائیں۔"

"جو بھی ہوگا، وہ تمہارے سامنے آ ہی جائے

گا۔" کیوپڈ نے کہا۔ "کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ میں تمہیں کہانی کے لیے ایک لاجواب سبجیکٹ دے رہا ہوں۔ ایک انوکھی داستان کی ابتدا ہونے والی ہے۔"

☆☆☆

انوکھی داستان کی ابتدا ہو چکی تھی۔ رات بھر تارے گننا محاورہ ہی سہی لیکن امجد اس وقت تارے ہی گن رہا تھا۔

اس کا کمرا اوپری منزل پر تھا۔ کمرے کے ساتھ ہی دروازہ چھت کی طرف کھلتا تھا۔ وہ چھت پر کرسی ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کی نگاہیں ستاروں کی طرف تھیں۔ ایسی بے چینی اس کی سمجھ سے باہر ہی تھی۔ وہ کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا تھا۔ وہ بھنگن اس کے معیار اور رتبے کی کہاں تھی۔ تو پھر وہ کیوں یاد آ رہی تھی۔ اس کے لیے ایسی بے چینی کیوں ہونے لگی تھی۔ اس نے کسی کے آنے کی آہٹ سنی اور گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ آنے والے کو دیکھ کر اس نے اطمینان کی سانس لی تھی۔ وہ اس کا دوست تھا پرویز۔

پرویز آتے ہی شروع ہو گیا تھا۔ "یار، کیا ہو گیا ہے تمہیں! میں آیا تو آنٹی نے بتایا کہ تم بہت دیر سے چھت ہی پر بیٹھے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں دیکھنے اوپر آ گیا۔ خیریت تو ہے نا۔"

"ہاں یار، بظاہر تو خیریت ہے لیکن خیریت نہیں ہے۔" امجد نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا ہو گیا ہے؟"

"بیٹھ جاؤ۔" امجد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "اطمینان سے بتاتا ہوں۔"

پرویز سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "ہاں اب بتاؤ۔"

"یار، مجھے عشق ہو گیا ہے۔"

"یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔" پرویز ہنس پڑا۔ "تم تو نہ جانے کتنی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکے ہو۔"

"میری جان یہ فلرٹ نہیں ہے۔ عشق ہے عشق۔" امجد نے بتایا۔ "ویسا عشق تم نے جس کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ جس پر فلمیں دیکھیں ہوں گی۔"

"ارے جاؤ یار، تم کو اس قسم کی بیماری ہو ہی نہیں سکتی۔"

"ہو گئی ہے دوست۔"

"تو پھر وہ کسی عالی شان گھرانے کی چشم و چراغ کوئی خوبصورت اسمارٹ سی لڑکی ہو گی۔"

"نہیں، یہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ میں نے اگر بتا دیا تو تم مجھے پاگل سمجھو گے۔ مجھے گالیاں دو گے۔"

"میرے یار، اب بتا بھی دے۔ کون ہے وہ؟"

"وہ ایک بھنگن ہے۔" امجد نے بتایا۔

"کیا؟" پرویز اپنی کرسی سے اچھل ہی پڑا تھا۔ "بھنگن!"

"ہاں یار، وہ ایک خاکروب ہے۔ سڑکوں پر جھاڑو لگاتی ہے۔ پھول وتی نام ہے اس کا۔"

"کیا پاگل ہو گئے ہو؟" پرویز نے کہا۔ "یہ کیسی بات سنا رہے ہو تم۔"

"بالکل ایسا ہی ہے یار۔ میں صرف ایک جھلک دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گیا تھا مجھے۔ بس میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جو حال میرا تھا وہی حال اس کا بھی تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سکتے کی سی کیفیت میں دیکھتے رہ گئے تھے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔" پرویز نے کہا۔

"ہاں یار، اب تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔" امجد نے کہا۔ "اب تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔"

"بہتر یہی ہے کہ اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔" پرویز چڑ کر بولا۔ "میں اس سے اچھا مشورہ نہیں دے سکتا۔"

"اب تم جو بھی کہتے رہو۔ میں عشق میں مبتلا ہو چکا ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم اس سے شادی کر سکتے ہو؟"

"ہاں۔" امجد کا لہجہ پُریقین تھا۔ "اگر اس نے میری محبت کا جواب بھرپور انداز سے دیا۔ اگر اس کے دل میں بھی ایسی تڑپ رہی تو میں اس کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزروں گا۔"

"تو پھر خدا تمہاری حالت پر رحم کرے۔"

☆☆☆

رام گوپال بہت حیرت اور دکھ بھری نگاہوں سے پھول وتی کو دیکھ رہا تھا۔

پھول وتی اس کے سامنے بیٹھ کر روئے جا رہی تھی۔ "میں نہیں جانتی... گوپال کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں شاید پاگل ہو گئی ہوں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تو میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ میرا ہمدرد ہے، اسی لیے تجھے دل کی بات کھل کر کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تیرے علاوہ میرا دکھ کوئی نہیں جان سکتا۔"

"لیکن پگلی یہ تو سوچ کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔" رام گوپال نے کہا۔ "ہمارے دھرم الگ، ہماری برادری الگ، ہم سڑکوں پر جھاڑو دینے والے، وہ گاڑیوں میں گھومنے والا۔ پھر تو نے یہ کون سا روگ اپنے آپ کو لگا لیا ہے۔"

"یہی تو نہیں معلوم کہ یہ کون سا روگ ہے۔" پھول وتی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "بس دل ہے کہ اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ تن من میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ ہر وقت اسی کا دھیان رہتا ہے۔ جب سے اس کو دیکھا ہے، ایک پل کے لیے بھی چین نہیں ہے۔"

"پاگل مت بن پھول وتی۔ چاند کو دیکھ کر راستے پر سفر نہیں کرتے، ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ راستے میں گڑھے بھی ہوتے ہیں۔"

"میں یہ سب جانتی ہوں۔" پھول وتی نے کہا۔ "میں کوئی پاگل، ناسمجھ یا بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اور اس بابو کے درمیان بہت فرق ہے۔ اس کے باوجود میں اسے بھول نہیں سکتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔"

"بے وقوف، تو بہت سوں سے زیادہ خوبصورت اور حسین ہے۔" گوپال نے کہا۔ "اس قسم کے لوگ عیاش ہوتے ہیں۔ وہ تجھ سے کھیل کر بھول جائے گا تجھے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" پھول وتی پورے یقین کے ساتھ بولی۔ "وہ بھی میرے لیے اتنا ہی بے چین اور پاگل ہو رہا ہو گا جس طرح میں ہو رہی ہوں۔ یہ میرا دل کہہ رہا ہے۔ میں نے... پہلی بار ہی اس کی آنکھوں میں پریم کی جوت جلتے ہوئے دیکھ لی تھی۔"

"اچھا ایک بات بتا، کیا تو اس سے بیاہ کر سکتی ہے۔" گوپال نے پوچھا۔

"نہیں۔" پھول وتی نے اپنی گردن ہلا دی۔ "کبھی نہیں۔ میں اس کو کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں، صرف محبت۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"کمال کی بات ہے۔" گوپال کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ "نہ جانے اس طرح کی محبت کے ذریعے تو کیا حاصل کرے گی۔"

"یہی تو اصل بات ہے گوپال۔ محبت کچھ حاصل کرنے کا نام نہیں ہوتا۔" پھول وتی نے کہا۔ "میں تو صرف اور صرف اس سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

کیوپڈ میرے سامنے بیٹھا ہوا ہنس رہا تھا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" میں نے کہا۔ "ان دونوں کو کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔"

"محبت کے امتحان میں۔" اس نے بتایا۔ "اور تم دیکھ لینا میں اپنے مشن میں کامیاب رہوں گا۔"

"اور یہ مشن کیا ہے؟"

"محبت، صرف محبت۔" اس نے کہا۔ "ہر قسم کی بندشوں سے آزاد۔ ہر قسم کی نسلی اور مذہبی حیثیت سے ماورا۔ ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک محبت۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہاری اس قسم کی حرکتوں سے یہ دنیا محبت سے بھر جائے گی۔"

"ہاں، اسی طرح ہو گا۔ ایک دوسرے کو آپس میں ملوا دو۔ غریب کو امیر سے، امیر کو غریب سے۔ ایک زبان بولنے والوں کو دوسری زبان والوں سے۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں جتنے فتنے ہیں، سب آپ اپنی موت مر جائیں گے۔ جھگڑا فساد سب ختم ہو جائے گا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو تمہارا یہ تجربہ کامیاب رہے گا؟" میں نے پوچھا۔

"تم خود دیکھ لینا۔ پھول وتی اور امجد کی محبت ایک مثال بن کر سامنے آئے گی۔" اس نے کہا۔ "اس سے دوسروں کو حوصلہ ملے گا۔ میں نے ایک شمع روشن کر دی ہے۔ تم دیکھ لینا اس کی روشنی کہاں تک پھیلتی جائے گی۔"

"خدا کرے تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"اس کے بعد تمہیں ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"

"کیسا وعدہ۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم ابھی تک صرف کہانیاں لکھتے رہے ہو۔ محبت کی کہانیاں۔ لیکن تم نے خود کبھی کسی سے محبت نہیں کی، اس تجربے کے بعد تمہیں محبت کرنی ہو گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" میں غصے میں بولا۔ "محبت میں مبتلا کرنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میری طرف بھی ایک تیر چلا دینا۔"

"نہیں، تمہاری طرف نہیں۔"

"وہ کیوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی مرضی سے محبت کرو۔ اپنی محبت کے لیے میرے محتاج نہ رہو۔" اس نے کہا۔ "خود ہی کسی کو منتخب کرو اور خود ہی ابتدا کردو۔"

☆☆☆

پھول وتی اور امجد کی محبت نے ایک ہنگامہ برپا کررکھا تھا۔

امجد کے باپ کو مجبوراً یہ بات امجد کے ہونے والے سسر کو بتانی پڑی تھی۔

اس کہانی کا چرچا اس طرح ہوا کہ امجد کے دوست پرویز نے امجد کے باپ کو سب کچھ بتادیا تھا۔ امجد کا باپ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے والا انسان تھا۔

اس نے اپنے طور پر جب تفتیش کی تو پتا چلا کہ امجد واقعی ایک بھنگن کے عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ وہ دونوں کئی بار ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔

امجد کے باپ نے امجد کی منگنی ایک دولت مند طاقتور... قسم کے آدمی کی بیٹی سے کررکھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس شادی کے بعد خود امجد کے باپ کے Status میں اضافہ ہو جائے گا۔

لیکن اب امجد نے ایک بھنگن کے عشق میں مبتلا ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ اس طرف امجد کے ہونے والے سسر کو بھی اس صورتِ حال کا علم ہو چکا تھا۔

اس نے امجد کے باپ سے ملاقات کی۔ "خلیل صاحب! یہ کیا تماشا ہے۔" اس نے غصے سے پوچھا۔ "تمہارے بیٹے نے یہ کیا لگا رکھا ہے۔"

"میں تو خود آپ کے پاس آکر یہ سب کچھ بتانے والا تھا۔" امجد کے باپ نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے وہ یا تو پاگل ہو گیا ہو یا اس پر کالا جادو کردیا گیا ہو۔"

"جادو" امجد کے ہونے والے سسر کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔ "ہاں، یہ ٹھیک کہا آپ نے، کالا جادو۔ اس قسم کے لوگ کالا جادو میں بہت مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کم بخت بھنگن نے امجد پر جادو ہی کروادیا ہو۔ ورنہ وہ تو بہت معقول نوجوان ہے۔"

"تو پھر بتائیں، اس کا کیا علاج کیا جائے۔ وہ تو پاگل ہو رہا ہے۔"

"اس کا ایک ہی علاج ہے۔" اس نے کہا۔ "خلیل صاحب، آپ مطمئن ہو جائیں، یہ کہانی ختم ہونے والی ہے۔"

☆☆☆

کہانی بہت ہی بھیانک انداز میں ختم ہوئی تھی۔

دو موٹر سائیکل سوار پھول وتی پر گولیاں برساتے ہوئے گزر گئے تھے۔ اخبار اور چینل والوں نے بھی صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ شہر میں ایک اور دہشت گردی کی واردات ہو گئی۔ ایک خاکروب لڑکی پھول وتی کو صبح سویرے دہشت گردوں نے گولیوں کا نشانہ بنادیا۔

☆☆☆

میرے لیے کہانی کا یہ انجام بہت تکلیف دہ تھا۔

کیوپڈ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میرے سامنے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"دیکھ لیا تم نے۔ تمہارے اس احمقانہ تجربے نے ایک غریب کی جان لے لی۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیوں ماردیا گیا۔" کیوپڈ دھیرے سے بولا۔ "اس کا قصور ہی کیا تھا۔ یہی نا کہ اس نے محبت کی تھی۔ اور محبت کی اتنی بڑی سزا۔"

"میرے بھولے کیوپڈ! تم بہت غلط معاشرے میں محبت کا پرچار کرنے چلے آئے ہو؟" میں نے کہا۔ "ہمیں اب محبت کی نہیں نفرت کی ضرورت ہے۔ ہم مرنا چاہتے ہیں۔ زبان کے نام پر، مذہب کے نام پر۔ امیری اور غریبی کے نام پر۔ سیاست کے نام پر، موت اور نفرت ہماری فطرت کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمیں جینے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسی لیے میں محبت کی صرف کہانیاں لکھتا ہوں، خود محبت نہیں کرتا۔ ہمیں محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھ گئے۔"

"ہاں میرے کہانی کار، میں سمجھ گیا ہوں۔ میں نے محبت کا بیج بونے کے لیے غلط زمین کا انتخاب کرلیا تھا۔" کیوپڈ نے کہا۔ "اب میرا یہاں کوئی کام نہیں ہے۔ میں جارہا ہوں یہاں سے۔"

وہ خوبصورت بچہ اپنی آنکھوں میں آنسو لیے فضا میں بلند ہوا اور دور دور اور دور ہوتا چلا گیا۔

میں اب تک فیصلہ نہیں کرسکا ہوں کہ یہ کیا تھا کیا واقعی کیوپڈ کا وجود ہے یا میں نے خواب دیکھا تھا مگر صبح کے اخبار میں یہ خبر جلی حرفوں میں موجود ہے کہ سڑک پر جھاڑو دے رہی ایک بھنگن کو دہشت گردوں نے ٹارگٹ کیا ہے۔

زندہ درگور

جناب ایڈیٹر ماہنامہ سرگزشت

السلام علیکم!

میں اپنے ہی گاؤں کی ایک انوکھی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ یہ صرف ایک سچی کہانی نہیں سبق بھی ہے اس لیے گزارش ہے کہ اسے ضرور شائع کریں۔

ہارون احمد

(اسلام آباد)

میں آج آپ کو ایک کہانی سنانے والا ہوں جو ہمارے ہی گاؤں کی ہے ہمارے اس گاؤں میں پاکستان بننے سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ بستی میں آہ و بکا مچی ہوئی تھی کیونکہ اس گھر کا واحد کفیل کرم دین اچانک مر گیا تھا۔ وہ چنگا بھلا اپنی دکان سے آیا تھا۔ اس نے آکر بیٹی سے پانی مانگا اور خود صحن میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بیٹی صغراں پانی لے کر آئی تو کرم دین تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ صغراں نے اسے کئی آوازیں دیں۔ پھر بلند آواز میں بولی "ابا!"

اس کی آواز سن کر کرم دین کی بیوی رحمت بی بی اور چھوٹی بیٹی زینت بھی وہاں آگئیں۔

"کیا ہوا صغراں؟ کیوں چیخ رہی ہے، اور یہ تیرا ابا کب آیا؟"

"ابا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہے۔ اس نے صحن میں سائیکل کھڑی کر کے مجھ سے پانی مانگا اور خود پلنگ پر لیٹ گیا۔ اب میں آوازیں دے رہی ہوں مگر ابا بولتا ہی نہیں۔"

"او فضل کے ابا!" رحمت بی بی نے اسے زور سے آواز دی۔ افضل اس کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کی پیدائش کے بعد رحمت بی بی اسے اسی طرح مخاطب کرتی تھی۔

کرم دین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحمت بی بی نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا۔

رحمت بی بی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر صغراں اور زینت بھی بری طرح چیخنے لگیں۔ اچانک کرم دین کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پڑوسیوں نے چیخ وپکار اور رونے دھونے کی آوازیں سنیں تو وہ سب کرم دین کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔

ان کا پڑوسی اجمل خان سب سے پہلے وہاں پہنچا۔ اجمل خان اور کرم دین کی بہت دوستی تھی۔ دونوں کے گھر تو برابر برابر تھے ہی، دکانیں بھی برابر برابر تھیں۔ اجمل خان ویلڈنگ کا کام کرتا تھا اور کرم دین کباڑی تھا۔ وہ پھیری لگانے والے کباڑیوں سے مختلف چیزیں انتہائی سستے داموں خریدتا پھر ان کی مرمت کروا کر انہیں صاف ستھرا کر کے اچھے داموں بیچ دیتا۔ وہ گاہک کے ساتھ بھی دھوکے بازی نہیں کرتا تھا۔ کسی چیز میں کوئی خرابی ہوتی تو وہ اسے بتا دیتا تھا کہ اس کی فلاں چیز خراب ہے۔ اس پر گاہک کی مرضی ہوتی تھی کہ وہ چیز خریدے یا نہ خریدے۔

ایک طرح سے کرم دین کی یہ صاف گوئی فائدہ مند تھی۔ گاہک اس کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتے تھے اور چیز خرید کر لے جاتے تھے۔ ایسا بہت کم بلکہ دو چار مہینے میں ایک دفعہ ہوتا تھا جب کوئی گاہک خریدی ہوئی چیز واپس لاتا تھا اور بتاتا تھا کہ کرم دین، یہ تو بالکل کام ہی نہیں کر رہی۔

کرم دین فوراً وہ چیز واپس لے کر اس کو رقم لوٹا دیتا تھا۔ گاہک تب کم رقم لے کر واپس جاتے تھے۔ عموماً وہ وہاں سے کچھ اور خرید لیتے تھے۔

اجمل خان بھی کرم دین ہی کی طرح کھرا آدمی تھا۔ وہ بھی اپنا کام اچھی محنت اور دیانت داری سے کرتا تھا۔

فارغ اوقات میں دونوں دوست آپس میں گپ شپ لگاتے۔ اکثر وہ لسی پیا کرتے تھے۔ اس دور میں چائے کا اتنا رواج نہیں تھا۔ چائے کا رواج بڑے شہروں میں تھا۔ راولپنڈی تو اس زمانے میں بہت چھوٹا شہر تھا۔

اجمل خان نے رحمت بی بی کو اندر جانے دیا اور خود کرم دین کا جائزہ لیا۔ اس کی نبض بالکل ساکن تھی۔ دل کی دھڑکن بھی خاموش تھی۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور رحمت بی بی سے بولا۔ "بھابی! پریشان مت ہو میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔"

وہ ڈاکٹر صاحب، کسی زمانے میں لاہور کے کسی اسپتال میں کمپاؤنڈر ٹائپ کی کوئی چیز تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنے آبائی شہر راولپنڈی آکر یہاں اپنا کلینک کھول لیا تھا۔

پاکستان کے قیام کو چار پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس دور میں ڈاکٹر تو نہ ہونے کے برابر تھے اس لیے اس قسم کے نیم حکیم اور عطائی بھی ڈاکٹر بن بیٹھے تھے اور خوب کما رہے تھے۔

اجمل خان کے جاتے ہی محلے کی عورتیں گھر میں آگئیں۔ ایک بڑی بی نے رحمت بی بی سے کہا۔ "ارے اس کے ہاتھ پیر سیدھے کر کے پیروں کے انگوٹھے باندھ دو اور منہ پر چادر ڈال دو۔"

"نہیں...... یہ کیا کہہ رہی ہو خالہ؟ ابا کو کچھ نہیں ہوا۔" صغراں چیخ کر بولی۔ "تم تو جیتے جی میرے ابا کو مارے ڈال رہی ہو۔"

"بیٹا! میں نے دنیا دیکھی ہے۔ خیر اجمل خان ڈاکٹر صاحب کو لینے گیا ہے، تم لوگوں کی تسلی بھی ہو جائے گی۔"

یہ بات سن کر رحمت بی بی اور زینت نے پھر رونا شروع کر دیا۔

اسی وقت کرم دین کا پانچ سالہ بیٹا افضل گھر میں داخل ہوا۔ پہلے اس نے اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے کنچے چھپائے کیونکہ ابا کو کنچے سخت ناپسند تھے، پھر اس نے حیرانی سے گھر میں جمع عورتوں کو دیکھا۔

اچانک اس کی نظر ابا پر پڑی جو صحن میں چارپائی پر لیٹا تھا اور اماں اس کی پٹی پکڑے زمین پر بیٹھی تھی اور بین

کر رہی تھی۔

وہ دوڑ کر اماں کے پاس پہنچا اور بولا۔ "کیا ہوا اماں! تم رو کیوں رہی ہو۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ ابا سو رہا ہے، اس کی آنکھ کھل جائے گی تو بہت غصہ کرے گا۔"

افضل کو یاد تھا کہ ایک مرتبہ اس کے شور کرنے پر ابا کی آنکھ کھل گئی تھی اور اس نے افضل کو بہت بری طرح ڈانٹا تھا۔

اس کی بات سن کر رحمت بی بی مزید بلک بلک کر رونے لگی۔ اسی وقت باہر سے اجمل خان کی آواز آئی "بھابی جی، پردہ کر لو، ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب یوں گھر میں داخل ہوئے جیسے کوئی بہت بڑا سرجن آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتا ہے۔ انہوں نے سفید لٹھے کی شلوار بوسکی کی قمیص اور سیاہ چمک دار پمپ شوز پہن رکھے تھے۔ ان کے سر پر انتہائی قیمتی قراقلی ٹوپی تھی اور ہاتھ میں گھڑی بھی تھی۔ گھڑی بھی اس دور میں بلند معیار زندگی کی علامت تھی۔ اپنی گھڑی کو نمایاں کرنے کے لیے انہوں نے کرتے کی آستینیں الٹ رکھی تھیں۔

ان کے پیچھے پیچھے اجمل خان ان کا دواؤں کا بکس اٹھائے چلا آرہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے فوراً محلے سے ایک کرسی منگائی گئی۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے کرم دین کی نبض دیکھی، پھر اپنے بیگ سے اسٹیتھو اسکوپ نکال کر اس سے کرم دین کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ اس کی ناک کے آگے ہاتھ لگا کر دیکھا، پھر مایوسی سے سر ہلا کر بولے۔ "اللہ کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی۔" یہ کہہ کر انہوں نے کرم دین کا منہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ سنتے ہی گھر میں گویا نئے سرے سے کہرام بپا ہو گیا۔ رحمت بی بی، صغراں اور زینت کے ساتھ ساتھ محلے کی عورتیں بھی رو رہی تھیں، بین کر رہی تھیں۔ ایسے موقعوں پر کرم دین اکثر ہنس کر کہتا تھا۔ "یہ باہر کی عورتیں مرنے والے کے لیے نہیں روتیں بلکہ اپنے مرے ہوئے عزیز رشتے داروں کو یاد کر کے روتی ہیں۔"

اجمل خان ڈاکٹر صاحب کے ساتھ باہر آیا اور ان سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ اپنی فیس تو لے لیں۔"

"میں نے کیا ہی کیا ہے بھائی؟" "میرا تو صرف آنے جانے کا وقت ہی لگا ہے نا تم فیس کی فکر چھوڑو اور کرم دین کی بیوی اور بچوں کو تسلی دو۔ اس بیچارے کا تو بیٹا بھی اتنا بڑا نہیں ہے کہ گھر کو سنبھال سکے۔"

اجمل خان ڈاکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے وہاں تک آیا جہاں انہوں نے اپنی نئی ریلے سائیکل پارک کر رکھی تھی۔ اس دور میں سائیکل اور وہ بھی ریلے اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگوں کے پاس ہوتی تھی۔ اجمل خان نے ڈاکٹر صاحب کا بیگ ان کی سائیکل کے کیریئر پر رکھ کر باندھا اور انہیں سلام کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ ڈاکٹر صاحب سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ عطائی ضرور تھے لیکن ان میں ابھی اتنی انسانیت باقی تھی کہ انہوں نے اجمل خان سے فیس نہیں لی تھی۔ آج کے دور میں تو ڈاکٹر میت کو اس وقت تک یرغمال بنا کر رکھتے ہیں جب تک لواحقین ڈاکٹر کی فیس اور اسپتال کے پورے اخراجات ادا نہیں کر دیتا۔

اجمل خان واپس آیا اور گھر کے باہر کھڑے ہو کر عورتوں کی آہ و بکا سنتا رہا۔ محلے کے چند لوگ مزید وہاں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے اجمل خان سے پوچھا۔ "میاں! ڈاکٹر صاحب نے کیا بتایا۔ مرحوم کو کیا بیماری تھی؟"

"کوئی بیماری نہیں تھی میاں جی!" اجمل خان نے جواب دیا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ دکان بند کر کے میرے ساتھ ہی اپنی سائیکل پر گھر آیا تھا، اسے تو کوئی بیماری تھی ہی نہیں، کبھی بخار بھی نہیں آتا، صحت بھی بہت اچھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ کرم دین کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔"

"کیا فیل ہو گیا ہے؟" بڑے میاں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے جی کہ کرم دین کے دل کی حرکت اچانک بند ہو گئی تھی۔"

"اللہ رحم کرے۔" بڑے میاں نے کہا۔ "یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں، ایسی ناگہانی موت قیامت کی نشانی ہی تو ہے۔ بندہ نہ اپنے بیوی بچوں سے کوئی بات کر سکے، نہ کلمہ پڑھ سکے۔ بس بیٹھے بیٹھے مر جائے۔"

اجمل خان کو بڑے میاں کی باتوں سے زیادہ کرم دین کی موت کا غم کھا رہا تھا۔ وہ برسوں سے ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دکان بھی برابر برابر تھیں اس لیے ان میں دوستی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کرم دین کا کوئی رشتے دار اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک چچا اور اس کے بیٹے قریب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ انہیں اطلاع کرنا ضروری تھی۔

پھر کرم دین کی تدفین کا بھی مسئلہ تھا۔ یہ سب کچھ اجمل خان ہی کو کرنا تھا۔ اس نے محلے کے ایک لڑکے سے کہا۔ ''پپو! تو نے کرم دین کے چچا احمد خان کا پنڈ دیکھا ہے نا؟''

''ہاں چاچا اجمل دیکھا تو ہے۔'' پپو نے جواب دیا۔ اس کی عمر مشکل سے سولہ سترہ برس رہی ہوگی۔

''پتر! تو میری سائیکل لے جا اور کرم دین کے چاچے کو خبر کر دے۔ وہ ان سے کہہ دینا کہ کرم دین کے دوسرے رشتے داروں کو بھی خبر پہنچا دیں۔''

پپو اسی وقت سائیکل لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اجمل خان نے ایک لڑکے کو آواز دی۔ ''شیرے پتر! تو ذرا قبرستان تک چلا جا اور گورکن سے قبر تیار کرا لے۔ اس سے کہنا کہ کرم دین فوت ہوگیا ہے اس کی قبر بنانا ہے۔ وہ کرم دین کو جانتا تھا۔ اسی لحاظ سے قبر بنا دے گا۔'' اس نے جیب سے اٹھنی نکالی اور شیرے کے حوالے کر دی۔ ''یہ بابا غفورے کو دے دینا۔'' بابا غفور اس علاقے کا واحد گورکن تھا۔ وہ اس چھوٹی سی آبادی میں رہنے والے ہر شخص کو جانتا تھا۔

اس طرف سے فارغ ہو کر اجمل خان نے محلے کے ہر ایک شخص کو تدفین کا سامان لینے بھیج دیا اور اس سے کہا کہ اگر ستار چاچا کی دکان بند ہو تو کھلوا لینا۔''

پھر وہ اپنے گھر میں گیا اور بیوی کو کرم دین کے گھر سے بلوا کر کہا کہ ''مرنے والے کے گھر کھانا بھیجا جاتا ہے۔ تجھے اتنا بھی ہوش نہیں ہے۔ چل جلدی سے کھانا بنا لے، رات ہونے والی ہے۔''

صبح تک سارے انتظامات مکمل ہوگئے۔ کرم دین کے رشتے دار بھی وہاں پہنچ گئے اور فجر کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا دی۔ پھر کرم دین کو وہاں سے کچھ دور قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

واپسی پر کرم دین کے ایک اور پڑوسی نے ناشتے کا انتظام کیا تھا۔ عورتوں نے ناشتا کیا، رحمت بی بی کو تسلیاں اور دلاسے دیے اور اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

اب صرف کرم دین کا چاچا احمد خان، اس کے دونوں بیٹے، رحمت بی بی کا ایک ماموں زاد اور دو بہنیں رہ گئیں۔ کرم دین کی موت کے غم سے زیادہ احمد خان کو اس کی دکان کی فکر تھی۔ اس نے کئی مرتبہ باتوں باتوں میں کہا۔ ''میں تو سوچ رہا ہوں کہ اب رحمت بی بی اور بچوں کا گزارہ کیسے ہوگا؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں کرم دین کی دکان پر بیٹھ جاؤں؟''

''آپ کیوں تکلیف کریں گے چاچا!'' ... نے جلدی سے کہا، وہ چاچا کے عزائم خوب سمجھ رہا تھا ... اجمل خان ہے نا! ویسے بھی مرنے والے نے ... میں ہی یہ کہہ دیا تھا کہ افضل کو بھائی اجمل ہی کو ... گا۔ اب اس کباڑ کے کاروبار میں تو کچھ رکھا نہیں ہے۔ بھائی اجمل، افضل کو اپنا کام سکھائے گا۔''

''جیسی تیری مرضی رحمتے!'' چاچا نے ... کہا۔ ''افضل تو ابھی بہت چھوٹا ہے۔ میں نے تو تیرے ... ہی کو کہا تھا۔ تیری مرضی نہیں ہے تو نہ سہی۔''

دوسرے دن چاچا اور اس کے ... بھی رخصت ہوگئے۔

اسی دن محلے میں ایک اور موت ہوگئی۔ محلے کے ایک راج مستری کی بیوی فوت ہوگئی۔ وہ کافی دنوں سے بیمار تھی۔ بیمار بھی ایسی کہ اس کی بیماری ڈاکٹر صاحب کی ... سے بھی نہیں گئی۔

رات تک اس کا جنازہ بھی تیار تھا اور لوگ اسے قبرستان کی طرف لے جا رہے تھے۔ محلے داری کے ... اجمل خان بھی جنازے میں شریک تھا۔ عشا کی نماز کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھائی گئی تھی اور اب محلے کا ایک لڑکا ... لیمپ سر پر رکھے آگے آگے چل رہا تھا کیونکہ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔

ایسے موقع پر مسجد کے مولوی صاحب بھی میت کے ساتھ ہوتے تھے، کیونکہ انہیں قبر پر جا کر بھی فاتحہ وغیرہ پڑھنی ہوتی تھی۔ اس کے عوض مرنے والے کے لواحقین مولوی صاحب کو دو چار آنے دے دیا کرتے تھے۔

مرنے والی کو سپرد خاک کرنے کے بعد مولوی صاحب فاتحہ پڑھ رہے تھے کہ اچانک لوگوں نے ایک دل خراش چیخ سنی۔ ایسا لگا جیسے کوئی بہت دور سے چیخا ہو۔ لوگوں نے اسے وہم سمجھا، اور پھر فاتحہ پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔

اچانک چیخ کی آواز پھر آئی اور اس مرتبہ اجمل خان نے واضح طور پر محسوس کیا کہ یہ آواز کرم دین کی قبر سے آ رہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور لوگوں نے بھی چیخ کی آواز سنی تھی۔ وہ سب کرم دین کی قبر کی طرف بڑھے جو مرنے والی کی قبر سے ایک قبر چھوڑ کر تھی۔

وہ لوگ قبر کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ اس مرتبہ کرم دین کی قبر سے پہلے سے بھی زیادہ فلک شگاف چیخ ...

... اس چیخ نے قبرستان میں موجود ہر شخص کو اس طرف متوجہ کر دیا۔

پھر وہاں مختلف آوازیں گونجیں۔ ''کرم دین زندہ ہے، یہ آواز تو اس کی قبر ہی سے آ رہی ہے، ہاں وہ زندہ ہے۔''

''میں کرم دین کی آواز اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' اجمل خان نے کہا۔ ''وہ زندہ ہے۔''

اب ہر شخص کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ کرم دین کی قبر کھولی جائے۔ کچھ لوگ اس طرف بڑھے بھی لیکن ایک سرکاری دفتر میں کام کرنے والے بابو سرفراز نے انہیں روک دیا اور بولا۔ ''ہم لوگ اپنے طور پر ایسا نہیں کر سکتے، یہ خلاف قانون ہے۔''

''تو پھر... کیا کریں باؤ جی؟'' اجمل خان نے کہا۔

''اس کے لیے علاقے کے تحصیل دار سے سرکاری اجازت نامہ ضروری ہے۔ چلو ہم سب ابھی تحصیل دار صاحب کے گھر چلتے ہیں۔''

''وہ تو سو گئے ہوں گے۔'' ایک شخص بولا۔

''مگر انہیں جگایا جا سکتا ہے۔'' باؤ سرفراز نے کہا۔ ''آخر یہ ایک آدمی کی زندگی کا معاملہ ہے۔''

قبرستان سے قافلہ تحصیل دار صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ ان کا گھر کافی دور تھا۔ بہت سے لوگ سائیکلوں پر تھے۔ باؤ سرفراز کے پاس بھی سائیکل تھی۔ اس نے گواہ کے طور پر مولوی صاحب کو بھی اپنے ساتھ سائیکل پر بٹھا لیا اور یوں وہ لوگ تحصیل دار صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ تحصیل دار صاحب واقعی سو چکے تھے۔ ان کے نوکر نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن جب مولوی صاحب نے کہا کہ یہ ایک انسانی جان کا معاملہ ہے۔ تم صاحب کو فوراً اٹھا دو۔

اس وقت تک قبرستان سے بقیہ لوگ پیدل وہاں تک پہنچ چکے تھے۔

تحصیل دار صاحب باہر نکلے تو مجمع دیکھ کر حیران رہ گئے۔

باؤ سرفراز نے انہیں بتایا کہ معاملہ کیا ہے؟

''مولوی صاحب!'' تحصیل دار نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے بھی اپنے کانوں سے کرم دین کی قبر سے آتی ہوئی آوازیں سنی ہیں؟''

''جی ہاں سرکار!'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''میں نے خود اپنے ان گناہ گار کانوں سے آوازیں سنی ہیں۔''

اتنے لوگوں کی گواہی کے بعد تحصیل دار کیسے انکار کر سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت قبر کھولنے کا اجازت نامہ لکھا اور اس پر دستخط کر کے اپنے ملازم سے مہر بھی لگوا دی۔

اب لوگ دوبارہ قبرستان کی طرف چلے اور بابا غفورے سے قبر کھولنے کو کہا۔

بابا غفور نے منٹوں میں قبر کی مٹی بیلچے سے ہٹا دی۔ قبر ابھی دو روز پہلے ہی بنی تھی اس لیے اس کی مٹی ابھی نرم تھی۔ مٹی ہٹانے کے بعد قبر پر رکھے ہوئے لکڑی کے تختے ہٹانے کا مرحلہ تھا۔ بابا غفورے نے تختے بھی ہٹا دیے۔ پھر لوگوں نے لالٹینوں کی روشنی میں دیکھا کہ کرم دین کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور وہ اندر جھانکنے والوں کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنے ہاتھ پھر ہلائے اور گرا لیے۔ شاید وہ قبر کھولنے والوں کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے۔

''کوئی تو جوان قبر میں اترے اور کرم دین کو باہر نکالے۔'' کسی نے کہا مگر کوئی بھی قبر میں اترنے کو تیار نہیں تھا۔

باؤ سرفراز نے کہا۔ ''مولوی صاحب آپ تو اللہ والے ہو، آپ کے سینے میں تو کلام الٰہی محفوظ ہے۔ آپ ہی قبر میں اتر جائیں۔''

دوسرے لوگوں نے بھی باؤ سرفراز کی بات کی تائید کی اور مولوی صاحب سے اصرار کیا تو وہ قبر میں اترنے پر آمادہ ہوگئے لیکن ان کے چہرے پر بھی خوف کے آثار تھے۔

وہ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے قبر میں اترے اور جھک کر کرم دین کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

کرم دین نے اچانک دونوں بانہیں ان کے گلے میں ڈال دیں۔ مولوی صاحب کے حلق سے ایک دبی دبی چیخ نکل گئی۔ وہ بوکھلا کر اٹھے تو اٹھ نہ سکے۔ کرم دین نے ان کی گردن کے گرد بہت مضبوطی سے بانہوں کا حلقہ ڈال رکھا تھا۔

مولوی صاحب کا چہرہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ سفید بے داغ کپڑوں پر مٹی لگ گئی اور ان کی بڑی گھڑی اس کوشش میں قبر ہی میں گر گئی۔

انہوں نے دوبارہ زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو وہاں موجود لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ساتھ کرم دین بھی ان کی گردن میں جھولتا ہوا کھڑا

ہوگیا۔

وہ ٹکر ٹکر ابلتی ہوئی آنکھوں سے مولوی صاحب کو گھور رہا تھا۔ مولوی صاحب کے چہرے پر گویا موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ انہوں نے با آواز بلند تلاوت کلام پاک شروع کردی اور کرم دین کے چہرے پر پھونکیں مارنے لگے لیکن کرم دین ان کی گردن میں جھولتا رہا۔

مولوی صاحب جھنجلا کر بولے۔ ''ارے چھوڑ مردود، خبیث!''

کرم دین نے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ اپنی بانہوں کا حلقہ ان کی گردن کے گرد مزید تنگ کردیا۔

''ارے کوئی مجھے اس قبر سے باہر تو نکالو۔'' مولوی صاحب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

دو تین نوجوانوں نے ہمت کی۔ ان کے ساتھ اجمل خان بھی شامل ہوگیا۔ ان سب نے مولوی صاحب کے ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر کھینچا تو کرم دین بھی ان کے گلے کا ہار بنا ہوا باہر نکل آیا۔

''ارے، یہ تم لوگوں نے کس مصیبت میں پھنسا دیا؟'' مولوی صاحب نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

اجمل خان نے مولوی صاحب کو چھڑانے کی کوشش کی اور کرم دین سے کہا۔ ''کرم دین! مولوی صاحب کو چھوڑ دو۔''

کرم دین نے انہیں مزید مضبوطی سے جکڑ لیا۔

باؤ سرفراز نے آگے بڑھ کر کرم دین کی نبض محسوس کی، اس کی سانس کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس کا معائنہ کر کے وہ بولا۔ ''کرم دین زندہ ہے۔ اسے گھر لے جانا پڑے گا۔''

اس وقت وہاں کوئی تانگا وغیرہ تو موجود نہیں تھا۔ سائیکل پر مولوی صاحب کرم دین سمیت بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ پیدل ہی کرم دین کے گھر کی طرف چلیں۔

چنانچہ لوگوں کا وہ قافلہ پیدل ہی کرم دین کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ کرم دین پہلے مولوی صاحب کے ساتھ گھسٹتا رہا، پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ ان کے ساتھ چلنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ اب اس کے رخ میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ پہلے وہ مولوی صاحب کے مقابل تھا۔ اب وہ اس حالت میں ان کی گردن جکڑے ہوئے مولوی صاحب کے پہلو میں آگیا تھا۔

یہ قافلہ جب کرم دین کے محلے میں پہنچا تو اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ چھوٹے علاقوں میں لوگ اس وقت تک اپنی آدھی نیند لے چکے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ہر طرف خاموشی اور سناٹا تھا۔

اجمل خان نے کرم دین کے گھر کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ اجمل خان نے دوبارہ زیادہ زور سے دروازہ بجایا تو اندر سے رحمت بی بی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔ ''کون ہے؟''

''بھابی جی، میں ہوں اجمل خان۔''

''بھائی اجمل!'' رحمت بی بی نے کہا۔ ''خیر تو ہے، آپ اس وقت کیسے آئے؟''

''بھابی جی آپ دروازہ تو کھولیں۔''

اس دوران میں کرم دین مسلسل مولوی صاحب کی گردن میں بانہیں ڈالے رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ مولوی صاحب پر اپنے جسم کا بوجھ ڈالنے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

اجمل خان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید رحمت بی بی دروازہ نہ کھولتی لیکن اسے اجمل خان پر اعتماد تھا اس لیے اس نے دروازہ کھول دیا۔

''بھابی جی، پردہ کرلیں؟'' اجمل خان نے کہا۔

اس سے پہلے کہ رحمت بی بی ایک طرف ہوتی، مولوی صاحب بے تابی سے کرم دین کے گھر میں داخل ہوگئے۔ کرم دین ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

رحمت بی بی کی دونوں بیٹیاں ابھی تک وہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ باہر لوگوں کی آوازیں سنیں تو وہ دونوں، صغراں اور زینت بھی ہڑبڑا کے کھڑی ہوگئیں۔

مولوی صاحب کرم دین کو ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ جہاں ایک چارپائی پر بستر تھا۔ اس پر شاید رحمت بی بی سو رہی تھی۔ اس چارپائی پر کرم دین کا بیٹا فضل بھی سو رہا تھا۔ اجمل خان نے بڑھ کر فضل کو گود میں اٹھالیا۔ مولوی صاحب نے کرم دین کو چارپائی پر رکھا تو اس نے ان کی گردن چھوڑ دی اور چارپائی پر ڈھے گیا۔

مولوی صاحب اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے وہاں سے فوراً نکل گئے کہ کہیں کرم دین دوبارہ ان کی گردن نہ دبوچ لے۔ پھر اجمل خان کے علاوہ ایک ایک کر کے تمام لوگ وہاں سے رخصت ہوگئے۔

رحمت بی بی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''بھائی یہ سب معاملہ کیا ہے اور یہ مولوی صاحب کیسے لائے ہیں؟''

''بھابی جی، کرم دین ہے۔''

''کرم دین؟'' رحمت بی بی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی ''جی، وہ تو فوت ہوچکے ہیں۔''

''وہ فوت نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں شاید سکتہ ہوگیا تھا اور ہم لوگوں نے انہیں زندہ دفن کر دیا۔ اب آپ جا کر ان کی دیکھ بھال کریں۔''

''میں؟'' رحمت بی بی نے سہم کر کہا۔ ''نہ بابا نہ! مجھے مردوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''وہ زندہ ہے بھابی جی۔'' اجمل خان نے کہا۔

''تو پھر اجمل بھائی، ایسا کرو، تم بھی تو کرم دین کے دوست ہو۔ تم ہی اس کی دیکھ بھال کرلو۔ میں بچوں کو لے کر تمہارے گھر جا رہی ہوں۔''

اجمل خان نے تاسف سے سر ہلایا اور رحمت بی بی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ رحمت بی بی اپنی دونوں بہنوں، بیٹیوں اور بیٹے کو لے کر اجمل خان کے گھر چلی گئی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ کرم دین زندہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اسے کرم دین کا بھوت سمجھ رہی تھی۔

اجمل خان نے باورچی خانے میں جا کر دیکھا۔ پتیلی میں تھوڑا سا دودھ موجود تھا۔ اس نے وہ دودھ پیالے میں انڈیلا اور کرم دین کے کمرے میں چلا گیا۔ کرم دین اسے دیکھتا رہا لیکن بولا کچھ نہیں۔

اجمل خان نے کہا۔ ''کرم دین! میں تمہارے لیے دودھ لایا ہوں۔ یہ پی لو۔''

کرم دین کے ہونٹ کپکپائے اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ ''پا... نی...''

اجمل خان نے صحن میں آ کر مٹکے سے پانی لیا پھر کرم دین کے پاس پہنچا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر پانی کا کٹورا اس کے منہ سے لگا دیا۔

کرم دین غٹ غٹ پانی پی گیا۔ پانی پی کر اجمل خان کو اس کی ویران آنکھوں میں زندگی کی جھلک نظر آئی۔

اس نے دوبارہ دودھ کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا تو کرم دین نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اجمل خان نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور دودھ بھی پلا دیا۔ دودھ پینے کے بعد کرم دین کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

''اب تم سونے کی کوشش کرو، ابھی میں تمہیں کھانے کو کچھ نہیں دوں گا۔'' اجمل خان نے کہا۔ وہ اس معاملے میں خاصا سمجھدار تھا۔

دودھ پینے کے بعد کرم دین غنودگی میں چلا گیا۔ اجمل خان دوسرے کمرے سے ایک چارپائی اٹھا لایا اور اسے کرم دین کے ساتھ ڈال کر خود بھی اس پر لیٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح رحمت بی بی اور دونوں بیٹیوں کو یقین آیا کہ کرم دین مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اسے زندہ دفن کردیا گیا تھا۔

رحمت بی بی اس کی تیمارداری میں لگ گئی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر کے بجائے اجمل خان حکیم جی کو لے آیا۔ انہوں نے کرم دین کا معائنہ کیا، پھر بولے۔ ''کرم دین مرا نہیں بلکہ اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ تم لوگوں نے اسے زندہ دفن کردیا۔ ابھی اسے ہلکی پھلکی غذا دو، مرغی کی یخنی اور کھچڑی وغیرہ کھلاؤ۔ دو دن بعد میں پھر آ کر اسے دیکھ جاؤں گا۔''

مرغ کی یخنی اور رقیق حلوہ، کھچڑی اور دودھ سے کرم دین دوسرے ہی دن بولنے کے قابل ہوگیا۔ اجمل خان کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

''میں جب تیرے ساتھ دکان سے گھر آیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ پھر میں نے صغراں سے پانی مانگا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کہ کیا ہوا، دوبارہ میری آنکھ کھلی تو وہاں بہت اندھیرا تھا۔ میں سمجھا کہ رات ہے۔ میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو ہل نہ سکا۔ میں نے کوشش کر کے اس کپڑے میں سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور اٹھنے کی کوشش کی تو میرے دونوں ہاتھ دیوار سے ٹکرائے۔ میں بوکھلا گیا کہ یہ کون سا کمرا ہے جس کی دیواریں اتنی تنگ ہیں۔ میں نے پوری قوت سے رحمت بی بی کو آواز دی۔ ''رحمتے!''

جواب میں مجھے عجیب سی گونج سنائی دی جیسے کوئی مٹکے میں منہ ڈال کر بولتا ہے۔ میں نے گھبرا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو میرا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور میں تکلیف کی شدت سے پھر لیٹ گیا۔

اچانک مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ شاید مجھے زندہ دفن کردیا گیا ہے، میں نے ٹٹول کر اپنا جسم دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے جسم پر کپڑے نہیں ہیں بلکہ ایک بغیر سلا کپڑا لپٹا ہوا ہے۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ایک دل دوز چیخ ماری کیونکہ وہ کفن تھا اور اس میں سے ابھی تک کافور اور عرق گلاب کی بو آرہی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اٹھا اور پاگلوں کی طرح قبر کے

تختے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ تختے بھلا مجھ سے کیسے ہٹتے۔ میں لاکھ طاقت ور سہی لیکن ان تختوں پر منوں مٹی کا ڈھیر تھا۔ میں نے ارد گرد دیکھا کہ مجھے کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے میں قبر کھود سکوں مگر مجھے وہاں سوائے مٹی کے کچھ بھی نہیں ملا۔

اب میری آنکھیں اندھیرے سے کسی حد تک مانوس ہو چکی تھیں اور مجھے انتہائی دھندلا دھندلا سا نظر بھی آ رہا تھا۔ شاید گورکن نے قبر کے تختوں پر اچھی طرح مٹی نہیں لگائی تھی۔ وہیں سے روشنی کی ایک رمق اندر آ رہی تھی یا پھر میرا وہم تھا۔ بھلا منوں مٹی کے اندر روشنی کیسے آ سکتی ہے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر تختے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔ الٹا میرے ہاتھ اس کوشش میں زخمی ہو گئے۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اوپر چل پھر رہا ہے۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”ارے کوئی ہے۔ مجھے بچاؤ، لوگوں نے مجھے زندہ دفن کر دیا ہے۔“

لیکن کسی نے بھی میری آواز نہ سنی اور پیروں کی آہٹ دور ہوتی چلی گئی۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا لیکن کسی کو میری آواز سنائی نہیں دی۔ وہاں میری آواز سنتا بھی کون۔ قبرستان میں مردوں کے علاوہ اور ہوتا ہی کون ہے۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ میں جس قبر میں ہوں، وہ بابا غفورے کی کوٹھڑی سے کتنے فاصلے پر ہے۔

اسی حالت میں مجھے کئی گھنٹے گزر گئے۔ میں کبھی چیختا کبھی پاگلوں کی طرح قبر کے تختے ہٹانے کی کوشش کرتا۔ پھر تھک کر گر جاتا۔

مجھے شدید پیاس کا احساس ہو رہا تھا، حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے لیکن وہاں پینے کو پانی کہاں سے آتا۔

اسی حالت میں شاید مجھے دو دن گزرے تھے یا تین دن، قبر کے اندھیرے میں دن رات کی تمیز بھلا کیسے ہو سکتی تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ میں نڈھال ہو گیا تھا اور اب مجھے پیاس کے ساتھ ساتھ شدید بھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اوپر کوئی آہٹ سنائی دیتی تو میں حلق پھاڑ کر چیختا، پھر وہ آہٹ آہستہ آہستہ دور ہو جاتی۔

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہو گئی کہ نقاہت کی وجہ سے اب میرے حلق سے آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ قبر کے تختوں کی مٹی ابھی تک گیلی تھی۔ اس میں سے مٹی کا کوئی ٹکڑا مجھ پر آ گرتا تو میں اسے بھی اپنے جسم سے ہٹانے کی کوشش نہ کرتا۔

میرے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں اور انہوں نے مجھے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے تو میں انہیں ہاتھ سے جھٹک دیتا تھا، پھر مجھ میں ہاتھ ہلانے تک کی سکت نہ رہی، میں خاموشی سے قبر میں لیٹ کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

ایک دفعہ اچانک مجھے اوپر کئی لوگوں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا کہ یہ ایک دو نہیں بلکہ کئی آدمی ہیں۔ شاید ان میں سے کوئی میری آواز سن لے۔ میں پوری قوت سے چیخا۔ ”مجھے بچاؤ!“ لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے حلق سے کچھ عجیب سے الفاظ نکلے ہوں جب کوئی ادھر متوجہ نہ ہوا تو میں اپنے جسم کی رہی سہی قوت جمع کر کے چیخا ”بچاؤ۔“

اسی وقت مجھے قبر پہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اُمید کی کیفیت میں یک مرتبہ پھر پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخا۔ ”بچاؤ کوئی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد مجھے قبر کے تختے ہٹنے کی آواز سنائی دی اور مولوی صاحب آیت الکرسی پڑھتے قبر میں اترے۔ جوں ہی مجھ پر جھکے، میں نے ہمت کر کے اپنی دونوں بانہیں ان کی گردن میں ڈال دیں۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر مولوی صاحب قبر سے نکل گئے تو لوگ مجھے دوبارہ دفن کر دیں گے۔ اس سے آگے کا حال تو تم لوگوں کو معلوم ہی ہے۔“

”بس یار زندگی ہو تو اللہ زندہ رہنے کے سو بہانے پیدا کر دیتا ہے اور اگر موت ہو تو دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں ٹال سکتی۔“ کرم دین نے کہا۔

☆☆☆

میری عمر اس وقت صرف پانچ سال تھی۔ کئی برس ہوئے کرم دین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں خود بھی اب چھیاسٹھ سال کا ہو چکا ہوں۔ اب میں اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکا ہوں۔ اب میرے دو بیٹے ملازمت کرتے ہیں۔ دونوں نے سی ایس ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔

میں اکثر انہیں تاکید کرتا ہوں کہ اگر کبھی تم لوگوں کو ایسا محسوس ہو کہ میں مر چکا ہوں اور بے شک کوئی ڈاکٹر تصدیق بھی کر دے تو تم لوگ مجھے پوری طرح تصدیق کے بعد دفن مت کرنا۔ مجھے کرم دین کی وہ موت یاد ہے جب اسے زندہ درگور کر دیا گیا تھا اور وہ موت بھی یاد ہے جب وہ واقعی مر گیا تھا۔

گولڈ میڈل

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم!
میں کئی ایک ڈائجسٹ میں افسانے کہانیاں لکھتی ہوں، اس بار ایک سچ بیتی لے کر سرگزشت کی محفل میں حاضر ہوئی ہوں۔ یہ روداد مجھے ایک صاحب نے سنائی جو اس کہانی کے مرکزی کردار کے ساتھ دہلی میں خاصا وقت گزار چکا ہے۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

گیتی آرا

آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن ایسا ہوا ہے جسے میں قلمبند کر رہا ہوں۔ میرا نام آپ کچھ بھی سوچ لیں کیونکہ میں ایک خطرے کی وجہ سے ملک سے باہر بھاگ آیا ہوں۔ اس سے پہلے میں ریلوے میں پچھلے چالیس برس سے ملازم تھا۔ ریلوے میں بطور ڈرائیور ملازم ہوا تھا اور اپنی اس چالیس سالہ ملازمت میں، میں نے جس محنت اور فرض شناسی سے کام کیا تھا اس سے محکمے کا ہر فرد اور کارکن بخوبی واقف تھا۔ لیکن اس چالیس سالہ محنت اور فرض

شناسی کے نتیجے میں مجھے کیا ملا؟ ریٹائر ہونے کے بعد صرف ہزار روپے کی پنشن اور بس...... یہ سوچ کر ہی میرے چہرے پر افسردگی چھا جاتی تھی۔ جب سے میں نے حکومت کے موجودہ اعلان کے متعلق اخبار میں یہ سرخی دیکھی تھی کہ حالیہ حکومت نے محکمہ آمدورفت سے متعلق ریلوے کے ڈرائیوروں کو ان کی اعلیٰ کارکردگی اور محنت کی بنیاد پر "گولڈ میڈل" دینے کا فیصلہ کیا ہے، تب سے میرے دل میں گولڈ میڈل کو حاصل کرنے کی خواہش مچل مچل جا رہی تھی، گو کہ مجھے اس ملازمت سے ریٹائر ہوئے دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا اور یہ اعلان ریلوے کے صرف حالیہ ملازمین اور ڈرائیوروں کے لیے تھا جس میں سابقہ ملازمین اور ڈرائیوروں کا دور دور تک کہیں کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں اس گولڈ میڈل کو حاصل کرنے کی خواہش بار بار کروٹیں لے رہی تھیں، مجھے یقین تھا کہ آج اگر میں ریلوے میں ملازم ہوتا تو یہ قیمتی گولڈ میڈل اور ایوارڈ میرے ہی حصے میں آتا۔ میں پہلا محنتی شخص قرار پاتا جسے گولڈ میڈل کا حق دار قرار دیا جاتا۔

میں نے دسیوں بار اخبار اٹھا کر ایک حسرت کی نظر اس شے سرخی پر ڈالی اور ایک لمبی ٹھنڈی آہ بھر کر مایوسی کے بھرپور احساس کے ساتھ اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ تبھی ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوندا اور جلدی سے کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"جناب عزت مآب"

"اُمید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ آپ نے حالیہ ریلوے ملازمین کی اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل دینے کا جو اعلان کیا ہے وہ ایک قابل ستائش عمل ہے۔ جناب عالیٰ! ریلوے کے ملازمت پیشہ ڈرائیور حضرات کے لیے یہ ایک حوصلہ افزا اقدام ہوگا۔ آپ کے اس فیصلے اور اقدام سے ملازمت پیشہ افراد کی کارکردگی میں پہلے سے کئی گنا زیادہ اضافہ ہوگا اور آپ کے اس اقدام کی بنا پر محکمہ کے ہر دوسرے ملازم میں لگن اور محنت سے کام کرنے کا جذبہ جاگے گا۔ وہ آپ کے اس اقدام کی بنا پر اب کام کو ایک بوجھ نہیں بلکہ انعام سمجھ کر بڑی خوش اسلوبی سے نمٹائیں گے، ہر سال ان کی اعلیٰ کارکردگی پر گولڈ میڈل ملنے کی امنگ اور خواہش انہیں بہتر سے بہتر اعلیٰ کارکردگی پر اکسائے گی، وہ اب پہلے سے زیادہ محنت اور لگن سے کام کریں گے۔ جناب عالیٰ! حکومت کا یہ عمل یک قابل تعریف اور قابل ستائش عمل ہے لیکن شومئی قسمت میری سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ میرے دور ملازمت میں آپ جیسے ذمے دار ذی عقل لوگ موجود نہیں تھے اور نہ ہی اس دوران میں ایسا کوئی ذمہ دارانہ اقدام عمل میں آیا۔ لیکن جناب عالیٰ! میں نے اپنی چالیس سالہ ملازمت میں جس طرح خون پسینا ایک کر کے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اس نتیجے میں کوئی بھی حکومت ہوتی تو میری اس محنت لگن اور اعلیٰ کارکردگی پر مجھے اس ایوارڈ سے ضرور نوازتی لیکن یہ اب میری بدنصیبی ہے کہ اس دور میں آپ جیسے ذی عقل ذمہ دار لوگ نہیں تھے، جو اپنے اندر سوجھ بوجھ اور شعور رکھتے ہوں۔ اگر آپ جیسے ذی عقل اور باشعور لوگ اس دور میں ہوتے تو ضرور مجھے اس ایوارڈ سے نوازتے۔ جناب! عزت مآب مجھے یقین ہے کہ آج بھی اگر آپ میری خدمت کا پچھلا چالیس سالہ ریکارڈ دیکھیں تو آپ بھی میری خدمت اور اعلیٰ کارکردگی سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکیں گے۔ جناب عالیٰ میں نے اپنی چالیس سالہ ملازمت میں جہاں میں بطور ٹرین ڈرائیور ملازم رہا تھا، میں نے اپنی ملازمت کے ان طویل سالوں میں ڈرائیونگ جیسے مشکل پیشے کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ جناب عالیٰ میری ملازمت کے دوران اگر آپ ایک نظر ڈالیں تو کہیں بھی میری ٹرین کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی۔ میری ملازمت کے دوران مسافروں کو کبھی سفر کے دوران کسی بھی تکلیف یا طویل انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی، میری ٹرین ہمیشہ وقت سے پہلے منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔ جناب عالیٰ! ایک اور اہم بات وہ یہ کہ میرے دور ملازمت میں میری ٹرین کے علاوہ دوسرے ملازمین کی زیر نگرانی چلنے والی ٹرینیں آئے دن حادثے کا شکار ہو رہی تھیں، جس بنا پر لوگوں نے مارے دہشت و خوف کے ٹرین سے سفر کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ اسے ایک موت کا کنواں تصور کرنے لگے تھے۔ یہ سفر خودکشی کی ایک علامت سمجھا جانے لگا تھا اور محکمہ آمدورفت خسارے میں جانے لگا تھا۔ لوگ ٹرین کے بجائے جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دینے لگے تھے، اس دور میں میں وہ واحد ڈرائیور تھا جس کی ٹرین جو کہ میرے زیر نگرانی چلتی تھی کبھی حادثے کا شکار نہیں ہوئی، تب ہی لوگوں نے جہاز کے بجائے ریل سے سفر کرنے کو ترجیح دینا شروع کر دیا، اس طرح میرے زیرِ نگرانی چلنے والی ٹرین لوگوں کے دلوں سے موت کا خوف دور کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

جناب عالیٰ! میری چالیس سالہ اعلیٰ کارکردگی کے نتیجے میں کسی سابقہ حکومت نے مجھے کسی گولڈ میڈل سے تو کیا کسی تحریری اعزاز، ایوارڈ سے بھی نہیں نوازا، جس کا عمر بھر مجھے ملال ہی رہے گا لیکن سر مجھے اُمید ہے کہ اگر آپ آج بھی میرا پرانا ریکارڈ چیک کریں، تو میری اس حسن کارکردگی کے پیش نظر میری اس ریٹائرمنٹ کے باوجود، آپ مجھے ہی اس گولڈ میڈل کا آج بھی صحیح حقدار قرار دیں گے۔ جناب عالیٰ! میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ جب آپ کی حکومت ریلوے کے ملازمین کو ان کی اعلیٰ کارکردگی پر، اس گولڈ میڈل سے نوازے گی۔ اور گولڈ میڈل حاصل کرنے والوں میں میرا نام سرفہرست ہوگا۔

آپ کے جواب کا منتظر

آج پورے دو مہینے ہو چکے تھے مجھے خط پوسٹ کیے لیکن حکومت کی طرف سے اب تک تسلی بخش جواب تو کیا کوئی انکار یہ لیٹر بھی موصول نہیں ہوا تھا اور نہ ہی مجھے اب کوئی اُمید رہی تھی۔ میں اب حکومت کی طرف سے تقریباً مایوس سا ہو چلا تھا۔ اس بات کا تو اسے پہلے ہی علم تھا کہ یہ اعلان مجھ جیسے ریٹائرڈ شخص کے لیے قطعی نہیں تھا۔ یہ اعلان تو صرف حالیہ ریلوے ملازمین کے لیے کیا گیا تھا صرف ان کی کارکردگی کو بڑھانے کی غرض سے اور بس۔ لیکن نہ جانے کیوں اس میڈل کو حاصل نہ کر سکنے کا دکھ اسے اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا۔ تب میں نے ایک ناکام سی کوشش کے ساتھ گولڈ میڈل کے لیے کاغذ قلم اٹھایا تھا۔ مجھے قوی نہ سہی پر اتنی اُمید تو تھی کہ میری درخواست پر محکمہ پرانا ریکارڈ چیک کر کے مجھے اور کسی نہ کسی انعام سے نوازے گا۔ اب یا تو خط پہنچا نہیں۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے، میں نے تو خط کی رجسٹری کرائی تھی۔ تو پھر اس کا مطلب ہے خط ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا یا پھر حکام نے ایک دیوانے کی بکواس سمجھ کر میری اعلیٰ کارکردگی کا چالیس سالہ ریکارڈ چیک کیے بنا ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ میں یونہی آنکھیں بند کیے صوفے پر لیٹا سوچے ہی جا رہا تھا کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ کہ تب ہی تمام ہمت یکجا کر کے اٹھ بیٹھا اور پھر ایک بار کاغذ قلم سنبھال لیا۔

حیرتوں کا شہر

تدمر شہر حضرت نوح کی اولاد سے ایک لڑکی تدمر بنت حسان کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں بڑی بڑی اور عجیب و غریب عمارتیں بلند ستونوں پر کھڑی ہیں۔ روایت ہے کہ یہ عمارتیں حضرت سلیمانؑ نے جنات سے تعمیر کرائی تھیں۔ اس شہر کے اندر ایک بہت قدیم قلعہ ہے جسے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کرایا تھا۔ جس کے اندر تدمر بنت حسان کی قبر ہوا کرتی تھی جو اب بند ہو چکی ہے۔ مشہور راوی اسمٰعیل بن محمد سے روایت ہے اموی خاندان کے آخری خلیفہ مروان ثانی کے دور میں اہل تدمر نے بغاوت کر دی۔ مروان ثانی خود ایک بھاری لشکر کے ساتھ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے آیا۔ شہر کے باغیوں سے نمٹنے کے بعد جب اس نے شہر میں قیام کیا تو اسے بتایا گیا کہ شہر سے صرف ایک فرلانگ باہر ایک عجیب و غریب غار ہے۔ مروان ثانی کو یہ غار دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اپنے مصاحبوں کے ہمراہ ہزاروں برس پرانے کھنڈرات میں گیا۔ وہاں ایک غار تھی۔ جب وہ اس غار میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک چبوترے پر ایک عورت کی لاش اوندھے منہ پڑی تھی اور اس کے اوپر ستر لبادے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے بال لمبے لمبے تھے جن میں چھلے پروئے ہوئے تھے۔ راوی اسمٰعیل بن محمد بھی مروان کے ساتھ تھا۔ وہ کہتا ہے میں نے خود اس عورت کے پاؤں کو ناپا وہ ایک ذرع (گز) لمبا تھا اور اس حسین عورت کے ایک گال پر سونے کی تختی تھی جس پر تحریر تھا۔

"بسمہ الحمدہ۔ میں تدمر بنت حسان ہوں جو میرے اس حجرے میں داخل ہو خدا اسے ذلیل کرے۔"

تب مروان ثانی نے اس غار کو بند کرنے کا حکم دیا اور اس کے مصاحبوں نے فوراً غار کا منہ بند کر دیا۔ یہ غار ابھی تک موجود ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ تدمر بنت حسان کی لاش اب بھی تروتازہ حالت میں ہے۔

بہ حوالہ: تاریخ بلاد و فلسطین، شام

''جناب عزت مآب
پوسٹ مین!
ابھی صحیح طور سے کاغذ قلم سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ ڈاکیے کی آواز پروڈز کر گیٹ پر پہنچا۔
''محکمہ آمد ورفت حکومت پاکستان''
لفافے پر موٹا موٹا حکومت پاکستان کا لیبل دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے تقریباً جھپٹ کر پوسٹ مین کے ہاتھ سے لفافہ چھینا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تب ہی میری نظریں تیزی سے کاغذ پر بکھری سطروں پر دوڑنے لگی۔

''جناب رحیم احمد!

2 ستمبر کو آپ کا خط ملا۔ جس میں آپ نے ریلوے ملازمین سے متعلق اقدام کو سراہتے ہوئے اپنی پچھلی اعلیٰ ترین خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے ہم سے اپنا پچھلا ریکارڈ چیک کرنے کی درخواست کی ہے، جس پر ہم نے بڑی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کا پچھلا ریکارڈ چیک کیا ہے جس کے مطابق آپ نے واقعی ٹرین کو کبھی حادثے کا شکار نہیں ہونے دیا جو کہ واقعی آپ کے ایک اعلیٰ ڈرائیور ہونے کا ثبوت ہے اور ایک محنتی انسان ہونے کی نشانی بھی۔ لیکن جناب عالی! آپ کو آپ کی اس اعلیٰ کارکردگی اور ڈرائیونگ کا محکمہ ایک بھاری معاوضہ دیتا رہا ہے۔ ہاں البتہ آپ کے پرانے ریکارڈ کی چیکنگ کے دوران کچھ باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں جس کی بنا پر محکمہ آمد ورفت کو آپ کی اعلیٰ کارکردگی کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ عظیم خساروں اور نقصان کا بھی سامنا کرنا پڑا، جن کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ نمبر ایک آپ کی ملازمت کے دوران آپ کی رہبری میں چلنے والی ایکسپریس میں لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا گیا، جو کہ ریلوے کے ڈسپلن کے خلاف تھا اور ریلوے ڈرائیور کی ذمہ داری بھی، جس کا قطعی خیال نہیں کیا گیا۔

نمبر 2۔ سیکنڈ کلاس کی ایمرجنسی چین جو کہ برسوں سے خراب پڑی تھی، جسے صحیح کرانے کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی جبکہ یہ کام بھی ایک ذمہ دار ٹرین ڈرائیور کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔

نمبر 3۔ مسافروں کی بدتھ سیٹ، جو کہ جابجا خستہ حالت میں تھی۔ جس کی طرف بھی توجہ نہیں دی گئی جس کی بنا پر ٹرین کے مسافروں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا جو کہ ایک ڈرائیور کی عظیم غلطی اور کاہلی کا ثبوت ہے۔ 13 دسمبر 1960ء کو آپ کی ٹرین کے نیچے آ کر ایک نوجوان کچلا گیا جو کہ ٹرین کے پانچ منٹ پہلے پہنچ جانے کی بنا پر ہوا، اگر اس روز اپنے مقررہ وقت پر ٹرین پہنچتی تو ایک قیمتی جان جس کا کوئی نعم البدل نہیں، بچ سکتی تھی لیکن آپ سے اس عظیم جرم کا ارتکاب ہوا، لہٰذا حکومت ان تمام غلطیوں کی بنا پر وراستے بڑے بڑے جرم سرزد ہونے کی بنا پر آپ پر بھاری جرمانہ عائد کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہے لیکن آپ کی پچھلی اعلیٰ کارکردگی اور عمدہ ڈرائیونگ کو دیکھتے ہوئے آپ کی سزا میں کچھ نرمی کرتے ہوئے آپ پر صرف تین لاکھ روپے کا جرمانہ عائد کرتی ہے اور ساتھ ہی آپ کی پچھلی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حکومت آپ کی سزا میں مزید نرمی کرتے ہوئے آپ کو اس رقم کی ادائیگی کے لیے پورے تین ماہ کی مہلت اور نوٹس دیتی ہے ورنہ دوسری صورت میں ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں حکومت کا محکمہ آپ کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کو فروخت کر کے رقم باآسانی وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔
شکریہ!

خط پڑھنے کے بعد میں نے افراتفری میں پاسپورٹ بنوایا تھا اور یو اے ای آ گیا تھا۔ عرصہ دس سال تک یہاں رہا پھر ایک دن فراز نامی نوجوان سے ملاقات ہوگئی۔ باتوں باتوں میں پتا چلا کہ وہ بھی ریلوے میں ملازم تھا۔ اور اسی زون میں تھا جس میں، میں۔ فرق اتنا تھا کہ وہ دفتر میں تھا اور میں فیلڈ میں۔ ہماری شامیں ساتھ گزرتی تھیں لیکن میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں بھی ریلوے کا ریٹائرڈ ملازم ہوں۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ دفتر میں کسی پاگل بڈھے کا خط آیا جو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی گولڈ میڈل مانگ رہا تھا۔ میں نے اسے ایسا جواب لکھا کہ وہ خاموش ہی ہو گیا ورنہ خط لکھ لکھ کر جان ہلکان کر دیتا۔

اتنا سننا تھا کہ میرے غصے کی انتہا نہ رہی اور میں غصے میں اٹھ کر آ گیا۔ آپ اگر میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟
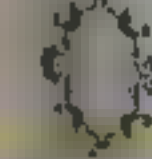
محترم معراج رسول
السلام علیکم۔
یہ زندگی کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اس کی عکاس خود میری زندگی ہے۔ میں کوئی تجربے کار لکھاری نہیں ہوں لیکن پڑھنے پڑھانے کا شوق ہے۔ جیل میں رہ کر بھی میں آپ کا ڈائجسٹ منگوا کر پڑھتا ہوں۔ اگر آپ سہارا دے دیں تو میں خالی وقت لکھنے لکھانے میں گزار سکتا ہوں۔ میری یہ تحریر ابتدا ہے اور خود میری آپ بیتی ہے۔ امید ہے اندازِ تحریر آپ کو بھی پسند آئے گا۔
شکیل
(لاہور)
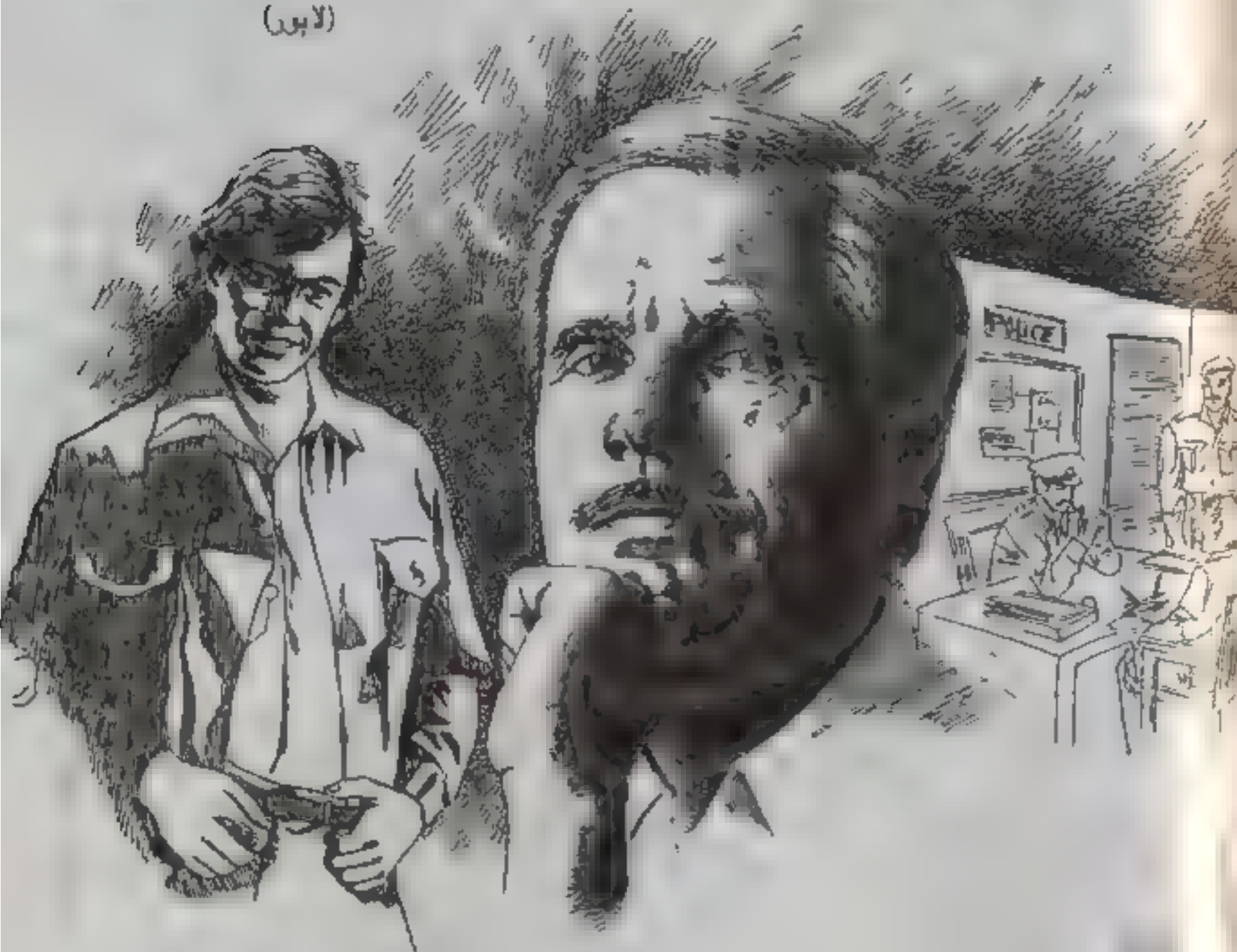
بڑی شرمناک اور المناک قسم کی کہانی ہے میری۔
ایک دن میرے دوست لنگڑے منان نے بتایا ''ابے تیرے ابا تو آج کل بہت اونچے جا رہے ہیں۔''
''کیوں' کیا وہ کسی بلڈنگ کی چھت پر چڑھ گئے ہیں؟''
''بیٹے' باپ کے عیبوں کو مت چھپا۔''
''ابے بتا تو سہی کیا کیا ہے ابا نے؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

"تیرے ابا آج کل نیلم پری کے چکر میں ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کون نیلم پری؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ابے وہی جس کو دیکھ کر تو بھی آہیں بھرتا رہتا ہے لیکن اسے تیرے ابا لے اُڑے۔"

"دیکھ، میرے ابا کی شان میں کچھ مت کہنا، میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔"

"تو ایسا ابا کیوں پال رکھا ہے۔"

"میں نے نہیں پالا۔ قدرت نے نصیب میں لکھ دیا تھا۔ تو یہ بتا تو ابا کی شان میں کیا گستاخی کررہا تھا۔"

"بتایا تو، میرے ابا نیلم پری کے چکر میں ہیں۔ میں نے خود دونوں کو کئی بار ایک ساتھ دیکھا ہے۔"

"کسی اور کو دیکھا ہوگا۔ میرے ابا ایسے آدمی نہیں ہیں۔ نمازی پرہیزگار ہیں۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تو کس دل سے ان کو نمازی پرہیزگار کہہ رہا ہے۔" اس نے کہا۔ "میرے سامنے کی بات ہے۔ عید کی نماز کے لیے بھی تو پکڑ کر انہیں زبردستی لے گیا تھا۔"

"اچھا یہ بتا، تو نے نیلم پری والی کیا بات کی تھی۔"

"بتا تو دیا، تیرے ابا نیلم پری کے چکر میں ہیں۔" اس نے کہا۔ "تو تو جانتا ہے، وہ اور اس کی ماں دونوں ہی کتنی بدمعاش ہیں۔ ابے تیرے ابا تو ان کے چکر میں تباہ ہوجائیں گے۔"

"جب تک میں اپنی آنکھ سے دیکھ نہ لوں یقین نہیں آئے گا۔"

"وہ دوسرے محلے میں جو پارک ہے نا، رانی پارک۔ یہ بتا تیرے ابا وہاں کیوں جاتے ہیں؟"

"جاگنگ کرنے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر نے جاگنگ کا مشورہ دیا ہے۔"

"ابے یہ سب غلط ہے۔ وہ بلڈ پریشر گھٹانے کے لیے نہیں بڑھانے کے لیے جاتے ہیں۔ وہ لڑکی ان سے وہیں پارک میں آکر ملتی ہے۔ تیری اماں کی موت کے بعد تیرے ابا بدمست بیل کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں۔"

ابا کے بارے میں اس کی یہ رائے بہت شرمناک تھی۔ میں بھنا کر رہ گیا تھا۔ لیکن مجبور اس لیے تھا کہ ابا کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔

لنگڑے منان کی اطلاع کا میں نے یقین کر لیا تھا۔ لیکن اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے اس سے بحث کیے جارہا تھا۔ رانی پارک جاکر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے ابا کو نیلم پری کے گھر سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا۔

میں اس وقت ایک دکان کی آڑ میں تھا۔ اس لیے ابا مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔

نیلم پری اور اس کی ماں دونوں ہی بہت بدنام تھیں۔ نہ جانے کیسے انہوں نے اس محلے میں کرائے کا مکان لے لیا تھا۔

پورا محلہ ان کے خلاف تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کے یہاں بااثر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسی لیے کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ ان کے خلاف کچھ بول سکے۔

عام طور پر یہ خیال تھا کہ ان کے یہاں صرف بااثر اور دولت مند لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ابا کس خوشی میں وہاں آنے جانے لگے تھے، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ابا کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے شام کے وقت ابا سے بات کرلی۔ ابا اس وقت گنا چھیل رہے تھے۔ "ابا، ایک زمانہ تھا کہ اولاد نافرمان ہوا کرتی تھی۔ اب والدین نافرمان ہونے لگے ہیں۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔"

"ابے فلسفہ مت بول۔ صاف صاف بتا کیا بات ہوگئی ہے۔"

"ابا، ہارون رشید کے زمانے میں ایک دفعہ ایک باپ...."

"ابے، یہ ہارون رشید کا کیا ذکر چھیڑ دیا تو نے۔" ابا بھنا گئے تھے۔ "مجھے اس سے کیا دلچسپی۔ تو آج کی بات کر۔"

"ابا، میں نے تم کو ایک غلط جگہ دیکھا ہے۔"

"ابے پورے محلہ میں صرف ایک ہی غلط جگہ ہے۔ درخت کے نیچے۔ پورے محلے کا کچرا وہیں پھینکا جاتا ہے۔ توفیق ہی نہیں ہوتی سالوں کو کہ کچرا ہی صاف کروادیں۔"

"ابا، میں درخت کے نیچے والے کچرے کی بات نہیں کررہا ہوں۔ کسی اور کچرے کی بات کررہا ہوں۔"

"صاف صاف کیوں نہیں بتاتا۔"

"ابا۔ میں نے تم کو نیلم پری کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔" میں نے صاف صاف بتادیا۔

ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ پھر دھیرے سے بولے۔ "ہاں بھئی، میں اسے نماز کی تلقین کرنے گیا تھا۔"

"نماز کی تلقین۔" میں نے حیران ہوکر ابا کی طرف دیکھا۔ "تم نماز کی تلقین کرنے چلے گئے۔"

"ابے یہ تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کو تلقین کرتا رہے۔"

"لیکن تم نے تو آج تک خود نماز نہیں پڑھی ہوگی۔"

"وہ بات اور ہے۔ خدا معاف کرنے والا ہے۔ کم ازکم نماز کی تلقین تو کرسکتا ہوں نا، یا اس پر بھی پابندی ہے۔ بتا۔"

اب ایسے ابا سے بحث کیا کرتا۔ اس لیے خاموش ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ شاید ابا کو کچھ لحاظ آجائے اور وہ اس مذاکرے کے بعد نیلم پری کے یہاں جانا چھوڑ دیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ابا وہاں جاتے رہے اور منان لنگڑا مجھے رپورٹ پہنچاتا رہا۔

ایک دن میں منان لنگڑے ہی سے الجھ گیا۔ "ایک بات بتا، باپ کس کا ہے، تیرا یا میرا۔"

"ظاہر ہے تیرا ہے۔"

"تو پھر تجھے کس بات کی تکلیف ہورہی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ جارہا ہے تو جانے دے۔"

"یار، یہ تو سوچ تیرے ابا بدنام ہورہے ہیں۔ کم ازکم یہ تو پوچھ کہ وہ وہاں جاتے کیوں ہیں۔"

میں نے اس بار دوٹوک اور ناراض لہجے میں ابا سے دریافت کیا۔ "ابا، آخر تم وہاں جاتے کیوں ہو۔ کیا لالچ ہے تمہیں۔"

ابا کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ پھر دھیرے سے بولے۔ "بیٹا، میرا خیال ہے کہ اب میں تجھے سچ بتا ہی دوں۔"

"تو بتادو نا۔"

"میں اسے کلاسیکل سکھانے کے لیے جاتا ہوں۔" ابا نے بتایا۔

میرے لیے یہ اطلاع نماز کی تلقین والی اطلاع سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔ "کیا کہہ رہے ہو ابا۔ تم اسے کلاسیکل سکھانے جاتے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کلاسیکل کیا چیز ہوتی ہے۔"

"ابے معلوم کیوں نہیں ہے۔ خیال گانے والے گھرانے سے تعلق ہے میرا۔" ابا نے بتایا۔ "میں ایک زمانے میں محفلوں میں گایا کرتا تھا۔"

"اور یہ کون سا زمانہ تھا؟"

"شادی سے پہلے کا۔"

"لیکن یہ بات تو میں پہلی بار سن رہا ہوں۔"

"ابے کیا کیا سنے گا۔"

"خدا کے لیے ابا! کیوں تماشا بن رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"ابے تجھے اپنے باپ کی صلاحیتوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ باہر والے جانتے ہیں۔ اس لیے ان لوگوں نے مجھے استاد رکھ لیا ہے۔ استاد جی کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھ جاتی ہیں۔"

"بس کرو ابا، بس کرو۔" میں بھنا کر رہ گیا۔ "اب تمہارا کوئی علاج نہیں ہے۔"

بہت غصہ آرہا تھا مجھے۔ لیکن میں اپنے ابا کے سامنے بے بس ہوکر رہ جاتا تھا۔ لیکن یہ نیلم پری والا معاملہ ایسا تھا کہ ابا کو یوں ہی چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک دن زبردستی نیلم پری کے گھر میں گھس کر ابا کو وہاں سے اٹھا لاؤں گا۔ کیونکہ اب معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا تھا۔ منان لنگڑے نے زندگی اور عذاب کردی تھی۔ وہ کم بخت اب ہر وقت ابا کے حوالے سے طنز کرتا رہتا تھا۔

ایک شام میں نیلم پری کے گھر میں داخل ہو ہی گیا۔ میری قسمت نے اس طرح ساتھ دیا تھا کہ گلی والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میں بے جھجک داخل ہوگیا تھا۔ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ ابا اس وقت بھی اندر ہی بیٹھے ہیں۔

پہلا کمرا خالی تھا۔ البتہ دوسرے کمرے سے کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے وہ آواز پہچان لی۔ وہ نیلم پری کی ماں کی آواز تھی۔ "شرم کر بڈھے، تو نے میری بے بی کا وقت برباد کیا۔ تجھے تو کلاسیکل کی ہوا بھی نہیں لگی ہے اور دعویٰ کرتا تھا کہ تو بہت بڑا استاد ہے۔"

"دیکھو، کچھ موقع اور دے دو۔ میں نیلم کو خیال اور ٹھمری دونوں سکھادوں گا۔" یہ ابا کی آواز تھی۔

"ابے تو یہاں سے جاتا ہے یا کچھ کھا کے جائے گا۔" اس کی ماں دہاڑ رہی تھی۔

"اب میرا اندر جانا بے کار تھا۔ میں جس کام سے آیا تھا وہ کام تو خود بخود ہی ہورہا تھا۔ اس لیے میں جس خاموشی

سے اندر گیا تھا، اسی خاموشی سے باہر آ گیا۔
شام کے وقت ابا کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ ”کیا ہوا ابا، خیر تو ہے۔ کچھ اداس اداس دکھائی دے رہے ہو۔“
”آج تیری ماں بہت یاد آ رہی ہے۔“ ابا نے ایک گہری سانس لی۔
”کون سی والی ماں۔“
”ابے کیا پاگل ہو گیا ہے۔“ ابا غصے سے بولے۔ ”کتنی مائیں تھیں تیری۔ ساری زندگی ایک ہی پر گزارہ کر لیا تو اب طعنے دے رہا ہے کہ کون سی والی ماں۔“
”اچھا ابا، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم یہ بتاؤ، تم وہاں تو نہیں جاتے۔“
”کہاں۔“
”ارے وہی نیلم پری کے یہاں۔ جس کو کلاسیکل سکھانے جاتے تھے۔“
”ابے توبہ کر۔ وہ تو بہت ہی کند ذہن نکلی۔ اسے تو معلوم ہی نہیں ہے کہ کلاسیکل کیا ہوتا ہے۔ کم بخت نے خوامخواہ میرا وقت ضائع کیا۔“
میں خاموش ہو گیا۔ ابا نے اپنے نکالے جانے کا سارا ملبا ان ہی لوگوں پر ڈال دیا تھا۔
میرا خیال تھا کہ اس حادثے کے بعد ابا سدھر جائیں گے۔ لیکن ایک دن منان لنگڑے نے ایک اور خبر سنا دی۔ ”ابے، تیرے ابا اس بار کسی اور کے چکر میں پڑ گئے ہیں۔“
”ایک بات بتا، کیا تو نے میرے ابا کا ٹھیکا لے رکھا ہے کہ ہر وقت ان کی جاسوسی کرتا رہتا ہے۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔
”یار، جب ایسی انوکھی چیزیں دیکھنے کو ملیں گی تو حیرت تو ہو گی نا۔“
”چل بتا، اس بار کیا ہوا ہے؟“
”ابے، تیرے ابا نے ایک اور جوان لڑکی کا گھر دیکھ لیا ہے۔“ اس نے بتایا۔
”کون ہے وہ لڑکی؟“
”ٹھمک ٹھمک کر چلتی ہے۔“ اس نے بتایا۔
”ابے ٹھمکنے کو چھوڑ، یہ بتا وہ ہے کون؟“
”یہ کل پتا کر کے بتا دوں گا۔“
دوسرے ہی دن اس نے اس لڑکی کا پورا جغرافیہ اور تاریخ میرے سامنے لا کر رکھ دی تھی۔ ”یار، اس لڑکی کا نام شاہدہ ہے۔ وہ ایک دھوبی کی بیٹی ہے۔ بہت زبردست چیز ہے۔ جوان اور خوبصورت۔ یار، تیرے ابا لڑکیاں کہاں سے پکڑ لیتے ہیں۔“
”اچھا بس خاموش ہو جا۔ ابا کی شان میں گستاخی مت کرنا۔“
”حالانکہ تو خود دل ہی دل میں اپنے ابا کو برا بھلا کہتا ہوگا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
اب میں ایسی بے ہودہ بات کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ حالانکہ یہ سچ تھا۔ ایک دن میں نے خود ابا کو اس شاہدہ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
میں ابا کے گلے پڑ گیا۔ ”ابا، یہ کیا چکر ہے۔ تم اب تھو دھوبی کے یہاں جانے لگے ہو۔“
ابا کچھ دیر کے لیے سناٹے میں رہ گئے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”ابے، کیا تو یہ نہیں جانتا کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔“
”تو کیا تم اس کو اپنی ماں سمجھ کر ملتے ہو۔“
”ابے کیا پاگل ہو گیا ہے۔“ ابا ناراض ہو گئے تھے۔ ”یہ تو میں تیرے لیے جنت کے راستے ڈھونڈ رہا ہوں۔“
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
”ابے، میں اس سے شادی کرنے والا ہوں۔“ ابا نے بتایا۔
”ابا کیا ہو گیا ہے۔ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ اگر شادی ہی کرنی ہے تو کسی بیوہ سے کیوں نہیں کر لیتے۔“
”ابے، یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ جس کی بیوی مر جائے وہ صرف بیوہ ہی سے شادی کرے۔ اگر اتفاق سے کوئی کنواری مل جاتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔“
”ابا ایک بات بتاؤ، اس سے تمہاری جان پہچان کیسے ہوئی؟“
”بیٹے، میں نے تو اس سے شادی کا فیصلہ اسی دن کر لیا تھا جس دن اس نے میری قمیص کے سارے بٹن توڑ دیے تھے۔ یہ ادا مجھے اچھی لگی تھی۔“
ابا، اگر یہ کسی قسم کی کوئی ادا ہے تو پھر میں تمہاری شادی ایسی عورت سے کروا دوں گا جو رات دن تمہاری قمیصوں کے بٹن توڑتی رہے گی۔“
”بیٹے، وہ بٹن تو توڑ دے گی۔ لیکن بٹن توڑنے والے ایسے نازک ہاتھ کہاں سے لائے گی۔“ ابا نے ایک گہری سانس لی۔
”ابا، تمہاری بیماری کا اب کوئی علاج نہیں ہے۔“

”تو پھر چھوڑ دے میرے حال پر۔“ ابا نے کہا۔
لیکن میں ابا کو ان کے حال پر کیسے چھوڑ دیتا۔ میں نے اس لڑکی کی جاسوسی شروع کروا دی۔ یہ جاسوسی منان لنگڑا ہی کر رہا تھا۔ اس میں چاہے اور ہزار برائیاں ہوں لیکن ایک بات یہ تھی کہ خبریں بہت کھری لایا کرتا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ”یار، وہ لڑکی ایک نمبر کی بدمعاش ہے۔ اس نے تیرے ابا جیسے اور کئی بڈھوں کو پھانس رکھا ہے۔ اور ہر ایک سے شادی کے وعدے کر رکھے ہیں۔“
”سوال یہ ہے کہ آخر میرے ابا سے وہ کیوں شادی کی بات کر رہی ہے۔ کیونکہ ابا کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔“
”ابے، میں اس سوال کا جواب بھی لے آیا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔
”بتا جلدی۔“
”تیرے ابا نے ان لوگوں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میر پور خاص میں ان کے دو آموں کے اور ایک امرود کا باغ ہے۔“
میں چلبلا کر رہ گیا۔ ابا نے تو کبھی آموں کا باغ دیکھا ہی نہیں ہوگا اور اب باغات کے مالک بھی ہو گئے تھے۔ میں نے جب ابا سے پوچھا تو ان کا جواب سن کر چکر سا آ گیا۔ ”ابے ہاں، بتایا تھا۔ لڑکے کو اپنا رشتہ پکا کرنے کے لیے تھوڑا بہت تو جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔“
میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ ابا کسی پرانی فلم کا کوئی رومانس بھرا گانا گاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔
ایک دن ابا نے خود بتایا۔ ”بیٹا، بات یہ ہے کہ اب میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں رہا۔ اس لیے میں نے سوچا ہے کہ شادی کر ہی لوں۔“
”یہ کیا بات ہوئی ابا، جب زندگی کا بھروسا نہیں رہا تو اللہ اللہ کرو۔ یہ شادی کیوں کر رہے ہو۔“
”ابے، یہ معرفت کی باتیں ہیں جس کو تو نہیں سمجھے گا۔“ انہوں نے کہا۔ ”اب دیکھ لینا۔ میں اسی ہفتے اسے تیری ماں بنا کر لے آؤں گا۔ پھر تو اس کی خدمت کرتے رہنا۔“
چار دنوں کے بعد منان لنگڑا پھر میرے پاس آ گیا۔ وہ اس بار بھی ایک خبر لے کر آیا تھا۔ ”پیارے، اب میں تیرے لیے بہت خطرناک خبریں لے کر آیا ہوں۔“
”اس میں کون سی نئی بات ہے۔ تو ہمیشہ ایسی ہی خبریں لے کر آتا ہے۔“
”لیکن اس بار جو خبریں ہیں، وہ بہت خطرناک ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”پہلی خبر تو یہ ہے کہ شاہدہ کا خون ہو گیا ہے۔“
”کیا...!“ میں اچھل پڑا تھا۔ ”خون ہو گیا ہے، کیا مطلب ہے تیرا۔ کسی نے اس کا مرڈر کر دیا ہے۔“
”ہاں پیارے، کسی نے نہیں بلکہ تیرے باپ نے۔ پولیس انہیں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“
میرے خدا! میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ منان لنگڑا واقعی خطرناک خبریں لایا تھا۔
”منان، میرے ساتھ ذرا تھانے چل۔“ میں باقاعدہ کانپنے لگا تھا۔ ”ابا سے ملنا ہے مجھے۔“
”چل یار، دوست ایسے ہی موقعوں پر کام آتے ہیں۔“
ہم دونوں تھانے پہنچ گئے۔ تھانے دار بہت ہی خوفناک قسم کا انسان تھا۔ ”ہاں بھئی، کون ہے تو، کس سے ملنے آیا ہے؟“
”میرا نام شکیل ہے، میں ابا سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔
”کون ابا، وہ بوڑھا عاشق۔“
”تھانے دار صاحب، آپ تو خود سمجھدار آدمی ہیں۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”آپ تو بندے کو دیکھتے ہی سب جان لیتے ہیں۔ میرا باپ عاشق تو ہو سکتا ہے، قاتل نہیں ہو سکتا۔“
”اوئے ہوئے، کس طرح باپ کی طرفداری کر رہا ہے۔ تیرا باپ موقع سے گرفتار ہوا ہے۔ جوان لڑکی کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔“
”تھانے دار صاحب، پلیز ذرا ابا سے ملوا دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔“
”جا ملاقات کر لے اپنے انوکھے باپ سے۔“
ابا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر

جلدی سے میرے پاس آگئے۔ ان سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔
"بیٹا، بہت مارا ہے کم بختوں نے۔" ابا فریاد کرنے لگے۔ "میرے بڑھاپے کا بھی خیال نہیں کیا۔ جب میں نے دوہائی دی تو کہنے لگے عشق کے وقت بڑھاپا کہاں چلا گیا تھا۔"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے ابا۔"
"اب تو آگ مت لگا۔ ویسے ہی پورے بدن سے جل رہا ہوں۔"
"بتاؤ تو سہی، ہوا کیا۔ تم نے کیوں مار دیا اس کو؟"
"بیٹے، میں نے اسے نہیں مارا ہے۔" ابا بلکنے لگے تھے۔ "پتا نہیں کون کم بخت اسے مار کر چلا گیا اور ان لوگوں نے سارا الزام میرے سر دھر دیا۔"
"تفصیل سے بتاؤ، کیا ہوا تھا؟"
"بیٹا، میں تجھے بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں کوئی برائی نہیں تھی۔ میں تو بس اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں مٹھائی لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔"
"تم یقیناً شادی کی بات کرنے گئے ہوگے۔"
"یہ بتا یہ کہانی کس کی ہے، تیری یا میری؟"
"ظاہر ہے ابا، تمہاری ہے۔"
"تو پھر مجھے بتانے دے۔" ابا نے کہا۔ "پھر یہ ہوا کہ اس کے گھر والے بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور وہ لڑکی بھی آگئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے رشتے کی بات چھیڑ دی جس پر وہ سب بہت ناراض ہوگئے۔ وہ لڑکی بھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی۔"
"اور انہوں نے رشتے سے انکار کر دیا ہوگا۔"
"پھر وہی بات، ابے یہ کہانی تیری ہے یا میری۔"
"ابا، تمہاری کہانی ہے۔"
"تو پھر اچھی طرح بتانے دے۔ بیچ میں کیوں بولنے لگتا ہے۔"
"چلو اب نہیں بولوں گا۔ تم اپنی کہانی پوری کر لو۔"
"تو پھر بیٹا ہوا یہ کہ مجھے نیند آگئی اور میں ذرا سی دیر کے لیے سو گیا۔"
"کہاں سو گئے۔ اسی گھر میں۔"
"ہاں، اسی گھر میں۔" ابا نے بتایا۔ "وہ لوگ بک بک کر کے چلے گئے تھے اور جاتے جاتے مجھے بول گئے تھے کہ میں ان کے گھر سے چلا جاؤں۔ پھر بجائے جانے کے مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ پھر ان ہی لوگوں کی چیخ و پکار سے آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ لڑکی شاہدہ میرے پاس ہی مری پڑی تھی۔ کسی نے اس کی گردن کاٹ دی تھی بیٹا۔ ایک بڑا سا خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ نہ جانے کہاں سے آگیا تھا کم بخت۔"
"پھر اس کے بعد تم نے کیا کیا۔"
"ابے پھر مجھے کیا کرنا تھا۔ جو کچھ کرنا تھا خود انہوں نے کیا۔ پہلے تو سب نے مل کر میری ٹھکائی کی۔ پھر پولیس کے حوالے کر دیا اور پولیس نے بھی ٹھکائی کی۔ بیٹے، میں تو بس ٹھکائی کا ہو کر رہ گیا ہوں۔"
ابا واقعی رنگے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔ بہت ہی پکا کیس تھا ان کا۔ کون ان کی بات پر یقین کرتا۔ وہ لڑکی کے پاس سے پکڑے گئے تھے۔ خنجر ان کے ہاتھ میں تھا اور لڑکی کا قتل ہو چکا تھا۔ پولیس کو اور کیا چاہیے تھا۔ سارے ثبوت سامنے تھے۔
"بیٹے، یہاں سے نکالنے کی کوئی ترکیب کر۔" ابا نے کہا۔ "ورنہ بے موت مارا جاؤں گا۔"
"بتاؤ ابا کیا کروں۔"
کوئی تگڑا سا وکیل کر لے۔ ورنہ تیرا باپ پھانسی چڑھ جائے گا اور تو یتیم ہو کر در در بھیک مانگتا پھرے گا۔ کیونکہ ہمارے ملک کے یتیم صرف بھیک ہی مانگتے ہیں۔"
"ابا وکیل کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔"
"اس کی فکر مت کر۔ اتنے پیسے ہیں میرے پاس۔" پھر ابا نے بتا دیا کہ انہوں نے برے وقتوں کے لیے گھر کے فلاں کونے میں پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں۔
میں نے ایک وکیل سے رابطہ کیا۔ وکیل ایماندار اور محنتی آدمی تھا۔
"لگتا ہے تمہارے بے وقوف باپ کو باقاعدہ سازش کر کے پھانسا گیا ہے۔" اس نے کیس کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کیس مکمل اور مضبوط ہے۔ خنجر پر تمہارے باپ کی انگلیوں کے نشانات ہیں۔ خود وہ لاش کے پاس ہی پڑا ہوا دکھائی دیا ہے۔"
"لیکن وکیل صاحب، خود سوچیں، کوئی شخص کسی کا مرڈر کرنے کے بعد لاش کے پاس کیوں سو جائے گا۔"
"یہ ایک نفسیاتی مرض بھی ہوتا ہے۔" وکیل نے بتایا۔ "دنیا میں ایسے بے شمار قاتل ہیں، جنہیں مقتول کے پاس ہی سے نیند کی حالت میں پکڑا گیا ہے۔ اسی لیے عدالت کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابا بری طرح پھنس گئے۔"

"ہاں۔ ابھی تو ایسا ہی ہے لیکن نہ جانے کیوں تمہارے ابا مجھے قاتل نہیں لگتے۔" وکیل نے کہا۔ "وہ ٹھرکی تو ہو سکتے ہیں، بک بک کرنے والے بھی ہو سکتے ہیں، لیکن قاتل نہیں ہو سکتے۔"
"تو پھر بتائیں وکیل صاحب، ان کو چھڑانے کے لیے کیا کیا جائے؟"
"ثبوت۔ ان کے حق میں ثبوت کی ضرورت ہے۔ اور یہ ثبوت تم مہیا کرو گے۔ کیس میں لڑوں گا لیکن ثبوت تم لاؤ گے۔"
"میں کہاں سے لاؤں گا ثبوت۔"
"تم تھو دھوبی کے گھر کی نگرانی کرو۔" وکیل نے بتایا۔ "دیکھو کہ وہاں کون آتا جاتا ہے۔ ان کے پچھلے ریکارڈ معلوم کرو۔"
"کیا یہ کام پولیس نہیں کرے گی۔"
"نہیں۔ پولیس نہیں کرے گی۔" وکیل نے کہا۔ "کیونکہ پولیس نے تو اپنے طور پر تمہارے ابا کو قاتل قرار دے ہی دیا ہے۔ وہ اب کیوں کوشش کرے گی۔"
"آپ کی بات سمجھ میں آگئی وکیل صاحب۔"
"تو بس جاؤ، شروع ہو جاؤ۔"
میں گھر آگیا۔ ابا کو پولیس والوں نے دو دنوں کے ریمانڈ پر رکھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ریمانڈ میں کیا صورتِ حال ہوتی ہے۔ بے چارے ابا کا تو کچومر ہی ہو گیا ہوگا۔
منان لنگڑا اس وقت بھی میرے کام آرہا تھا۔ "یار، تم فکر مت کرو۔ باپ جیسا بھی ہو۔ وہ پھنس جائے تو دکھ ہوتا ہی ہے۔ میں اس کم بخت دھوبی کے پورے خاندان کو کھدیڑ کر رکھ دوں گا۔"
چار دنوں کے بعد اس نے بتایا۔ "یار، ایک بندہ نگاہوں میں تو آگیا ہے۔ اس کا اس گھر میں آنا جانا ہے۔ وہ صورت سے بھی مشکوک ہی لگتا ہے۔"
"کون ہے وہ؟"
"فرقان نام ہے اس کا۔ موٹر مکینک ہے۔" اس نے بتایا۔
"ان لوگوں سے کیا تعلق ہے۔ اور اگر وہی شاہدہ کا قاتل ہے تو اس نے شاہدہ کو قتل کیوں کیا؟"
"یہی بات تو سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ لیکن خیر اس کا بھی پتا چل جائے گا۔"
اس دوران میں ابا کو دلاسے دیتا رہا تھا۔ تین دنوں کے بعد منان لنگڑے نے بہت زبردست خبر سنا دی۔ "یار، میں نہیں جانتا کہ جو کچھ میں بتانے والا ہوں اس کا کوئی تعلق شاہدہ کے قتل سے ہے یا نہیں۔"
"تو اس کی فکر مت کر۔ یہ دیکھنا وکیل کا کام ہے۔ تُو تو اپنی جاسوسی بتا۔"
"یار، تو نے شاہدہ کی ماں یعنی تھو کی بیوی کو دیکھا ہے۔"
"نہیں تو، میں نے تو نہیں دیکھا۔"
"ایک نظر دیکھ لے۔ کیا زبردست چیز ہے۔" منان لنگڑے نے بتایا۔ "مرنے والی شاہدہ تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی اور وہ شاہدہ کی سوتیلی ماں ہے۔"
"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اور شاہدہ کی اپنی ماں کہاں ہے؟"

حضرت ثابت بن قیسؓ جلیل القدر صحابی تھے۔ ابو محمد کنیت اور خطیب رسول اللہ لقب تھا۔ قبیلہ خزرج سے تھے۔ آپ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کئی غزوات میں آنحضورؐ کی معیت میں لڑے۔ حضرت جویریہؓ غزوہ مریسیع میں اسیر ہو کر ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں جنہیں آنحضرتؐ نے رقم دے کر ثابت بن قیس سے آزاد کرا لیا اور عقد میں لے لیا۔ 9ھ میں بنو تمیم کے وفد کے سامنے آپ نے آنحضورؐ کے حکم سے جو جوابی خطبہ دیا اسے سن کر بنو تمیم دنگ رہ گئے اور آپ کی فصاحت کے معترف ہوئے۔ 11ھ میں جب طلیحہ پر فوج کشی کی گئی تو انصار آپ ہی کی قیادت میں تھے۔ جب وہ آیت جس میں مسلمانوں کو رسول اللہؐ کے سامنے اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا گیا نازل ہوئی، تو حضرت ثابت بن قیسؓ کو فکر دامنگیر ہوئی اور اپنے گھر میں سر جھکائے بیٹھے رہے۔ صحابہؓ نے دریافت کیا تو کہنے لگے۔ میں اکثر آنحضورؐ کے سامنے اونچی آواز سے بولتا رہا اس باعث مجھے ضرور جہنم میں جانا پڑے گا۔" جب آنحضورؐ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا "خدا کی قسم ثابت جہنمی نہیں۔ بلکہ میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔" آپؓ 12ھ میں مسیلمہ کذاب سے مقابلہ کے دوران شہید ہوئے۔

مرسلہ: زاہد ہمدانی، لاہور

''وہ بے چاری تو بہت پہلے ہی مر چکی ہے۔ اس کی موت کے بعد ہی نتھو نے اس عورت سے شادی کی ہے۔ اور کام کی بات یہ ہے کہ اس موٹر مکینک اور اس عورت میں بہت دوستی ہے۔ وہ مکینک اس وقت نتھو کے گھر آتا ہے جب وہ عورت اکیلی ہو اور نتھو کام پر گیا ہوا ہو۔''

''میرے یار، یہ تو نے بہت زبردست بات معلوم کر لی ہے۔ میں آج ہی وکیل کو جا کر بتاتا ہوں۔''

وکیل بھی یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ ''ہاں، یہ بات ہوئی نا۔ یہ اس کیس کا نیا اینگل سامنے آیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر اس آدمی نے مرڈر کیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہوگی۔''

میں ایک بار پھر ابا سے جیل میں جا کر ملا۔ ابا کو جیل منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں نے ابا سے پوچھا۔ ''ابا، یہ بتاؤ تم فرقان کو جانتے ہو۔''

''کون فرقان؟''

''موٹر مکینک۔ جو نتھو کے یہاں آتا جاتا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں جانتا ہوں اس کو۔'' ابا نے کہا۔ ''لیکن وہ تو میرا بڑا ہمدرد ہے۔ مجھ سے کہتا تھا کہ بڑے میاں تم فکر مت کرو۔ میں شاہدہ سے تمہاری شادی کرا کے رہوں گا۔''

''تم یہ بتاؤ، جس وقت یہ کہانی ہوئی، کیا اس وقت وہ بھی موجود تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ابے، وہ کیوں نہیں ہوگا۔ اسی کی شہ پر تو میں نے رشتے کی بات ڈالی تھی۔'' ابا نے بتایا۔

یہاں تک بات آ گئی تھی۔ لیکن سوال پھر وہی تھا کہ شاہدہ کے مرڈر میں اس کا ہاتھ کیسے تلاش کیا جائے۔ اس کے خلاف تو کوئی ثبوت ہی نہیں تھا۔

میں نے اپنے منان لنگڑے ہی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''دیکھ بھائی، میں تو ایک بات جانتا ہوں۔ تو اگر قانونی چکروں میں پڑا رہے گا تو وہ شخص زندگی بھر قبول نہیں کرے گا۔''

''تو پھر کیا کیا جائے۔''

''اس سالے پر سختی کرو۔ ڈراؤ دھمکاؤ۔ زبردستی بیان لو اس سے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔''

منان لنگڑے کی یہ بات دل کو لگی تھی... میں نے اسی سے کہا۔ ''یار، ذرا تو ہی اس کا پورا جغرافیہ معلوم کر کے بتا دے۔ کہاں رہتا ہے، اس کے ساتھ اور کتنے لوگ رہتے ہیں۔ کس وقت گھر سے نکلتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''کل ہی لو استاد! اس کا پورا جغرافیہ تمہارے سامنے رکھ دوں گا۔''

منان لنگڑے نے جو جغرافیہ میرے سامنے لا کر رکھا وہ کچھ یوں ہے۔ ''اکیلا آدمی ہے۔ ایک چھوٹی سی ورکشاپ ہے اس کی۔ وہی اس کا گھر بھی ہے۔ وہیں سویا کرتا ہے۔ سامنے کے ہوٹل سے کھانا کھاتا ہے۔ یا تو اپنی ورکشاپ میں رہتا ہے یا نتھو دھوبی کے یہاں جاتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات میں اکیلا ہی رہتا ہوگا۔''

''اور کیا۔ جب چاہو چھاپ لو اس کو۔''

اور میں نے اس رات اسے چھاپ لیا۔ منان لنگڑے نے ایک بار پھر میری مدد کی۔ وہ نہ جانے کہاں سے کسی پولیس انسپکٹر کی وردی لے آیا۔ ''بس استاد! یہ پہن کر چلے جاؤ اس کے سامنے اور ڈائریکٹ اس پر الزام لگا دو۔ پھر دیکھو، کیا کہتا ہے۔''

''نہیں یار، وردی ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پولیس والا سادہ لباس میں بھی ہوتا ہے نا۔ تو میں خود کو یہی ظاہر کروں گا۔''

''ایک بات اور سن لو، وہ ہاتھ پیروں کا مضبوط ہے۔'' منان نے بتایا۔ ''ذرا سنبھل کر ہاتھ ڈالنا۔''

''ابے ہم دو ہوں گے۔ وہ اکیلا ہوگا۔''

''دوسرا کون ہوگا۔''

''تو... اور کون۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بھائی... مجھے تو معاف رکھ۔ میں ایسے معاملات سے بہت دور رہتا ہوں۔ ویسے زبانی جمع خرچ چاہے جتنا کرا لو۔ اس کے علاوہ مجھے جتنی مدد کرنی تھی، وہ میں کر ہی چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے دوست، تم نے واقعی میرا بہت ساتھ دے دیا ہے۔ اب تم مجھے اس کی ورکشاپ دکھا دو۔''

منان نے دور سے اس کی ورکشاپ دکھا دی تھی۔

میں نے اس قسم کی حرکت پہلے کبھی نہیں کی ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ ابا کا تھا۔ اسی لیے اپنی جان پر کھیل کر یہ حرکت کرنے جا رہا تھا۔

رات بارہ بجے کے بعد میں نے اس کی ورکشاپ کے دروازے پر دستک دے دی۔ اس وقت تک میرے ذہن میں کوئی واضح اسکیم نہیں تھی۔ میں نے دوبارہ دستک دی تو فرقان کی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بے۔''

''پولیس۔'' میں نے اپنی آواز میں بھاری پن پیدا

کرلیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چھوٹے قد اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ جو بڑی حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”کہاں ہے پولیس؟“ اس نے غراتے ہوئے پوچھا۔

”میں سی آئی اے سینٹر سے آیا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں؟“

”تم نے نتھو دھوبی کی لڑکی کا خون کیا ہے۔“ میں نے ڈائریکٹ یہ بات کہہ دی تھی۔

اتنا سنتے ہی اس نے اچانک مجھے دھکا دیا اور باہر بھاگ نکلنے کی کوشش کی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں کچھ اس طرح گرا کہ اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ اور جب اس نے مجھے پھلانگ کر بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اپنی ٹانگ اڑا دی۔

وہ الجھ کر بہت زور سے گرا تھا۔ وہ ایک مضبوط آدمی تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ وہ اگر اٹھ گیا تو پھر میری خیر نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اسے اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

قریب ہی لوہے کی ایک راڈ پڑی ہوئی تھی میں نے وہ راڈ اٹھا کر اس کی کمر پر رسید کردی۔ وہ بلبلا کر ڈکرانے لگا۔ میں نے دوسرا وار کیا۔ مجھ پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ ”بول، تو نے اس لڑکی کا خون کیا ہے۔ بول؟“

”ہاں، میں نے مارا تھا اس کو۔“ اس نے بالآخر اعتراف کر ہی لیا۔

میں نے راڈ مار مار کر اسے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہنے دیا تھا۔ اسے وہیں چھوڑ کر میں سیدھے وکیل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ”جناب، جلدی چلیں میرے ساتھ۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے اس لڑکی کے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

میں نے پوری کہانی سنادی۔ وکیل نے متعلقہ تھانے کے افراد کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ شخص اسی طرح فرش پر گرا ہوا ڈکرا رہا تھا۔

اس کے بیان کے مطابق اس کے تعلقات شاہدہ کی سوتیلی ماں سے تھے، جبکہ میرے ابا شاہدہ کے چکر میں وہاں جایا کرتے تھے۔

جس دن ابا اپنی شادی کا پیغام لے کر وہاں گئے تھے۔ اس دن شاہدہ نے فرقان اور اپنی سوتیلی ماں کو ایک ساتھ عجیب حالت میں دیکھ لیا تھا۔ لیکن اسے واویلا کرنے اور اپنے باپ کو بتانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ کیونکہ اسی وقت ابا اپنا رشتہ لے کر پہنچ گئے تھے اور سب ابا کے ساتھ الجھ گئے تھے۔

اور اسی وقت فرقان اور شاہدہ کی سوتیلی ماں کے ذہن میں یہ سازش آگئی کہ شاہدہ کو فوری طور پر راستے سے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ دونوں ہی جانتے تھے کہ شاہدہ موقع ملتے ہی اپنے باپ کو سب کچھ بتا دے گی۔ اسی لیے ان کے سازشی ذہنوں میں یہ اسکیم آگئی کہ شاہدہ کا قصہ بھی صاف ہوجائے اور اس کا الزام میرے ابا پر آجائے۔

ان دونوں نے ضد کرکے ابا کو چائے پلا دی تھی۔ انہوں نے ابا سے کہا تھا کہ رشتے کی ناراضی اپنی جگہ اور خاطرداری اپنی جگہ۔ ابا بھی جوش میں آکر وہیں بیٹھ گئے۔ شاید ان کے دل میں یہ بات بھی ہو کہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد شاہدہ کی ماں اس رشتے کے لیے راضی ہوجائے۔

دونوں کو چائے پلائی گئی تھی۔ یعنی شاہدہ کو اور ابا کو۔ نتھو معاملہ ختم کرکے اپنے کام پر واپس چلا گیا تھا۔ چائے میں بے ہوشی کی دوا ملی ہوئی تھی۔

چائے پی کر دونوں ہی اتنا غافل ہوگئے تھے پھر شاہدہ کا خون کرکے خنجر ابا کے ہاتھ میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی سب کو معلوم ہے کہ کس طرح دونوں نے واویلا کیا اور ابا مجرم قرار پاگئے۔

فرقان مکینک تو صاف نکل گیا تھا۔ خون کا الزام ابا پر آچکا تھا۔ لیکن منان لنگڑے کی محنت اور اس کی ترکیب کام آگئی تھی۔ میں نے اپنے ابا کو بچانے کے لیے ہمت کرڈالی تھی اور اصل قاتل کو پکڑ لیا تھا۔

لیکن اس پوری کہانی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ پہلو بہت اذیت ناک اور دردناک ہے۔ میں نے لوہے کی راڈ سے اس آدمی کی جو ٹھکائی کی تھی اس کے نتیجے میں وہ جاں بر نہیں ہوسکا تھا۔

نہ جانے اسکی کون سی ضرب لگ گئی تھی کہ ایک ہفتے بعد اس کا انتقال ہوگیا..... آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

جی ہاں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ابا تو باہر آگئے ہیں اور میں اندر ہوگیا ہوں۔ اور اب مجھ پر قتل کا مقدمہ چل رہا ہے۔

اشکِ ندامت

جناب اعلیٰ

سلام تہنیت!

میں صرف چند جماعتیں پڑھی ہوئی ہوں اس لیے ہوسکتا ہے اردو اتنی اچھی نہ ہو لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ میری داستان بھی قارئین تک پہنچے، امید ہے میری اس خواہش کو پورا کردیں گے۔

حیاتاں یار محمد

(جیکب آباد)

مجھے اپنے شوہر سے بہت محبت تھی اور میں اسے پوجنے کی حد تک چاہتی تھی۔ اس کا نام یار محمد لاشاری تھا۔ جبکہ میں اسے یارو کہہ کر پکارتی تھی۔ اس کی محبت نے مجھے انتہائی ضدی، خودسر، اور نفع ونقصان کے احساسات سے بے پروا بنادیا تھا اور یہی میری سچ بیانی کی بنیاد ہے۔

ہمارا گوٹھ ڈیرا سبھائی جیکب آباد کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ ہمارا گوٹھ بمشکل ڈیڑھ سو نفوس پر مشتمل ہے جہاں ایک پرائمری اسکول کے علاوہ ایک ہائی اسکول اور

بنیادی مرکز صحت کا ایک یونٹ بھی اپنے پیشہ ورانہ کاموں میں مصروف رہتا ہے۔ گوٹھ کے مکینوں میں زیادہ تر افراد وڈیروں کی زمینوں پر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں۔ یہاں تعلیم کا رجحان کم تھا اس وجہ سے مجھے فخر تھا کہ میرا شوہر یار محمد پورے گوٹھ میں چند ہی گنے چنے پڑھے لکھے لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس نے بارہ جماعتیں پڑھی تھیں۔ ہمارا گوٹھ چونکہ برسر اقتدار پارٹی کا ووٹ بینک تھا لہٰذا ایک دن اس پارٹی کا ایم پی اے دورے پر وہاں آیا تو یار محمد نے پرائمری ٹیچر کی نوکری کے لیے ایک عرضی لکھ کر وڈیرے حاجی خدا بخش کے ذریعے پیش کی تو وہ فوراً سفارش کے لیے منظور کرلی گئی، اس طرح میرا شوہر ایک استاد کی حیثیت سے گاؤں کے اکلوتے پرائمری اسکول میں پڑھانے لگا تھا۔

وہ جولائی کی تپتی سلگتی دوپہر تھی۔ کچے مگر کشادہ کمروں کی منڈیروں پر چڑیاں اپنی چونچیں کھولے ہانپ رہی تھیں۔ یارو کے آنے کا وقت ہو چلا تھا اس لیے میں اس کے آنے سے پہلے ہی سارا کام نمٹا کر روٹیاں پکانے بیٹھ جاتی تھی تاکہ اسے آتے ہی گرم گرم کھانا ملے۔

تھوڑی دیر میں یار محمد آگیا۔ اس کا چہرہ خلافِ معمول بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسکول سے آکر چپ چاپ اندر جا کر چارپائی پر نیم دراز ہوگیا۔

وہ خاصا الجھا الجھا نظر آرہا تھا۔ جب میں اس کے لیے ساگ پلی اور دیسی گھی میں چپڑی روٹیاں لے کر گئی تو اس نے وہ بڑی بے دلی کے ساتھ کھائیں۔ حالانکہ میں نے اس کی پسند کا کھانا بنایا تھا۔

مجھے کچھ تعجب تو ہوا مگر میں نے اس وقت اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

جب ہم گھر کے کشادہ صحن میں تاروں بھرے آسمان تلے سونے کے لیے لیٹے تو میں اسے گوگو کی کیفیت میں پا کر نرم لہجے میں بولی۔ "سائیں! کیا بات ہے؟ کوئی فکر پریشانی ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموش اور چپ چاپ بہ دستور کہیں کھویا کھویا سا رہا۔ پھر جب میں نے اپنا سوال۔۔۔۔۔ دہرایا تو وہ خلافِ توقع کسی قدر بیزاری سے بولا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔۔ حیاتاں۔۔۔۔۔! تو چپ کر کے سو جا۔۔۔۔۔ تنگ نہ کر مجھے۔"

میں نے چپ سادھ لی، البتہ اس کے روکھے روکھے لہجے سے میں اندر ہی اندر کلس کر رہ گئی تھی۔ یہی وہ موقع جب میرے اندر کی عورت نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کردی تھی۔ قدرت نے شاید عورت کو یہ حس خصوصی طور پر بخشی ہے کہ وہ فوراً اپنے شوہر کے ڈھکے چھپے رویے میں اچانک آنے والی تبدیلی کو بھی بھانپ لیتی ہے۔ چند ثانیے بعد وہ خود ہی بولا۔ "اڑی حیاتاں، ایک بات تو بتا۔"

"جی سائیں؟" میں ایک دم پلٹی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ بتا۔۔ تجھے بھلا مجھ سے کتنی محبت ہے؟"

"سائیں! تم تو میرے سر کا سائیں، میرے دل اور ہو، محبت تو بڑی شے ہے۔ مجھے تو تمہارے پیروں کی خاک بھی مل جائے تو میں اس کا سرمہ بنا کر اپنی آنکھوں میں لگاؤں۔"

پہلے پہل تو وہ میرے اس جواب پر لہک لہک اٹھتا تھا مگر آج جانے کیوں وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ "دیکھ حیاتاں! سیدھی بات کر۔۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔ "میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تجھے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔"

میں ہمہ تن گوش بر آواز ہوگئی۔

"وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔ دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی بات سن کر میں دھک سے رہ گئی تھی۔ میرے منہ سے ایک لفظ تک برآمد نہ ہو سکا۔ میرے پورے وجود میں جیسے کسی نے چنگاریاں بھر دیں۔

"مگر حیاتاں! میں تم سے اسی طرح محبت کرتا رہوں گا۔ تم یقین کرو کہ دوسری شادی محض میری مجبوری ہے۔" وہ میرے اندر کے جوار بھاٹے کا اندازہ لگاتے ہوئے بڑی رسان سے بولا۔

"کیسی مجبوری سائیں؟ کیا مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی یا میری محبت میں کوئی کمی تم نے محسوس کی ہے؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی بات سن کر بہت دکھ ہوا تھا اور میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔ میں حیران بھی تھی کہ آخر یہ بیٹھے بیٹھے یار محمد کو دوسری شادی کا شوق کیوں چڑھ گیا تھا۔ مجھ میں کس بات کی کمی نہ تھی۔ گوٹھ کی حسین لڑکیوں میں میرا شمار ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تین پیارے پیارے بچے بھی دیے تھے۔ غصہ تو مجھے اس "چنڈال" پر آرہا تھا، جس نے بڑی مکاری سے میرے محبوب شوہر کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا اور ہنستی بستی زندگی پر شب خون مارا تھا۔

"دیکھ حیاتاں۔۔۔! " وہ کہنے لگا۔ "مول۔۔ میری خالہ زاد ہے۔ جس سے بچپن میں منگنی طے ہو چکی تھی لیکن پھر بعض خاندانی وجوہ کی بنا پر میری اس سے شادی نہ ہو سکی اور تجھ سے ہوگئی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ موَل بے چاری بیٹھی رہ گئی ہے۔ تجھے پتا ہی ہے کہ اگر گوٹھ میں کسی لڑکی کی ایک بار منگنی ٹوٹ جائے تو اسے کوئی نہیں بیاہتا۔ اب چونکہ مجھے پتا چلا کہ قصور تو خود ہمارے بڑوں کا ہی تھا لہٰذا میرا ضمیر اب یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی سزا بے قصور موَل بھگتے۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگیا۔

میں عورت ذات تھی۔ رقابت کا جذبہ رکھتی تھی۔ مگر کیا کہتی، لب سی کر رہ گئی۔

پھر یوں ہوا۔ موَل۔۔ میرے شوہر یار محمد کی دلہن بن کر آگئی۔

مجھے میری سہیلیاں اکثر کہتی تھیں۔ "اڑی حیاتاں، دیکھ ذرا، اب بھی اگر تو سیدھی سادی بن کر رہ گئی تو یک دن یار محمد۔۔ مجھے اللہ حافظ کہہ دے گا، اپنی اہمیت منوا۔"

پھر ایسا ہوا کہ میرے محروم اور زخمی جذبوں نے اس بات کو میرے دل و دماغ پر نقش کرنا شروع کردیا۔ میں اپنی سوتن، موَل کا چہرہ دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا کر بیٹھ جاتی، اس پر حکم چلاتی رہتی مگر وہ سر جھکائے میری کرختگی کو نظر انداز کرتی ہوئی میرا ہر حکم خنداں پیشانی سے بجالاتی تھی۔

"اڑی موَل، چل جا۔۔ روٹیاں اتار لے۔۔۔۔۔ یار محمد آتا ہوگا۔" حسبِ معمول ایک روز میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ "اور ہاں، روٹیاں اتارنے کے بعد کپڑوں کا ڈھیر رکھا ہے، اس کو بھی نمٹانا ہے۔ سب کے سب دھونے ہوں گے۔" میری بات پر وہ خاموش رہی اور سر جھکائے رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔

مگر روز بہ روز میرے لیے موَل کا وجود ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔ وہ جب یارو کے ساتھ بیٹھی مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی ہوتی تو میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ وہ سوکن کے روپ میں مجھے ایک ناگن کی طرح محسوس ہوتی تھی جو میرے اور یارو کے درمیان پھن کاڑھے کھڑی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ یارو کے پیار میں میرے لیے ابھی تک کوئی کمی نہ آئی تھی۔ بلکہ میں نے تو یہ تک محسوس کیا تھا

اسلامی ثقافت

کیا مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت، تہذیب یا تمدن ہے یا کبھی رہا؟ کیا اسلام نے کسی قسم کی ثقافت کا آغاز کیا؟ اس کا جواب صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ خود مفکرین یورپ نے بھی دیا ہے۔ تشکیل انسانیت میں رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"یہ صرف سائنس ہی نہیں جس سے یورپ کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کے اور بھی متعدد گوناگوں اثرات ہیں۔ جن سے یورپ میں پہلے پہل زندگی نے آب و تاب حاصل کی۔ پھر اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو نہیں جس سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے فیصلہ کن اثرات کا پتا نہ چلے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اور روشن ثبوت اس طاقت کے ظہور سے ملتا ہے۔ جو عصرِ حاضر کی مستقل اور نمایاں ترین قوت اور اس کے غلبے اور کارفرمائی کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ ہمارا مطلب ہے علوم طبعیہ اور روحِ علم کے ظہور سے۔۔۔۔۔"

بریفالٹ۔۔ کی طرح دیگر مستشرقین کو بھی اس امر کا بخوبی یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب یا ثقافت مغربی تہذیب و تمدن کو پچھاڑ سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کا تمدن ختم ہوگیا، ان کی تہذیب تمدن اجڑ گئی اور ثقافت برباد ہوگئی۔ چین کی ثقافت عصرِ رواں کا ساتھ نہیں دے سکی۔ ہندو تہذیب و تمدن اوہام اور خرافات کا مجموعہ ہے اور یورپی تہذیب یکیاول کی ابلیسی سیاست پر مبنی ہے۔

مرسلہ: حامد خان، لاہور

کہ موتل کے آنے سے میری اہمیت میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا تھا۔ یہاں یہ سچائی بھی مجھے نظر آتی تھی کہ یارو نے واقعی کسی ''اخلاقی'' مجبوری کے تحت ہی دوسری شادی رچائی تھی مگر کچھ بھی تھا، میں اپنے شوہر یار محمد کو اپنی ہی ملکیت سمجھتی تھی۔ میں نے گھر کے کاموں کی ساری ذمّے داری موتل پر ڈال رکھی تھی۔

ایک دن یہ ہوا کہ یارو اچانک بیمار پڑ گیا۔ مجھے یارو کے بیمار ہونے پر یقیناً فکرمند ہونا چاہیے تھا اور ایک خدمت گار بیوی کی طرح اس کی تیمارداری میں مصروف ہو جانا چاہیے تھا۔ تاہم میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ مجھ پر وہی رقابت کا جذبہ بھوت کی طرح سوار تھا۔ اس دوران میں نہ جانے میری عقل کو کیا ہوا کہ میں نے اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اپنے میکے جانے کی ٹھان لی جو دریا کے پار واقع دوسرے گاؤں میں تھا۔

''حیاتاں......! تو نہ جا، تجھ سے مجھے بڑا سہارا ملتا ہے۔''

یارو سسک کر میرا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ دل تو میرا بھی پسیجا تھا مگر پھر سوتن سے دیرینہ رقابت اور اپنی حیثیت منوانے کے احساسات غالب آ گئے۔ میں بات بناتے ہوئے قدرے روکھے پن سے بولی۔ ''تھوڑے دنوں کی بات ہے، میں آجاؤں گی، ویسے تمہیں کیسی پریشانی ہے۔ موتل جو ہے تمہارے پاس۔'' میرے آخری الفاظ میں بڑی زہریلی کاٹ تھی۔

''حیاتاں! تمہارے ہونے سے ''سائیں'' کو بڑا آسرا ملتا ہے، تم ابھی نہ جاؤ۔'' قریب پریشان اور مغموم سی بیٹھی موتل نے بھی مجھے روکا۔ اس کے لہجے میں التجا تھی...

مجھے یوں لگا جیسے وہ محض دکھاوے کی خاطر یارو کے سامنے اپنے نمبر بڑھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ مگر میرے سر پر تو خبط سوار تھا۔ میں نہ رکی اور اپنے بھائیوں کے ساتھ جو مجھے لینے کے لیے آئے تھے، چلی گئی۔

☆☆☆

میں ضد میں میکے تو آ گئی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اندر سے مجھے یارو کی بھی فکر ستا رہی تھی۔ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا؟ اگرچہ موتل وہاں موجود تھی مگر پھر بھی میرے دل کو جانے کیوں تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ میرے اندر کی عورت بار بار مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔

''حیاتاں! تجھے تو اپنے یارو سے بہت محبت تھی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ وہ تو تیرے سر کا سائیں تھا، کیا ہوا جو اس نے دوسری شادی رچالی۔ پیار تو پھر بھی وہ تجھ سے ہی کرتا ہے تا اپنی زبان کا بھی وہ دھنی ثابت ہوا۔ سوتن کو اس نے تجھ پر کبھی فوقیت نہ دی۔ پھر تو بھی تو اس کی بے لوث محبت کی دعویدار تھی۔''

میرے دل کو کچھ ایسی ہی بے چینی کھانے لگی کہ میں تین روز میکے رہنے کے بعد واپس گھر کی طرف پلٹ گئی۔

گھر پہنچی تو یہاں ایک روح فرسا خبر میری منتظر تھی۔ جب میں نے گھر میں قدم رکھا تو مجھے چاروں طرف موت کی سی خاموشی محسوس ہوئی۔ سامنے موتل کا اشک بار چہرہ میرا منتظر تھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے چمک رہا تھا مجھے دیکھتے ہی وہ جذباتی انداز میں چلّا دی۔

''حیاتاں ! ہمارا یارو ہم سے روٹھ کر ہمیشہ کے لیے چلا گیا۔''

یہ خبر میرے لیے ایک بڑا جھٹکا تھی۔ پہلے تو میں کئی ثانیے سن ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد چکرا کر زمین پر آ رہی کہ موتل کے نرم ہاتھوں نے مجھے تھام لیا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ مگر جانے والا وقت تو کب کا ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور اب یارو بھی تو واپس نہیں آ سکتا تھا۔ دکھ اور پچھتاوں کے یہ دن زندگی بھر کے لیے میری یادوں کا حصہ بن گئے۔ آج مجھے اپنے شوہر یار محمد کو کھوئے کئی سال ہو گئے ہیں مگر جب بھی اس کا مردانہ وجاہت سے بھرپور مسکراتا چہرہ مجھے اپنے ساتھ ماضی کے دریچوں میں کھینچ لے جاتا ہے تو بے اختیار میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں اور ساتھ ہی انا پرستی کی آگ میں جھلسنے والا وہ روپ مجھے اپنی ہی نظروں میں مجرم بنا دیتا ہے۔

ہاں ! میں... آج تک...... اپنی سوتن موتل کے ان الفاظ پر کہ.

''ہمارا یارو ہم سے روٹھ گیا'' پر غور کرتی ہوں تو بے اختیار میرے دل میں اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے کیونکہ...... مجھ سے اچھی تو موتل رہی تھی۔ جس نے یارو کی ہمیشہ خدمت کی تھی اور آخری وقت تک اس کے ساتھ رہی تھی اور میں.. جو یارو سے محبت کی بڑی دعویدار تھی۔ اسے ''ملکیت'' سمجھ کر خود ہی اپنی نظروں میں گر چکی تھی۔

قارئین! آپ ہی فیصلہ کریں، میں بری تھی یا میری سوتن

ادائیگی

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
میرے ہاتھوں میں سرگزشت کا ایک پرانا شمارہ ہے۔ اس کی ایک سچ بیانی ''حلالہ'' پڑھ کر میں ہنس پڑا ہوں۔ حلالہ ایک قابلِ نفرت فعل ہے۔ یہ فعل میاں بیوی کو تا عمر اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا رہتا ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو حلالہ کو برسوں کی دبی کھلی خواہش قرار دیتے ہیں جن میں آپ میرا شمار بھی کرسکتے ہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا، کیوں میں ایسا کہہ رہا ہوں انہی واقعات کو میں نے الفاظ کا پیرہن دیا ہے۔ اس میں وہ تمام لوازمات شامل ہیں جو ایک اچھی کہانی میں ہوتے لیکن سچ کڑوا ہوتا ہے یہ میری خود بیتی خود بتائے گی۔

عظیم
(کراچی)

برسوں بعد میری آرزو کی تکمیل کا وقت قریب آ گیا تھا۔ ریحانہ میری آرزو نہیں میرا جنون تھی۔ آج سے کوئی پندرہ سال پہلے میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ وہ کوئی غیر نہیں میری چچا زاد تھی اور ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ چچا کے گھر میرا بے تکلف آنا جانا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد پتا چلا کہ گھر میں امی نہیں ہیں اور کھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ اس لیے میں چچا کے گھر چلا آیا۔ ریحانہ صحن میں واشنگ مشین لگائے کپڑے دھو رہی تھی۔ وہ اس وقت پندرہ

سال کی تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اب ایک نوجوان لڑکی ہے۔ کپڑوں کے ساتھ وہ خود بھی بھیگ گئی تھی اور اس کا لان کا سوٹ بدن سے چپک گیا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ میری نظریں محسوس کرکے اس نے جلدی سے دوپٹا لے لیا اور کسی قدر خفگی سے بولی۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ میں جھینپ گیا اور جلدی سے اندر چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ریحانہ مجھے اچھی لگی اور میرے اندر چاہت بیدار ہوئی تھی۔ پھر ہر گزرتے دن یہ چاہت بڑھتی چلی گئی اور اس نے جنون کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ہم کراچی کے جس متوسط علاقے میں رہتے ہیں یہاں ایک زمانے میں دادا جان نے ایک ہی گلی میں کئی پلاٹ خرید لیے تھے۔ اس وقت آبادی نہ ہونے کے برابر تھی اور زمین کی قیمت بھی زیادہ نہیں تھی۔ دادا جان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے سب کے نام پر الگ الگ پلاٹ لیے اور پانچواں پلاٹ اپنے لیے لے کر اس پر گھر بنوایا پھر جس اولاد کی شادی کرتے پلاٹ اس کے حوالے کردیتے۔ یوں میرا سارا خاندان ایک ہی گلی میں رہنے لگا۔ البتہ امی کے رشتے دار دور دراز علاقوں میں رہتے تھے۔ میرے ابو حسین احمد سب سے بڑے تھے اور میں ان کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ اپنے کزنز میں بھی سب سے بڑا میں ہی ہوں۔ کزنز میں مبشر حسن جو بڑی پھپھو کا بیٹا ہے۔ شرجیل احمد جو چھوٹی پھپھو کا بیٹا ہے، ہم تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ مبشر مجھ سے چھوٹا اور شرجیل اس سے چھوٹا تھا۔ ہماری عمروں میں چند مہینوں کا فرق تھا۔

میرے [illegible] کمسن بھائی اور ہیں۔ مجھ سے چھوٹا رحیم اور اس سے چھوٹی بہن شگفتہ ہے۔ حسن چچا کی دو بیٹیاں ہیں ریحانہ اور اس سے دو سال چھوٹی فرزانہ۔ بڑی پھپھو کے مبشر کے علاوہ دو بچے ہیں۔ مبشر سے چھوٹا عاشر اور سب سے چھوٹی رمل ہے۔ جب کہ چھوٹی پھپھو کی چار اولادیں ہیں۔ شرجیل سے چھوٹی دو بہنیں رفیہ اور صفیہ ہیں۔ سب سے چھوٹا راحیل ہے۔ سارے خاندان کا تعارف کرانے کا مقصد یہ ہے کہ زیرِ نظر سچ بیانی ان ہی گھروں میں گھومتی ہے۔ بارہ کزنز کے ہوتے ہوئے لڑکے اور لڑکیوں کو خاندان سے باہر دوست بنانے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی ہم سب آپس میں ہی کافی تھے۔ خاندان کا ماحول اچھا تھا سب مل جل کر رہتے اور ایک دوسرے سے تعلق بنا کر رکھتے تھے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی ہم کزنز میں بھی ایکا اور محبت تھی۔ کسی ایک کا مسئلہ سب کا مسئلہ ہوتا تھا اور سب مل کر اسے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان دنوں میں گریجویشن کر رہا تھا۔ ریحانہ میٹرک میں تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے تک وہ کسی قدر موٹی اور بھدے ڈیل ڈول والی لڑکی ہوا کرتی تھی۔ میں اسے بچی سمجھتا تھا اور اس سے بچی سمجھ کر ہی پیش آتا تھا۔ مگر چند مہینوں میں کیا کایا کلپ ہوئی کہ اوروں کا تو نہیں پتا لیکن اس نے مجھے دنگ رہ جانے پر مجبور کردیا۔ ریحانہ یک دم چھریری ہوگئی۔ بدن نازک اندام ہوگیا۔ جلد جیسے گلاب دودھ میں ڈھل کر گلابی جیسی ہو گئی۔ بالوں میں ریشم جیسی اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک آ گئی تھی۔ گالوں پر گلاب اور ہونٹوں پر گلاب کی پنکھڑیاں کھل اٹھی تھیں۔ نازک اندام ہونے کے باوجود جسمانی پیچ و خم اور خطوط نمایاں ہونے لگے تھے۔ جس دن میں نے پہلی بار اسے الگ انداز میں دیکھا اس دن کے بعد وہ میرے سامنے احتیاط کرنے لگی تھی۔ جب میں سامنے آتا تو وہ دوپٹا ٹھیک کرلیتی تھی۔ یا بغیر دوپٹے کے ہوتی تو سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ اس پہلی جھلک نے جو تاثر قائم کیا تھا میں اسے بار بار دیکھنا چاہتا تھا لیکن اب اسے ہی دیکھنے کا موقع کم ملتا تھا۔

ہمارے خاندان میں بچپن میں نسبت طے کرنے کا رواج نہیں تھا۔ جب سب صاحب اولاد ہو گئے تو دادا جان نے کہا کہ بچوں کی نسبت بچپن میں نہ طے کی جائے بلکہ بڑے ہونے پر ان سے پوچھ کر طے کیا جائے۔ اگر وہ خاندان میں شادی کرنے پر راضی ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ خاندان سے باہر شادی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ حکم صرف لڑکوں کے لیے نہیں تھا بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی تھا۔ دادا جان علی گڑھ سے پڑھے ہوئے تھے اور صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت بھی اسی طرح کی تھی۔ وہ بھی دادا جان کی طرح اپنے بچوں پر اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑوں نے نہ تو ہمارے بچپن میں رشتے قائم کرنے کی اور نہ ہی ہم پر ملنے جلنے یا کھیلنے کودنے کی پابندی لگائی۔ جیسے جیسے لڑکیاں بڑی ہوتی گئیں انہوں نے اپنی گیدرنگ خود الگ کرلی۔ لڑکوں نے اپنا الگ حلقہ بنالیا۔

لڑکوں میں میری مبشر اور شرجیل سے بنتی تھی کیونکہ ہم ایک ہی ایج گروپ کے تھے۔ اس طرح لڑکیوں میں شگفتہ، ریحانہ اور رفیہ ایک ہی ایج گروپ کی تھیں۔ لڑکوں میں

دوسرا گروپ رحیم، عاشر اور راحیل کا تھا اسی طرح لڑکیوں میں فرزانہ، رمل اور صفیہ الگ گروپ کی تھیں۔ سب مل کر بھی انجوائے کرتے تھے لیکن گروپ کی حد زیادہ واسطہ رکھا جاتا تھا۔ میں، مبشر اور شرجیل آپس میں اچھے دوست ہی نہیں بلکہ ایک ہی کالج میں اور ایک ہی گروپ میں تھے۔ سب نے کامرس لی تھی اور سب کا ارادہ بی کام کے بعد ایم بی اے کرنے کا تھا۔ صبح سے دوپہر تک کالج اور پھر شام کو تفریح اور کوچنگ سینٹر میں بھی بیشتر وقت ساتھ گزرتا تھا۔ ہم میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور ہم ہر بات آپس میں شیئر کرلیتے تھے لیکن میں نے شرجیل اور مبشر کسی کو نہیں بتایا کہ میں ریحانہ میں... دلچسپی لے رہا ہوں بلکہ یہ بات شاید ہی سوائے ریحانہ کے اور کسی نے محسوس کی تھی۔ ریحانہ واقف تھی تبھی وہ میرے سامنے لیے دیے رہنے لگی تھی ورنہ باقی سب سے اس کا رویہ پہلے جیسا تھا۔

میرے پاس بائیک تھی۔ ابو کی اچھی جاب تھی اور وہ افورڈ کرسکتے تھے بلکہ بہن بھائیوں میں سب سے اچھی مالی حالت ابو کی تھی۔ انہوں نے الیکٹریکل میں ڈپلوما کرنے کے بعد فوٹو کاپی مشین کی مرمت میں مہارت حاصل کی اور ایک فرم میں جاب کررہے تھے لیکن انہیں اپنا کام بھی ملتا تھا اور اس سے انہیں خاصی آمدنی حاصل ہو جاتی تھی۔ حسن چچا گورنمنٹ جاب کرتے تھے اور ان کا گزارا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ مبشر کے ابو خالد پھوپا ریلوے میں ملازم تھے جب کہ دوسرے پھوپا دانیال اسکول ٹیچر تھے۔ وہ بھی بس گزارا کر پاتے تھے اس لحاظ سے سب سے بہتر حالت ہماری تھی اور ابو نے مجھے بائیک دلا دی تھی۔ اس زمانے میں ڈبل سواری کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم مزے سے ایک ہی بائیک پر آتے جاتے تھے۔ جب میرے پاس بائیک نہیں تھی تو ہم بس سے جاتے تھے۔ البتہ جب شگفتہ، ریحانہ اور رفیہ نے ایک ساتھ فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا تو ان کے لیے وین لگوائی گئی تھی۔ وہ وین میں آتی جاتی تھیں۔ ایک دن میں صبح کالج کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ چچی آگئیں۔ انہوں نے میرا پوچھا۔ ”عظیم کہاں ہے؟“

”تیار ہو رہا ہے۔“ امی نے بتایا۔

”آج بچیوں کی وین نہیں آئے گی۔ لیکن ریحانہ کا ٹیسٹ ہے وہ بس سے جانے کو کہہ رہی ہے لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ اس لیے عظیم سے کہنے آئی ہوں اسے آج کالج لے جائے اور واپسی میں لے آئے۔“

وین والے نے ایک دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ آج وین کا کچھ کام کرائے گا اس لیے نہیں آسکے گا اس لیے لڑکیاں گھر پر تھیں۔ شگفتہ تو موقع سے فائدہ اٹھا کر سو رہی تھی۔ میں کھل اٹھا تھا یہ سوچ کر کہ ریحانہ میرے ساتھ بائیک پر جائے گی۔ میں جلدی سے باہر آیا۔ چچی کو سلام کیا اور انجان بن کر پوچھا۔ ”خیریت چچی آج صبح صبح نظر آرہی ہیں؟“

”ریحانہ کو کالج لے جانا اور واپس لانا ہے۔“ وہ بولیں۔ ”اس لیے آئی تھی۔“

”کیوں نہیں لے جائے گا۔“ امی نے کہا۔ ”آج مبشر اور شرجیل بس سے چلے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے سعادت مند بن کر کہا۔ ”میں ان کو بتا دیتا ہوں آپ ریحانہ سے کہیں کہ وہ تیار رہے۔“

میں تیار ہو کر باہر آیا۔ مبشر اور شرجیل کو بتا دیا کہ میں ریحانہ کو لے جا رہا ہوں اس لیے وہ بس سے جائیں۔ کچھ دیر میں ریحانہ آ گئی۔ وہ پیچھے بیٹھی تو میں نے اس سے کہا۔ ”آج میں بہت خوش ہوں؟“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم میرے ساتھ بائیک پر بیٹھی ہو۔“

وہ چپ ہو گئی لیکن جب میں نے اسے کالج کے سامنے اتارا تو اس نے کہا۔ ”اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں مبشر بھائی اور شرجیل بھائی کے ساتھ بھی بائیک پر جا چکی ہوں لیکن ان میں سے کسی نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔“

وہ کہہ کر اندر چلی گئی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اس چکر میں مجھے پوچھنا یاد نہیں رہا کہ اسے لینے کب آنا تھا؟ کیونکہ اس کا صرف ٹیسٹ تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس کے بعد کالج میں میرا انتظار کرتی۔ اس لیے میں چھٹی کے مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گیا اور اس لیے مجھے پورے دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ چھٹی کے وقت ہی دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ اس بار بھی وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھی اور بیٹھتے ہوئے اس نے میرے اور اپنے درمیان فاصلہ برقرار رکھا تھا۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ قریب ہو کر بیٹھے۔ اسے دروازے پر اتارتے ہوئے میں نے صبح کی بات کا جواب دیا۔ ”تمہارے لیے شاید اس میں خوشی کی کوئی بات نہ ہو لیکن میرے لیے تو ہے اور میں مبشر یا شرجیل نہیں ہوں۔“

اس کے بعد بھی کئی بار اتفاق ہوا کہ ریحانہ کو کہیں لانے اور لے جانے کا لیکن اس کا مجھ سے لیے دیے رہنے کا انداز

برقرار رہا۔ اسی سال میں نے گریجویشن مکمل کر لیا۔ میرے ساتھ مبشر اور شرجیل نے بھی پیپرز دیے تھے، اور جب رزلٹ آیا تو شرجیل آگے نکل گیا۔ اس کا اے ون گریڈ آیا تھا جب کہ مبشر اور میں اے گریڈ لے سکے تھے۔ میرے نمبر سب سے کم تھے۔ ہم سب نے آئی بی اے میں اپلائی کیا لیکن اتفاق سے جتنے نمبروں پر داخلے بند ہوئے میرے پاس اس سے صرف دو نمبر کم تھے یوں میں رہ گیا اور وہ دونوں آئی بی اے میں چلے گئے۔ حالانکہ یہ میرا خواب تھا کہ میں کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کروں۔ مبشر اور شرجیل کی اتنی خواہش نہیں تھی وہ پڑھنے میں بھی مجھ سے زیادہ تیز نہیں تھے اس کے باوجود آگے نکل گئے اور کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں بھی کامیاب رہے۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جن دنوں فائنل کی تیاری ہو رہی تھی تو میرے ذہن پر زیادہ تر ریحانہ سوار رہتی تھی۔ میرا دھیان اسٹڈی کی طرف کم تھا، اور اسی لیے تیاری متاثر ہوئی تھی۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے دل پر جبر کر کے تعلیم پر توجہ کیوں نہیں دی، معمولی سے فرق سے میں رہ گیا اور اب میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا کہ کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں داخلہ لوں جو ایم بی اے کراتا ہو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ یوں ہمارا گروپ جو اسکول سے اب تک ایک چلا آ رہا تھا ٹوٹ گیا۔ میں اپنی یونیورسٹی جاتا اور وہ دونوں کراچی یونیورسٹی جاتے تھے۔ پھوپھا نے مبشر کو بھی بائیک دلا دی تھی تاکہ اسے اور شرجیل کو مشکل نہ ہو۔ اس کے بعد ریحانہ نے میرے ساتھ آنا جانا چھوڑ دیا۔ اس وقت میں نے غور نہیں کیا میں سمجھتا تھا کہ شاید اسے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی یا پھر وہ رکشے میں چلی جاتی تھی۔

لیکن ایک دن میں نے اسے مبشر کے ساتھ مارکیٹ سے آتے دیکھا۔ اس نے خاصے شاپرز اٹھا رکھے تھے۔ میں نے مبشر سے سرسری سے انداز میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ریحانہ کہیں آنے جانے کے لیے اب اس سے ہی کہتی ہے۔ یہ سن کو مجھے سخت جلن ہوئی تھی کہ ریحانہ مجھے نظر انداز کر کے خاص طور سے مبشر کے ساتھ آتی جاتی رہی تھی۔ جب کہ میں بھی دستیاب ہوتا تھا۔ اس کے بعد میں موقع کا انتظار کرنے لگا کہ ریحانہ سے اکیلے میں سامنا ہو اور میں اس سے پوچھ سکوں کہ اس نے میرے بجائے مبشر کا انتخاب کیوں کیا؟ یہ موقع مجھے جلد مل گیا۔ چچی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ حسن چچا نے دفتر سے کال کر کے امی سے کہا۔ ''عظیم کو بھیج دیں وہ نعمانہ کو ڈاکٹرز کو دکھا دے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

امی نے مجھے کہا تو میں چچی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ وہاں سے واپسی پر چچی نے ریحانہ کو میرے لیے چائے بنانے کا کہا اور خود آرام کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نشست گاہ میں بیٹھ گیا تھا۔ کچھ دیر میں ریحانہ چائے بنا کر لے آئی اور میرے سامنے رکھ کر جانے لگی تھی کہ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''رکو اور بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''جی کہیں۔''

ایک سال میں وہ کہیں زیادہ دلکش اور خوب صورت ہو گئی تھی۔ پہلے اس میں نوخیز دلکشی تھی جو اب بھرپور جوانی کی دلکشی میں بدل چکی تھی۔ بدن مناسب مقامات سے بھر گیا تھا۔ میں نے اسے بہت دن بعد اپنے سامنے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کھنکھار کر کہا۔ ''آپ کچھ کہہ رہے تھے۔''

میں چونکا اور خفت سے بولا۔ ''وہ میرے ذہن سے نکل گیا۔ ریحانہ میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''تو پوچھ لیں۔'' اس نے کسی قدر بیزاری سے کہا۔ ''ابھی مجھے رات کا کھانا بھی بنانا ہے۔''

جب سے ریحانہ کے لیے میرے جذبات تبدیل ہوئے تھے اس کے انداز میں میرے لیے ایک اوپری پن آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے جھجکتی یا شرماتی نہیں تھی حالانکہ اس تبدیلی کو اس نے بھی محسوس کیا تھا۔ بلکہ اس کے انداز میں بیزاری اور لاتعلقی آ گئی تھی۔ جیسے میری اور میرے جذبات کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہ ہو۔ میں نے آزردہ ہو کر کہا۔ ''ریحانہ کیا تم دو منٹ میرے پاس بیٹھ کر بات بھی نہیں کر سکتیں۔ اگر تمہیں یہ گوارا نہیں ہے تو بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا چائے کا کپ ویسے کا ویسے ہی رکھا تھا اسے میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ شرمندہ ہو گئی۔ ''اچھا سوری عظیم بھائی آپ پلیز بیٹھیں۔ چائے پئیں اور مجھے بتائیں کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔''

اس کے لہجے میں ایسا اصرار تھا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔ اس نے اصرار کر کے مجھے چائے پینے پر مجبور کیا تو اچھا لگا تھا۔ میں تو اس کی توجہ کو ترسا ہوا تھا۔ اس لیے جب اچانک ہی توجہ ملی تو شکوہ بھول ہی گیا۔ چائے ختم ہونے پر اس نے یاد دلایا۔ ''کیا کہنا چاہتے تھے آپ؟''

تب مجھے یاد آیا اور میں نے شکوہ کیا۔ ''کیا بات ہے تم نے میرے ساتھ آنا جانا چھوڑ دیا ہے جب کہ تم مبشر کے ساتھ آتی جاتی ہو۔''

''نہیں تو۔'' اس نے فوراً انکار کیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے یہ اتفاق ہوگا کہ مبشر بھائی ہوں گے تو میں ان کے ساتھ چلی گئی۔''

''نہیں میں بھی ہوتا ہوں تب ہی تو میں نے تمہیں مبشر کے ساتھ آتے جاتے دیکھا ہے۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے کہ میں مبشر بھائی کے ساتھ جاتی ہوں؟''

''نہیں... نہیں۔'' میں نے جلدی سے تردید کی۔ ''میں یہ اعتراض کیسے کر سکتا ہوں جیسے میں تمہارا کزن ہوں اسی طرح مبشر بھی تمہارا کزن ہے۔ مجھے اس کے ساتھ جانے پر اعتراض نہیں ہے۔ میرے ساتھ نہ جانے پر اعتراض ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ تو ایک ہی بات ہوئی۔''

''نہیں ایک بات نہیں ہے۔''

''اچھا بابا۔'' اس نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔ ''اگر اب مجھے کہیں جانا ہوا تو میں آپ سے کہہ دوں گی۔''

''بالکل میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ لیکن اگر میں نہ ہوں اور تمہیں جانا ہو تو بے شک مبشر یا کسی اور کے ساتھ بھی چلی جایا کرو۔''

اس گفتگو کے بعد ریحانہ کا انداز بدل گیا تھا اب وہ مجھ سے پہلے جیسی لاتعلقی اور بیزاری سے پیش نہیں آتی تھی کسی قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ بیٹھ کر بات کر لیتی تھی۔ اسی طرح میرے ساتھ آتی جاتی بھی تھی لیکن اس کا موقع کم آتا تھا۔ مہینے میں ایک دو بار ہی ایسا ہوتا تھا۔ وہ مبشر کے ساتھ بھی آتی جاتی تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد میں نے محسوس کیا کہ مبشر سے گفتگو میں ریحانہ کا انداز بالکل الگ ہوتا تھا۔ وہ ایک مخصوص شوخی اور چلبلے پن سے بات کرتی تھی۔ ظاہر ہے یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن میں اسے ٹوک بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ مبشر اسے بالکل نارمل لیتا تھا۔ میں نے دو تین بار اسے کرید اور معنی خیز انداز میں پوچھا بھی کہ ریحانہ اس سے ذرا الگ انداز میں بات کرتی ہے لیکن مبشر نے ہمیشہ اس کی تردید کی۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بھئی وہ تو سب سے اسی طرح بات کرتی ہے۔''

مبشر اور دوسروں نے نوٹ نہیں کیا تھا یہ بات صرف میں نے نوٹ کی تھی۔ گرچہ اسے روایتی پسند یا محبت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ لیکن ریحانہ کا جھکاؤ واضح طور پر مبشر کی طرف ہو رہا تھا اور یہ چیز مجھے بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ مگر میں ریحانہ یا مبشر سے یہ بات کہہ نہیں سکتا اس لیے اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ میرا ایم بی اے کا تیسرا سمسٹر چل رہا تھا۔ ریحانہ بی اے کے پہلے سال میں تھی اور گریجویشن کے بعد یقیناً چچی اور چچا کو اس کی شادی کی فکر ہوتی۔ میرا ایم بی اے اس کے بعد مکمل ہوتا۔ اس لیے مجھے فکر لاحق ہونے لگی تھی کہ کہیں چچا چچی پہلے کوئی فیصلہ نہ کر لیں۔ تقریباً سب بڑے ہو رہے تھے اور اب گھروں میں شادی کی بات ہونے لگی تھی۔ شگفتہ کئی بار امی سے اصرار کر چکی تھی کہ بھائی کے لیے لڑکی دیکھی جائے اور ان کی منگنی کر دی جائے۔ جب میں کہیں ملازمت سے لگ جاؤں تو شادی بھی کر دی جائے مگر امی کا کہنا تھا کہ وہ لڑکی اس وقت دیکھیں گی جب میں ملازمت کرنے لگوں گا۔

مگر اس وقت تک دیر ہو سکتی تھی اس لیے جب میرا چوتھا سمسٹر شروع ہوا اور ریحانہ گریجویشن فائنل میں آئی تو میں نے امی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن جب گھر میں اتفاق سے کوئی اور نہیں تھا تو میں نے ہمت کر کے امی سے بات کر لی۔ وہ حیران ہوئی تھیں اور پھر چپ ہو گئیں۔ میں نے بے قراری سے کہا۔ ''امی کیا بات ہے کیا ریحانہ آپ کو پسند نہیں ہے۔''

''نہیں میرے بچے پسند کیوں نہیں ہو گی۔ گھر کی دیکھی بھالی بچی ہے، شکل صورت، تعلیم، سلیقے کسی چیز میں کم نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے آپ چپ کیوں ہو گئیں؟''

امی نے سرد آہ بھری۔ ''عظیم میں نے تجھے بلکہ کسی کو نہیں بتایا کہ میں پہلے ہی نعمانہ سے بات کر چکی ہوں۔''

یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ ''پھر انہوں نے کیا کہا؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ تیری پھپھو ایمن پہلے ہی مبشر کی بات کر چکی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر ان کو منع کیا تو بات خراب ہو گی اور وہ پہلے بات کر چکی ہیں اس لیے پہلے حق ان کا ہے ہاں کسی وجہ سے یہ رشتہ نہیں ہو پاتا تو وہ ہمیں ترجیح دیں گی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اگر مبشر سے نہیں ہوا تو مجھ سے کر دیں گی۔''

''میرے بچے خاندان کے رشتوں میں ایسا ہوتا ہے

بعض اوقات ایک ہی لڑکی کے کئی امیدوار بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں بہت دیکھ بھال کر بات کرنی پڑتی ہے۔ خاندان میں تعلقات خراب نہیں کیے جاسکتے ہیں۔"

"لیکن امی میں ریحانہ کو پسند کرتا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میں جانتی ہوں اسی لیے تیرا رشتہ لے کر گئی تھی لیکن قسمت، وہ دن پہلے ہی ایمن مبشر کے لیے بات کرگئی۔"

"میں چچا سے بات کروں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" امی جلدی سے بولیں۔ "وہ غصے میں آگئے تو بات اور بگڑ جائے گی۔ مجھے موقع دے میں ایمن سے بھی بات کرتی ہوں۔ ممکن ہے وہ اس رشتے سے دست بردار ہوجائے۔"

"امی آپ بات کریں وہ ہر صورت اس رشتے سے دست بردار ہوں ورنہ.."

امی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ "عظیم بیٹا اس قسم کے معاملات غصے سے اور لڑائی جھگڑوں سے حل نہیں ہوتے ہیں۔"

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی پھپھو سے جا کر انکار کروادوں۔ لیکن امی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ کسی قسم کی تلخی یا زور زبردستی سے یہ معاملہ اور خراب ہوجاتا۔ امی پھپھو سے بات کرتیں اور شاید اس سے کوئی حل نکل آتا۔ ریحانہ مجھے مل جاتی۔ مگر جب میں سوچتا کہ اگر ایسا نہ ہوا اور ریحانہ مبشر کی ہوگئی تو میں یہ بات کیسے برداشت کروں گا۔ ایسا سوچنے سے میرا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔ اگر ایسا سچ ہوجاتا تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ میں ہر روز امی کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھتا کہ شاید انہوں نے بات کی ہو۔ جب کہیں باہر سے آتا تو سب سے پہلے امی کے پاس جاتا اور جب وہ مجھ سے نظریں چراتیں تو میں سمجھ جاتا کہ ابھی تک انہوں نے کوئی بات نہیں کی ہے۔ کئی بار میں نے دبے لفظوں میں امی سے کہا بھی کہ وہ بات کریں اس سے پہلے کہ پھپھو اپنا ارادہ پختہ کرلیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ مبشر کو اس بارے میں علم نہیں تھا یا اگر تھا بھی تو اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا ورنہ وہ ہم کزنز کو ضرور بتاتا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد امی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پھپھو سے بات کی تھی براہِ راست تو نہیں کی تھی لیکن کریدا تھا کہ کیا ہورہا ہے تو ایمن پھپھو نے بتایا کہ انہوں نے چچی اور چچا سے ریحانہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن ان کا کہنا تھا کہ وہ ریحانہ کے فائنل امتحانات سے پہلے اس سلسلے میں کوئی بات

نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جسے بھی رشتے کی بات کرنی ہے وہ اس کے بعد ہی کرے۔ میں نے کسی قدر سکون محسوس کیا تھا۔ مجھے مہلت مل گئی تھی اور اگر میں کوشش کرتا تو ریحانہ کو حاصل کرسکتا تھا میں نے سوچا اور ایک منصوبہ بنایا۔ میں اب چچا حسن کے گھر زیادہ جانے لگا تھا ان کے آگے پیچھے ہوتا۔ ان کے گھر کوئی لڑکا نہیں تھا اور چچا صبح کے کام پر گئے شام گئے آتے تھے۔ اس لیے باہر کے کاموں کے لیے چچی اور لڑکیوں کو دشواری ہوتی تھی۔ میں نے چچی سے کہا کہ وہ جب چاہیں مجھے کہہ دیا کریں۔ اگر کوئی کام صبح کا ہو تو مجھے پیشگی بتا دیا کریں میں یونیورسٹی سے آتے ہوئے یہ کام کردیا کروں گا۔ چچی نعمانہ خوش ہوگئی تھیں مجھے دعائیں دیتی تھیں لیکن مجھے تو کچھ اور درکار تھا۔ ابو مجھ کھلا خرچ دیتے تھے۔ مجھے کوئی شوق یا علت نہیں تھی۔ جیسے سگریٹ پان، یا آؤٹنگ اور باہر کھانے کی۔ اس لیے میرے پاس رقم ہوتی تھی۔ میں اکثر چچی کے گھر جاتے ہوئے کچھ نہ کچھ لے جاتا تھا اور یہ چیز ریحانہ کی پسند کی ہوتی تھی۔ جب میں اسے دیتا تو وہ خوش ہوجاتی۔ اس بار عید آئی تو میں ریحانہ کے لیے خاص طور سے ایک خوب صورت اور مہنگا سوٹ لے کر آیا۔ سوٹ کے ساتھ میچنگ کی جیولری، چوڑیاں اور سینڈل بھی تھے۔ ریحانہ خوش ہوئی تھی اور میرا شکریہ ادا کیا لیکن جیسے ہی یہ خبر دوسری لڑکیوں تک پہنچی میرا ناطقہ بند ہوگیا تھا۔ سب نے مجھے گھیراؤ کرلیا اور حملے کرنے لگیں۔

"اچھا جی ریحانہ خاص کزن ہے اور ہم عام کزن ہیں۔"

"کیا ریحانہ کا دل ہے۔"

"آپ کو ریحانہ ہی نظر آتی ہے۔"

"یہ دھاندلی ہے ہمیں بھی ادا کردیں۔"

میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ "بھئی تم سب کو لاکر دیتا رہا ہوں ریحانہ کو کبھی کچھ نہیں دیا اس لیے اس بار اسے دیا ہے اور میں کوئی جاب کرتا ہوں جو تم سب کو بھروں۔"

بڑی مشکل سے میں نے پیچھا چھڑایا۔ لڑکوں تک یہ بات پہنچی یا نہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ مبشر چپ ہوگیا تھا اور وہ مجھ سمیت سب سے کم بات کررہا تھا۔ بہرحال مجھے پرواہ نہیں تھی۔ میں نے اس سے دو مقاصد حاصل کیے تھے ایک تو ریحانہ کو تحفہ دے کر اس کے اندر اپنے لیے جگہ پیدا کی تھی اور ساتھ ہی دوسروں کو پیغام دیا تھا کہ ریحانہ میرے

لیے خاص حیثیت رکھتی تھی۔ لڑکیوں کے توسط سے یہ بات یقیناً ان کی ماؤں تک پہنچ گئی ہوگی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اس طرح میں پھپھو کو پیغام دینا چاہتا تھا کہ ریحانہ میرے لیے عام کزن سے ہٹ کر ہے اور وہ مبشر کے لیے اس کا رشتہ نہ لائیں۔ یہ نہیں سبھوں نے یہ بات محسوس کی یا نہیں۔ کیونکہ کسی طرف سے کوئی ایسی بات سامنے نہیں آئی۔ میں نے اس بارے میں امی سے پوچھا بھی لیکن انہوں نے بھی یہی کہا کہ ایمن پھپھو نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا ہے۔

عید پر سوٹ دینے کے بعد میری ہمت بڑھ گئی تھی۔ اب میں اکثر کھانے پینے کے علاوہ اور چیزیں بھی ریحانہ کو دینے لگا جیسے جیولری جو اسے پسند تھی اور.... میں پاکٹ منی کا بڑا حصہ اسی پر خرچ ہوتا تھا۔ وہ حسین تھی مگر مزید حسین نظر آنا چاہتی تھی اس لیے میک اپ کرتی تھی اور اس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ میں نے اسے اچھی سی میک اپ کٹ لاکر دی۔ وہ اس نے سب سے چھپا کر رکھی تھی۔ یہ اچھا ہوا کیونکہ دوسروں کو پتا چلتا تو ایک بار پھر سب لڑکیاں مل کر میرا جینا حرام کرتیں۔ آنے والے ایک سال میں میں نے اسے بہت کچھ دیا تھا۔ جسے وہ شکریے کے ساتھ وصول کرتی رہی تھی اور میں اس خوش فہمی میں تھا کہ میں اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہورہا ہوں۔

میرے فائنل سمسٹر قریب آگئے تھے اور مجھے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ ابو نے مجھے ایک اچھی نجی یونیورسٹی میں داخل کرایا تھا یہاں فیس اچھی خاصی تھی اور اسی طرح تعلیم کا معیار بھی بلند تھا۔ مجھے نمایاں پوزیشن لینے کے لیے بہت محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ شام تک میں یونیورسٹی میں ہوتا تھا وہاں سے واپسی پر بھی رات گئے تک پڑھتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں مبشر اور شرجیل دونوں سے بہتر نمبر حاصل کروں۔ کسی طرح ان سے پیچھے نہ رہ جاؤں۔ اس کے لیے میں نے تمام تفریحات چھوڑ دی تھیں حد یہ کہ جو کچھ دیر کزنز کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اس سے بھی دست بردار ہوگیا۔ تعلیم کے علاوہ اس کی ایک وجہ مبشر بھی تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ کزن سے زیادہ میرے لیے رقیب بنتا جارہا تھا۔ مجھے اس سے چڑ ہوگئی تھی اور جب میں اس کے پاس ہوتا تو بڑی مشکل سے اپنے تاثرات پر قابو پاتا تھا۔ ورنہ میرا اس سے بات کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ یوں تعلیمی مصروفیت کے بہانے میں اس سے دور رہتا تھا۔ میرا پانچواں سمسٹر شروع ہوا تو ریحانہ کے بی اے فائنل کے پرچے ہونے لگے

تھے۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں ایمن پھپھو نہ پہلے بات کرلیں۔ میں نے امی سے کہا۔ "پلیز اب آپ چچی اور چچا سے پہلے بات کرلیں۔"

امی نے انکار کیا۔ "بیٹے ایمن بات کرچکی ہے جب تک اس کا معاملہ ہے میں آگے بات نہیں کرسکتی۔"

میں مایوس ہوا۔ "پلیز امی اس طرح تو بات وہیں کی وہیں رہے گی۔ اگر پھپھو دس سال تک بات نہیں کریں گی تو کیا ریحانہ کے رشتے کی بات نہیں کی جائے گی۔"

"میں نعمانہ سے پوچھ لیتی ہوں لیکن اگر اس نے پھر انکار کیا تو میری کیا عزت رہ جائے گی۔ میں بیٹے کی ماں ہو کر بار بار اس کے دروازے پر جارہی ہوں۔"

"امی یہ میری زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔ آپ ابو سے بات نہیں کرسکتی ہیں، وہ پھپھو اور چچی دونوں سے بات کرسکتے ہیں۔"

"نہ عظیم۔" امی نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "تم اپنے باپ کو جانتے ہو اگر ان کو پتا چل گیا تو وہ مجھے بھی بات کرنے سے روک دیں گے۔"

امی کی طرف سے مایوس ہوکر میں نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ خود ریحانہ سے بات کروں گا۔ چچا چچی سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اسی طرح پھپھو سے بھی نہیں کرسکتا تھا اب اس مسئلے کی واحد فریق ریحانہ بچی تھی جس سے میں بات کرسکتا تھا۔ چچا حسن کے گھر میرا آنا جانا تھا لیکن کئی بار جانے کے باوجود مجھے موقع نہ مل سکا کہ ریحانہ سے اکیلے میں بات کرسکوں۔ جو بات میں اسے کہنا چاہتا تھا اس کے لیے تنہائی ضروری تھی۔ ایک شام یونیورسٹی سے آنے کے بعد میں وہاں گیا تو دروازہ ریحانہ نے کھولا اور کسی قدر ہچکچاتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ "وہ امی اور فرزانہ مارکیٹ گئی ہیں۔"

یعنی وہ گھر میں اکیلی تھی میں نے کہا۔ "تو کیا ہوا میں تمہارا کزن ہوں اور پھر تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

ریحانہ راضی نہیں تھی لیکن میری بات سن کر اس نے دروازہ کھول دیا اور ایک طرف ہوگئی۔ میں اندر آیا اور نشست گاہ کی طرف جانے کے بجائے صحن میں رکھی کرسیوں کی طرف آگیا۔ "ریحانہ بیٹھو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ زبردستی مسکرائی۔ "آپ کو ہر کچھ دن بعد مجھ سے

کوئی نہ کوئی ضروری بات کرنی ہوتی ہے۔ خیر کہیں اب کیا کہنا ہے۔"

میں ہچکچایا۔ "ریحانہ بات تم سے متعلق ہے۔ تم جانتی ہوگی کہ امین پھپھو نے مبشر کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔"

اس کا چہرہ جس طرح سرخ ہوا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ جانتی ہے لیکن اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں تو، آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ میں نے امی کو تمہارے رشتے کے لیے چچا اور چچی سے بات کرنے کو کہا تھا۔"

"جی۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"اس سے پتا چلا کہ پھپھو پہلے ہی رشتے کی بات کر چکی ہیں لیکن چچا چچی تمہاری تعلیم مکمل ہونے تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے پھپھو کو کوئی جواب نہیں دیا۔"

اس نے رکھائی سے کہا۔ "ٹھیک ہے ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔"

"ریحانہ میں چاہتا ہوں کہ تم چچا چچی کو مبشر کے رشتے کے لیے منع کردو۔"

"کیوں منع کردوں؟" اس نے خفگی سے کہا۔ "میں نے یہ معاملہ امی ابو پر چھوڑا ہوا ہے وہ میرے لیے جو چاہیں کریں میں ان کی رضا میں راضی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ "اگر آپ یہی کہنے آئے تھے تو آپ جا سکتے ہیں اور آئندہ مجھ سے اس موضوع پر دوبارہ بات مت کیجیے گا۔"

"ریحانہ میری بات سنو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔" اس نے رخ پھیر لیا۔ "آپ نے کیا سوچ کر مجھ سے بات کی ہے، کیا میں اس گھر کی بڑی ہوں؟"

میں نے دوبارہ بات کرنی چاہی لیکن ریحانہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں وہاں سے بے نیل و مرام لوٹ آیا تھا اور نہ جانے کیوں اس دن مجھے یقین ہوگیا کہ ریحانہ میرے مقدر میں نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں ملے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا ادھر وہ امتحان سے فارغ ہوئی اور ادھر پھپھو مبشر کا رشتہ باقاعدہ لے کر پہنچ گئیں اور ایک ہفتے بعد چچا اور چچی نے اس رشتے کی منظوری بھی دے دی۔ یہ دن میں نے کیسے انگاروں پر لوٹ کر گزارے تھے میں آج بھی سوچتا ہوں تو میرے تن بدن میں آگ سی دہک جاتی ہے۔ لیکن اس وقت جب میرے اندر مسلسل آگ جل رہی تھی میں نے خود کو اوپر سے برف کی سل کر لیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے امی کو مطمئن کیا کہ میں ریحانہ کو پسند کرتا ہوں لیکن یہ پتلی جنون والی محبت نہیں ہے۔ پھر میں نے مبشر اور دوسروں سے یہ رویہ نارمل کر لیا کہ اگر کسی کو شک تھا تو وہ بھی نہ رہے۔ میں نے مبشر کو مبارک باد دی تو وہ بھی خوش نظر آیا تھا۔ ان کی منگنی کر دی گئی تھی اور طے پایا تھا کہ شادی مبشر کی جاب کے بعد ہوگی۔ میری طرح اس کا بھی ایم بی اے کا فائنل سمسٹر تھا۔ فائنل کے دوران ہی مجھے ایک فرم میں انٹرن شپ مل گئی تھی۔ وہاں میرے کام سے مطمئن ہو کر فرم مالکان نے ملازمت کی پیشکش کر دی۔ یوں تعلیم مکمل کرتے ہی مجھے جاب مل گئی تھی۔

مبشر اور شرجیل نے بھی ایم بی اے مکمل کیا لیکن انہیں کئی مہینے کی خواری کے بعد جاب ملی تھی۔ تنخواہ بھی میرے مقابلے میں کم تھی اس لحاظ سے میں ان سے آگے تھا لیکن میرے لیے ان کامیابیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مبشر کی ایک کامیابی نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس وقت میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ریحانہ نے ماں باپ کی رضا کے سامنے سر جھکایا ہے۔ لیکن اتفاق سے ایک دن میں چچا حسن کے گھر میں تھا۔ وہ اپنے آفس کی اکاؤنٹس کی کچھ فائلیں لائے تھے اور ان پر میری مدد چاہتے تھے کیونکہ میں نے فنانس میں ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ کام کے دوران چچا مجھے چھوڑ کر واش روم گئے۔ نشست گاہ کے ساتھ ہی ریحانہ کا کمرا تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ رمل اس سے ملنے آئی ہے۔ جب سے میں نے اس سے بات کی تھی اس کا رویہ مجھ سے دوبارہ لاتعلقی والا ہوگیا تھا۔ میں سر جھکائے فائل دیکھ رہا تھا کہ ریحانہ کے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھل گیا اور میں نے رمل کی دھیمی آواز سنی۔ وہ ریحانہ سے کہہ رہی تھی۔ "جب ماں نے آپ کے سامنے آپشن رکھا تو آپ نے مبشر بھائی کو چن لیا؟"

"ہاں میری تو جان پر بنی ہوئی تھی کہ کہیں امی ابو عظیم بھائی کے لیے نہ ہاں کر دیں۔ قسم سے میں نے بہت ہمت کر کے مبشر کا نام لیا تھا وہ بھی امی کے سامنے ورنہ ابو کے سامنے تو میری ہمت بھی نہ ہوتی۔"

رمل نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا عظیم بھائی آپ کو پسند کرتے ہیں؟"

"نہیں یہ تو ماموں اور مامی کی خواہش تھی۔" ریحانہ نے جلدی سے تردید کی۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ عظیم بھائی آپ کو پسند کرتے ہیں۔"

"وہم ہے تمہارا۔" ریحانہ ایک بار پھر مکر گئی۔ میں سن سا رہ گیا تھا۔ یہ انکشاف مجھے اندر سے مار گیا تھا کہ ریحانہ نے مجھے مسترد کر کے مبشر کو چنا تھا۔ وجہ تو صاف ظاہر تھی وہ مبشر کو پسند کرتی تھی۔ شکل صورت میں مبشر مجھ سے بہتر تھا۔ اسی لیے ریحانہ نے مجھے مسترد کر دیا تھا لیکن وہ میری محبت سے کیوں انکار کر رہی تھی جب کہ وہ جانتی تھی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ وہ چالاکی سے کام لے رہی تھی اپنے ہونے والی نند کے سامنے وہ کیسے اقرار کر سکتی تھی کہ اسے کوئی اور بھی چاہتا ہے۔ ریحانہ اتنی چالاک و مکار نکلے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میرے سامنے اس نے کتنی برہمی کا اظہار کیا تھا کہ اس کے رشتے کے ذمے دار اس کے ماں باپ ہیں اور وہ اس میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ہے۔ لیکن جب ماں باپ نے اس کے سامنے میرا اور مبشر کا آپشن رکھا تو اس نے مبشر کو چن لیا۔

یہ دکھ بھی میں نے اندر ہی اندر برداشت کر لیا تھا اور اپنے ظاہری رویے میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ جیسے جیسے میں سنبھل رہا تھا میرے اندر ریحانہ کی محبت نفرت میں بدلتی جا رہی تھی اور جب وہ شادی کر کے مبشر کی ہوئی تب میرے دل میں اس کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اب تک میں سنتا آیا تھا کہ شدید نفرت ہمیشہ شدید محبت کے ختم ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ مجھے اس کا عملی تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ میری محبت کا تو ریحانہ اور امی کو علم ہو گیا تھا لیکن ریحانہ کے لیے نفرت میں نے اپنی ذات تک محدود رکھی تھی۔ مبشر کے جاب پر لگنے کے ایک سال بعد ریحانہ اور اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے دو مہینے بعد میری بھی شادی ہو گئی۔ اگرچہ مجھے جاب کرتے ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ تنخواہ میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا لیکن میں ایک کورس کر رہا تھا۔ پھر میں اپنی شادی کے لیے ابو پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ مجھے رقم جمع کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تھی۔ مبشر اور ریحانہ کی منگنی کے کچھ عرصے بعد ہی امی نے میرے لیے لڑکی دیکھ لی تھی۔

ایمان بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ خوب صورت اور سلیقہ شعار تھی۔ ساتھ ہی مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگی تھی۔ میرا کہا ایک لفظ بھی اس کے لیے حرفِ آخر ہوتا تھا۔ شادی کے دوسرے دن سے اس نے میری تمام ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ ہم ہنی مون منانے ناردرن ایریا گئے۔ بہت انجوائے کیا، میں اس کے ساتھ خوش تھا۔ کوئی کمی نہیں تھی لیکن نہ جانے کیا بات تھی جب کبھی اکیلے بیٹھتا تو اندر ایک عجیب سی چبھن اور کھٹک محسوس ہوتی۔ جیسے کچھ باقی رہ گیا ہو۔ میری زندگی میں کوئی ادھورا پن تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ ادھورا پن اور چبھن کا احساس شاید ریحانہ کے نہ ملنے کی وجہ سے تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ یہ ادھورا پن اور چبھن کم ضرور ہوئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ پانچ سال میں ہمارے تین بیٹے ہوئے اس کے بعد قدرت کی طرف سے بس ہو گیا۔ اسی دوران میں ریحانہ اور مبشر کے دو بچے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔

مبشر کی جاب جاری تھی لیکن اسے مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے صرف اپنا ہی نہیں بلکہ گھر کے اخراجات کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا۔ پھپھو کو کینسر ہو گیا تھا ان کے علاج پر بہت خرچہ ہوا تھا لیکن وہ بچ نہیں سکیں۔ مبشر کی شادی کے چار سال بعد وہ بہت تکلیف اٹھانے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میری امی دو سال پہلے دنیا سے گئیں۔ انہیں ہارٹ پرابلم تھی اور پرہیز کرتی نہیں تھیں۔ اس دوران میں تقریباً تمام کزنز کی شادیاں ہو گئیں۔ کچھ کی خاندان میں ہوئیں اور کچھ کی باہر ہوئیں۔ اس معاملے میں کوئی بندھا اصول نہیں تھا جس کی جہاں مناسب لگی وہاں شادی کر دی۔ یوں رفتہ رفتہ سب ٹھکانے لگ گئے تھے۔ میری شادی کے بعد ابو نے تھوڑی تھوڑی کر کے اوپری منزل بنوانا شروع کر دی تھی۔ یہ ڈیڑھ سو گز کا پلاٹ تھا اور نیچے کا حصہ پورا بنا ہوا تھا جس میں دو بڑے بیڈ رومز، وسیع لاؤنج اور بڑے سے ڈرائنگ روم کے ساتھ کھلا صحن بھی تھا۔ ابو نے اوپر دو بیڈ رومز بنوائے۔ پھر جب میرے پاس رقم آئی تو میں نے لاؤنج اور ڈرائنگ روم بھی بنوالیا اور اوپر منتقل ہو گیا۔ کیونکہ رحیم کی شادی طے ہو گئی تھی۔ ابو نے فیصلہ کیا تھا کہ رحیم ان کے ساتھ رہے گا۔ شگفتہ کی شادی دو سال پہلے ہی کر دی تھی۔

شادی کے کچھ عرصے بعد مبشر اور ریحانہ کی زندگی صرف مالی مشکلات ہی نہیں بلکہ دوسرے مسائل کا شکار بھی ہونے لگی تھی۔ ان کی آپس میں لڑائی ہوتی تھی اور کبھی کبھی جھگڑا اتنا شدید ہوتا تھا کہ ریحانہ ناراض ہو کر ماں باپ کے گھر آجاتی تھی۔ چچا چچی اسے سمجھاتے بجھاتے اور مبشر کو بلا کر دونوں کی صلح کراتے تھے لیکن کچھ دن بعد دونوں میں پھر

جھگڑا ہوتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مبشر ذرا پرانے خیالات رکھتا تھا۔ اس کے خیال میں عورت کو غیر مردوں کے سامنے ڈھک چھپ کر جانا چاہیے۔ جب کہ ریحانہ آزاد خیال تھی۔ وہ جدید فیشن کے کپڑے پہنتی تھی۔ جو عام طور سے فٹنگ والے ہوتے تھے پھر وہ کہیں آتے جاتے عبایا یا چادر نہیں لیتی تھی بلکہ نارمل دوپٹا لیتی تھی۔ یہ بات مبشر کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ اسے ٹوکتا تو دونوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ اس کے اصرار پر مبشر ٹی وی لایا تھا لیکن جب وہ ڈرامے اور فلمیں دیکھتی تب بھی مبشر اسے منع کرتا۔ وہ اسے باہر کم لے کر جاتا تھا اسے اپنی بیوی کو ایسی جگہوں پر لے جانا اچھا نہیں لگتا جہاں دوسرے مرد ہوں اور وہ ریحانہ کو دیکھیں۔ وہ اسے مخلوط شادیوں اور محفلوں میں بھی نہیں لے جاتا تھا۔ ریحانہ شروع سے سیر و تفریح اور گھومنے پھرنے کی شوقین تھی۔ جدید فیشن ایبل لباس اور میک اپ اس کی کمزوری تھی۔

سچی بات ہے کہ مجھے خود بھی یہ چیز اچھی نہیں لگی تھی۔ دوسرے شادی کے بعد ریحانہ کی دلکشی مزید بڑھ گئی تھی۔ پہلے وہ کلی تھی تو اب بھرپور کھلا ہوا گلاب بن گئی۔ چہرے کے نقوش تو پہلے ہی دل آویز تھے اب جسمانی خطوط بھی قاتل بن گئے تھے۔ اوپر سے وہ لباس ایسے پہنتی تھی جو اس کی جسمانی دلکشی کو مزید نمایاں کرتے تھے۔ ایمان بھی حسن و دلکشی میں اس سے کم نہیں تھی لیکن وہ خود کو ڈھک چھپ کر رکھتی تھی۔ اگر وہ اس طرح سے خود کو نمایاں کرتی تو یقیناً مجھے بھی برا لگتا۔ مبشر اس لحاظ سے حق بہ جانب تھا۔ میرے اور مبشر کے ایک مشترکہ دوست کی بہن کی شادی میں ہم سب گئے تھے۔ اس شادی میں ریحانہ نے غرارہ سوٹ پہنا تھا، بہت تنگ کرتی جو اس کی کمر سے لے کر اوپر تک جیسے چسپاں ہو رہی تھی اور گریبان بھی معمول سے بڑا تھا۔ جس سے اس کا گداز گلابی بدن جھلکا پڑ رہا تھا۔ اوپر سے اس نے نہ ہونے کے برابر دوپٹا لیا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ گیدرنگ مکس تھی اور ریحانہ ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے پورے ہال میں تتلی کی طرح چکراتی پھر رہی تھی۔ ایسے میں مردوں کی نگاہ عورت پر کس طرح پڑتی ہے اس سے تمام مرد حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ ہال میں موجود تقریباً تمام مردوں کی نگاہیں ریحانہ پر مرکوز تھیں اور مبشر شدید پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مگر ریحانہ کو کوئی پروا نہیں تھی…… ایمان نے مجھ سے دبے لفظوں میں کہا۔ ”یہ ریحانہ کو کیا ہو گیا ہے۔ آج اس نے کیسی ڈریسنگ کی ہے اور کیا اسے اندازہ نہیں ہے کہ مبشر بھائی کتنے غصے میں ہیں۔“

”یہ ان کا معاملہ ہے۔“ میں نے بھی دبی زبان میں کہا۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی ریحانہ کے حسن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں اس طرح بیٹھا تھا کہ ایمان یا مبشر نہیں دیکھ سکتے تھے کہ میں ریحانہ کو دیکھ رہا تھا اور بہت عرصے بعد میں نے اسے اس طرح دیکھا تھا۔ تب مجھے ایک انوکھا خیال آیا۔ میرے اندر جو ایک خلش اور ادھورے پن کی کیفیت تھی وہ اصل میں ریحانہ سے محرومی کی تھی۔ میں شروع سے اس کی خوب صورتی کا دیوانہ تھا۔ اس کے وجود کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اس میں ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی سے مجھے ریحانہ سے نفرت ضرور ہوئی تھی لیکن اب بھی میں اس کا طلب گار تھا۔ یہ خیال کسی تیز سنسناتے سیال کی طرح میرے پورے جسم میں تیر گیا۔ میں کانپ اٹھا تھا۔ شکر ہے ایمان اور مبشر دونوں کی توجہ ریحانہ کی طرف تھی۔ ورنہ وہ میری حالت میں تغیر محسوس کر لیتے۔

ریحانہ دلہن کی طرف سے اس کے سسرالی رشتے داروں کو جوتا چرائی کے موقع پر ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ ان میں اکثریت نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی۔ وہ اتنی شوخ و چنچل ہو رہی تھی کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا اور وہاں موجود مرد اور لڑکے اسے جس طرح دیکھ رہے تھے صاف لگ رہا تھا یہ مبشر کی برداشت سے باہر تھا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر ریحانہ کی طرف بڑھا۔ پاس جا کر اس نے ریحانہ کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا لا کر اس نے کرسی پر پٹخنے کے انداز میں بٹھا دیا۔ اتفاق سے کرسی میرے برابر میں تھی۔ ریحانہ گری اور سنبھلتے ہوئے بھی مجھ سے ٹکرا گئی تھی۔ اس کا نرم، گرم اور بھرپور گداز جسم مجھ سے ٹکرایا تو ایک بار پھر وہی سنسنی کی لہر پیدا ہوئی تھی۔ میں نے سہارا دینے کے بہانے اس کا بازو پکڑا اور مبشر سے کہا۔ ”ایزی یار……“

”آپ دیکھ رہے ہیں انہیں۔“ ریحانہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ”انہوں نے سب کے سامنے میری کتنی انسلٹ کی ہے۔“

”انسلٹ۔“ مبشر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تمہیں عزت، بے عزتی کا احساس بھی ہے۔“

ریحانہ رونے لگی اور ایمان اسے چپ کرا رہی تھی۔ تقریباً سب ہی نے اس بات کو محسوس کیا اور میں نے مبشر سے کہا۔ ”میرا خیال ہے گھر چلو اب یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“

خود مبشر بھی یہی چاہتا تھا۔ ہم سب کار میں آئے تھے۔ میں نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی کار لے لی تھی۔ جب کہ مبشر کے پاس وہی بائیک تھی۔ واپسی میں بھی ریحانہ روتی رہی اور مبشر خاموش بیٹھا ہونٹ کاٹتا رہا۔ میرا اندازہ تھا کہ آج رات مبشر اور ریحانہ میں شدید جھگڑا ہو گا۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے انوکھا خیال آیا کہ اگر مبشر بے قابو ہو جائے اور ریحانہ کو طلاق دے دے تو کیا ہو گا؟ مگر یہ لمحاتی خیال تھا جو بس ایک لمحے کے لیے آیا تھا۔ مگر جب ہم گھر آئے اور میں چینج کر کے آیا تو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بال برش کرتی ایمان نے کہا۔ ”سچ کہوں تو مجھے ڈر لگ رہا ہے کہیں مبشر بھائی کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لیں۔ آج ریحانہ نے بھی حد کر دی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر مبشر بھائی کو چڑا رہی ہو۔“

”میرا خیال ہے اس معاملے میں دونوں قصور وار ہیں۔ مبشر اسے آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”ویسے عورت کو کرنا تو وہی چاہیے جو اس کے شوہر کو پسند ہو۔“

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ میں بھی ایک شوہر ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ اگلی صبح چھٹی تھی اور چھٹی والے دن میں دیر سے اٹھتا تھا۔ لیکن ایمان جلدی اٹھتی تھی کیونکہ اس نے بچوں کو جلدی اٹھنے کی عادت ڈالی تھی اس لیے انہیں صبح صبح ناشتا درکار ہوتا تھا وہ عام طور سے بچوں سے نمٹ کر مجھے اٹھاتی تھی اور ہم ساتھ ہی ناشتا کرتے تھے۔ لیکن اس صبح ایمان نے جس طرح مجھے بیدار کیا تو اس کے انداز اور چہرے پر بدحواسی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”خیریت؟“

”مبشر بھائی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”بہت برا ہوا ہے۔ وہی جس بارے میں ہم رات کو بات کر رہے تھے۔“

میں چونک گیا۔ ”کیا مطلب؟ مبشر نے کوئی حماقت کی ہے؟“

ایمان نے سر ہلایا۔ ”وہ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے رات جھگڑے کے بعد غصے میں آ کر ریحانہ کو طلاق دے دی ہے۔“

میں تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکا جہاں مبشر زرد چہرہ لیے بیٹھا تھا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔ ”مبشر یہ کیا کیا؟“

”بس یار…… پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا شاید میری برداشت جواب دے گئی تھی اور میں نے……“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کر لیا کیونکہ بچے جاگ گئے تھے۔ میں مبشر کے پاس آ بیٹھا۔

”تم نے تین دفعہ طلاق دے دی ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں میں نے تین بار یہ منحوس لفظ اپنی زبان سے ادا کر دیا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”تب تم جانتے ہو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ریحانہ تمہاری بیوی نہیں رہی ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ وہ بولا۔ اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ”میں نے حماقت کی ہے اور ریحانہ نے ضد کی تھی ہم دونوں کو اب اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔“

”لیکن تمہارے بچے ان کا کیا قصور ہے؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”میں بھی ان کے لیے پریشان ہوں۔“ وہ بولا۔ ”ان معصوموں کو اس قیامت کی خبر نہیں ہے جو ان کے ماں باپ پر گزر گئی ہے۔“

”تم نے ابھی تک کسی اور کو نہیں بتایا ہے؟“

”نہیں میری ہمت نہیں ہو رہی ہے اپنے گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا ہے۔ اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم میری مدد کرو اور بڑوں تک یہ بات پہنچاؤ۔“

”میں حسن چچا سے بات کرتا ہوں تم پھوپا کو بتاؤ۔“

”نہیں یار ان سے بھی تم ہی بات کرنا۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”بھائی وہ تمہارے باپ ہیں میں ان سے کیسے بات کر سکتا ہوں بہتر ہو گا تم ان سے خود بات کرو۔“ میں نے انکار کیا۔ ”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ چچا چچی کو یہ خبر کیسے سناؤں۔ ان پر تو قیامت گزر جائے گی۔“

”یار عظیم میرا قصور بھی ہے لیکن تم جانتے ہو ریحانہ حد سے گزر گئی تھی اگر وہ تمہاری بیوی ہوتی تو کیا تم یہ بات برداشت کر سکتے تھے؟“

مبشر کی اس بات سے میرے جسم میں پھر وہی سنسناہٹ ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ ”اب مفروضات پر بات کرنے سے کیا حاصل ہو گا۔ جو ہونا تھا وہ

ہو گیا ہے۔ میں چچا حسن کی طرف جاتا ہوں۔ ریحانہ کہاں ہے؟''

''اس نے خود کو بچوں والے کمرے میں قید کرلیا ہے۔''

''میرا خیال ہے چچا چچی اسے گھر لے جائیں گے۔'' میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

ایمان نے بچوں کو ناشتا کرا دیا تھا۔ میں نے اسے ریحانہ کے پاس جانے کو کہا اور خود نیچے آیا۔ مبشر جا چکا تھا۔ نیچے ابو صحن میں اخبار پڑھتے ہوئے دھوپ سینک رہے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے یہ مبشر صبح صبح کیوں آیا تھا؟''

میں نے سوچا اور ابو کو مختصر الفاظ میں مبشر اور ریحانہ کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔ ''میرے خدا اس لڑکے نے کیا حماقت کی ہے۔''

''میں چچا کی طرف جا رہا ہوں۔ مبشر نے کہا ہے کہ میں ان کو یہ خبر دوں۔''

''ایک منٹ رکو میں بھی چلتا ہوں حسن جلدی غصے میں آجاتا ہے۔'' ابو نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اب ابو معاملہ دیکھ لیتے۔

کچھ دیر بعد ہم چچا حسن کے گھر میں تھے اور ابو نے ان کو بتا دیا تھا۔ وہ اور چچی تو سنتے ہی حواس باختہ ہو گئے تھے پھر چچی نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ چچا نے ان کو ڈانٹا۔ ''مجھے پہلے ہی خدشہ تھا اس لڑکی کی خودسری کبھی گل کھلائے گی۔''

''میں نے سمجھایا تو تھا۔''

''خاک سمجھایا ہوگا۔'' چچا کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ''اگر وہ سمجھتی تو یہاں تک نوبت آتی۔''

''مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں اپنی مرضی سے بہن کو بیٹی دی تھی۔'' اس بار چچی نے بھی تنک کر کہا۔

ابو نے دونوں کو خاموش کرایا اور چچی سے کہا۔ ''آپس میں لڑنے کے بجائے تم جاکر ریحانہ کو دیکھو اور ہو سکے تو اسے یہاں لے آؤ۔''

''تاکہ جن لوگوں کو پتا نہیں ہے ان کو بھی پتا چل جائے۔'' چچا حسن تلخی سے بولے۔

''لوگوں کو ویسے بھی پتا چلے گا۔ ریحانہ عورت ہے وہ زیادہ متاثر ہوئی ہے اسے تم لوگوں کی ہمدردی کی ضرورت ہے۔''

''اس گھر میں اس خودسری کی کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''خدا کے لیے حسن....'' ابو بولے۔ وہ انہیں سمجھانے میں لگ گئے اور میں چچی کو لے کر مبشر کے گھر آیا۔ مبشر نیچے والے حصے میں پھوپا کے ساتھ رہتا تھا جب کہ عاشر اوپر دو کمرے بنوا کر بیوی بچوں سمیت وہاں منتقل ہو گیا تھا۔ پھوپا ابھی تک بے خبر تھے لیکن جب چچی وہاں پہنچیں اور رونا دھونا شروع کیا تو ان کو بھی معلوم ہو گیا۔ ایک بجلی تھی جو اس گھر پر گری تھی اور اس نے سب جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ چچی نے اسی وقت ریحانہ کا ذاتی سامان لیا اور اسے لے کر چلی گئیں۔ پھوپا اور مبشر نے بچوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مبشر کی بڑی بیٹی آئینہ تیرہ سال کی ہو رہی تھی اور سمجھدار تھی۔ اس نے بھی رو رو کر آنکھیں سجائی ہوئی تھیں البتہ دس سال کا بیٹا ابھی صورت حال کو اتنا نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ سہا ہوا ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ مبشر غم سے نڈھال تھا۔ وہ ریحانہ سے محبت کرتا تھا مگر ریحانہ نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی حالانکہ اس نے خود مبشر کو پسند کیا تھا۔ ابو نے پھوپا سے کہا۔ ''خالد اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا ہوگا ورنہ بچے رل جائیں گے۔''

''اس کا ایک ہی حل ہے۔'' پھوپا نے کہا۔ ''تم بھی جانتے ہو اور میں بھی۔''

''حلالہ۔'' ابو نے کہا۔

''لیکن سوال یہ ہے کیا ریحانہ اور مبشر اس کے لیے تیار ہوں گے اسی طرح حسن اور نعمانہ مانیں گے؟''

مبشر وہاں موجود تھا اور یہ سن کر ہی اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ جو شخص اپنی بیوی پر کسی غیر مرد کی نظر برداشت نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ ویسے تو ہر مرد کے لیے یہ تصور ہی ناقابلِ برداشت ہوتا کہ اس کی بیوی جسے اس نے طلاق دے دی ہو وہ کسی اور مرد کے تصرف میں رہ کر اس کے پاس واپس آئے۔ مبشر اس کے معاملے میں زیادہ ہی حساس تھا اور اسی وجہ سے طلاق کی نوبت آئی تھی۔ کچھ دیر میں چچا حسن اور ایمن پھپھو بھی دانیال پھوپا کے ساتھ آگئیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے اٹھ جاؤں کیونکہ اب سب ہی بڑے تھے۔ مبشر کی وہاں موجودگی لازمی تھی کیونکہ مسئلہ اسی کا تھا۔ میں گھر آیا تو ایمان بھی آگئی تھی اس کا کہنا تھا کہ ریحانہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اسے اپنے بچوں کی فکر بھی تھی کہ اب ان کا کیا ہوگا۔ میں نے چچی کا ردِعمل پوچھا۔ ایمان بولی۔ ''وہ بہت غصے میں ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اچھا ہوا ریحانہ کی ایسے شخص سے جان چھوٹ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''چچی جان غلط کہہ رہی ہیں۔ مبشر نے ریحانہ کے ساتھ ایسا کوئی ظلم نہیں کیا ہے۔ اگر طلاق مبشر نے دی ہے تو اسے لینے میں ریحانہ کا بھی پورا ہاتھ ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' ایمان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کاش ریحانہ یہ بات سمجھ سکتی۔''

''وہ شروع سے خود پسند رہی ہے اور اسے اپنے سوا کسی کی پروا نہیں تھی۔'' میں نے اس وقت کو یاد کیا جب میں نے اسے چاہا تھا۔

''لیکن ریحانہ نے شادی تو پسند سے کی تھی؟'' ایمان بولی۔

''ہاں، لیکن یہ محبت نہیں تھی بلکہ ریحانہ کی خواہش تھی۔ وہ شروع سے مبشر کی طرف ملتفت تھی۔''

''سنا ہے آپ کا رشتہ بھی گیا تھا اس کے لیے؟'' ایمان نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ لیکن انداز چھیڑنے والا تھا۔

''ہاں امی کی خواہش تھی۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''واقعی؟''

میں نے اسے گھورا تو اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تو میں بھی مسکرا دیا تھا۔ پھر مجھے سچویشن یاد آئی تو میں سنجیدہ ہو گیا۔ شام تک بزرگوں کا اجلاس جاری رہا تھا۔ مبشر کے ہاں اجلاس میں ذرا گرما گرمی ہو گئی تھی۔ چچا حسن نے مبشر کو سنائیں۔ جواب میں اس نے بھی کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو بھی دیکھیں۔ دوسرا اجلاس ہمارے ہاں ہوا تھا۔ اس میں سب سے پہلے طے ہوا کہ یہ خبر ان چار گھروں سے آگے نہیں جانی چاہیے۔ اس کے بعد ابو اور چچا حسن کسی عالم کے پاس فتویٰ لینے چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ ابو نے بتایا کہ عالم نے قطعی طلاق کا بتاتے ہوئے اس کا حل حلالہ قرار دیا ہے۔

''یہ دونوں مانیں گے؟'' دانیال پھوپا نے پوچھا۔ ان کا اشارہ ریحانہ اور مبشر کی طرف تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا تو پہلے دونوں نے ہی انکار کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ مگر جب بچوں کا مسئلہ سامنے آیا تو دونوں کے دلوں میں جمی برف پگھلنے لگی تھی۔ ریحانہ ابھی چھتیس برس کی تھی لیکن دیکھنے میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ حسین اور دلکش تھی کوشش کی جاتی تو اس کی دوسری شادی ممکن تھی۔ مگر بچے پھر کہاں جاتے، اس کی بیٹی بڑی ہو رہی تھی اور اسے ماں کی ضرورت تھی پھر ریحانہ کو اپنے بیٹے سے والہانہ پیار تھا وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ ایسے میں واحد حل حلالہ رہ جاتا تھا۔ مگر ریحانہ اور مبشر دونوں اسے مانتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ جانتے تھے کہ اگر انہیں دوبارہ ایک ہونا ہے تو اس کا راستہ اصل میں یہی ہے۔ جس دن مبشر نے یہ حل تسلیم کیا وہ میرے سامنے پھوٹ کر رو دیا تھا۔

''یار میں کیا کروں میرا دل چاہ رہا ہے کہ خودکشی کر لوں۔''

''دوست انسان کو زندگی میں ایسی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے اور ریحانہ کے مسئلے کا ایک یہی حل باقی رہ جاتا ہے۔''

ریحانہ نہیں مان رہی تھی لیکن پھر وہ بھی راضی ہو گئی۔ جب ایک بار فیصلہ ہو گیا تو اب یہ سوچا جانے لگا کہ اس کام کے لیے کون تیار ہوگا؟ کیونکہ بات ان چار گھرانوں سے باہر نہیں گئی تھی اس لیے ابو نے فرد کو بھی یہیں تلاش کرنے کا کہا۔ یہ ان دونوں کو راضی کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا کیونکہ سب سے پہلے شرجیل کا نام نکلا اور اس نے سنتے ہی انکار کر دیا۔ اس کی بیوی غزل شوہر کے معاملے میں بہت حساس تھی۔ اس نے شرجیل سے کہا کہ وہ اگر راضی ہوا تو پہلے اسے طلاق دے اور اس کے بعد جو چاہے کرتا رہے۔ شرجیل نے معذرت کرلی تھی وہ ویسے بھی راضی نہیں تھا۔ اب رہ گئے تھے میں، رحیم، عاشر اور راحیل۔ یہ تینوں عمر میں اور رشتے میں ریحانہ سے چھوٹے تھے اس لیے جب انہوں نے بھی انکار کیا تو کسی نے زیادہ زور نہیں دیا۔ آخر میں، میں بچا تھا۔ ابھی تک کسی نے مجھ سے کہا نہیں تھا لیکن ایمان کے ذہن میں یہ خیال پہلے آگیا۔

''سنیں اگر انہوں نے اس کام کے لیے آپ سے کہا تو آپ کیا کریں گے؟''

''تمہارا اشارہ اگر ریحانہ سے شادی کرنے کا ہے تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔''

''لیکن آپ پر زور دیا گیا خاص طور سے بڑوں کی طرف سے تو....'' ایمان کا لہجہ دھیما ہو گیا تھا۔

''تب بھی میرا جواب انکار میں ہوگا۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا تو ایمان نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ظاہر ہے کون عورت پسند کرے گی کہ اس کا شوہر عارضی طور پر ہی لیکن کسی دوسری عورت کا ہو۔ لیکن خاندان کے بڑوں

میں اسی بارے میں کھچڑی پک رہی تھی۔ سب کے انکار کے بعد میں ہی بچتا تھا۔ جس دن ایمان نے خدشہ ظاہر کیا اس سے اگلے دن ابو نے مجھے الگ بلا کر اس بارے میں بات کی۔ میں نے انکار کر دیا۔ "ابو میں یہ نہیں کر سکتا۔"

"میں جانتا ہوں بیٹے یہ بہت مشکل ہے لیکن کسی کو تو کرنا ہے ورنہ ریحانہ اور مبشر کا گھر اجڑ جائے گا۔ ان کے بچے رل جائیں گے۔ اگر ریحانہ کی دوسری شادی کی تو مبشر کو بھی شادی کرنا پڑے گی۔ پتا نہیں آنے والی عورت اس کے بچوں کو پیار دے یا نہ دے۔"

"ابو میں سمجھتا ہوں لیکن میں یہ قربانی نہیں دے سکتا۔"

ابو نے بہت اصرار کیا اور میرا انکار برقرار رہا تو ابو چپ ہو گئے لیکن دو دن بعد ابو، چچا اور پھوپا نے مجھے چچا کے گھر بلا لیا۔ اس سے پہلے ایمان کو پتا چل گیا تھا اور وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "عظیم مجھے لگتا ہے یہ آپ سے منوا کر چھوڑیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو جہاں تک میرے بس میں ہوا میں انکار پر قائم رہوں گا۔"

"بس سے کیا مراد ہے؟" ایمان بولی۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ ابو نے مجھ پر کتنا دباؤ ڈالا ہے اور میں نے کیسے برداشت کیا ہے۔"

جب ابو، چچا اور پھوپا نے مل کر گھیرا تو میں اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکا تھا۔ میں مان گیا لیکن ساتھ ہی شرط رکھ دی کہ اگر ایمان اجازت دے گی تو میں ریحانہ سے نکاح کروں گا۔ یہ ضروری بھی تھا کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت درکار ہوتی ہے۔ بات ایمان تک پہنچی تو بزرگوں نے اس سے بات کی۔ اس کا خیال تھا کہ بات اس تک نہیں آئے گی لیکن جب آئی تو وہ کمزور پڑ گئی اور اس سے انکار نہیں ہو سکا۔ وہ اس شرط پر مان گئی کہ جو ہوگا وہ فوری ہو گا اور یہ شادی زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی۔ وہ مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے گیند اس کے کورٹ میں کیوں پھینک دی تو میں نے کہا۔ "جیسے تمہارے لیے انکار کرنا مشکل تھا اسی طرح میرے لیے بھی مشکل تھا۔ مجھے خاندان کی عزت کے واسطے دیے گئے تھے۔"

"لیکن اب تو آپ خوش ہیں۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ مجھے کوئی خوشی نہیں ہے بلکہ کوفت ہے۔"

میں نے سچ کہا تھا لیکن پورا سچ نہیں تھا۔ درحقیقت مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کیونکہ میری برسوں پرانی آرزو پوری ہونے والی تھی۔ میری اور ایمان کی طرف سے رضامندی پا کر سب نے سکون کا سانس لیا تھا کہ سب سے مشکل مرحلہ ختم ہو گیا تھا۔ مبشر میرا شکر گزار تھا کہ میں اس کی خاطر قربانی دے رہا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ طے پایا کہ جیسے ہی ریحانہ کی عدت پوری ہوگی میرا اور اس کا نکاح سادگی اور خاموشی سے کرا دیا جائے گا۔ میں اس کے ساتھ ایک رات گزاروں گا اور صبح اسے طلاق دے دوں گا۔ پھر عدت گزار کر وہ دوبارہ مبشر کے نکاح میں آجائے گی۔ اس قسم کے حالات میں ایسا ہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ لیکن میں نے کچھ اور سوچا ہوا تھا۔ ابھی تو طلاق کو ایک مہینا بھی نہیں ہوا تھا اور میرے ساتھ ریحانہ کے نکاح میں وقت تھا اس لیے سب آرام سے بیٹھ گئے۔ ریحانہ مبشر کے گھر میں تھی لیکن وہ بچوں کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی اور جب مبشر گھر میں ہوتا تو وہ کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔ وہ صرف بچوں کا کام کرتی تھی۔ مبشر کے لیے کھانا بھی نہیں بناتی تھی۔ ابھی اس سے کوئی نامحرم نہیں مل سکتا تھا اس لیے نکاح طے ہو جانے کے باوجود میں بھی اس سے نہیں مل سکتا تھا۔

ایمان سہمی سہمی سی رہنے لگی تھی۔ میں اسے پیار سے تسلی اور دلاسے دیتا کہ کچھ نہیں ہوگا بس ایک دو دن کی بات ہے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی کا تھا اور آیندہ بھی اسی کا رہوں گا۔ ایک رات اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے آپ نہیں جانتے آپ میرے لیے کیا ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "میں نے اس امید پر گیند تمہارے کورٹ میں پھینکی تھی کہ تم شرجیل کی بیوی کی طرح ڈٹ جاؤ گی لیکن تم نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔"

"اب پچھتا رہی ہوں کہ میں نے ان لوگوں کی بات کیوں مانی، کیا میرا ہی شوہر رہ گیا تھا۔ باہر سے کوئی پکڑ لاتے۔" وہ غصے میں آگئی تھی۔

میں نے دل میں سوچا کہ باہر سے کسی کو پکڑ لاتے تو میرے ارمان کہاں سے پورے ہوتے۔ وقت تیزی سے گزرا اور ریحانہ کی عدت پوری ہو گئی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق عدت پوری ہونے کے اگلے دن میرا اور ریحانہ کا نکاح کرا دیا گیا تھا۔ شادی کی رات۔ ہم چچا حسن کے گھر رہتے۔ نکاح بھی وہیں ہوا تھا۔ نکاح خواں کو چچا ہی لائے تھے۔ گواہ خاندان کے لوگ بنے۔ نکاح کے بعد میں گھر آگیا۔ ایمان نے مجھے دیکھا۔ "کیا بات ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟"

"پتا نہیں ایمان میرا دل نہیں مان رہا۔"

وہ بھی افسردہ ہو گئی۔ "لیکن اب کیا ہو سکتا ہے اب تو نکاح بھی ہو گیا ہے۔"

میں نے سر تھام لیا۔ "یہ مجھ سے نہیں ہوگا میں وہاں نہیں جاؤں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہیں؟ اب سب ہو چکا ہے تو آپ منع کر رہے ہیں۔"

جب میں نے زیادہ شدت سے انکار کیا تو ایمان نے پریشان ہو کر ابو کو بلا لیا۔ "دیکھیں، یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

ابو نے پوچھا تو میں نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ میرا دل نہیں مان رہا اور میں چچا کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟ اب تو نکاح بھی ہو گیا ہے اور کل تک معاملہ نمٹانا ہوگا۔"

"بس ابو میں نے کہہ دیا ہے یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

میں نے دوٹوک انداز میں کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ایک گھنٹے کے اندر چچا، پھوپو اور مبشر بھی آگئے تھے۔ وہ سب مجھ پر چڑھ دوڑے تھے کہ جب سب ہو گیا تو میں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میں خاموشی سے سب کی سنتا رہا اور پھر کہا۔ "میرا دل اس کام کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ میں ریحانہ کو طلاق دینے کو تیار ہوں۔"

"تمہارا دماغ درست ہے۔" مبشر نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم ریحانہ کو طلاق دے دوگے تب بھی بات وہیں رہے گی اسے کسی اور سے شادی کرنا پڑے گی۔"

چچا حسن بھی غصے میں آگئے۔ "تم میری بیٹی کو تماشا بنا رہے ہو اگر ایسی بات تھی تو نکاح پر کیوں مانے؟"

"اس وقت میری کیفیت ایسی نہیں تھی لیکن اب میں بتا نہیں سکتا کہ میری اندر سے کیا حالت ہو رہی ہے۔"

وہ سب زور دے رہے تھے اور میں انکار کر رہا تھا۔ ابو دیکھ رہے تھے کہ بات بگڑ رہی ہے۔ انہوں نے چچا اور مبشر کو ٹھنڈا کیا۔ "آج کے لیے اس بات کو یہیں چھوڑ دو۔ کل بات کریں گے۔"

چچا اور مبشر فیصلہ کرا کے جانا چاہتے تھے لیکن ابو اور پھر پھوپو کے کہنے پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں اپنے کمرے میں آیا تو کچھ دیر بعد میرے موبائل پر ریحانہ کی کال آئی میں نے ریسیو نہیں کی تو اس نے ایمان کے نمبر پر کال کی۔ اس نے موبائل میری طرف بڑھایا میں نے انکار کیا۔ "تم ہی بات کرلو۔"

"میرا کیا تعلق ہے۔" وہ تلخی سے بولی۔ "وہ بات آپ سے کرنا چاہ رہی ہے۔ تعلق تو آپ سے ہے۔"

ایک بار کال خود کٹ گئی تو ریحانہ نے دوبارہ کال کی۔ میں موبائل لے کر نشست گاہ میں آگیا اور کال ریسیو کی۔ "کیا بات ہے کیوں کال کر رہی ہو؟"

"اس لیے کہ آپ سے پوچھوں مجھے سب کی نظروں میں تماشا کیوں بنا رہے ہیں۔"

"یہ میں خود بھی نہیں جانتا لیکن ریحانہ میرا دل اس کام کے لیے بالکل راضی نہیں ہے۔"

"تو میرا کون سا راضی تھا۔" اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "جیسے میں مجبور اسی طرح آپ مجبور۔"

"میں مجبور نہیں ہوں، میں نے چچا جان اور مبشر سے بھی کہہ دیا ہے کہ میں تمہیں طلاق دینے کو تیار ہوں وہ کوئی دوسرا کاٹھ کا الو تلاش کر لیں۔"

یہ سن کر ریحانہ کے ہوش اڑ گئے تھے۔ "عظیم کیا کہہ رہے ہیں۔ پلیز یہ میری اور میرے بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔"

"تم شاید مبشر کا ذکر کرنا بھول گئیں۔" میں نے طنز کیا۔ "بھی وہ تمہاری زندگی اور چاہت تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "اس شخص کے لیے میرے دل میں اب کوئی جگہ نہیں رہی ہے۔ میں صرف بچوں کی وجہ سے راضی ہوئی ہوں۔"

میں نے دروازے پر کسی کو محسوس کیا تو لہجہ بدل کر بولا۔ "یہ تمہارا اور مبشر کا مسئلہ ہے تم لوگ خود نمٹو۔"

میں نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور پھر موبائل بھی بند کر دیا۔ باہر آنے پر میں نے ایمان کی جھلک دیکھی جو تیزی سے بیڈ روم میں واپس جا رہی تھی وہ تجسس میں پیچھے آئی تھی کہ میں ریحانہ سے کیا بات کر رہا ہوں۔ میں دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔ ابھی تک سب میری پلاننگ کے مطابق جاری تھا۔ مجھے امید تھی کہ آگے بھی ایسا ہی ہوگا۔ آنے والے دو دن تک ابو اور دوسرے لوگ مجھ سے بات کرتے رہے اور میں اپنے انکار پر قائم رہا۔ تیسرے دن ابو نے مجھ سے کہا۔ "بیٹے یہ مسئلہ اس طرح حل نہیں ہوگا۔ میرا ایک

مشورہ ہے۔ میں نے حسن اور مبشر سے بات کی ہے وہ بھی اس پر راضی ہیں۔"

"کیسا مشورہ ابو؟"

"تم ریحانہ کو لے کر چند دن کے لیے شہر سے باہر چلے جاؤ۔ میرا خیال ہے ناردرن ایریا چلے جاؤ اور وہاں چند دن ہوٹل میں قیام کرو۔ پھر واپس آجانا۔"

میں ہچکچایا۔ "یہ مناسب ہے؟"

"دیکھو اس مسئلے کو حل کرنا ہے۔ حسن اور مبشر تمہاری طرف سے طلاق پر آمادہ نہیں ہیں۔" ابو نے ڈھکے چھپے انداز میں کہا۔ "وہ چاہتے ہیں تم اپنا طے شدہ کردار ادا کرو۔"

"میں سوچوں گا ابو۔"

"نہیں سوچنے کا وقت نہیں ہے، میں تمہاری اور ریحانہ کی سیٹس بک کرا رہا ہوں۔" ابو نے کہا۔ پھر انہوں نے مجھے قائل کرلیا کہ یہی طریقہ مناسب ہے۔ دوسرے دن ہم نائٹ کوچ سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئے وہاں سے شوگراں پہنچے اور آنے والے ایک ہفتے تک ہم وہیں مقیم رہے تھے۔ آخر کار میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اس ایک ہفتے کے دوران ہم زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں رہے۔ ایک ہفتے بعد جب ہم واپسی کی تیاری کررہے تھے تو ریحانہ کا حسین چہرہ ستا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "عظیم کیا یہ سب ختم ہوجائے گا؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے شانے اچکائے۔

وہ روہانسی ہوگئی۔ "اگر آپ نے یہ تعلق ختم کرنے کے لیے جوڑا تھا تو اس سلسلے کو اتنا دراز کیوں کیا؟"

"کیا مطلب؟" میں نے بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "مطلب یہ کہ اس کے لیے صرف ایک بار کا ملاپ کافی تھا۔ یہ کام آپ وہاں بھی کرسکتے تھے۔ یہاں لانے اور پورے ہفتے مجھے ساتھ رکھنے کا مقصد....؟"

"حیرت ہے تم اب بھی نہیں سمجھیں۔" میں نے کہا اور اس کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا اور بولا۔ "میں اس حسین وجود سے دل بھر کر خوشہ چینی کرنا چاہتا تھا۔ ایک آدھ بار سے میرا دل کہاں بھرتا اسی لیے تمہیں یہاں لایا۔"

وہ دنگ رہ گئی تھی پھر سنبھل کر بولی۔ "ٹھیک ہے آپ کا حق بنتا ہے میں قانونی لحاظ سے آپ کی بیوی ہوں لیکن پہلے تو آپ ایک بار بھی میرے پاس آنے پر تیار نہیں تھے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "وہ سب ڈراما تھا۔ اگر میں وہاں تمہارے پاس آجاتا تو اس کے فوراً مجھے تم کو طلاق دینا پڑتی۔ جب کہ میں چاہتا تھا کہ طلاق دینے سے پہلے میں اپنے سارے ارمان نکال لوں۔"

اس نے مشتعل ہو کر کہا۔ "آپ ... آپ نے مجھے استعمال کیا؟"

"تم نے بھی مجھے ہمیشہ استعمال کیا۔" میرا لہجہ سرد ہو گیا۔ "شادی سے پہلے بھی اور اب بھی استعمال ہی کررہی ہو تو کیا مجھے حق نہیں ہے کہ میں تمہیں استعمال کروں۔"

"آپ مجھ سے محبت کرتے تھے اس لیے...."

میں نے اس کی بات کاٹی۔ "نہیں اب میں صرف ایک عورت سے محبت کرتا ہوں اور وہ میری بیوی ایمان ہے۔"

"تب یہ سب....؟"

"یہ میری نفرت ہے جو اب میں تم سے کرتا ہوں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا ہے اس لیے میں صاف صاف بتا رہا ہوں۔ میں نے بھی تم سے محبت کی تھی لیکن جب تم نے مجھے بیوقوف بنایا اور مبشر کا انتخاب کیا تو یہ محبت نفرت میں بدل گئی۔ اس کے باوجود میں نے تمہارا برا نہیں چاہا مگر دیکھو قدرت نے مجھے موقع دیا کہ میں بدلہ چکا سکوں۔"

"تب وہ پیار اور محبت جو ان سات دنوں میں جتاتے رہے....؟"

"وہ صرف ایک دھوکا تھا تاکہ تم راضی خوشی خود کو میرے حوالے کرتی رہو۔ سچ کہو تو تم نے ایسا ہی نہیں کیا؟"

اس کا سر شکست خوردہ انداز میں جھک گیا تھا۔ میں نے بیگ بند کیا۔ "ریحانہ بیگم میرا خیال ہے حساب برابر ہو گیا۔ تم نے پہلے بھی مجھ سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور اب بھی میں تمہیں کچھ دے رہا ہوں۔" میں نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اس میں طلاق نامہ ہے۔"

وہ ساکت رہی تو میں نے لفافہ اس کی گود میں ڈال دیا اور بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔